

علوم القرآن

تأليف

شيخ الإسلام حضر مولانا محمد تقى عثمان ظاظاوى

حصرياً في كتاب موسوعة علوم القرآن

ناشر

مكتبة دار العلوم الكرچي



معزز قارئین توجہ فرمائیں

کتابِ مہنت کی روشنی میں لمحیٰ جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا منتشر کرزا

- **کتاب و سنت ذات کام** پرستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
 - **بیانات التحقیق الislamی** کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصریق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
 - **دعوتی مقاصد** کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیه

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر متمم کتب متعلقہ ناشرپن سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاؤشوں میں بھر پور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com
🌐 www.KitaboSunnat.com

علم القراءات

* * *

تألیف

مولانا محمد تقی عثمانی

* * *

ناشر

مکتبہ دارالعلوم کراچی

طبع جدید — ۱۳۱۵ھجری
بایہتہ کام — مبداصبور
مطبع —
تاشریف — مکتبہ دارالعرفان شلوم کراچی ۱۲ پوسٹ کوڈ ۵۱۸۰،

مختصر کے پئتے — ادارہ المعارف کراچی ۱۹۷۶
و ارالاشاعت اردو بازار، کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۷۱ تاکلی لاہور
ادارہ اہمیت آن سبیلہ چوک کراچی

اتاب

اپنے والد ماجد
 حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مذہب
 کی خدمت میں

جن کی ذات میں احترم کے لئے ایک مثالی، بلکہ بے مثال باب، ایک
 ہمہ جمیت اور ایک باریک میں مرتب و شرع کی شفقتیں جمع ہیں،

اور

رُوئے زمین پر احقر کی محبت ہی نہیں، عقیدت کا بھی ان سے بردا
 مرکز کوئی نہیں، حفظہ اللہ تعالیٰ،
 یہ حیر کا دش آنکہ کی پہنچی اجازت کے بغیر ان کے نام نامی سے منسوب کر کے
 وہن گزار ہوں گے

اگر سیاہ دلم، داغ غ لالہ زائر توام
 و گر کشادہ جہنم، گلی بہتا پر توام

محمد تقی مثالی

فہرست مَصَامِنْ عُلُومُ الْقُرْآن

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۲	حضرت پرنز دل دھی کے طریقے	۱۱	تقریط: حضرت مولا نامھ روی سنت بنوری ظڑا
۳۳	(۱) صلصلة الہجس	۱۲	پیش لفظ: حضرت مولا نامفتی محمد شفیع صاحب مذکو
۳۶	(۲) تسلیم لک	۱۴	حرفت آغاز، مولف
۳۸	(۳) فرشتہ کا اصل نکل میں آتا	۲۱	حصہ اول القرآن الکریم
"	(۴) رویتے صادقة	۲۳	باب اول ، تعارف ،
"	(۵) کلام آتی	"	قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ
۳۹	(۶) نفثت فی الردع	"	دھی اور اس کی حقیقت
"	دھی اور کشف و الہام	۲۵	دھی کی ضرورت
۴۰	دھی مستلو اور غیر مستلو	"	دھی کا مہموم
۴۳	دھی پر عقلی شبہات	۲۸	دھی کی تعلیمات
۴۸	کیا قرآن کے صرف معنی دھی ہیں؟	۳۰	دھی کی اقسام
۵۳	باب دوم ، تایخ نزول قرآن	"	(۱) دھی قبلی
۵۴	پہلا نزول	"	(۲) کلام آتی
۵۵	دوسرا نزول	۳۲	(۳) دھی ملک

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۰۶	"سبعہ احرف" کی راجح ترین تشریع	۵۹	سبے پہلی نازل ہونیوالی آیت
۱۱۰	اس قول کی وجہ ترجیح	۵۹	مکنی اور مدنی آیات
	اس قول پر دار ہونیوالے اعتراضات	۶۲	گئی اور مدنی آیتوں کی خصوصیات
۱۱۲	اور ان کا جواب،	۶۲	ترول کا وقت اور مقام
۱۱۳	سات حروف کے ذریعہ کیا آسانی	۶۵	(۱) ہماری
	پیدا ہوتی؟	۶۰	(۲) لیل
۱۱۸	حروف سبع اب بھی محفوظ ہیں یا	»	(۳) صيفی
	مرزوک ہو گئے؟	»	(۴) مشتانی
۱۱۹	حافظ ابن حجر کاظمی اور اس کی قتابیتیں،	»	(۵) فراشی
۱۲۳	امام طحاوی کا قول	۶۶	(۶) نومی
۱۲۴	سبے پہنچ قول	»	(۷) سادوی
۱۲۵	اس قول کے قاتلین	۶۴	(۸) فضانی
۱۳۴	اس قول کے ولائل	۶۹	قرآن کریم کا تدیرجی نزول
۱۲۰	اس قول پر دار ہونیوالے سوالات اور ان کے جواب	۷۲	ترتیب نزول اور موجودہ ترتیب
	لغت قریش پر لکھنے کا مطلب	۷۳	اسباب نزول اور اس کے فوائد
۱۲۳	مراد الفاظ سے تلاوت کا مسئلہ	۷۹	اسباب نزول اور شاہ ولی اللہ
۱۲۶	حضرت عبد اللہ بن مسعود اور ان کا مصحف	۸۲	سبب نزول ادا حکام کا عالم خصوص
۱۲۹	تتابعی بحث	۸۶	سبب نزول اور اختلاف روایات
۱۵۵	سات حروف کے بارگیں اختلاف آراء کی	۹۳	محکمہ نزول اور اس کی حقیقت
۱۵۶	حقیقت ایک غلط فہمی کا زال	۹۷	باب سوم، قرآن کے سات حروف
		۹۸	حروف سبعہ کا مفہوم

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۹۵	حرکات	۱۵۹	باب پھر، ناج منسوخ
۱۹۶	احزاب یا منزیلیں	"	نسخ کی حقیقت
"	اجزاء یا پاکے	"	نسخ کا عقلی و نقلی ثبوت
۱۹۷	ا خاص اور اعشار	"	نسخ کے بارے میں متقدمین اور متاخرین کی صلحانات کافر،
"	رکوع	۱۶۱	قرآن کریم کی طباعت، پاچواں مرحلہ
۱۹۸	رموز و ارقام	۱۶۲	قرأت اور ان کی تعداد
۲۰۱	قرآن کریم کی طباعت، پاچواں مرحلہ	۱۶۳	منسوخ آیات قرآن کی تعداد
۲۰۳	قرأت اور ان کی تعداد	۱۶۴	نیچہ بحث
۲۱۱	باب ششم	۱۶۲	باب سیم، تاریخ حفاظت قرآن
"	حفظت قرآن متعلق بہما	۱۷۳	انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حفاظت قرآن،
"	اور آن کا جواب	"	عہدِ رسالت میں کتابت قرآن، پہلا مرحلہ
۲۱۲	ابتدائی زمانہ کی آیات محفوظ نہیں	۱۷۴	حضرت ابو بکر رضی کے عہد میں جمع قرآن، دوسرا مرحلہ
"	رہیں؛ پہلا اعتراض	۱۷۵	حضرت عثمان رضی کے عہد میں جمع قرآن، تیسرا مرحلہ
۲۱۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ترہ ایک آیت یا دو نہیں ہی؛ دوسرا اعتراض	۱۸۱	تہسیل تلاوت کے افتادمات،
۲۱۶	سورہ نساء میں سورۃ الفاتحہ کا حوالہ؛	۱۸۲	چوتھا مرحلہ
"	کیسرا اعتراض	"	نقطہ
۲۱۹	امام بخاری پر مارگ روی توکہ کا ایک بہتان	۱۹۳	
۲۲۰	حضرت عائشہؓ نے کچھ آیتیں لگھوئیں تھیں، پاچواں اعتراض	"	

صفحہ	معنون	صفحہ	معنون
۲۶۸	قرآن کریم کی پیشگی بخوبی!	۲۲۱	ہمدرد سالت میں حفاظات کی تعداد
"	رمیوں کی فتح		چھٹا اعراض
۲۶۰	فتح مکہ کی خبر	۲۲۳	حضرت عبداللہ بن مسعود اور مخدومین
۲۶۱	بیویوں کی تہائی موت		ساتواں اعراض
۲۶۲	قرآن کریم کی حفاظت	۲۲۵	خلافت صدیقی میں جمع قرآن کی روایت
۲۶۵	قرآن کریم کے اكتشافات		مستشرقین کا آٹھواں اعراض
۲۶۶	حقایقت قرآن اور مغرب کے غیر مسلم مصنفین.	۲۳۱	خلافت صدیقی تک پورا قرآن لکھنیں
۲۸۳	آخرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابن حماد	۲۳۲	مختلف قرائیں کس طرح وجود میں آئیں
۲۸۷	قرآن کریم پر چند اعراضاں		دوساں شبہ
"	حضرت مریمؑ کے والد کا نام	۲۳۶	قرآن کریم کی شاذ قراءتیں اور آن کی
۲۸۹	فرعون کا وزیر ہامان		حقیقت؛ ٹیار ہواں شبہ
۲۹۳	باب ششم، مضامینِ قرآن	۲۲۱	باب سیشم، حقایقتِ قرآن
"	عقائد (ایجادی پہلو)	"	آخرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت
۲۹۵	نقل دلائل	۲۳۲	کتب مقدسر میں آپؐ کی بشارتیں،
۲۹۶	منطق دلائل	۲۳۸	اعجائز فتنہ آن
۲۹۷	قیاس استثنائی	۲۵۳	قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات،
۲۹۸	البر و تقسیم	"	الفاظ کا اعجاز
۲۹۹	تسییم	۲۵۹	ترکیب کا اعجاز
"	انتقال	"	اسلوب کا اعجاز
۳۰۲	مشابهات دلائل	۲۶۵	نظم کا اعجاز

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳۷	دوسرا مأخذ؛ احادیث نبوی	۳۰۳	تجرباتی دلائل
۳۳۸	تیسرا مأخذ؛ احوال صحابہ	۳۰۴	عقلتائید (سلی بیلو)
۳۲۰	چوتھا مأخذ؛ تابعین کے احوال	۳۰۵	بُت پرست مشرکین
۳۲۱	پانچواں مأخذ؛ لغت عرب	۳۰۸	سیوری
۳۲۳	چھٹا مأخذ، عقل سیلم	۳۱۰	نصاری
۳۲۵	بابِ دوم تفسیر کے ناقابل اعتبار مأخذ	۳۱۱	منافقین
۳۲۵	۱۔ اسرائیلی روایات	۳۱۵	احکام
۳۲۸	کعب الاحرار کون تھے؟	۳۱۶	شانِ نزول
۳۵۰	وہب بن منتبہ	۳۱۷	قصص
۳۵۱	حضرت عثیمین عروۃ	۳۱۸	ماضی کے واقعات
۳۵۳	۲۔ صوفیاتے کرام کی تفسیریں	۳۱۹	واقعات میں تنگار کیوں ہیں؟
۳۵۶	۳۔ تفسیر بالراتے	۳۲۰	مستقبل کے واقعات
۳۵۹	تفسیر میں گمراہی کے اسباب	۳۲۱	امثال
۳۶۳	۱۔ پہلا سبب بناہیلت	۳۲۲	حصہ دوم علم تفسیر
۳۶۴	چند غلط نہیاں	۳۲۳	باب اول
۳۶۵	علماء اور اجارة راری	۳۲۴	علم تفسیر اور اُس کے مأخذ
۳۶۶	علماء اور پیاسیت	۳۲۵	تعارف
۳۶۷	۲۔ قرآن کریم کو اپنے نظریات کتابخانہ	۳۲۶	تفسیر اور تاویل
۳۶۸	بنانا،	۳۲۷	تفسیر کے مأخذ
۳۶۹	۳۔ زبان کے افکار سے مرعوبیت	۳۲۸	پہلا مأخذ؛ خود قرآن کریم

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۲۳	۹ - زندگی تبدیلی اور حکما شرعی	۳۸۷	محرومات کا مستسل
۲۲۶	۱۰ - زنا نہ کی تبدیلی کا مطلب	۳۸۸	خلافِ عقل اور بادراً عقل
۲۲۸	۱۱ - عقل کا سمجھ و اثر کار	۳۹۰	۱۲ - قرآن کریم کے مومنوں کو غلط بخینا
۲۵۳	باب چہارم قرولی اولیٰ کے بعض مفسرین	"	باب سوم تفسیر کے چند ضروری صہول
"	حضرت عبدالذین عباسؓ	۳۰۰	۱ - قرآن کریم اور بجاذب
۲۵۶	گولڈزیپر کا ایک مخالفاط	۳۰۹	۲ - قرآن کریم اور عقلی دلائل
۲۵۸	مرد جن تفسیر بن عباسؓ نے	"	۱ - قطعی عقلی دلائل
"	حضرت علیؓ	۳۱۰	۲ - قطعی عقلی دلائل
۲۵۹	حضرت عبدالذین مسعودؓ	"	۳ - وہی عقلی دلائل
۲۶۰	حضرت ابی بن کعبؓ	۳۱۱	۱ - قطعی نقلي دلائل
۲۶۱	صحابہؓ کے بعد	"	۲ - علمی نقلي دلائل
"	۱ - حضرت مجاهدؓ	۳۱۹	۳ - وہی نقلي دلائل
۲۶۳	حضرت سعید بن جبیرؓ	۳۲۱	۴ - احکام شرعیہ اور عقل
۲۶۴	حضرت عکبرؓ	"	۱ - آزاد عقل اور پدایت و گزاری
۲۶۵	عکبرؓ پر اختر اضافات کی حققت	۳۲۰	۲ - اسلامی احکام کی مکتبیں
۲۶۶	گولڈزیپر کا ایک مخالفاط	۳۲۲	۳ - اور دن میں آن کا قیام
۲۶۹	حضرت طاؤسؓ	"	۴ - حکتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا
۲۷۰	۵ - حضرت عطا بن ابی بیانؓ	۳۲۹	۵ - احکام شرعیت کا اصل مقصد
۲۷۱	۶ - حضرت سعید بن المیتبؓ	۳۲۰	۶ - اتباع کا امتحان ہے،
۲۷۲	۷ - محمد بن سیرینؓ	"	۷ - قرآن و سنت کی تعبیر کا

صفنون	صف	عنوان	صفنون
۲۸۵	۳۴۳	قرول اول کے ضعفایا مختلف تفہیم	- ۸ - حضرت زید بن اسلم
۰	۳۴۵	سُدَّیٰ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ	- ۹ - حضرت ابوالعالیہ
۲۸۸	۳۴۶	سُدَّیٰ صَنِیرٰ	- ۱۰ - حضرت عروۃ بنت الزبیر
۲۸۹	"	مقاتل	- ۱۱ - حضرت حسن بصری
۳۹۳	۳۴۷	ربیع بن انس	- ۱۲ - حضرت قتادہ
۳۹۴	۳۴۸	علیتی العوی	- ۱۳ - محمد بن کعب لہسترنی
۳۹۶	۳۴۹	عبدالرحمن بن زید بن اسلم	- ۱۴ - حضرت علقمہ
۳۹۷	"	کلی	- ۱۵ - حضرت اسود
۵۰۰	۳۵۰	متاخرین کی چند تفسیریں	- ۱۶ - مرۃ الہدایہ
۵۰۱	۳۵۱	۱۔ تفسیر ابن کثیر	- ۱۷ - حضرت نافع
۵۰۲	۳۵۲	۲۔ تفسیر کبیر	- ۱۸ - حضرت شعبی
۵۰۵	"	۳۔ تفسیر ابن الصود	- ۱۹ - حضرت ابن ابی ملیکہ
"	۳۵۳	۴۔ تفسیر مشربی	- ۲۰ - حضرت ابن جریح
"	۳۵۴	۵۔ روح المعانی	- ۲۱ - حضرت ضحاک
۵۰۶		بيان القرآن ، معارف القرآن	

لُقْتَرِ لَظَّ

از شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد يوسف بنوری صاحب جنت الشعلیہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيدنا محمد

خاتم النبیین والله وصحبه اجمعین،

اما بعده، قرآن کریم کے علوم پر عربی زبان میں عمدہ قدماہ و متاخرین کی کتابیں آرہی ہیں، لیکن ان سے زیادہ تر علماء ہی استفادہ کر سکتے ہیں، اور زیادہ وہ کتابیں قدیم طرز، قدیم حاجات اور قدیم ذوق کے پیش نظر تصنیف کی گئی ہیں اور بلاشبہ ان کتابوں نے اس وقت کے تقاضوں کو بہت خوبی سے پیش کیا، اور امت کو تفعیل پہچایا، دہلی میں جب سرسری احمد خان کی تفسیر و تدوین آئی، اور ان کی تصنیف شائع ہوئی ہیں، اس تفسیر سے جو امت کے عقائد پر زدیڈی، اور جدید فسل کے ساتھ غیر واقعی نظریات پیش کئے گئے، نبوت کو کبھی کہا گیا، متحجّرات سے جبت و درزخ، ملائکہ و شیاطین کے وجود سے انکار کیا گیا، اور قرآنی صراحت کے لئے جدید اصول بجوز کئے گئے، حق تعالیٰ نے مولانا عبدالحق حقانی دہلوی دہلی بندی کو کھڑا کیا، فتح المان کے نام سے عمدہ تفسیر لکھی، اور "البيان فی علوم لہتر آن" کے نام سے بینظیر مقدمہ لکھا، اور تفسیر کی پہلی جلدیں اس مقدمہ کی تخصیص کی گئی، ہنایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس ضرورت کو پورا کیا، لیکن وہ صہی سے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی، کہ جدید نسل کی رہنمائی کے لئے جدید انداز پر ایسی کتاب اور قرآنی حقائق کو داعیگات کرنے کے لئے ایک مبسوط مفصل مقدمہ لکھا جائے، جس میں وحی اور نزول قرآن، ترتیب نزول، قراءات سبعہ، اعجاز قرآن وغیرہ وغیرہ، حقائق قرآنی کے اجمالیات اس طرح

بصیرت افراد زانداز سے آجاتیں، جس میں مستشر قین کے ادہام و دسادس اور خلافاً یا معاند ازانت سکوک و شبہات کا تشفی کرن مواد آجاتے، اور مستشر قین کی قیادت میں مستقر بین (مغرب زدہ طبقہ) کے مزومات کا بھی جواب آجاتے، الحمد للہ کہ اس عظیم اور اہم ترین مقصد کو ہمارے برادر محترم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی خلف الرشید حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رامت حیا تم المبارک نے بہت خوبی کے ساتھ معارف القرآن کا بہسٹ مقدمہ تالیف کر کے اس دینی و علمی ضرورت کو پورا کر دیا، اور امت پر احسان کیا، حق تعالیٰ اُن کے علم، ان کے قلم میں برکتیں عطا نہ رائیں، اور مزید توفیقات آئیں سرفراز فرمائیں،

مقدمہ کا کچھ حصہ تو مسلسل دیکھا، کچھ جستہ جستہ مقامات سے دیکھا، الحمد للہ کہ بہت خوش ہوا، اور دل سے دعا نکلی، ورقنا اللہ وایاہ لخدمۃ دینہ ابتعاء لوجه الکریم، وصلی اللہ علی سید نامحمد مسید العالمین و خاتم النبیین وعلی الہ واصحابہ وعلماء امتہ اجمعین،

**محمد لو سفت بپوری عن عن
مذکور مسیح بن یہودی اسلام کرپی؟**

جماعات

۱۳۹۶ھ

— — — — —

پیش لفظ

ام حضرت مولانا مفتی محمد شفیع حنفی مدرس

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے "معارف القرآن" کی صورت میں احتکر قرآن کریم کی ایک خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اور یہ اطلاعات باعث شکر و مسرت ہوتی رہتی ہیں کہ بفضل تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا ہے، جب اس تفسیر کی جلد اول نظر آئی اور تمیم کے بعد دوبارہ شائع ہوتے گی تو احقر کی خواہش ہوئی کہ اس کے تردید میں "علوم قرآن" کی معلومات پر مشتمل ایک مقدمہ شامل کر دیا جائے، مجھے لپنے اور ارض کو اور ضعف کی بناء پر خود اس کام کا محلہ نہ رہا تھا، اس لئے برخدا داعزیز محمد تقی سلمہ کو اس مقدمہ کی تایف پر درکی، انہوں نے ایک مختصر مقدمہ لکھ کر تو معارف القرآن جلد اول کے ساتھ لگاتارا، لیکن اسی دوران انہوں نے اسی موضوع پر ایک مفصل اور تہایت مفید کتاب کی بنیاد بھی ڈال دی، جو بفضل تعالیٰ اب پائیتے تک پہنچ کر "علوم القرآن" کے نام سے شائع ہو رہی ہے، "علوم القرآن" ایک دسیخ علم ہے جس پر عربی میں ضخیم کتابیں موجود ہیں، اور اردو میں بھی کئی کتابیں آچکی ہیں، لیکن اسیں موضوع پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں متعلقہ مباحث کو پوری تحقیق کے ساتھ حل بھی کیا گیا ہو، اور ہدایت میں مستشرقین اور متحبدین نے جو فکر و شبہات پیدا کر دی ہیں ان کا علمی جواب بھی دیا گیا ہو، اس کے علاوہ ہمارے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے تفسیر کی اہلیت کے بغیر قرآن کریم کی جو تفسیریں لکھ دی ہیں، ان میں تفسیر قرآن کے مسلم اصولوں کو

جس طرح پا مال کیا ہے اُس کے پیش نظر ہی ضروری تھا کہ تفسیر کے اصولوں کی دھن
کی جائے، اور ان کو نظر انداز کرنے سے جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی طرف توجہ
دلائی جاتے،

اللہ تعالیٰ کا مشکر ہو کر اس کتاب میں وقت کی اس اہم ضرورت کو میرے
دہم و گمان سے بھی زیادہ اچھی طرح پورا کیا گیا ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ
اگر اس کتاب کو حق طلبی اور انصاف پسندی کے جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو انشا اللہ
اس سے علم تفسیر میں بصیرت بھی حاصل ہو گی، اور اس راہ میں جو غلط فہمیاں، شکرکوں
شہابات اور گمراہیاں، مستشرقین کی تبلیسات اور عام لوگوں کی نادراقتیت سے عموماً
زہنوں میں پیدا ہوتی ہیں، ان کا بھی تخفیٰ بخش حل محل جاتے گا،

حقیقت یہ ہو کہ اس کتاب کی تالیف کو بخوردار عزیز کے سپرد کرنے کی پہلی
وجہ تو میرے مسلسل امراض اور روز افزدی صحفت تھا، اور یہ سمجھ کرہے اقدام کیا تھا،
کہ اگر پرتوانہ پرستام کندہ کام مصدقان ہو تو ہو ہی جاتے گا، لیکن کتاب کی تصنیف
سامنے آئی، میں اگرچہ ضعف بعمارت کے سبب اس کو خود نہیں دیکھ سکا، مگر اس کے
بہت سے مباحث کو پڑھو اکر سنا تو میری مسرت کی حد رہ رہی، جس پر اللہ تعالیٰ کا گھر
ار آکیا، کیونکہ پہکل کتاب ماشاء اللہ ایسی ہے کہ اگر میں خود بھی اپنی تدریسی کے
زمانے میں لکھتا تو ایسی نہ کہ سکتا تھا، جس کی رو رجہ ظاہر ہیں، اول تو یہ کہ عزیز
مورصون نے اس کی تصنیف میں جس تحقیق و تنقید اور متعلقہ کتابوں کے عظیم بخیز
کے مطالعہ سے کام لیا، وہ میرے بس کی بات نہ تھی، جن کتابوں سے یہ مضایں ہے
گئے ہیں ان سب مأخذوں کے حوالے نقید الواب و صفات حاشیہ میں درج ہیں
اہنی پرسری نظر دلتے سے ان کی تحقیق کا داش کا اندازہ ہو سکتے ہے،

اور دوسرا بات اس - کسی تزیادہ ظاہر یہ ہے کہ میں انگریزی زبان سے
نادراقت ہونے کی بناء پر مستشرقین پر یہ کی اُن کتابوں سے بالکل ہی نادراقت تھا
جن میں انہوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زبرآلو و تبلیسات سے کام

یا ہے، برخوردار عزیز نے جو نکل انگریزی میں بھی ایجئی اے، ایل بی ایل بی ایل نمبروں میں پہلی، انھوں نے ان تلبیات کی حقیقت کھو ل کر وقت کی اہم ضرورت پوری کر دی، دل سے دُھا، ہر کہ اللہ تعالیٰ میرے اس نور نظر کو عافیت کامل کے ساتھ عمر دراز نصیب فرمادیں، اور تمام شرود رافات اور فتنی ظاہرہ و باطنہ سے خلاقت کے ساتھ مزید رینی علی خدمات کی توفیق عطا فرمادیں، اور صدق و اخلاص اور اپنی رضاہ کامل عطا فرمادیں، اور اس تصنیف کو لپتے نفضل سے قبل فرمائکر ان کے لئے اور میرے لئے زریلیہ بخات بنائیں، اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ فتح پہنچائیں،

وَاللَّهُ الْمُسْتَعْلَنْ وَعَلِيْمُ التَّكْلِلَنْ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
دَارُ الْعِلُومِ كِرَاجِي مَلا
يَعْمَلُ جَادِيَ الثَّانِيَةِ ۱۳۹۶

جَمِيعَ الْمُبْتَدَأِينَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حُرْفٌ آعَازٌ

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفوا

قرآن کریم پوری انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی دولت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، یہ وہ نجۃ شفا ہر جس کی تلاوت، جس کا دیکھنا، جس کا سنتا سنا، جس کا یسمانہ سکھانا، جس پر عمل کرنا، اور جس کی کسی بھی حیثیت سے نشر و اشاعت کی خدمت کرنا دنیا اور آخرت دونوں کی عظیم سعادت ہے، صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز ہم صفحہ میں بیٹھے تھے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا، تم میں سے کس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ روزانہ صحیح کو طھان یا عینق رکے بارا رکے جایا کرے، اور ہر روز و دہترین قسم کی اذشیان کسی گناہ یا قطع رحمی کا ارتکاب کئے بغیر کر لایا کری؟ ہم نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! اس کو تو ہم میں ہر ایک پسند کرے گا"، آپ نے فرمایا: "اگر کوئی شخص روزانہ مسجد میں جا کر دو آیتیں یا کوئی بارے یا پڑھ لیا کرے تو یہ اس کے لئے دوازشیوں سے بہتر ہے، اور تین آیتیں یا کچھ ترہ تین اذشیان سے اور چار

یکھے تو وہ چار سے بہتر ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تلاوت، اس کے معانی کا عمل مل کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کے جو فضائل بیان فرمائے، اور امت کو جس طرح اس کی ترغیب دی، نذکورہ بالا حدیث اُس کی صرف ایک مثال ہے، اور حدیث کے مجموعے اس قسم کی احادیث سے بھرے پڑتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امّتِ محمدیہ رعلی صاحبہ الاسلام نے قرآن کریم اور اس کے علوم کی لیے لیسے پہلوؤں سے خدمت کی ہے، اور اس کے الفاظ و معانی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایسی بے مثال کاوشیں کی ہیں کہ آن کی تفصیلات کو دیکھ کر عقل بہوت رہ جاتی ہے۔

قرآن کریم کے معانی مطالب کا تو کہنا ہی کیا ہے، اس امّت نے کتابِ اہمی کے الفاظ، اس کی حرکات و سکنیات اور اس کے حروف کو ٹھیک ٹھیک زبان سے ادا کرنے کی غرض سے ایسے لیے علوم و فنون کی بنیاد ڈالی ہے جن کی نظیر دنیا کے کسی مذہب اور کسی زبان میں نہیں ملتی، ایک تجوید و قرات، ہی کے علم کو لے لیجئے تو اس فن کی تفصیلات اور اس کی باریکیوں کی تشریح کے لئے اتنی کتابیں انکھی گئی ہیں کہ آن سے ایک مستفول کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے،

غرض جن مختلف جمتوں اور گوناگون پہلوؤں سے قرآن کریم کی خدمت کی گئی ہے اُہنی میں سے ایک خاص رُخ کی خدمت دہ کتابیں ہیں جو "علوم القرآن" کے موصوع پر لکھی گئی ہیں،

"علوم القرآن" ایک دلیع و عریض علم ہے، اور اس میں علم تفسیر کے مباری اور اصول واضح کے جاتے ہیں، قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح نازل ہوتا تھا، وحی کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب کس ترتیب سے نازل ہوئی؟ کتنے سورہ میں اس کا نزول مکمل ہوا؟ مکی اور مدینی سورتوں کا کیا مطلب ہے؟ شان نزول کے کہتے ہیں؟ تفسیر قرآن میں اس کا کیا مقام ہے؟ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ ہو یا ہنیں؟ قرآن کے مختلف حروف اور قراءتوں کا کیا مطلب ہے؟ قرآن کریم کس قسم کے

کے مضمایں پر مشتمل ہو؟ ائمۃ تعالیٰ نے اس کتاب کو کس طرح محفوظ رکھا ہے؟ اور اس کی کتابت و طباعت کتنے مراحل سے گزری ہے؟ قرآن کریم کی تفسیر کے کیا اصول اور آداب ہیں؟ ائمۃ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھنے کا چیخ طریقہ کیا ہے؟ اور اس راہیں کوئی غلطیاں انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوالات کا مفصل جواب "علوم القرآن" میں دیا جاتا ہے،

عربی زبان میں اس موضوع پر علامہ زرکشیؒ کی "البرهان فی علوم الفترآن" (چار جلدیں میں)، علامہ سیوطیؒ کی "الاتفاق" (دو جلدیں میں) ایشیخ زرقانیؒ کی "مناہلہ الفرقان" (دو جلدیں میں)، آج بھی اس علم کی معروضت و متدالوں کتابیں ہیں جو اپنے موضوع پر مأخذ کی جیشیت رکھتی ہیں، اردو میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں آئی ہیں، جن میں علامہ عبد الرحمن حقانیؒ کی "البيان فی علوم الفترآن" سب سے زیادہ جامع اور ممتاز ہے،

لیکن زمان کے لحاظ سے ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں، اس لئے یہ ضرور تو عوام سے محسوس ہوتی تھی کہ عہدِ حاضر میں معنربی افکار کے زیر اثر ان موضوعات پر جائز سوالات پیدا ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر کوئی نئی کتاب لکھی جاتے، تاہم یہ تصور دُور دور نہ تھا کہ اس ضرورت کی تکمیل میں مجھ ناچیز کا بھی کوئی حصہ لگ سکے گا،

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت مقرر میں تھی، اور اس کے حصول کی تقریب یہ ہوتی تھی کہ احقاق کے والد ماجد حضرت مولانا ہفتی محمد شفیع صاحب مظلہ نے اردو زبان میں تفسیر معارف القرآن "تایف فرمائی، جو آٹھ جلدیں میں شائع ہو چکی ہے، اور کسی جھگ کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ وہ سلف صالحین کے مطابق عہدِ حاضر کی بنی نظیر اور تفسیر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُسے مقبولیت بھی بیج دیا فرمائی، اور جب اس کا دروس ایڈیشن شائع ہونے لگا تو حضرت والد صاحب مظلہ نے احقاق کو حکم دیا کہ اس کے شروع میں "علوم القرآن" کی ضروری معلومات پر مشتمل

ایک مختصر مقدمہ تحریر کر دیں،

میں نے تعیین حکم کے لئے یہ مقدمہ لکھنا شروع کیا، تو وہ پڑائی خواہش ابھر آئی، اور اختصار کی کوشش کے باوجود یہ مقدمہ طویل ہتھا گیا، جب مسودے کے تقریباً دو صفحات لکھے چکا تھا، اور بہت سے ضروری موضوعات ابھی باقی تھے تو خجال آیا کہ اتنا طویل مقدمہ تفسیر کے شروع میں موزوں نہیں ہو گا، اس لئے حضرت والد صاحب مظلوم کے ایمان پر میں نے تفسیر کے مقدمہ کے لئے تراخی اختصار کے ساتھ کچھ ضروری معلومات الگ جمع کر دیں جو تفسیر کے شروع میں بطور مقدمہ شائع ہو گئیں، اور اس مفصل مقدمہ کو مستقل تصنیف کی صورت دیجی، اپنے مشاغل اور عوارض کی وجہ سے اس کتاب کی تکمیل میں خاصی دیر لگ گئی، تاہم یہ اللہ تعالیٰ کا انعام و کرم ہو کہ جتنے ضروری مباحث میں اس کتاب میں لانا چاہتا تھا وہ اس میں کم و بیش جمع ہو گئے ہیں،

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ "علوم القرآن" کے موضوع پر عبد حافظ کوجن نے تصنیف کی ضرورت سمجھی وہ اس کتاب نے مُھیم مُھیم پوری کردی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہو کہ الشام اسلام میں موضوع سے متعلق ہمہ حاضر کی ضروریات کا کافی سامان مل جائیگا، احرار نے اس میں "علوم القرآن" کے اُن مشہور مسائل کی تحقیق بھی بجا کرنسی کو شیش کی سرجن کی پوری تفصیل کیلئے بہت سی کتابوں کی مراجعت کرنی پڑتی تھی، اور بعض نے مباحثہ بھی درج کر رکھی ہے، اگر وہ اپنے لفظ کے تزدیک کافی اور اطمینان بخش ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، ورنہ کم از کم ان کی داروغ بیل توڑاں دیکھی ہے، اور آئندہ دو سو ایل علم فکر حضرات اُن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں، یہ کتاب الگ فہم قرآن کے سلسلہ میں کسی صاحب کے کچھ کام آسکے تواحر کو اپنی ناچیز محنت کا پورا اصل مل جائیگا، قارئین سے اس دعا کی دو خواہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کا دش کو اپنی بارگاہ میں شرفت قبولیت عطا فرمائے، اور یہ احرار کے لئے زخیرہ آخرت ثابت ہو، آمین، دیا تو فیقی الاباللہ العلی العظیم،

احترم ترقی عثمانی

خاتم طلبہ دارالعلوم کراچی ۱۴۲۹ھ

۲۹ جادی الاولی ۱۴۲۹ھ

حصہ اول

القرآن الکریم

- دھی نزول فترآن
- ناجع و منسوج
- حافظت فترآن
- حقائیقت فترآن
- مضامین فترآن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِنَا
 وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى أَلِيهِ وَآصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ وَعَلَى كُلِّ
 مَنِ اتَّبَعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ،
 آللَّهُمَّ أَرِنِي الْحَقَّ حَقَّاً دَارِسًا فِي إِشَاعَةٍ وَأَرِنِي الْبَطْلَانَ
 بَاطِلًا وَأَسْرُرْ قِنْيَ إِجْتِنَابَةً -
 رَبِّيْسٌ وَلَا تَعْسِرْ وَتَهْمَمْ بِالْتَّحْيِيرِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ،
 رَبِّنَا لَقَبِيلٌ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ التَّعْمِيمُ الْعَلِيمُ ،

احقر محمد لقى عثمانی عف عنہ
 ۹۲ سلام
 یکم رمضان المبارک

بائب اول

تعارف

قرآن کریم کا نام اور وجہ تسمیہ | علامہ ابوالمحایی نے قرآن کریم کے چھپنے والے شاکر بیوی، ادیبعن حضرات نے ان کی تعداد نو تسلی سے بھی مجاہدین کے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی صفات مثلاً مجید، "کریم"، "حیکم" وغیرہ کو نام قرار دے کر تعداد اس حد تک پہنچا دی ہے، ورنہ صحیح معنی میں قرآن کریم کے نام مگر پانچ ہیں، القرآن، الفرقان، الذکر، الکتابت، اور التنزیل، خود قرآن کریم نے اپنے لئے یہ پانچوں الفاظ اسیم علم کے طور پر ذکر فرمائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور نام "قرآن" ہے، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے کم از کم اکٹھے

لہ ابوالمحایی، بنیت عزیز تھیں عبدالملک نام اور شیخ لقب ہی، پانچوں صدی ہجری کے شافعی علماء، ان کی کتاب "ابرتان فی مشکلات القرآن" کے عالمہ زرکشی اور علامہ سیوطی نے بکرشت حوالے دیتے ہیں، میں وفات پائی، رابن خلکان و قیات الاعیان، ص ۳۱۸ ج ۱۱

تمہارے دیکھنے اتیے؟، "الاتقان فی علوم القرآن" ص ۱۵۷ ج ۱۴ مطابعہ جوازی بالقاهرة شمسیہ ۱۳۶۴ھ
تمہارے ازرقانی؟، مہالل العروان ص ۱ ج ۱، مطبعہ عینی البالی الحلبی ۱۳۷۳ھ،
تمہارے افرقاں کے لئے دیکھنے سورہ آل عمران آیت ۶ اور الذکر کیلئے آل عمران: ۵۸ و الحج: ۶ و ح: ۶۹ و غیرہ
اور الکتاب کیلئے بقرہ: اول حکم ۶۲ و ۸۹ و کعبہ: دغیرہ اور التنزیل کیلئے یلس: ۵ و داشر: ۸۰ و الحجۃ: ۱۹

مقامات پر اپنے کلام کو اسی نام سے یاد کیا ہے،
”قُرْآن“ دراصل قَرَأَ يَقْرَأُ سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں ”جمع کرنا، پھر
یہ لفظ ”پڑھنے“ کے معنی میں اس لئے استعمال ہونے لگا کہ اس میں حروف اور کلمات کو
جمع کیا جاتا ہے، قَرَأَ يَقْرَأُ کا مصدر قَرَأَ اَعْقَدَ کے علاوہ ”قُرْآن“ بھی آتا ہے،
چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَةً وَقُرْآنَهُ۔ بل مشہد اس رسم کتاب، کاجمع کرنا اور
پڑھنا ہمکے سی ذمہ ہے ॥

(القيامة: ۱۴) ر (القيامة: ۱۴) پھر عربی زبان میں کبھی کبھی مصدر کو اسم مفعول (Past participle)
کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے، کلام اللہ کو ”قرآن“ اسی معنی میں کہا جاتا ہے،
یعنی ”پڑھی ہوئی کتاب“ ہے

قرآن کی بہت سی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں، زیادہ راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ
کا یہ نام کفار عرب کی ترمیدی میں رکھا گیا ہے، وہ کہا کرتے تھے:-

لَا تَسْمُوا الْهُدًى الْقُرْآنَ أَنْ أَنْقُوْا ستم اس متر آن کو نہ سنو، اور اس کی تلاو
فِيهِ، (حَمْ السجق: ۲۶) کے دران لغوبہ میں کیا کرو ॥

ان کفار کے علی الرغم ”قرآن“ نام رکھ کر اشارہ فرمادیا گیا کہ قرآن کریم کی دعوت
کو ان اوچھے ہمکنڈوں سے دبایا نہیں جا سکتا، یہ کتاب پڑھنے کے لئے نازل ہوئی ہے،
اور قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی، چنانچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ساری

له حوالہ کئے ملاحظہ ہو علی زادہ الحسن: فتح الرحمن لطالب آیات القرآن، صفحہ ۳۵۹ و ۳۶۰،

المطبعة الاحصائية بیروت ۱۹۷۳ء

سلہ الراوغب الاصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، ص ۱۱۳، اصح المطالع کراچی ۱۹۸۳ء
سلہ اس لفظ کے شتقاً میں اور بھی کئی اقوال ہیں، لیکن وہ مختلف سے خالی نہیں، تفصیل کیلئے
ملاحظہ ہو الاتقان، ص ۵۲ ج ۱ و مناصل العرفان، ص ۱۷۱،

دنیا میں سبے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے

بہر کیفیت! قرآن کریم کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

المنزل على الرسول المكتوب في المصايف المتقول اليه اذن مثلاً

متواصلاً بلا شبهةٍ

"اسلام تعالیٰ کا دہ کلام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں

لکھا گیا، اور آئی سے بغیر کبھی شبہ کے تواتر آمنقول ہے۔“

یہ تعریف تمام اہل علم کے درمیان متفق علیہ ہے، اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں،

دھی اور اُس کی حقیقت

قرآن کریم چونکہ سر در کائنات محمد مصطفیٰ اصل اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے، اس لئے سبے پہلے ”وحی“ کے بارے میں چند باتیں جان لینی ضروری ہیں: ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آرٹھ دھی کی ضرورت کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگادیا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو سُتعال کرتے ہوئے اللہ کے احکام کو میر نظر رکھ، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو، ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو ”علم“ کی ضرورت ہے، اس لئے جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کوئی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے سُتعال نہیں کر سکتا، زیرِ جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کوئی

کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتے ہیں، اس وقت تک اس کے لئے اللہ کی مرضی پر کاربند ہونا ممکن نہیں،

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدائیں جن کے ذریعے اسے مذکورہ بالوں کا علم ہوتا رہے، ایک انسان کے حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، منہ اور ہاتھ پر، دوسرا عقل، اور تیسرا دل وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعے اور جو باتیں ان دونوں ذرات سے معلوم نہیں ہو سکتیں اُن کا علم دل وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے،

علم کے ان تینوں ذرات میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کا رہے، جس کے آگے دہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے خواص سے معلوم ہو جاتی ہیں، ان کا علم زیری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً اس وقت میرے سامنے ایک انسان بیٹھا ہے، مجھے اپنی آنکھ کے ذریعہ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ انسان ہے، آنکھ ہی نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اس کا زنگ گورا ہے، اس کی پیشانی چڑھی، بال سیاہ، ہونٹ پتھری اور حیرہ کتابی ہے، لیکن اگر کہی باتیں میں اپنے حواس کو معطل کر کے محض عقل سے معلوم کرنا چاہوں، مثلاً آنکھیں بند کر کے یہ چاہوں کہ اس انسان کی رنگت اس کے اعضا کی صحیح صبح بناوٹ اور اس کے سر اپا کی ٹھیک ٹھیک تصویر مجھے صرف اپنی عقل کے ذریعہ معلوم ہو جاتے تو یہ ناممکن ہے،

اسی طرح جو چیزیں دل کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً اسی شخص کے بال میں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی کوئی شکوئی ماں ضرور ہے، نیز یہ بھی علم ہے کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے، اگرچہ نہ اسکی ماں اسومیری سامنے ہے، نہ میں اس کے پیدا کرنے والے کو دیکھ سکتا ہوں، لیکن میری عقل بتا رہی ہے کہ یہ شخص خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا، اب اگر میں یہ علم اپنی عقل کے جا سے اپنی آنکھ سے حاصل کرنا چاہوں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ اس کی تخلیق اور پیدائش کا منظراً بیرونی آنکھوں کے سامنے نہیں آ سکتا،

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کا تعلق ہے دہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواسِ خمسہ جواب دیتی ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رُک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی شخص کے بارے میں عقل نے یہ تو بتا دیا کہ اسے کبھی نے پیدا کیا ہے، لیکن اس شخص کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس کے ذمہ خدا کی طرف سے کیا فرانص ہیں؟ اس کا کونسا کام اللہ کو پسند ہے اور کونسا ناپسند؟ یہ سوالات ایسے ہیں کہ عقل اور حواس مل کر ہی ان کا جواب نہیں دے سکتے، ان سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ نے مفترر فرمایا ہے اسی کا نام ”دحی“ ہے،

اس سے واضح ہو گیا کہ ”دحی“ انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق آن سوالات کا جواب ہمیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہوتے، لیکن اُن کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اور مذکورہ تشرع سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مٹا بدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر دحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کا کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہربیات کا درآں عقل سے ہو ہی جائے، جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے اسی طرح بہت سے درستی معتقدات کا علم دینا عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے درآں کے لئے محض عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں ہے،

لہ یہاں وحی کی ضرورت کی طرف بہت جمل اشائی کئے گئے ہیں، اس موصوع پر مفصل بحث کیلو تمہیدابی مشکور سالمی، ص ۲۸۷، اور راز الدو، مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم کی کتاب علوم القرآن ص ۳۱۸، امطبوعہ دارک مرسرہ فاروق قیہ ہباؤ پور ۱۹۸۹ء ملاحظہ فرمائیے،

دھی کا مفہوم اس تہمیید کو ذہن میں رکھ کر "دھی" کے مفہوم اور اس کی حقیقت پر خود فرمائی۔
 سُوْنَتٌ "اور ایسا ہے" عربی زبان کے الفاظ ہیں، اور لغت میں اُن کے
 معنی یہں "جلدی سے کوئی اشارہ کر دینا" خواہ یہ اشارہ رہندا کنایہ ہے ستعال کر کے کیا جائے،
 خواہ کوئی بے معنی آزاد نہ کمال کر، خواہ کسی عفنون کو حرکت دے کر، یا اختر و لفوش ستعال
 کر کے، ہر صورت میں لفظ اس پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں،
 چنانچہ اسی معنی میں حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم
 میں ارشاد ہے:-

نَعْرَجَ عَلَى قَوْمٍ هُنَّ مِنَ الظَّاهِرَاتِ فَأَوْتَنِي إِلَيْهِمْ أَنْ سَيَّعُونَكُمْ وَعِيشَيَا هَرَمِيم ، ۱۱

”پس وہ اپنی قوم کے سامنے محابدے نکلے، اور انھیں اشارہ کیا کہ صحیح و ستم تسبیح کرتے رہا کرو۔“

پھر ظاہر ہے کہ اس قسم کے اشارے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے دل میں کوئی بات ڈال دی جائے، اس لئے لفظ "وَجْهٍ" اور "أَنْجِيَاجَاءَ" دل میں کوئی بات ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا، چنانچہ قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں یہی معنی مراد ہیں، مثلاً

وَأَوْسْتَى رَبْطُكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِنِي مِنَ الْجَيَّانِ مِبْرُوتًا هَرَالْغَنِّ^{۱۰}

اور آپ کے رب نے شہد کی سکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ توہیناروں میں گھر بنائے، یہاں تک کہ شیاطین دلوں میں جو دسوں سے ڈالتے ہیں ان کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، ارشاد ہے:-

وَكَنَّ لِكَ جَعْلَنَا لِكُلِّ تَبَّى عَنْ وَأَشَيَّاطِينَ إِلَّا تَسْ وَالْجِنُّ يُحْجِي
بَعْضُهُمُ إِلَى بَعْضٍ ط رَاغِمٌ (١١٢: رَاغِمٌ)

”اور اسی طرح ہم نے ہر بھی کیلئے ایک نا ایک دشمن ضرور پیدا کیا ہے، جن و انس کے شیاطین رہیں سے جو ایک دوسرے کے دل میں دسو سے ڈالتے ہیں“
سلہ الزبیری، تاج العروس ۳۸۳ ص ۱ دارالسیاست عقازی مکتبہ امام، والراجح: المفردات،

نیز ارشاد ہے:-

وَلَئِنْ أَتَيَ الظَّاهِرِينَ لِيُؤْمِنُوا لَمْ يُؤْمِنُوا هُمْ لِيَعْجَدُوا مُؤْمِنُونَ، (الانعام: ۱۲۱)

اور بلاشبہ شیطان اپنے دستوں کے دل میں وسو سے ڈلتے ہیں، تاکہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں ॥

اللہ تعالیٰ فرشتوں سے جو خطاب فرماتے ہیں اس کو بھی "ایحاء" کہا گیا ہے:-

إِذْ نُوحَىٰ رَبُّكَ إِلَيْهِ الْمُلْكَةَ أَنِّي مَعْلُومٌ، رَالْأَنْفَال : ۱۲

محب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو اطلاع دیتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ॥

کسی غیرتی کے دل میں جربات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے اس کو بھی اسی لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے:-

وَأَوْحَيْنَا لَيْلَىٰ أَنِّي مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعُهُ، (القصص: ۷)

اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ اس کو دُودھ پلاو ॥

لیکن یہ سب اس لفظ کے لغوی مفہوم ہیں، شرعی اصطلاح میں "وحیٰ" کی تعریف یہ ہے:-

كَلَامُ اللَّهِ الْمُتَنَزَّلُ عَلَىٰ فَتْيَةٍ مِّنْ أَنْبِيَاءِهِ

"اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اس کے کسی بنی پر نازل ہو ॥"

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہتے ہے کہ لفظ "وحیٰ" اپنے اصطلاحی معنی میں اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ اب اس کا استعمال سیغیر کے سوا کسی اور کسے نہ درست ہے، حضرت عَلَيْهِ السَّلَامُ اور شاہ صاحب شیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "دُوحیٰ" اور "ارْبِحَاجا" و دُونوں الالگ لفظ ہیں، اور دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، "ایحاء" کا مفہوم عام ہے، اور انہیاں عپروجی نازل کرنے کے علاوہ کسی کو اشارہ کرنا اور کسی غیرتی کے دل میں کوئی بات ڈالنا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے، لہذا یہ لفظ بھی اور غیرتی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس کے برخلاف "دُوحیٰ" صرف اُس المام کو کہتے ہیں جو انبیاء پر نازل ہو، یہی وجہ ہے کہ قرآن کیم

نے لفظِ آیحاء، "کا استعمال تو انbia اور غیر انbia، دونوں کے لئے کیا ہے، لیکن لفظ وحی" سوائے انbiاء کے کسی اور کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔

بہر کیفیت! "وحی" وہ ذریعہ ہر جس سے اللہ تعالیٰ اپنا کلام اپنے کسی منتخب بندے اور رسول تک پہنچاتا ہے، اور اس رسول کے ذریعہ تمام انسانوں تک یا اور جو کہ "وحی" اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک مقدس تعلیٰ رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کا مشاہدہ صرف انbiاء علیہم السلام ہی کو ہوتا ہے، اس لئے ہمارے لئے اس کی طبیعت ٹھیک ٹھیک حقیقت کا ادراک بھی ممکن نہیں، البتہ اس کی اقسام اور کیفیات کے بارے میں کچھ معلوم خود دست آن روایت نے فرمایا ہے، یہاں صرف انہی کو بیان کیا جا سکتا ہے:-

وحی کی تعلیمات

جو وہ محض اپنی عقل اور حواس سے معلوم نہ کر سکیں، یہ باتیں خالص مذہبی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہیں، اور دنیا کی عام ضروریات بھی، انbiاء علیہم السلام کی وحی عموماً پہلی قسم کی ہوتی ہے، لیکن بوقت ضرورت دینیوی ضروریات بھی بذریعہ وحی بتائی گئی ہیں، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنلنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَاصْنُمِ الْفُلُكَ يَا عَيْنِيْنَا وَ حُسِنَا (ہود: ۲۷)

"کشتی بہائی سامنے ہماری وحی کے ذریعہ سازا"

اس سے معلوم ہوا کہ انہیں کشتی کی صنعت بذریعہ وحی سکھائی گئی، اسی طرح حضرت داؤ و علیہ السلام کو زرہ سازی کی صنعت سکھائی گئی، نیز حضرت آدم علیہ السلام کو خواصِ ہشیار کا علم بذریعہ وحی دیا گیا، بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ علم طب بنیادی طور پر بذریعہ وحی نماز ہوا ہے۔

له حضرت مولانا اور شاہ صاحب کشمیریؒ؛ فیض الباری ص ۱۹۱ جامیعۃ ججازی قاهرہ ۱۳۵۴ھ
له عبد العزیز فراہریؒ؛ النبراس علی شرح العقامہ، ص ۲۲۸ و ۲۳۸ مطبوعہ امر تحریر ۱۸۳۴ھ

وحي کی اقسام | تین قسمیں ہوتی ہیں:-

(۱) وحي قلبي : اس قسم میں باری تعالیٰ براؤ راست نبی کے قلب کو سخن فرما کر اس میں کوئی بات ڈال دیتا ہے، اس قسم میں نہ فرشتہ کا واسطہ ہوتا ہے، اور نہ نبی کی قوت سامنہ اور حواس کا، بلکہ اس میں کوئی آواز نبی تو سنائی نہیں دیتی، بلکہ کوئی بات قلب میں جاگریں ہو جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، یہ کیفیت بیداری میں بھی ہو سکتی ہے اور خواب میں بھی، چنانچہ انہیا، علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے پیٹ کے ذبح کرنے کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا،

(۲) كلام الٰٰي : اس روسری قسم میں باری تعالیٰ براؤ راست رسول کو اپنی کلامی کا شرف عطا فرماتا ہے، اس میں بھی کرسی فرشتہ کا واسطہ نہیں ہوتا، لیکن نبی کو آواز سنائی دیتی ہے، یہ آواز مخلوقات کی آواز سے بالکل جدا ایک عجیب و غریب کیفیت کی حالت ہوتی ہے، جس کا در راک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں، جوانبیا، اُسے سنتے ہیں وہی اس کی کیفیت اور اس کے سر در کو پہچان سکتے ہیں،

وحی کی اس قسم میں چونکہ باری تعالیٰ اسے براؤ راست ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس نے یہ قسم وحی کی تمام قسموں میں سب سے افضل اور اعلیٰ ہے، اسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

وَكَلَمَّا أَتَهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا، (النساء: ۱۹۳)

”اور اللہ نے موسیٰ میں خوب باتیں کیں“

لہ یہ تین قسمیں بنیادی طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کی فیضن الباری ص ۳۲ تا ۳۴ اسے ماخوذ ہیں
تشريح و تفصیل اور تینیوں قسموں کے نام ہمارے اپنے ہیں،
لہ ابن القیم: مدارج السالکین، ص ۳۲، مطبعة الشذوذ المحمدية، مکہ مکرہ ۱۴۴۵ھ

(۱۲) وحی ملکی : اس تیسری قسم میں اللہ تعالیٰ اپنا پیغام کسی فرشتہ کے ذریعے
بُنی تک بھیجناتا ہے، اور وہ فرشتہ پیغام پہنچاتا ہے، پھر بعض اوقات یہ فرشتہ نظر نہیں
آتا، صرف اس کی آواز سننی دیتی ہے، اور بعض مرتبہ وہ کسی انسان کی شکل میں سمجھتے
اکر پیغام پہنچادیتا ہے، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنی کو اپنی مہل صورت میں نظر آ جائے
لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے،

فترآن کریم نے وحی کی اہنی تین قسموں کی طرف آیت ذیل میں اشارہ فرمایا کہ:-

مَا كَانَ لِبَشَّرٍ أَنْ يُكَلِّمَ اللَّهُ إِلَّا وَخِيَأَ وَمَنْ وَرَاءَ حِجَابًَ، أَوْ

يُرْمِلَ رَسُولًا فَيُؤْتِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ، (الشوریٰ: ۱۵)

”کسی بشر کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو درد ہو کر (بات کرے، مگر

دل میں بات ڈال کر بار بار کے پیچھے سے یا کسی پیغام بر (فرشتہ)، کو بھیج کر جو اللہ ک

اجارت سے جو اللہ چاہے وحی نازل کرے“

اس آیت میں وَخِيَار دل میں بات ڈالنے سے مراد ہیں قسم یعنی وحی قلبی ہے، اور پردے
کے پیچھے سے مراد دوسرا قسم یعنی کلام الہی، اور پیغام بر کہیجئے سے مراد تیسرا قسم یعنی
وحی ملکی ہے،

حضور پر وحی کے طریقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مختلف طرقوں سے

میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا:-

لہ حضرت حارث بن ہشامؓ فضل اسے صحابہ میں سے ہیں، فتح کمک کے موقع پر اسلام لائے،
اور رہاں ہم میں شام کو فتح کرتے ہوتے شہید ہوتے را القسطلانیؓ ارشاد انتاری، ص ۲۵۴
بولاق مصر ۲۲۳ھ،

آخیان آتیا شدیں مثلاً صلصلة الْجَرَسِ وَهُوَ آشَدُ عَلَى فِيفِم
عَنْ وَقْدِ دِعَيْتُ مَا قَالَ وَاحِيَانًا يَمْثُلُ لِلْمَلَكِ رَجُلًا،
”کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سائی رہتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سبے
زیادہ خست ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو وہ کچھ آواز نے کہا ہوتا ہے،
مجھے یاد ہو جاتا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آ جاتا ہے“
اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے دو طریقے معلوم ہوتے ہیں،
(۱) صلصلة الجرس؛ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آپؐ کو اس قسم کی آواز آیا کرتی تھی کہ
جیسی گھنٹیاں بجتے سے پیدا ہوتی ہے، حدیث میں تصور اتنا ہی مذکور ہے، اس لئے
یقین کے ساتھ ہمیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی وحی کو کس اعتبار سے گھنٹیوں کی آواز
سے شبیہ دی گئی ہے، البتہ بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ فرشتے کی آواز ہوتی
تھی، بعض کا خیال ہے کہ فرشتہ وحی لاتے وقت اپنے پروں کو پھر پھر آتا تھا، اس سے
یہ آواز پیدا ہوتی تھی، اور علماء خطابی نے یہ راستے ظاہر کی ہے کہ یہاں شبیہ آواز کے ترمیم
میں نہیں بلکہ اس کے تسلسل میں ہے کہ جس طرح گھنٹی کی آواز مسلسل ہوتی ہے اور
کسی جگہ طویل نہیں، اسی طرح وحی کی آواز بھی مسلسل ہوا کرتی تھی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ
محض قیاسات ہیں، اور ان کی بناء پر کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، البتہ حضرت
علاء الدین اور شاہ صاحب کشیریؒ نے شیخ اکبر حضرت محبی الدین ابن عربیؒ سے نقل کر کے
اس شبیہ کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ مذکورہ تمام توجیہات سے زیادہ لطیف ہے،
آن کا کہنا یہ ہے کہ یہ شبیہ صرف دو اعتبار سے دی گئی ہے، ایک تو آواز کے تسلسل کے
اعتبار سے جیسا کہ اور پر بیان کیا گیا، اور دوسرا اس اعتبار سے کہ گھنٹی جب مسلسل
بج رہی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمعت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ

لہ صحیح بخاریؒ ص ۲۴ ج ۱، اصح المطالع کراچی،
لہ دیکھتے حافظ ابن حجر : فتح الباری ص ۱۶ ج ۱، المطبعۃ البهیۃ مکتبۃ مسلمان

اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور باری تعالیٰ چونکہ جہت اور مکان سے منزہ ہے، اس نے کلامِ الہی کی یہ خصوصیت ہی کہ اس کی آواز کسی ایک سخت سے ہمیں آتی، بلکہ ہر جہت سے آتی ہے، اس کیفیت کا صحیح اور اک تو بقیر مشاہدہ کے مکن نہیں، لیکن اس بات کو عامِ زہنوں کے قریب لانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دیدی ہے،

بہر کیفت! اس کی تھیک تھیک کیفیت کا عالم تو اللہ ہی کو ہے، یا اُس کے رسول کو، حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دھی کے اس خاص طریقے میں گھنٹیوں کی سی آواز آیا کرتی تھی، ساتھ ہی حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دھی کا طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سبے زیادہ دشوار ہوتا تھا،

حافظ ابن حجر ر فرماتے ہیں کہ ڈھو اشتَنَ کَ عَلَى (یہ طریقہ میرے لئے سبے زیادہ سخت ہوتا ہے) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوں تو دھی کا ہر ایک طریقہ سخت ہوتا تھا، لیکن اس گھنٹیوں کی آواز والے طریقے میں سبے زیادہ بار ہوا کرتا تھا، وجہ یہ ہو کہ کہنے والے اور سننے والے میں کسی نہ کسی طرح مناسبت پیدا ہوئی تو مذکوری ہے، اب اگر فرشتہ انسانی شکل میں آجائے تو حضور پر کوئی غیر معقول بار نہیں پڑتا تھا، صرف کلامِ الہی کے جلال و عیّرہ کا بار ہوتا تھا، اس کے برخلاف جب فرشتہ انسانی شکل میں نہ آئے، بلکہ اسکی آواز یا براہ راست باری تعالیٰ کا کلامِ شناآن دے، تو یہ ایک غیر معقولی کیفیت ہوتی تھی، اور اس سے ماوس ہونے اور استفادہ کرنے میں آپ پر زیادہ لوحجہ پڑتا تھا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی مذکورہ بالاحدیث کے آخر میں فرماتے ہیں :-

وَقَعَقَدَ أَيْتَهُ يَنْزَلُ عَلَيْهِ التُّوحِيدُ إِلَيْهِمُ الشَّدِيدُ مِنِ الْبَرِدِ

لہ نیعنی الباری ص ۱۹۰ ج ۲۰ ا قاہرہ ۱۳۵۴ھ

لہ فتح الباری ص ۱۶۱ ج ۱ ، قاہرہ ۱۳۷۸ھ

قِيَّضَهُ مِنْ عَنْهُ قَرَائِبَ جَيْنَتَهُ لَيَتَفَصَّلُ عَرَقًا،

میں نے سخت جاریوں کے دن میں آپ پر دھی نازل ہوتے دیکھی ہے، (ایسی سردی
میں بھی) جب دھی کا سلسلہ ختم ہو جاتا تو آپ کی پیشانی مبارکہ پسند سے شرابور
ہو چکی ہوتی تھی۔

ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضیتہ میں کہ ”جب ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بر
وی نازل ہوئی تو آپ کا ساسن مرنے لگتا چہرہ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد ٹھاٹا
سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپ کو اتنا پسند آتا کہ اس کے قطرے موتیوں
کی طرح ڈھلنے لگتے تھے۔“

دھی کی اس یقینت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی تھی کہ آپ جس جانور پر
میں وقت سوار ہوتے وہ آپ کے بوچھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ نے ایناں امریں
حضرت زید بن ثابت کے زان پر رکھا ہوا تھا، کہ اسی حالت میں وی نازل ہوئی شروع ہو گئی،
اس سے حضرت زید کی ران پر اتنا بوچھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی،

اور مسنداحمد کی ایک روایت میں آپ خود فرماتے ہیں کہ جب یہ دھی نازل ہوتی ہے
تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری رُوح کھپخ رہی ہے،

بعض اوقات اس دھی کی بلکی آذار دوسروں کو بھی سُنانی دیتی تھی، حضرت
عمرہ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر دھی نازل ہوئی تو آپ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھیوں
کی بجنہنناہست جیسی آواز سُنانی دیتی تھی،

لِهِ مُحَمَّدِ بْنِ جَارِيٍّ ص ۲۷ أحادیث معا ، لِهِ التَّيوط : الاتقان ص ۲۶ ج ۱ قاہرہ شَامِ بَحْرَالْابِنِ سَعِيدٍ

شَهْابِ الدِّينِ العَقِيم : زاد المعاشر في حدیث العباد ص ۸ او ۱۹ ج المطبعة اليمنية مصر،

لِهِ الْفَتَحُ الرَّابِي (بترتیب مسنداحمد) بحوالہ حضرت عبد الشہب بن عمر ص ۲۱ ج ۲۰ کتاب السیرۃ النبویة

حدیث شَامِ قَاهِرَةِ شَامِ،

۹۵ ایضاً، ص ۲۱۲ ج ۲۰،

(۲) تمثیل ملک؟ وحی کی دوسری صورت جس کا اس حدیث میں ذکر ہے، یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس آ کر اللہ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے موقع پر عموماً حضرت جبریل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت وحیہ بخاریؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ میں سے حضرت دحیہ کلبیؓ کا انتخاب شاید اس لئے کیا آگیا ہو کہ وہ اپنے وقت کے حسین ترین انسان تھے، اتنے حسین کا اپنے چہرے کو پیٹ کر چلا کرتے تھے لہلہ البتہ بعض واقع پر دوسری صورتوں میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام کا آنا ثابت ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کی مشہور روایت میں وہ بالکل ایک اجنبی کی صورت میں تشریف لاتے تھے، یوں کہ وہاں مقصد ہی یہ تھا کہ حاضرین ایک اجنبی کو حضورؐ کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کرتا دیکھ کر اچھے میں پڑ جائیں، بہرحال اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ جو فرشتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پا پر وحی لاتا تھا وہ جبریل علیہ السلام تھے، قرآن کریم کی آیت ہے:-

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجَبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَدْبِلَكَ،

(البقرة: ۹۴)

”کہہ دو کہ جو شخص جبریلؑ کا دشمن ہو تو (ہوا کرے) اسی نے یہ (فترآن)

آپؑ کے دل پر اُتارا ہے“

اس سے یہ بات واضح ہے کہ عموماً حضرت جبریل علیہ السلام ہی وحی لایا کرتے تھے، البتہ امام حسینؓ نے اپنی تایخ میں امام شعبیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”ابتداء نبوت میں تین سال تک حضرت امراء فیل علیہ السلام وحی لاتے رہے ہیں ۱۰۰ لیکن ان کے ذریعہ فترآن کریم نازل ہمیں کیا گیا، قرآن تمام تر حضرت جبریل علیہ السلام ہی لائیں“

لہ العین؛ عدۃ القارئ؛ ص ۲۴ ج ۱، استنبول شام

لہ ریحیحہ مشکوہ المصایع، ص ۱۱ ج ۱، اصح المطالع کراچی

لہ الاتقان، ص ۲۶ ج ۱ والقطلانی؛ ارشاد اسارتی، ص ۵۹، ج ۱،

مگر علامہ داقدی[ؒ] وغیرہ نے اس روایت کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام کے سوا کوئی فرشتہ وحی نہیں لایا، علامہ بدر الدین علی[ؒ] کارچان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، اور کسی مرفوع حدیث یا کسی صحابی کے قول میں اس روایت کی بنیاد بھی نہیں ملتی، لیکن حافظ ابن حجر[ؒ] اس روایت کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں، اور اسے زمانہ فترت کا داقعہ قرار دیتے ہیں^ل،
بہر کیفیت وحی کی اس صورت میں فرشتہ انسان کی نشکل میں آیا کرتا تھا، اور وحی کے اس طریقے میں آپ کو کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی تھی، چنانچہ صحیح ابو عوانہ[ؓ] کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے وحی کی اس صورت کا ذکر کر کے فرمایا:
وَهُوَ أَهْوَأُّهُ مِنْهُ عَلَيْهِ

اور یہ صورت میرے نو سبک زیادہ آسان ہوتی ہے^م
حضرت عائشہ رضی[ؓ] کی مذکورہ بالاحدیث میں تو وحی کے صرف یہ دو طریقے بیان کئے گئے ہیں، لیکن دوسری احادیث سے اس کے علاوہ بھی کئی طریقے معلوم ہوتے ہیں،
یہاں تک کہ علامہ حلبی[ؒ] نے تو لکھا ہے کہ آپ پر وحی چھیالیں طریقوں سے نازل ہوتی تھی^ن، لیکن حافظ ابن حجر[ؒ] فرماتے ہیں کہ انہوں نے حامل وحی ریعنی جبریل علیہ السلام[ؐ] کی مختلف صفات کو وحی کے مختلف طریقے شمار کر کے تعداد چھیالیں تک پہنچا دی^و،
ورنہ تعداد اتنی نہیں^ل،

تاہم دوسری احادیث سے نزدیل وحی کے جود و سلسلہ اس طریقے ثابت ہیں، وہ
مندرجہ ذیل ہیں:-

لہ عمرۃ الانقاری، ص ۲۷۸ و ۲۷۹ ج ۱ لہ فتح الباری، ص ۲۲ و ۲۳ ج ۱، لہ الاتقان^م
لہ یہ ابو عبد اللہ حسین بن الحسن الجلیمی البجراوی رمتوں میں (۶۴۰ھ) ہیں، جن کی کتاب "المہاج"
اصول دین پر ایک جامع کتاب ہے، (کشف النطوف نمبر ۱۸۴)

۵۔ حافظ ابن حجر[ؒ] : فتح الباری، ص ۱۱۶ ج ۱،

۶۔ حافظ ابن حجر[ؒ] : فتح الباری، ص ۱۱۶ ج ۱،

(۲) فرشتہ کا اصلی شکل میں آنا : دھی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جہریل

علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصل صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اُس وقت جب آپ نے خود حضرت جہریلؑ کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسرا مرتبہ مسراج میں اور تیسرا بار نبوت کے باکل ابتدائی زمانے میں مکر مکرم کے مقام اجیاد پر پہلے دو ادعاءات تو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں، البته یہ آخری دادعہ سند اُمک در ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔
(۲) رویا کے صادقه : دھی کی چوتھی صورت یہ تھی کہ آپ کو نزدیل قرآن سے قبل پہنچ خواب نظر آکرتے تھے، جو کچھ خواب میں دیکھتے بیداری میں ویسا ہی ہو جاتا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں :-

أَوَّلٌ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أُولُو الْحِكْمَةِ
 الْرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي اللَّوْمِ فَكَانَ لَأَيْرَمِيُّ رُؤْيَا إِلَالَاجَاءَتْ هِشَّالَ
 فَقِيقُ الْفَتْيَّاحِ

”آپ بر دھی کی ابتدائیں دکھل کی طرح پہنچنے کی وجہ سے ہوتی، اُس وقت آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ صحیح کی وجہ سے ہوتا۔“

اس کے علاوہ مدینہ طیبہ میں ایک مرتبہ ایک منافت نے آپ پر سحر کروایا تھا، اس سحر کی اطلاع اور اسے دفع کرنے کا طریقہ بھی آپ کو خواب ہی میں بتایا گیا۔

(۴) کلامِ الٰہی : حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ کو بھی اللہ تعالیٰ سے برادرست ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، بیداری کی حالت میں یہ واقعہ صرف معراج کے موقع پر مبین آیا ہے، اس کے علاوہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری، ص ۱۹ و ۲۰

لہ صحیح بخاری ص ۲۷ و حدیث ۲۷

لہ صحیح بخاری باب التحریک ابواب الطیب ص ۸۵ و ۸۶ و ۸۷ و ۸۸ ج ۲، مطبوعہ اصح المطابع کراچی،

اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں ۔^{لہ}
 (۲) نَفْثَةُ الرُّوحِ ؟ وحی کا چھٹا طریقہ یہ تھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام
 جسی بھی شکل میں سامنے آئے، بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات القار فرمادیتے تو
 چنانچہ ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ:
 إِنَّ رُوحَ الْقُدُّسِ نَفْثَةً فِي رُوْحِ الْخَلْقِ^{لہ}
 ”روح القدس رجبریل علیہ السلام، نے میردل میں یہ بتا دیا تھا
 اور مستدرک حاکم کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:
 ان جبریل علیہ السلام القی فی رُوْحِ اَنْ اَحَدًا مِنْكُمْ
 لَنْ يَخْرُجْ مِنَ الدُّنْيَا حَتَّى يَتَكَمَّلْ رُونقُهُ،
 يَجْرِيْل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم میں سے کوئی دنیا سے
 نہیں جائے گا، تا اقتیکہ اپنا رزق پورا نہ کر لے ۔^{لہ}

وحی اور کشف الہام | اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وحی صرف انبیاء، علیہم السلام کے
 اساتھ خاص ہے، اور کسی بھی غیر تبیینی شخص کو خواہ وہ تقدیس
 اور روایت کے کتنے بلند مقام پر ہو، وحی نہیں آسکتی۔ البته بعض اوقات اللہ تعالیٰ
 اپنے بعض خاص بندوں کو کچھ بتایا ہے، اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے، کشف
 اور الہام میں حضرت مجدد الف ثانی رحمنے یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ کشف کا تعلق حتیا
 سے ہے، یعنی اس میں کوئی چیز یا واقعہ آنکھوں سے نظر آ جاتا ہے، اور الہام کا تعلق وجہ ایسا
 ہے، یعنی اس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی، صرف دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے،
 اسی لئے عموماً الہام کشف کی بنیت زیادہ صحیح ہوتا ہے ۔^{لہ}

لہ ایضاً

لہ الاتفاق، ص ۲۶۱ ج ۱،

لہ الحاکم، المستدرک، کتاب البيوع ص ۲۳ ج ۲، دائرة المعارف، دکن، نسخہ ۱۹۷۴

لہ نیشنل اباری ص ۱۹ ج ۱

وَحْيٌ كَيْ آخرِي صورت يعنى "نُفْثَةٌ فِي الرَّوْعِ" بظاهر الہام سے بہت قریب کر کیونکہ دونوں کی حقیقت یہی ہے کہ دل میں کسی بات کا القار کر دیا جاتا ہے، لیکن دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ وَحْيٌ میں — جو صرف نبی کو ہوتی ہے — ساتھ سے یہ علم بھی ہو جاتا ہے کہ یہ بات کس نے دل میں ڈالی ہے؟ چنانچہ حاکم روح کی مذکورہ رول است میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت بستلا دیا کہ "روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے" لیکن اہم میں ڈالنے والے کی تعین نہیں ہوتی، بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ دل میں کوئی ایسی بات آگئی ہے جو پہلے نہیں تھی ہے اسی بنا پر انہیاً علیہم السلام کی وَحْيٌ سو فی صدر تھی ہوتی ہے، اور اس کی پیروی فرض ہے، لیکن اولیاً اللہ کا اہم ترینی نہیں ہوتا، چنانچہ وہ دین میں جھٹ ہی، اور نہ اس کا اتباع فرض ہے، بلکہ اگر کشف اہم یا خوب کے ذریعہ کوئی ایسی بات معلوم ہو جو قرآن و سنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرناسی کے نزدیک جائز نہیں ہے،

وَحْيٌ مُتْلُوٌ أَوْ غَيْرُ مُتْلُوٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی وہ دو قسم کی تھی، ایک تو قرآن کریم کی آیات، جن کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے، اور جو قرآن کریم میں سیدھے کے لئے اس طرح محفوظ کر دی گئیں کہ ان کا ایک نقطہ باشو شہ بھی نہ بدلا جاسکتا ہے اور نہ بدلا جاسکتا ہے اس وَحْيٌ کو علماء کی اصطلاح میں "وَحْيٌ مُتْلُوٌ" کہا جاتا ہے، یعنی وہ وَحْيٌ جس کی تلاوت کی جاتی ہے، دوسری قسم اُس وَحْيٌ کی ہے جو قرآن کریم کا جزو نہیں بنی، لیکن اس کے ذریعہ آپ کو بہت سے احکام عطا فرمائے گئے ہیں، اس وَحْيٌ کو "وَحْيٌ غَيْر مُتْلُوٌ" کہتے ہیں، یعنی وہ وَحْيٌ جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، عموماً وَحْيٌ مُتْلُوٌ یعنی قرآن کریم میں اسلام کے اصولی عقائد اور بنیادی تعلیمات کی تشریح پر اکتفا کیا گیا ہے اُن تعلیمات کی تفضیل

لہ رشید رضا، ابو الحسنی، ص ۳۸، مطبعة المدار مصطفیٰ اسلام،
لہ اشاطی: الاعتصام ص ۲۵۷ فابرج، مطبعة المدار مصطفیٰ اسلام،

اور جزوی مسائل زیادہ تر ”وَحِيٌ غَيْرٌ مُّتَلَوٌ“ کے ذریعہ عطا فرمائے گئے ہیں، یہ ”وَحِيٌ غَيْرٌ مُّتَلَوٌ“ صحیح احادیث کی شکل میں محفوظ ہی، اور اس میں عموماً صرف مصنایں وحی کے ذریعہ آپ پر نازل کئے گئے ہیں، ان مصنایں کو تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب آپ نے خود فرمایا ہے، ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ

”جَعَلَ قُرْآنَ بُحْرَى دِيَارَكِيلَهُ، اور اس کے ساتھ اسی بُحْرَى دِبْرِی تعلیماً بُحْرَى“

اس میں قرآن کریم کے ساتھ جن ”دوسرا تعلیمات“ کا ذکر ہے اُن سے مراد یہی وحی غیر متلو ہے،

اسلامی احکام کی جزوی تفضیلات چونکہ اسی وحی غیر متلو کے ذریعہ بتائی گئی ہیں، اس لئے جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود اسلامی احکام کی پابندیوں کے آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں انہوں نے کچھ عرصہ سے یہ شوشه جھوڑا ہے کہ ”وَحِيٌ غَيْرٌ مُّتَلَوٌ“ کوی چیز نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ سب قرآن کریم میں محفوظ ہے، قرآن کریم کے علاوہ جواہر حکام آپ نے دیے وہ ایک سرمراہ حملکت کی حیثیت سے دیئے جو صرف اُس زمانے کے مسلمانوں کے لئے واجب عمل تھے، آج اُن پر عمل کرنا ضروری نہیں،

یعنی یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے، خود قرآن کریم کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی الہی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہیں بلکہ آیات قرآنی کے علاوہ بھی آپ کو پہت سی باتیں بذریعہ وحی بتائی گئی تھیں، اس بات کی تائید میں چند قرآنی دلائل ملاحظہ فرمائیے:-

۱) وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّقِيمُ
الرَّسُولُ مِنْ يَسْقِلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ، (ابقر: ۱۴۲)

”اوجب قبلہ کی طرف آپ پہلے رُخ کرتے تھے، اسے ہم نے صرف اس کو معتبر کیا تھا تو کہ یہ جان لیں کہ کون رسول اللہ کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنی ایڈیوں کے بل پلٹ جاتا ہے“

ہر مسلمان جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں ایک عصہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے، میں، اس کے بعد جب دوبارہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے بیت المقدس کی طرف منزہ کرنے کا حکم صرف اس لئے دیا تھا تو کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کون اس حکم کی تعلیل کرتا ہے اور کون انکار، میہاں قبل غوریات یہ سُر کہ اس آیت میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم بھی ہم نے ہی دیا تھا، اب قرآن کریم کو الحمد سے لے کر دن انس تک پڑھ جائیے، اس میں کہیں یہ حکم نہیں ملے گا کہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی وحی کے ذریعہ دیا تھا جو فتر آن کریم میں کہیں مذکور نہیں، اور اسی کا نام دھی غیر متلوہ (۲)، فَلَمَّا بَأْتُ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بِعُصْنَةٍ وَأَغْرَصَ

عَنْ بَعْضِ الْخَٰنِ ” (التحریم : ۳)

”پس جب اُس (عورت) نے آپ کو اس کی خردی اور اللہ نے اس کو آپ پر ظاہر کر دیا،

اس آیت کی تشریع مختصر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوست مطہرہ نے ایک بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپاپی چاہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ دھی آپ کو وہ بات بتلادی، اس پر اکھوں نے آپ سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کتنی بتائی؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات مجھے علم دخیر یعنی اللہ تعالیٰ نے بتلادی تھی، اس آیت میں تصریح ہے کہ وہ پوشیدہ بات اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ دھی بتلائی تھی، حالانکہ پورے فتر آن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اطلاع

اپے کو وحی غیر متلو کے ذریعہ دی گئی تھی، اور بھی متعدد آیات سے وحی غیر متلو کا ثبوت ملتا ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف اپنی دو آیتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، اگر تحقیقِ حق مقصود ہو تو یہ دو آیتیں بھی اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہستیا کرنے کے لئے کافی ہیں کہ وحی غیر متلو بھی وحی کی ایک قسم ہے، اور وہ بھی وحی متلو کی طرح یقینی اور واجب الاتباع ہے،

وحی پر عقلی شبہات

یہ وحی اور اس کی حقیقت سے متعلق وہ ضروری معلوم تھیں جو فترآن و سنت سے ثابت ہیں، ہم شروع میں بھکھ پچھے ہیں کہ وحی اُن معاملات میں اللہ کی طرف سے رہنمائی کی ایک شکل ہے، جن کا درآٹک نزدی عقل سے نہیں ہو سکتا، اور جو نکہ وحی کا مشاہدہ انبیاء علماء اسلام کے سوا کسی اور کوئی نہیں ہوتا، اس لئے اس کی تھیک ٹھیک یقینیات کا اندازہ بھی دوسروں کے لئے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج کی وہ دنیا جو مغربی افکار کے ہمہ گیر سیلاب پر مروب ہے، اسے یہ باتیں نامانوس اور اجنبي معلوم ہوتی ہیں، اور وہ انھیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے، پھر بعض لوگ تو کھل کر وحی والہام کا انکار کر کے اسے معاز الشقصہ کہانی سے تبعیر کرتے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو اس کا کھل کر انکار تو نہیں کرتے، لیکن "سانٹسٹیک ترقیات" کے اس دور میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شریعتی حضور ہیں، اس لئے یہاں مختصر آیہ بھی سمجھے لیجئے کہ خالص عقلی اعتبار سے وحی کی کیا چیزیت ہے؟

ہمارے نزدیک وحی کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے طے کرنے کی بات یہ ہو کہ اس کائنات کا کوئی غالتوں والک ہے یا یہ خود بخوبی بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے وجود میں آگئی ہے؟ جہاں تک اُن مادہ پرست لوگوں تعلق ہے جو کسے خدا کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، جو شخص خدا کے وجود ہی کا قابل نہ ہواں کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ وحی کی حقیقت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اُسے دل و جان سے تسیلم کر لے، اس لئے اس سے تو سب

پہلے خدا کے وجود پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، رہبے وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں سو اُن کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا بکھر مشکل نہیں،

اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادر مطلق نے پیدا کی ہے وہی اس کے مروط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے اُسے اندر ہیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فراض ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصد زندگی کو بروئے کار لاسکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلتے ہوئے اس کے سفر کا مقصد بتائے اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس بریہ واضح کر کے کہ اُسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے، اور سفر کے دوران اس کی ٹیکوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی قسم کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اُس خداوندِ قادر وس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور ستاروں کا ایسا مighr "العقل نظاہ" پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے، جس کے ذریعہ انسانوں کو اسکے مقصد زندگی سے متعلق ہدایات دی جاسکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی مانتا پڑے گا کہ اُس نے اپنے بندوں کو اندر ہیرے میں نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اُن کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باعث نظام کا نام وحی و رسالت ہے،

اس سے صاف واضح ہے کہ "وحی" محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں ایک عقلی ضرورت ہے، جس کا انکار درحقیقت اللہ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے، رہی یہ باعث

کو دھی کے جو طریقے اور ذکر کئے گئے ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، سو یہ دھی کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی علمی دلیل نہیں ہے جس چیز کی عقلی ضرورت اور اس کا وقوع ناقابل انکار دلالت سے ثابت ہوا۔ مخصوص اس بنا پر زدنہیں کیا جاسکتا کہ ہم نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، آج سے چند سو سال پہلے اگر کسی شخص کے سامنے یہ ذکر کیا جاتا کہ عفریب انسان ہوانی جہاز میں پرداز کر کے ہزاروں میں کافاصلہ چند گھنٹوں میں طے کریا کریں گے تو وہ یقیناً اسے پرتوں کا افسانہ فرا ر دینا، لیکن کیا اس کے مشاہدہ نہ کرنے سے ہوانی جہاز کی حقیقت ختم ہو گئی ہے؟ آج بھی پسمندہ علاقوں کے ہزارہا افزادا یہیں جو اس بات کو مانتے کر لئے تیار نہیں ہیں کہ انسان چاند پر پہنچ گیا ہے، لیکن کیا ان کے انکار کرنے سے یہ واقع غلط ثابت ہو گیا ہے؟ دیہات میں جاگر گہی آدمی سے پکیوڑہ سسٹم کی فصیلہ بیان کیجئے اور اسے بتائیے کہ کم طرح ایک میثون انسانی رماغ کا کام کر رہی ہے، وہ آپ کے بیانات پر آخر تک شک و شبہ کا انہار ہی کرتا رہے گا، لیکن کیا ان شکوں و شبہات سے پکیوڑہ کے وجود کا خاتمہ ہو گیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو وہ دھی جس کی عقلی ضرورت مسلم اور ناقابل انکار ہے، اور جس کا مشاہدہ دنیا کے ایک لاکھ چوبیں ہزار صادق ترین انسانوں نے کیا ہے (علیہم السلام) اسے مخصوص ان شکوں و شبہات کی بنابری کیسے جھوٹلایا جاسکتا ہے،؟

اور آخر دھی کے ان طریقوں میں عقلی بُعد کیا ہے؟ کیا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کو دھی کے ان طریقوں پر قدرت نہیں؟ اگر دنیا کے سائنسدان مخصوص اپنی محدود عقل کے تکمیل پر سیغام رسانی کے لئے ٹیلیفون، تار، ٹیلی پرنسپر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے چہرہ ایگزیکٹ ایجاد کر سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ کو نعمت باشد؟ اتنی بھی قدرت نہیں ہے کہ وہ اپنے بندروں تک سیغام رسانی کا کوئی ایسا سلسلہ قائم فرماد جو ان تمام ذرائع موافقات سے زیادہ مستحکم اور یقینی ہو؟

دھی کی حقیقت ہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام کہیں واسطے کے ذریعہ یا بلا واسطہ اپنے کسی سفیر پر القار فرمادیتا ہے، سوال یہ ہے کہ کہاں بات کو درست تسلیم کر لیتے ہیں

عقلی تباہت کیا ہے؟ وحی کے ثبوت میں کسی انسانی ایجاد یا عمل کی مثال پیش کرتے ہوئے ہمیں تأمل ہوتا ہے، لیکن بات کو سمجھنے کے لئے یہاں ہم ایک ایسے انسانی عمل کو بطور نظری پیش کرتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے کے قاب و دماغ کو مسخر کر کے اس میں جو خیال چاہتا ہے ڈال دیتا ہے،

اس عمل کو صوفیا کی اصطلاح میں "تصرف خیالی" کہا جاتا ہے، صوفیا سے کرام کے نزک روں میں اس عمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جس کے ذریعہ ایک شخص اپنی خیلی قوت کے زور سے دوسرے کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اس سے جو چاہتا ہو، کہ ملاتا ہے، اور جو چاہے کرواتا ہے، ماڈہ پرست لوگ ایک مرتب تک اس "تصرف" کی قوت کا بھی انکار کرتے رہے، اور انہی کی تقلید میں بہت سے مسلمانوں نے بھی اسے قصہ کہانی سے تعمیر کیا، یہاں تک کہ اٹھاڑ ہوئیں صدی کے دسٹمین سویٹزر لینڈ کا مشہور ماہر طبیعتیات میسمر Mesmer (پیدا ہوا، اس نے انسانی دماغ کو اپنی تحقیقی کاموں ضرور بنایا، اور ۱۷۷۰ء میں اپنے ایک مقامے کے ذریعے یہ انکشاف کیا کہ ایک مقناطیسی عمل کے ذریعے انسان کے دماغ کو مسخر کیا جا سکتا ہے، اس عمل کو دو مقناطیسی عمل تنویم (Anima Magnetism) کہتا تھا، اور فرانس میں مقیم رہ کر اس نے کامیاب عمل بتیرے بھی کئے، لیکن وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو پوری طرح مطلع نہ کر سکا، پھر ۱۸۳۰ء میں انگلستان میں ایک اور شخص جیس بریٹ.....

لہ اس کا پورا نام فریڈرک انیٹون میسمر (Frederich Anton Mesmer) ہے، یہ سویٹزر لینڈ کی ایک جھیل کا نیشنس کے قریب میں سُنْتَہ ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا اور میر سبرگ کے مقام پر پاچ سالہ ہے میں وفات پائی، ابتداء میں اس نے طب کو اپنا مصنوع بنایا تھا، بعد میں مقناطیسی عمل تنویم کا ماہر بلکہ اس کا بانی کہلا یا، اور (در لٹ فیملی انسائیکلو پیڈیا) اس ۱۲۳۲۵ ص ۲۵۰ مطبوعہ مشی گاہ انگلستان میں (۱۷۹۵ء) مسمر نیم کا علم اسی کی طرف منسوب ہے،

(James Braid) پیدا ہوا، جس نے اس عمل تحریک کو سانستھ کیا، بنیادوں پر از سر فروثابت کر کے اس کا نام عمل تنویم یا ہپناٹزم (Hypnotism) تجویز کیا،

جیس بردیڈ کے تجویز کردہ ہپناٹزم میں مختلف مدارج ہوتے ہیں، اس کا اہتمائی درجہ تو یہ ہوتا ہے کہ جن شخص پر یہ عمل کیا جاتے یعنی معقول (Hypnotised) اس کے جسم کے تمام عضلات و اعصاب بالکل جامد اور بے حس ہو جاتے ہیں، اور اسی کے ساتھ حواسِ ظاہر و باطنہ متعطل ہو جلتے ہیں، لیکن اس کا ایک درمیانی درجہ بھی ہے، جس میں جسم بے حس و حرکت نہیں ہوتا، اس کیفیت کا حال بیان کرتے ہوئے درلد فینٹلی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:-

”اگر تنویم کا عمل ذرا بہکا ہو تو معقول اس لائق رہتا ہے کہ وہ مختلف اس ثیار کا تصور کر سکے، مثلاً اس حالت میں یہ ممکن ہو کہ وہ رعایت کے مطابق، اپنے آپ کو کوئی اور شخصیت لیقین کرے، اُسے کچھ خاص چیزیں رجود ہاں فی الواقعہ موجود نہیں ہیں، نظر آنے لگیں، یادِ غیر معمولی حس اپنے اندر محسوس کرنے لگے، اس لیے کہ وہ اُس وقت عامل کی ہدایات کا نالج ہو جاتا ہے۔“

جیس بردیڈ کی تحقیقات اور تجربات کے بعد ہپناٹزم کو ان مادہ پرست لوگوں نے بھی مان لیا جو پہلے اس کے قاتل نہ تھے، اور آجکل تو یہ معنربی عوام کی دلچسپی کا بہت بڑا موضوع بنا ہوا ہے، سینکڑوں عامل اس کے ذریعہ روپیہ کماں ہو گئیں، مریضوں کے علاج میں بھی اس سے کام لیا جا رہا ہے، اور وہ ”تصوفِ خیال“ جس کا ذکر مسلمان صوفیا کرام کے ہیاں صدیوں سے چلا آتا تھا اور جس کو لوگ حاضر تو ہم پرستی کہہ کر طال دیا کرتے تھے، اب ہپناٹزم کے نام سے ایک حقیقت بن گیا ہے، اور اب ہمارے زمانے کے وفاہ نہ ”عقلیت پسند“ بھی اُسے تسليم کرنے لگے ہیں جنہیں مسلمانوں کی ہر غیر معمولی بات تو ہم پرستی

اور مغرب کی ہر دریافت "ساندھن حیثیت نظر آتی ہے،

بہرکیف! عرض کرنا یا سچا کہ مسیر زم ہو یا ہپنا اڑزم، اس کی حیثیت اس کے سوا اور سیا ہو کہ ایک انسان دوسرے کو سخت کر کے اپنے خیالات اور اپنی باتیں اس کے دل و دماغ میں ڈال دیتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جس خدا نے انسان کے تصریح خیالی یا عملی تنظیم میں اتنی قوت دی ہے کہ وہ معمولی محولی مقاصد کے لئے بلکہ بعض اوقات بالکل بیکار دوسرے کے دماغ و دل کو سخت کر دیتا ہے، کیا وہ خود اس بات پر قادر ہے؟ یہ کہ انسانست کی ہر ایسی کی خاطر ایک سپیگر کے قلب کو سخت کر کے اپنا کلام اس میں ڈال دے؟ سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ،

کیا قرآن کے صرف معنی وحی ہیں؟ اور پڑکر آجکا ہر کہ وحی کی دو قسمیں ہیں؛ ایک دوسری غیر مبتدا، اس دوسری قسم میں توعوٰ نیا ہوا ہے کہ صرف مصاہین اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی غیر مبتدا، اس دوسری قسم میں تو عوّیا ہوا ہے کہ الفاظ کا انتخاب حضرت جبریل علیہ السلام یا ہوتے تھے اور انھیں تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب حضرت جبریل علیہ السلام یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ ہمیں، وہ لفظاً اور معنی پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جس طرح اس کے مصاہین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی ہیں و عن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اور ان کے انتخاب یا ترکیب و انشاء میں نہ حضرت جبریل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا،

جو لوگ وحی کے بالے میں مادہ پرستوں کے اعتراضات سے مرجوب ہیں ہمارے زمانے میں ان میں سے بعض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا تھا، اور رمعاذ اللہ، اس کے الفاظ اور ترکیبیں وغیرہ سب حضرت جبریل علیہ السلام کی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، لیکن یہ خیال بالکل باطل، جھل اور قرآن و سنت کے صریح دلائل کے بالکل خلاف ہے،

قرآن کی بہت سی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے الفاظ اور معنی

دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، اس کے چند دلائل درج ذیل ہیں:-

(۱) قرآن کریم نے جا بجا اپنی ایک صفت "عُبَيْ" بیان فرمائی ہے، یعنی یہ کام سے عینی زبان میں نازل کیا گیا ہے، اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا صرف مفہوم یزدیۃ وحی نازل ہوا ہوتا تو ائمّا آنُزْ نَنْهَهُ قُرْآنًا غَرَبِيًّا کے کوئی معنی ہی نہ تھے، کیونکہ عربیت الفاظ کی صفت ہے معانی کی نہیں،

۲۔ قرآن کریم میں کہی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرانص منصبی بیان فرماتے گئے ہیں؛

يَشْكُلُونَ عَلَيْهِمْ حَمْمَ الْيَتَابِ وَعَلَيْهِمْ أَيْكَثْبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُنَزِّلُ كَهَامُ رَابِعَهُ

آن کے ساتھ تیری آئیتیں تلاوت کریں اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں

ادْرَأْخِينَ پَاكْ صَانِبَانِينَ"

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے ذمہ دو فرانص الگ الگ تھے، ایک آیات اللہ کی صرف تلاوت اور دوسرے آن کی تعلیم، ظاہر ہے کہ تلاوت الفاظ کی، ہوتی ہے معنی کی نہیں لہذا آپ کے سب سے پہلے فریضہ منصبی کا تعلق صرف الفاظ قرآن سے ہے معانی سے نہیں ۳۔ قرآن کریم نے جا بجا اپنے لئے "الکتب" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اور لفظ "کتاب" کا اطلاق صرف ذہنی مضامین پر نہیں ہوتا، بلکہ جب آن مضامین کو الفاظ کے ساتھ میں ڈھال لیا جاتا ہے تب اُسے کتاب کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے لفظ اور معنی دونوں منزل من اللہ ہیں،

۴۔ سورہ قیامت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام وحی لیکر کتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی الفاظ دُھراتے تھے اس پر باری تعالیٰ نے حکم دیا کہ:-

لَهُ مَلَاحِظٌ فَرَيَيْتَ سُورَةَ خَلْ: ۱۳، شَعْرَاءَ: ۱۹۵، يُوسُفَ: ۲، ظَلَمَ: ۳۹، الرَّعْدَ: ۳۹، الزَّمَرَ: ۲۸

لَمْمَ السَّجَرَهَ: ۳، الشَّوَّرَهَ: ، الزَّخْرَفَ: ۳ وَغَيْرَهُ،

لَا تُخْرِقْ فِيهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلْ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنَهُ
 فَإِذَا قَدِمْتَ أَثْنَا عَشْرَ قَاتِئْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا مَيَانَهُ (البقرة: ۹۷-۹۸)۔
 نہ پہلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سکھ لے، وہ تو بارا ذہب ہے اسکو
 جسم کر دینا تیری سیمنہ میں اور پڑھنا (تیری زبان) پھر جب تم پڑھنے لگیں (فرشتہ کی زبانی)،
 یہ آیت صراحتہ دلالت کر رہی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام جو الفاظ لے کر آتے تھے
 وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تھا، اسی لئے اس کے الفاظ یاد کرنے، اس کی تلاوت کا طریقہ
 سکھانے اور اس کے معانی کی تشریح کرنے کے تینوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لئے ہیں
 ان واضح دلائل کی روشنی میں یہ مگان بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ الفاظ فتر آن دھی کے
 ذریعہ نازل نہیں کئے گے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبد العظیم زرقانی چنے
 بڑی اچھی بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

”اس مقام پر بحث کا لیت لیاب یہ ہے کہ فتر آن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں
 بالاتفاق بذریعہ دھی نازل ہوئے ہیں، اور احادیث قدسیت کے بارے میں بھی مشہور
 قول یہ ہے کہ ان کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، البتہ احادیث نبویہ م
 کے صرف معنی دھی میں الفاظ حضور کے اپنے ہیں، اور جو احادیث آپ نے پختے
 اجتہاد سے ارشاد فرمائیں ان کے معنی اور الفاظ دونوں حضور کے ہیں۔“

دراصل جن لوگوں نے الفاظ فتر آن کے دھی ہونے سے انکار کیا ہے ان کے
 اس مغالطے کا منشاء یہی ہے کہ دھی کے ذریعہ الفاظ کا تزدیل ان کی سمجھ میں نہ آسکا، لیکن
 دھی کی حقیقت اس کی عقلی صورت اور اس پر عقلی شبہات کے جواب میں جو ہائی اور پر
 لکھی گئی ہیں ان کو پیش نظر کھا جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہو جاتا ہے، اگر دھی واقعہ
 ایک ضرورت ہے اور باری تعالیٰ اس بر قادر ہے، تو آخر کوئی معقول وجہ ہے کہ وہ معنی
 توبی کے قلب پر اُتار سکے اور الفاظ اُتار نے پر (معاذ اللہ) قادر نہ ہو؟

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ علامہ بذر الدین زکریٰ اور علامہ سیوطیؒ نے بھی بعض لوگوں کا یہ قول نقیل کیا ہے کہ آن کے نزدیک صرف مصنایں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، الفاظ احضرت جبریلؐ کے یا حضور مکے ہیں، لیکن آپ نے دیکھا کہ قرآن و سنت اور احادیث امت کے مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ اقوال بالکل باطل ہیں، ذکورہ بزرگوں نے بھی ان اقوال کے قائلین کا کوئی حوالہ نہیں دیا، بلکہ قال بعضہم (بعض لوگوں نے کہلای ہے) کہہ کر یہ اقوال نقیل کر دیتے ہیں، اور علامہ سیوطیؒ نے تو اس کی صراحة تردید بھی کی ہے، اس لئے ان اقوال کو اس مذہب باطل کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

جنبہ جنبہ جنبہ جنبہ جنبہ جنبہ

باب دوم

تاریخ نزول قرآن

قرآن کریم در اصل کلام الٰی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے،
قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ يَقِينٌ فِي تَوْحِيدٍ مَّتَحْفُظٌ (البوف: ۲۲)

”بلکہ یہ نتر آن بجید ہی، لوح محفوظ میں“

پھر لوح محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورا کا پورا آسمان
دنیا کے ”بُیْتِ عَتَّ“ میں نازل کر دیا گیا، اُس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر
”تھوڑا تھوڑا“ کر کے حسب صدرست نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تینس سال میں اس کی
تمکیل ہوئی، فتر آن کریم میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، ایک ”انزال“، اور دو سترے
”نزیل“، ”انزال“ کے معنی یہن کسی چیز کو ایک ہی دفعہ میں مکمل نازل کر دینا، اور ”نزیل“
کے معنی یہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا، چنانچہ فتر آن کریم نے اپنے لئے پہلا لفظ
جهان کمیں استعمال کیا ہے، اس سے مراد عموماً وہ نزول ہے جو لوح محفوظ کے آسمان نما
کی طرف ہوا، ارشاد ہے:-

إِنَّا آنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ، (آل خان: ۲)

”بلاشبہ ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں آتا را“
 اور ”تربیل“ سے مراد وہ نزول ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمدرج ہوا، چنانچہ
 ارشاد ہے:-

وَقُرْآنًا فَرَقْشَهُ لِيَقْرَأَهُ عَنِ التَّائِسِ عَلَى مَكْثُوتٍ وَنَزَّلَنَا هُوَ تَنْزِيلُهُ
 (رَمَضَانِي اسْرَائِيل: ۱۲)

”اور قرآن کوسم نے متفرق طور سے اس لئے اٹالا تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے
 ٹھہر کر پڑھیں یا اور یہم نے اسے تھوڑا احتوڑا کر کے نازل کیا۔“

نزولِ قرآن کی یہ دو صورتیں خود قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی واضح ہیں،
 اس کے علاوہ نسا فی حاکم، یعنی، ”ابن ابن شیبہ“، طرانی، اور ابن مردوبہ نے حضرت
 عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا
 پہلا نزول یکبارگی آسمان و نیا پر ہوا، اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر
پہلا نزول؛

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا نزول لوح
 محفوظ سے آسمان دنیا کے ایک مقام ”بیت عزت“ پر ہوا، جسے ”ابیت المعمور“ کہی
 کہا جاتا ہے، اور جو کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبارت گاہ ہے نہیں
 بیت عزت“ میں قرآن کا نزول کی طرح ہوا؛ اور اس نزول کی حکمت کیا تھی؟
 اس بارے میں کوئی یقینی بات ہنسیں کہی جاسکتی، البتہ بعض علماء مثلًا علامہ ابو شامة
 نے یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعت شان کو واضح کرنا مقصود
 تھا، اور اس مقام کے ملا جنم کو یہ بات بتانی نبھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہل زمین
 کی ہدایت کے لئے اُنمایی جانے والی ہے، ”زر قافی“ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس

لہ دیکھئے الاتقان، ص ۱۴۷، ج ۱، الموضع السادس عشر،

لہ طاہر انکروی، ”تاریخ القرآن و غرائب اسمہ و حکمر“، ص ۲۰، جلد ۲۳، آم کلمہ مناہل العزان، ج ۲،

طرح دو مرتبہ آئرنے سے یہ بھی جتنا مقصود ہے کہ یہ کتاب ہر شک و شبے سے طلاق کے قلب مبارک کے علاوہ یہ رو گذا ربعی محفوظ ہے، ایک لوح محفوظ میں اور دوسرے بیت عزت میں، واللہ اعلم،

بہر کیف، اللہ تعالیٰ کی حکومتوں کا احاطہ کون کرے؟ اسی کو صحیح علم ہے کہ اس کی اور کیا کیا حکمتیں ہوں گی، اور ہمیں ان کی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، البتہ ہمیں اتنا صفات کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ پہلا نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا،

دوسرانزدیل؛

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ فترآن کریم کا دوسرا نزول بھی نزول اُس وقت شروع ہوا جبکہ آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کا آغاز بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر ہی سے ہوا ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں گیا ہے سال بعد غزوہ بدربیش آیا، چنانچہ ارشاد ہے :-

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُقَرَاءِ قَاتِلَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْجَمِيعَانِ
(انفال : ۲۱)

اس طرح نزول فترآن کے آغاز کے باعث میں مندرجہ ذیل بائیں تoxid قرآن کریم سے ثابت ہیں :-

- ۱۔ اس کی ابتداء رمضان کے مہینے میں ہوئی،
- ۲۔ جن رات نزول فترآن کا آغاز ہوا وہ شبِ قدر تھی،
- ۳۔ یہ وہی تاریخ تھی جس میں بعد کو غزوہ بدربیش آیا،
لیکن یہ رات رمضان کی کوئی تاریخ میں تھی؟ اس کے باعث میں کوئی یقینی تاریخ نہیں ہے کہ آپ کو ربیع الاول میں عطا ہوئی تھی، علامہ سیوطیؒ نے اس کا محمل یہ بتایا

لہ مشہور یہ ہے کہ آپ کو نبوت ربیع الاول میں عطا ہوئی تھی، علامہ سیوطیؒ نے اس کا محمل یہ بتایا ہے کہ آپ کو ربیع الاول میں پچھے خواب آنے شروع ہوتے تھے، یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا، پھر رمضان میں فترآن نازل ہوا، (الاتفاق، ص ۲۲۱)

ہمیں کہی جا سکتی، بعض روایات سے رمضان کی ستر ہوئی، بعض سے انیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے،
سب سے پہلے نازل ہونیوالی آیت؛

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ سرہ علّق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری "میں حضرت عائشہؓ اس کا دفعہ یہ بیان فشریاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تزدیل وحی کی ابتداء تو پچھے خواہوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپؐ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس سے دوران آپؐ غارِ حرثا میں کئی راتیں گزارتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں کہ ایک دن اُسی غار میں آپؐ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ إقْرَأْ (یعنی پڑھو) حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہْ وَسَلَّمَ میں پڑھا ہوئیں ہوں۔ اس کے بعد خود حضور نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتہ نے مجھے پکڑا، اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور دوبارہ کہا کہ إقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ "میں تو پڑھا ہو انہیں ہوں" فرشتہ نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ إقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ "میں پڑھا ہو انہیں ہوں" اس پر اس نے مجھے تیسرا مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

إِقْرَأْ تِبْيَانَ أَسْمَرَ تِبْيَانَ الَّذِي خَلَقَ هَذَانَ النَّاسَ مِنْ عَلَىٰ

إِقْرَأْ وَرَبِّكَ مُمْكِنٌ، (علق ۱۱) رعنی

پڑھو، اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو نجہ

خون سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو لے کر واپس گھر کی طرف چلتے، تو آپ کامباک

دل دھڑک رہا تھا، آپ حضرت خدیجہ رضی کے پاس پہنچے، اور فرمایا۔ **ذَمِّنُهُنَّ**،
ذَمِّنُهُنَّ (محض کبیل اٹھاؤ، مجھے کبیل اٹھاؤ) گھرداؤں نے آپ کو کمبیل اٹھایا،
 یہاں تک کہ آپ سے خوف جاتا رہا۔

یہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا
 سلسلہ منقطع رہا، اس زمانے کو ”فترت وحی“ کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد
 دسی نرستہ جغرار حرام میں آیا تھا، آپ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھانی دیا اور اسی
 سورہ مدد شر کی آیات آپ کو نہیں،

یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلمؓ کے علاوہ تقریباً تمام کتب حدیث میں صحیح
 سندر کے ساتھ منقول ہے، اسی لئے جہوں علماء کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ قرآن کریم کی
 سب سے پہلی آیات جو آپ پر نازل ہوتیں سورہ علق کی ابتدائی آیات ہیں، ان کے بعد
 سورہ مدد شر کی آیتیں نازل ہوتیں، لیکن اس سلسلے میں تین اقوال اور بھی ہیں، جن پر
 یہاں ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا:-

۱۔ صحیح بخاریؓ کتاب التفسیر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت
 کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پرسبے پہلے سورہ مدد شر کی ابتدائی آیات
 نازل ہوتیں، اس بنا پر بعض علماء نے یہ کہدیا کہ نزول کے اعتبار سے سورہ مدد شر
 سورہ علق سے مقدم ہے، لیکن حافظ ابن حجرؓ نے اس مغالطہ کی حقیقت واضح کرتے
 ہوئے فرمایا ہے کہ درحقیقت بخاریؓ کی کتاب التفسیر میں حضرت جابرؓ کی روایت
 مختصر ہے، اور اس میں دو جملے نقل نہیں کئے گئے، یہی روایت امام زہریؓ کی
 سندر سے بخاریؓ ہی نے باب بدروحی میں نقل کی ہے، اس میں حضرت جابرؓ نے
 سورہ مدد شر کے نزول کا واقعہ بتاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ
 صراحةً نقل فرماتے ہیں کہ:-

لَهُ صَحْبُ بَخْرَىٰ، حَدَّىٰ يَقِنَّ كَانَ بَدَّ الْوَحْى إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

فَإِذَا الْمُلَكُ الَّذِينَ مِنْ جَاءَهُنَّ بِحِرَاءٍ حِجَالِشْ عَلَى الْكُسُّ مِنْ
”پس اچانک ریں نے دیکھا کہ جو فرشتہ میرے پاس غار حرام میں آیا تھا
وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے یہ“

اس سے صاف واضح ہے کہ غار حرام میں سورۃ الفرقۃ کی آیتیں پہلے نازل ہو گئی
تھیں، سورۃ مدد شعبہ میں نازل ہوئی، ^{۱۳} البنتیہ یہ کہنا درست ہے کہ ”فترت وحی“ کے بعد
سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات سورۃ مدد شرب کی ہیں، لہذا جن روایات میں حضرت
جابر رضی سے یہ منقول ہے کہ پہلے نازل ہونے والی وحی یا آیہ ^{۱۴} المدد شرب ہے، اس سے
مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”فترت“ کے زمانے کے بعد پہلی وحی یہ تھی، اور یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ پہلی سورت جو مکمل نازل ہوئی وہ سورۃ مدد شرب تھی، کیونکہ سورۃ اقراب پری ایک
مرتبہ نازل نہیں ہوئی۔

۲- امام بہقی ^{۱۵} نے دلائل النبوۃ میں حضرت عمرو بن حبیل رضی اللہ عنہ سے ایک
مرسل روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی سے پہلے حضرت
خریج رضی سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جب بھی خلوت میں جانا ہوں تو کوئی مجھے یا الحسن
یا الحسن کہہ کر پیچا رتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن جب میں خلوت میں پہنچا تو اس نے
کہا یا مامُحَمَّدُ يَسِّيرًا لِلَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ أَتَعْمَلُ بِنِعْمَةِ رَبِّ الْعَظِيمِ اَع
یہاں تک کہ پوری سورۃ فاتحہ پڑھ دی ہے ^{۱۶}

اس روایت کی بتاریخ علماء زمخشری ^{۱۷} نے لکھا ہوا کہ سب سے پہلے نازل ہونے والی
سورۃ فاتحہ ہے، بلکہ اسی کو انہوں نے اکثر مفسرین کا قول قرار دیا ہے ^{۱۸} لیکن
حافظ ابن حجر ^{۱۹} نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ زمخشری ^{۲۰} کا یہ کہنا درست نہیں،

لد فتح الباری، ص ۲۲۳ ج ۱، اس واقعہ کی مزید تحقیق کے لئے دیکھئے فیضن الباری ص ۲۵۰ ج ۱،

والاتفاقان، ص ۲۲۵ د ۲۵ ج ۱، گہ الاتفاقان، ص ۲۵ ج ۱،

کہا لزم مختری، الکشاف عن حقائق غواصین التنزیل ص ۵، ج ۳ مطبع الاستقامة، قاہرہ ۱۳۶۵

سورة فاتحہ کو پہلی دھی فزار دینے والے بہت کم ہیں، اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ سورہ اقراء سب سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

چنان تک یہی حقیقی ہے کہ مذکورہ روایت کا تعلق ہے اُس کے بالے میں خود امام سعید قیضی نے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ روایت درست ہو تو یہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ سورہ افترا اور سورہ مدثر کے نزول کے بعد کا ہو، اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خیال بھی فرمایا ہے کہ ہو سکتا ہے سورہ فاتحہ بعض دوسری آیات کی طرح دو مرتبہ نازل ہوئی ہو، ایک مرتبہ سورہ افترا کے نزول سے پہلے، اور دوسری بار اس کے بعد، اس صورت میں یہ کہنا پڑتے گا کہ سورہ فاتحہ کا نزول پہلی بار قرآنیت کی صفت کے ساتھ ہمیں ہوا تھا، بلکہ ایک فرشتے نے آپ کو یہ سورت سنادی تھی، بعد میں اپنے وقت پر باقاعدہ قرآن کے جزو کی حیثیت میں نازل ہوئی۔

بہر کیف! ان تین روایتوں کو چھوڑ کر باقی اکثر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ سورہ اقراء کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں، علامہ سیوطیؒ نے اس کی تائید میں بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔

مکنی اور مدنی آیات

آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہو گا کہ کسی سورت کے ساتھ ممکنیٰ اور کسی کے ساتھ مدنیٰ لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے، اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق ”مکنی آیت“ کا مطلب وہ آیت ہے جو آپ کے بغرض، بحرت مدینہ طیبہ سے پہلے پہلے نازل ہوئی، بعض لوگ ممکنی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ

لہ نفح اباری ص ۵۵۸ ج ۸ کتاب تفسیر سورہ اقراء، گلہ الاتقان ص ۲۵ ج ۱،
گلہ الاتقان، ص ۲۳ ج ۱، لہ نفح اباری، ص ۲۵ ج ۱،

میں اُتری، لیکن اکثر مفسرین کی اصطلاح کے مطابق یہ مطلب سمجھا درست نہیں، اس نے کہ کتنی آئیں ایسی پیش جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں، لیکن چونکہ بحث سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس نے انھیں مکنی کہا جاتا ہے، چنانچہ منی، عرفات و غیرہ اور سفر مراجع کے ذریان نازل ہونے والی آیات ایسی ہی ہیں، یہاں تک کہ سفر بحث کے ذریان جو آیات راستے میں نازل ہوتیں وہ بھی مکنی کہلاتی ہیں، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہو، مگر انھیں مدینہ کہا جاتا ہے، چنانچہ بحث کے بعد آپ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپ مدینہ سے سینکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیات مدینی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی مدینہ کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوہ حدیثیۃ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی اَنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا إِلَى الْآمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا، مَذْنَى هے، حالانکہ وہ مکہ مکرہ میں نازل ہوتی ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ مکنی اور مدینی کی تقسیم اگرچہ بظاہر مقامات نزول کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ زمانہ نزول کے اعتبار سے ہے، بحث کی تکمیل سے قبل کی آیات مکنی ہیں اور بعد کی مدینی،

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے جس میں آپ نے کسی آبتدیا یا سورت کو مکنی یا مدینی نظر دیا ہو، لیکن جن حضرات صحابہ و تابعین نے قرآن کریم کے الفاظ و معانی کی حفاظت میں اپنی عربی کھپائی ہیں انھوں نے ہی سورتوں اور آیات کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں سے کوئی مکنی ہے اور کوئی مدینی؟ مثلاً حضرت عبدالرشید بن مسعود رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے ہیں: ”قسم اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ کی کتاب کی ہر آیت

لہ تفصیل کے لئے دیکھئے ابراہیم فی علوم القرآن، ص ۱۸۸ ارج ۱، النزع انتاس،

لہ منابع العرفان ص ۱۸۸ ارج ۱

کے بارے میں صحیح معلوم ہے کہ دہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی ہے؟ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں: «خدا کی قسم! میں ہر ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ دہ رات میں نازل ہوئی یادن کو، میدانی علاقہ میں اُتری یا پھاڑ پڑے؟» اکثر دیشتر تو انہی حضرات صحابہؓ نے قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ وہ مکنی یہ یادنی، اس کے علاوہ بعض آیات یا سورتوں کے بارے میں روکے شواہد کے ذریعہ بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے، مثلاً جن آیات میں غزوہ بدرا کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ مدینی ہی ہو سکتی ہیں، یا جن آیتوں میں خاص طور پر شرکین مکہ سے خطاب کرنے کو کہا گیا ہے ان میں سے بیشتر کو مکنی ہی سمجھا جا سکتا ہے، لہذا بعض مرتبہ اس قسم کے قیاسات اور شواحد کی بنیاد پر بھی کسی آیت کو مکنی یادنی قرار دیدیا جاتا ہے، پھر جنکہ قیاسات مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے بعض آیات کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف بھی پیدا ہو گیا ہے کہ بعض کے نزدیک دہ مکنی اور بعض کے نزدیک مدینی ہیں، پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکنی یا پوری کی پوری مدینی ہیں مثلاً سورہ مدثر پوری مکنی ہے اور سورہ آل عمران پوری مدینی، اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت تو مکنی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدینی آگئی ہیں مثلاً سورہ آعاف مکنی ہے، لیکن اس میں وَا سَأَلْهُمْ عَنِ الْقُرْبَةِ الَّتِي كَانَتْ حَدَّهُمْ الْبَعْرِیَّ سے لے کر وَإِذَا خَلَ رَبِيعَ مِنْ بَيْنِ أَدْمَنَ الْمَكَ کی آیات مدینی ہیں، اسی طرح بعض مرتبہ اس کے بر عکس بھی ہوتا ہے، مثلاً سورہ حجؑ مدینی ہے لیکن اس کی چاہتیں یعنی وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ فِيلَكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا تَرَى إِلَّا إِذَا تَهَنَّى سے لے کر عَدَّا مُبَرِّئِ مَعِيقَتِمْ تَكَ مکنی ہیں،

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکنی یادنی ہونا عموماً اس کی آیات کی اکثریت کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی

ابتدائی آیات ہجرت سے قبل نازل ہو گئیں اُسے مکن فتار دیدیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوتی ہوئیں،
مکن و مدنی آیتوں کی خصوصیات:

علماء تفسیر نے مکن اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے ان کی بعض ایسی خصوصیات بیان نہ رہا ہیں جن سے باوی النظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکن ہے یا مدنی، اس سلسلے میں بعض قواعد مکن ہیں اور بعض اکثری، قواعد کلیتی یہ ہیں :-

۱۔ ہر وہ سورت جس میں لفظ "کلّا" (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکن ہے، یہ لفظ بینہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں، چنانچہ علامہ دریتنیؒ کا شعر ہے ۷

وَمَا نَزَّلْتُ كَلّا بِشَوَّبٍ فَاعْلَمُ وَلَمْ تَأْتِ فِي الْقُرْآنِ فِي نَصْفِهِ الْآخِرِ

۲۔ ہر وہ سورت جس میں کوئی سجدے کی آیت آئی ہے مکن ہے۔ (یہ اصول حفیۃ کے مسلک پر ہی، کیونکہ ان کے نزدیک سورۃ حج میں سجدہ نہیں ہے، شوافع کے نزدیک سورۃ حج میں سجدہ ہے، اور وہ مدنی ہے، لہذا وہ اس قواعد سے مستثنی ہوگی)

۳۔ سورۃ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدم و ابیس کا واقعہ آیا ہو وہ مکن ہے،

۴۔ ہر وہ سورت جس میں چہار کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے،

۵۔ ہر وہ سورت جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے، بعض علماء نے اس قاعدے سے سورۃ عنکبوت کو مستثنی کیا ہے، لیکن تحقیق یہ ہر کو سورۃ عنکبوت بحیثیت جموعی تو مکن ہے، مگر جن آیات میں منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں ۹

اور سورتوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر دبیشور ایسا ہی ہوتا ہے،

۱۔ مکن سورتوں میں عموماً کیا آیا ہے؟ (ایسا ہی کہ اس قواعد سے خطاب کیا گیا ہے)

۱۰ منابع العرقان، ص ۱۹۲ ارج ۱، ۱۱ ایضاً، ص ۱۹۱ ارج ۱،
عہ یہ فااعدہ القرآن وغیرہ سے مأوفذی ہے۔ اور یہ اس قول کے مطابق تو سورت جس کی رو سے سورۃ حج کی
ہے، لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہ وتابعین سے روی ہے تو سورۃ حج اس قاعدے سے
مستثنی ہوگی۔ تلقی

- اور مدنی سورتوں میں آیا آیمہ الٰذین امْتُوں کے الفاظ سے،
- ۲۔ مکی آئیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مدنی آیات و سور طویل اور مفصل ہیں،
- ۳۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، جسرو نشر کی منتظرکشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلي کی تلقین اور بچپلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہو سے ہیں، اس کے بر عکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور ستمانی قوانین، چادر و قبال کے احکام اور حدود فراض بیان کئے گئے ہیں،
- ۴۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہت پرستوں سے ہی، اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے،
- ۵۔ مکی سورتوں کا اسلوب بیان زیادہ پُرشکوہ ہے، اس میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبتہ سادہ ہے،
- مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالاتِ ماحل اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بہت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دارمیں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح بہت پرستوں کی مثالی تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدنی طبیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جو حق درحق اسلام کے ساتے تلے آرہے تھے، علی سطح پر محبت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا، اور تمام نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوب بیان ختمیاً کیا گیا،

ہر منصف مراج انسان حالات کی تدریج کی روشنی میں نظر آن معنائیں ہلوب کے اس اختلاف کو بآسانی سمجھ سکتا ہے، یعنی جن مستشرقین کے دل میں اسلام دشمنی کی آگ سلگتی ہی رہتی ہے، انہوں نے مکنی اور مردنی اسلوب کے اس فرق سے بھی من گھڑت نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ بعض مستشرقین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، اسی لئے وہ حالات اور ماحول کے اختلاف سے مختلف اسلوب اختیار کرتا رہا، اگریہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس کا اسلوب گرد و پیش سے متاثر نہ ہوتا، یعنی جس شخص کے دل میں بھی انصاف اور معقولیت کی ادنیٰ رہن موجود ہو وہ اس معانداۃ اعتراض کی لغویت محسوس کر سکتا ہے، علم بلاغت کی اصل روح یہ ہر کو کلام اپنے مخاطب اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہو، ہر قسم کے مخاطب کے سامنے اور ہر قسم کے ماحول میں ایک ہی اندازہ اسلوب پر بحی رہنا پر لے درجے کی بذریعاتی اور بلاغت کے بنیادی آداب تک سے نابلد ہونے کی دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس بذریعاتی کی توقع وہی شخص کر سکتا ہے، جس نے اعتراض برائے اعتراض کی قسم ہی کھارکی ہو۔

نرذل کا وقت اور مقام

آیات قرآنی میں مکنی اور مردنی کی تقيیم کے علاوہ نرذل کے مقام اور وقت کے لحاظ سے مفسرین نے کچھ اور قسمیں بھی بیان نظر مانی ہیں، مثلًا حضری آیات آن آیتوں کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دھن میں نازل ہوئیں، ایسا اثر نظر آنی آیات ایسی ہی ہیں، اور سفری آیات وہ ہیں جو سفر کی حالت میں نازل ہوئیں

لہ اس لغو اعتراض کی باقاعدہ علی تردید کی ہم صدورت ہمیں سمجھتے، تاہم جو مذاہب اس نوعیت کے اعتراضات اور ان کے مفصل جواب کے لئے شیخ زرقانیؒ کی منابل العرفان میں صفحہ ۱۹۸ تا ۲۲۷ ج اکامطالعہ فرمائیں،

شَلَّا إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِمُحَمَّدٍ أَنْ تَعُودُ الْأَمَانَاتِ إِلَى آهْلِهَا فِتْحَ مَكَّةَ كَسْفِ مِنْ أَتْرَىٰ
عَلَامَ سِيوطِي حَنْفِي اسْقَمْ كَيْ تَغْرِيْبَا چَالِينْ اَيْتِسْ شَارِكِيْلَيْ اَسْ كَيْ عَلَادَهْ هَنْدَرِجَذِيلْ قَسِيمِيْ بَهِي
اَخْصُونْ نَهِيْ بَيْانْ فَرَاتِيْ بَيْنْ :-

(۱) نَهَارِي : يَهْ دَهْ آيَاتِ بَيْنْ جَوَدَنْ كَيْ دَقْتِ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ، بَقْوِيْ عَلَامَهْ جَنِيْتِيْ
اَكْرَثَ آيَاتِ اَسِيْ قَسْمِ سَهْ تَعْلَقَ رَكْهَتِيْ بَيْنْ،

(۲) لَيْلِي : يَهْ دَهْ آيَاتِ بَيْنْ جَوَرَاتِ كَيْ دَقْتِ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ، مَثَلَّ سُورَةَ آلِ عَرَانَ كَيْ
اَخْرَىٰ آيَاتِ اَنْ فِي خَلْقِ الشَّمْوَاتِ فَالْأَسْرَاضُ وَالْخِلَافُ الْلَّدُلُّ وَالنَّهَارِ الْلَّامِيْتِ
لَامِيْتِ الْأَنْبَابِ هَرَاتِ كَيْ دَقْتِ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ، عَلَامَهْ سِيوطِي حَنْفِي فِي اَسْ كَيْ مَزِيدَ
اِيكَ درْجَنْ مَثَالِيْنْ اَتَقَانَ مَيْسِ ذَكْرَ كَيْ بَيْنْ،

(۳) صِيفِي : يَهْ دَهْ آيَاتِ بَيْنْ جَوَگَرِي كَيْ موْسِمِ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ، مَثَلَّ سُورَةَ نَسَاءَ
کَيْ آخِرِي آيَتِ يَسْقَطُتِ تَلَاقُ قُلِ اللَّهُ يُفْتَنُكُمُ فِي الْكَلَالَةِ، صَحِحَ مُسْلِمِ مِنْ حَضْرَتِ
عَمَرَهْ کَيْ روَايَتِ کَيْ مَطَابِقَ گَرَمِي مِنْ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ، اُورَ دَوْسَرِي روَايَاتِ سَهْ یَهْ بَحْبَشَتِ
ہَے دَهْ آيَتِسْ حَجَّةَ الْوَدَاعَ کَيْ مَوْقِعَ پَرْ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ، اَسْ سَهْ مَعْلُومَ ہُوَ اَكْحَجَّةَ الْوَدَاعَ
لَهْ مَوْقِعَ پَرْ جَنِيْ آيَاتِ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ وَهْ سَبْ صِيفِي بَيْنْ، مَثَلًاً أُمُّيَّوْمَ اَكْمَلَتْ تَكْسُمَ
دِينِكُمُ وَغَيْرَهْ،

(۴) رَشْتَانِي : يَهْ دَهْ آيَاتِ بَيْنْ جَوَسِرَدِي كَيْ موْسِمِ مَيْسِ اَتَرِنْ، مَثَلَّ سُورَةَ نَوْرَ
کَيْ آيَاتِ اَنْ اَلْيَذِيْنَ حَجَاءُ وَابِلَا قُلِ الْخَجَنِ مِنْ حَضْرَتِ عَائِشَهْ بِرَتْهَمَتْ گَلَانِي
وَالْوَوْلِ کَيْ تَرْدِيدِ کَيْ گَتَّی هَے، سِرَدِي کَيْ موْسِمِ نَازِلْ ہُوَيْسِنْ، جِيسَا کَيْ صَحِحَ بَحْجَارِيْ مِنْ
خُودَ حَضْرَتِ عَائِشَهْ رَمَنْسَهْ مَرْدِي هَے، اَسِيْ طَرَاحَ غَزَّدَهْ خَنْدَقَ کَيْ بَارِي مِنْ سُورَةَ اَحْرَآبَ
کَيْ آيَاتِ بَھِي اَسِيْ قَسْمِ مِنْ دَاخِلِ بَيْنْ، کِيوْنَکَهْ یَهْ غَزَّدَهْ بَھِي سِرَدِي کَيْ موْسِمِ مَيْسِ ہَوَا تَحَاهَا،
(۵) فَرَاشِي : يَهْ دَهْ آيَاتِ بَيْنْ جَوَآخْضَرَتِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پَرَايَسَهْ دَقْتِ نَازِلْ

ہوتیں، جب آپ اپنے بستر پر ستحے، چانچخ آیت وَإِذْ هُوَ يَعْصُمُ مَنِ النَّاسِ (ماندہ: ۲۰) اسی حالت میں نازل ہوئی، علامہ سیوطیؒ نے اس کی دو مثالیں اور ذکر کی ہیں،
(۱) نومی : بعض حضرات نے آیات کی ایک قسم "نومی" بھی ذکر کی ہے، یعنی وہ آیات جو نیند کی حالت میں اُتریں، اور اس کی مثال میں صحیح مسلمؑ کی وہ روایت پیش کی ہے، جس میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت سلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرماتھے کہ آپؐ کو نیند کا ایک جھونکا آیا، پھر آپؐ نے تسلیم فرماتے ہوئے سرمبارک اٹھایا اور فرمایا کہ مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپؐ نے سورہ **إِنَّا أَعْطَيْنَا لَقَدْ كَوْتَرَ تَلَادَتْ فَرَبَّانِي**

یعنی محقق بات یہ ہے کہ نیند کی حالت میں آپؐ پر کوئی آیت قرآنی نازل نہیں ہوئی، اور پر کی روایت میں جس کیفیت کو "نیند کے جھونکے" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لئے اصل حدیث میں "اغفارة" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور امام رافعیؓ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مرا نیند نہیں، بلکہ وہ مخصوص حالت ہے جو آپؐ پر نزولِ وحی کے وقت طاری ہو جائی کرتی تھی، اس لئے اس حدیث سے یہ بھنا درست نہیں ہے کہ نزولِ قرآن نیند میں بھی ہو لے، علامہ سیوطیؒ نے بھی امام رافعیؓ کی تائید کی ہے،
(۲) سماوی : یعنی وہ آیات جو میراج کے وقت آسمان پر نازل ہوئیں، ان کے باعے میں صرف ایک صحیح مسلمؑ کی روایت ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ بعثۃ کی آخری آیات شبِ میراج میں سدرۃ المنہجی کے قریب نازل ہوئیں ہیں،

(۳) فضانی : علامہ ابن عسریؓ نے ایک قسم الیسی بھی ذکر کی ہے جو نہ زمین پر نازل ہوئی تر آسمان پر، ان کاہمنا ہے کہ سورہ صافات کی تین آیتیں و مامتا اللہؑ مقام مَعْلُومٌ الْخ اور سورہ زخرف کی ایک آیت قاتِل مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ بَلِيلٍ مِنْ مُّسْلِمِنَ، اسی قسم میں داخل ہیں، یعنی علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی

کوئی سند نہیں مل سکی،

قرآن کریم کا تدریجی نزول؛

بعض اچھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فترآن کریم دفعہ اور سیارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تحفظ اتحوڑا کر کے تقریباً تینس سال میں اُستار آیا ہے بعض اوقات جرسیل ایمن علیہ اسلام ایک چھوٹی ٹھی آیت ... بلکہ آیت کا کوئی ایک جزو لے کر بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کسی کسی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں فترآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقل نازل ہوا وہ غیر اولیٰ الفضّر (نسار: ۹۷) ہے، جو ایک طویل آیت کا ملحوظہ ہے، دوسری طرف پوری سورۃ القمر ایک ہی مرتبہ نازل ہوتی ہے،

بعض حضرات کو این عساکرؒ کی ایک روایت سے یہ شبہ ہو گیا ہے کہ جرسیل ایمن علیہ اسلام ایک مرتبہ میں پانچ سے زائد آیتیں نہیں لائے، لیکن علامہ سیوطی رحم نے اس خیال کی ترویید کرتے ہوتے فرمایا ہے کہ نازل قواں سے زائد آیتیں بھی ہوتی ہیں، مثلًا واقعہ افک میں بیک وقت دش آیتوں کا نزول صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن ہوتا یہ تھا کہ جرسیل ایمن علیہ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچ پانچ آیتیں یاد کرایا کرتے تھے، جب پانچ آیتیں یاد ہو جاتیں تو مزید آیتیں سن کر یاد کر دیتے تھے، چنانچہ امام سیوطیؒ نے حضرت ابوالعالیٰؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی پانچ پانچ آیتیں سیکھا کر دیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جرسیل سے پانچ پانچ آیتیں ہی یاد کر کر تھیں قرآن کریم کو سمجھا گی نازل کرنے کے بجائے تحفظ اتحوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آپ سے کیا تھا؟ کیونکہ وہ ایک قصیدہ پورا کا پورا ایک وقت میں سنتنے کے عادی تھے، اور یہ تدریجی نزول آن کے لئے ایک

۱۰ تفسیر ابن کثیر، ص ۱۲۲ ج ۲

تلہ اس پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہو الاتقان ص ۳۲ ج ۱، انواع اسد عشر، المسنّة الاولی

اچنپی سی بات حقی، اس کے علاوہ فتر آن سے پہلے تورات، زبور، اور انجیل تینوں ایک ہی مرتبہ نازل ہو گئی تھیں، ان میں یہ تدریج کاظمیہ نہیں تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ مِنْ جُنْدَةَ وَاحِدَةٍ
كَذَلِكَ لِتُنْتَهِيَ بِهِ فَوْعَادُكَ وَرَبَّلْكَهُ تَرْتِيلًا وَلَا يَأْتُكُمْ ذَكْرٌ
بِمِثْلِ إِلَّا حَنَّا فِي الْحَقِّ وَأَخْسَنَ تَفْسِيرًا (الفرقان ۳۲ و ۳۳)

”اور کافر دوں نے کہا کہ آپ پر فتر آن ایک ہی رفع کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح ربہم نے قرآن کو تدریجیاً تمازج ہے تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم اس کو رفتہ رفتہ پڑھ لیے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حتیٰ لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیریں کریں گے۔“

امرازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فتر آن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائی ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لیتا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس تدریجی نزول میں کمی حکمتیں تھیں:-

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّتی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے اُن پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل گردی گئی،

۲۔ اگر پورا فتر آن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً شروع ہو جاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت میں ملحوظ رہی ہے،

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جس تسلیل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آئنا ان اذیتوں کے مقابلہ کو پہل بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویت قلب کا سبب بنتا تھا،

۴۔ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات

متعلق ہے، اس لئے ان آیات کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کے غیبی خبریں بیان کرنے سے اُس کی حکایت اور زیادہ آشکار ہو جاتی تھی ہے۔

ترتیبِ نزول اور موجودہ ترتیب

یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ اس وقت موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا، بلکہ حزورت اور حلا کے مطابق نزول کی ترتیب اس سے مختلف تھی، ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اپنے کتابیں وحی کو ساتھ ہی یہ بتادیتے تھے، کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لیا جائے، چنانچہ وہ آپ کے بتائے ہوئے مقام پر درج ہو جاتی تھی، ترتیبِ نزول کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور نہ صحابہؓ نے، اس لئے جب قرآن مکمل ہو گیا، تو لوگوں کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ کونسی آیت کس ترتیب نازل ہوئی تھی؟ لہذا ب جزوی طور پر بعض سورتوں یا آیتوں کے باڑے میں توبی علم ہو جاتا ہے کہ ان کی ترتیب کیا تھی؟ لیکن پورے قرآن کی ترتیب نزول یقین کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی، علامہ سیوطیؒ نے الاتفاق میں بعض روایات کی مدد سے سورتوں کی ترتیب نزول بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن درحقیقت ان

لِهِ التَّفْيِيرُ كَبِيرٌ لِلَّامِ الرَّازِيِّ، ص ۳۶ ج ۶، المطبع العارمة ۱۳۲۲ھ
لِهِ الْأَقْوَانِ، نوع ملخص، آتا ۱۲ ج ۱، انڈس سے ایک معلوم علم کی کتب میں مکتبہ المبانی فی نظم المعانی
کا ایک مختلطف نوح آرخمنی پیغمبر نے مقدمتان فی علوم القرآن "کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں بھی
ترتیب نزول کی مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں (مقدمتان فی علوم القرآن، مرتبہ آرخمنی پیغمبر
مکتبہ المبانی مهر ۱۹۷۸ء ص ۱۶ تا ۲۰) مگر یہ روایات قابل اعتماد نہیں ہیں،

روایتوں سے یقینی طور پر صرف آتنا معلوم ہوتا ہے کہ کونسی سورت کی اور کونسی مرتبی؟
 ترتیبِ نزول کی تفصیلات ان سے معلوم نہیں ہوتیں، ماضی قریب میں بعض مستشرقین
 نے بھی ترتیبِ نزول معین کرنے کی کوشش کی ہے، سب سے پہلے مشہور جرج من مستشرق
 نو لڈیج نے اس کام کا آغاز کیا، اور اس کے بعد یہ بہت سے مغربی مصنفوں کی دلچسپی کا
 موضوع بنارہا، دیم میور نے بھی اس سلسلے میں ایک جداگانہ کوشش کی ہے، بلکہ ہے،
 ایم راڈویل نے قرآن کریم کا جوانگریزی ترجمہ شائع کیا، اس میں سورتوں کو معروف
 ترتیب سے ذکر کرنے کے بجائے نو لڈیج کی مزاعمہ تاریخی ترتیب سے ذکر کیا، بیسوں
 صدی کے آغاز میں ہارٹ وگ ہرشفیلڈ نے صرف سورتوں بلکہ آیتوں تک کی تاریخی ترتیب
 معین کرنے کی کوشش کی، اس کے علاوہ رحیم بلاشیر نے اپنے فرانسیسی ترجمہ میں اس کام
 کا بیڑا اٹھایا، رچرڈ بیل نے بھی اس سلسلے میں مغربی دنیا میں کافی نام پیدا کیا،
 مستشرقین کی یہ کوششیں اب بھی جاری ہیں، اور شاید ابھی سے متاثر ہو کر بعض
 مسلمانوں نے بھی ترتیبِ نزول کی تحقیق کرنی شروع کی ہے،
 لیکن ہماری نظریں یہ ساری کوششیں ایک ایسے کام میں اپنا وقت صرف

Nöldeke, Theodor, Geschichte des Qorans, Gottingen
 (1860) ۸۱

Muir, William, The Life of Mohammed ۸۲

Rodwell, J. M., The Koran (translated) London, 1953 ۸۳

Hirschfeld, Hartwig, New Researches into the
 composition and exegesis of the Quran. (1902) ۸۴

Blachere, Regis, Coran traduction selon un essai
 de reclassement des sourates, Paris, 1947-51 ۸۵

Bell, Richard, Translation of The Quran (1937-39) ۸۶

کہ یعقوب حن: کشات اہری، ص ۵، آتا ۸۲ اور اشاعت مدراس علمیہ

کرنے کے مراد فیں جس میں کبھی لقینی کا ممکنی حاصل نہیں ہو سکتی، مذکورہ بالا مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں وہ زیادہ تر متن کے بارے میں اُن کے ذاتی قیاست پر مبنی ہیں اور چونکہ ہر شخص کے قیاسات دوسرے مختلف ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کی بیان کردہ ترتیبوں میں بھی فرق ہے، لہذا ہزار کوشش کے باوجود ان قیاسات سے کوئی خاص عملی قابلہ حاصل کرنا مشکل ہے، دراصل مستشرقین کی ان کوششوں کے سچے ایک مخصوص ذہنیت کا فرماء ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم ابھی تک غیر مرتب ہے، اس کی اصلی ترتیب وہ ہے جس پر وہ نازل ہوا تھا، یعنی چونکہ نازل ہونے کے ساتھ اُسے کتابی شکل میں لکھنے کے بجائے متفرق چیزوں پر لکھا گیا اس لئے وہ ترتیب محفوظ نہ رہ سکی، راذولیں نے اپنے ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ موجودہ ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب متفق تحریریں جمع کیں تو وہ انھیں جس ترتیب سے ساتھ ملی گئیں اسی ترتیب کے وہ لکھتے چلے گئے، لہذا اس میں کسی تاریخی یا معنوی ترتیب کا لحاظ نہیں رہ سکتا، اب قرآن کریم کی موجودہ ترتیب اُن کے خیال میں (معاذ اللہ) ایک نقص ہے جسے وہ بزرگ خود اپنے "تحقیق" سے دور کرنا چاہتے ہیں، !!

حالانکہ واقعات کی یہ تصویر نہ صرف خیالی بلکہ واضح دلائل کے بالکل خلاف ہے، اس لئے کہ آیات قرآنی کی ترتیب بالاتفاق وحی سے ثابت ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کا تبین وحی کو ساتھ ہی یہ بھی بتادیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی، لہذا اور صحابہ نے قرآن کریم کو اسی ترتیب سے یاد کیا تھا، جو حضور نے بتائی تھی، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت زید رکو جس ترتیب سے آتیں

ملئی گئیں اسی ترتیب سے وہ لکھتے گے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو موجودہ قرآن میں سب سے آخری آیت مِنَ الْمُوْمِنِينَ رَبَّهُمْ صَلَّى اللّٰہُ عَلٰیْہِ وَاٰلِہٖہِ وَسَلَّمَ ہوتی چاہئے تھی، کیونکہ حضرت زیدؑ کو یہ آیت سب سے آخری میں ملی، حالانکہ یہ آیت سورہ احزاب میں درج ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت زیدؑ اور ان کے رفقاء کے سامنے جب کوئی آیت لائی جائی تھی تو وہ اس کو اسی مقام پر لکھتے تھے جس مقام پر حضور نے بتایا تھا، البتہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اہل علم کی درایتیں ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ بھی بذریعہ دھی بتائی گئی ہے، اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے معین کیا ہے، زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض سورتوں کی ترتیب تو بذریعہ دھی ہی بتادی گئی تھی، البتہ بعض سورتوں مثلاً سورہ توبہ کے بارے میں کوئی صریح ہدایت موجود نہ تھی، اس نے صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے سورہ انفال کے بعد رکھا ہے۔

اسباب نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تودہ آیتیں ہیں جو اشد تعالیٰ نے ازخواں فضرا میں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ ان کے نزدیک کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات الیٰ ہیں کہ جن کا نزدیک کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی کے سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں "سبب نزدیک" یا "مشان نزدیک" کہلاتا ہے، مثلاً سورہ بھترہ کی آیت ہے:

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنْنَ وَلَا مَهْمَّةٌ شَوَّعْمَنَةٌ حَيْرَمْ فَمَنْ
مُشْرِكَاتِ كَيْدَةٍ وَلَوْمَهْمَّةٌ أَعْجَبْتُكُمْ، (بقرة : ٢٢١)

تمشک عورتوں سے نکاح نہ کر جب تک وہ ایمان سے آتیں، اور بلاشبہ ایک مومن کیز ایک مشرک کے پہنچنے والے مشرک تمہیں پسند نہ ہو۔

^{١٦} تفصیل کیلے دیکھتے فتح الباری، ص ۳۲ تا ۳۵ ج ۹، باب تأثیت القرآن،

پہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرشد بن ابی مرثیہ غنوی رضی کے عنانے نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ کسی کام سے حضرت مرشد بن مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عنانے نے انھیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرشد بن مکہ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حاصل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آخہر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مدینہ طیبہ تشریف لا کر حضرت مرشد بن نے حضور مسیح کی اجازت طلب کی، اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی۔

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا شدید نزول یا مشابہ نزول ہے،

شان نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد:

بعض ایسے لوگوں نے جنہیں علم میں بچتگی اور رسول خاص نہیں ہے، اس باب نزول کی اہمیت سے انکار کرتے ہوتے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم بذات خود اتنا واضح ہے کہ کراس کی تشریح کے لئے اس باب نزول کو جانتے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ خیال بالکل باطل اور غلط ہے، اس باب نزول کا علم تفسیر قرآن کے لئے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کے فوائد بے شمار ہیں، جن میں سے چند بہاں بیان کئے جاتے ہیں؟

۱۔ علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں کہ اس باب نزول جانتے کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے احکام کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کہن حالات میں اور کیوں نازل فرمایا؟ مثلاً سورہ نسماہ میں ارشاد ہے:-

لَهُ الْوَاحِدِيُّ؛ اسْبَابُ النَّزْوَلِ، ص ۳۸، مصطفیٰ الباجی، مصر ۱۳۷۶ھ
لَهُ الرَّزْكَشِيُّ؛ البرهان في علوم القرآن، ص ۲۲۷ ج ۱ عيسى الباجي ۱۳۷۶ھ

يَا يَهُوا إِلَّا نَيْنَ أَمْتُرُ الْأَقْصَى جُوَالُ الصَّلَاةِ وَأَمْتُرُ سَكَارِيٍّ،
”اُسے ایمان دا اتم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جا کر تم نشیریو“
اگر شان نزول کی روایات سامنے نہ ہوں تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے
کہ جب شراب ازوئے قرآن بالکل حرام ہے تو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ
نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، اس سوال کا جواب صرف شان نزول ہی سے
ہل سختا ہے، چنانچہ اس کے سبب نزول میں حضرت علیؑ سے مردی ہے کہ شراب کے
حرام ہونے سے پہلے ایک مرتبہ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے کچھ صحابہؓ کو کہانے پر
مدعو کیا، وہاں کہانے کے بعد شراب پی گئی، اسی حالت میں نماز کا وقت آ گیا، تو ایک
صحابی نے امامت کی، اور اس میں نشے کی وجہ سے قرآن آیات کی تلاوت میں غلطی کر گئی،
اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

۲۔ بسا واقعات سبب نزول کے بغیر آیت کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا، اور
اگر سبب نزول سامنے نہ ہو تو انسان آیت کا بالکل غلط مطلب سمجھ سکتا ہے، یہ بتا
چنہ مثالوں سے واضح ہو گی :-

سورہ البقہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَيَذِلُّهُ الْمُعْشِرُّ بِنَ الْمُخْرِبِ، فَإِنَّسَمَاعِيلَ لَوْلَأَقْثَمَ وَجْهَ اللَّهِ
”او مشرق و مغرب الشہی کی ہیں پس جو هر بھی تم رُخ کر لو ادھر
ہی اللہ کا رُخ ہے“

اگر اس آیت کا شان نزول پیش نظر ہو تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز
میں کسی خاص جگہ کی طرف رُخ کرنا نادری نہیں، مشرق و مغرب سب الشہی

لہ النساء : ۲۳ ،

تہذیب تفسیر ابن کثیر، ص ۵۰، ج ۱، مطبوعہ مصطفیٰ محمد شمس الدین

لہ البقہ : ۱۱۵ ،

ملکیت میں میں اور وہ ہر سمت میں موجود ہے، اس لئے جس طرف بھی رُخ کر لیا جائے نماز ہو جاتے گی، حالانکہ یہ مفہوم بدیکی طور پر غلط ہے، خود قرآن کریم ہی نے دوسرے مقام پر کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو صدری فتوار دیا ہے،

یہ عقده صرف شانِ نزول کو دیکھ کر ہی حل ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن عبَّاس[ؓ] فرماتے ہیں کہ جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تبدیل ہوا تو یہو دیوں نے اعتراض کیا کہ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر سمت اللہ کی بنائی ہوئی ہے، اور اللہ ہر طرف موجود ہے، لہذا وہ جس طرف بھی رُخ کرنے کا حکم دیدیے، اُدھر رُخ کرنا واجب ہے، اس میں قیامت کو دھنل دینے کی کوئی ضرورت نہیں،

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے:-

لَيْسَ عَلَى الظَّالِمِينَ أَمْنَوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِجَنَاحِ فِيشَةٍ

كَلِيعَةٌ وَإِذَا أَمَّا اتَّقَوْا فَأَمْنُوا،

جو لوگ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں ان پر اُس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھلتے پیتے ہوں جبکہ وہ لوگ اللہ سے ذرتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں یہ

اگر اس آیت کے صرف ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی بھی چیز کا کھانا پینا حرام نہیں، اگر دل میں ایمان اور خدا کا خوف ہوا وہ عمل نیک ہوں تو انسان جو چاہے کھاپی سکتا ہے، اور چونکہ یہ آیات تحريم شراب کے متصل بعد آئی ہیں، اس لئے کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس آیت نے ایمان دار اور نیک لوگوں کے لئے (معاذ اللہ) شراب کی بھی اجازت دیدی ہے، اور یہ صرف شبہ اور احتمال نہیں بلکہ بعض صحابہؓ تک کو اس آیت سے غلط فہمی ہو گئی تھی، اور انہوں نے حضرت عمر رض

کے سامنے اس آیت سے ہستد لال کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ شراب پینے والا اگر ماضی میں ہنکو کار رہا ہو اور اس کی عام زندگی نیکیوں میں گزری ہو تو اس پر خود مشرعی سزا نہیں ہو بعد میں حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے شانِ نزول ہی کے حوالہ سے اُن کی اس غلط فہمی کو رفع کیا،

درحقیقت آیت کا پس منظیر ہے کہ جب شراب اور قمار کی حرمت نازل ہوئی تو بعض صحابہؓ نے یہ سوال کیا کہ جو صحابہؓ میں حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے دفات پائی تو اپنی زندگی میں شراب نوشی اور قمار بازی کے مرتکب ہوتے اُن کا کیا انعام ہوگا؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جن مؤمنوں نے حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے شراب پی یا قمار کا مال کھایا اُن پر کوئی عذاب نہیں ہوگا، بشرطیکہ وہ مؤمن ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کے پابند رہتے ہوں، ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے، سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:-

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْدَأَ مِنْ شَعَاعِ رَبِّنَا فَمَنْ حَجَّ
الْبَيْتَ أَوْ أَعْمَمَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطْوِفَ بِهِمَا، إِنَّ
بِلَاشْبِيهِ صَفَا وَمَرْدَأَ اللَّهُكَ نَشَانِيُوْنَ مِنْ سَے ہیں، پس جو کوئی
بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ دہ
ان دونوں (صفا اور مردہ) میں چکر لکھتے۔

اس آیت کے یہ الفاظ کہ ”اس پر کچھ گناہ نہیں ہے“ اُن سے بظاہریہ معلوم ہوتا ہے کہ جو یا عمرہ کے دوران صفا اور مردہ کے درمیان سعی کرنا صرف جائز ہے، کوئی فرض یا وجہ نہیں، چنانچہ حضرت عودہ بن زیرؓ اسی غلط فہمی میں تھے، حضرت عائشہؓ نے انھیں بتایا کہ درحقیقت زمانہ جاہلیت سے ان پہاڑیوں

لِهِ الْفَرْطَىٰ : الجامع لاحکام القرآن، ص ۲۹ ج ۶، قاہروہ شمسہ ۱۴۳۷ھ
لِهِ ایضاً ص ۲۹ ج ۶، قاہروہ، البقرہ، ص ۱۵۸

پر دو دبٹ رکھے ہوتے تھے، ایک کا نام اساتھ تھا، دوسرا کے کا نام تھا، اس لئے صحابہؓ کرامؓ کو یہ شبہ ہوا کہ کہیں ان بیتوں کی وجہ سے سچی کرنا ناجائز نہ ہو گیا ہو، اُن کا یہ اشکال رفع کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔^۱

یہ چند مثالیں محنن مونز کے طور پر پیش کی گئی ہیں، درستہ ایسی اور سمجھی مثالیں دیجی گئی ہیں جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بہت سی آیتوں کا صحیح مفہوم سب پ علم نزول کے بغیر سمجھیں نہیں آ سکتا،

۳۔ قرآن کریم بسا ادفات ایسے الفاظ استعمال فرماتا ہے جن کا شان نزول سے گمراہ تعلق ہوتا ہے، اور اگر ان کا صحیح پس منظر معلوم نہ ہو تو وہ الفاظ (معاذ اللہ) بے فائدہ اور بعض ادفات بے جوڑ معلوم ہونے لگتے ہیں جس سے قرآن کریم کی فصاحت ملا پڑتی حرفاً آتی ہے،

مثلًا سورة طلاق میں ارشاد ہے:

وَاللَّا إِنِّي يَتَسَاءَلُ مِنَ الْمُجِيْضِ مِنْ نَسَاءٍ إِنَّكُمْ عَنِ الْقِبْلَةِ
قَعِدْتُمْ ثَلَاثَةَ أَشْهُرٍ قَالَ اللَّا إِنِّي لَمْ يَحْصُنْ،

"اور حماری دہ عورتیں جو حیض آنے سے نامید و بھی ہیں اگر تم کو ران کے بارے میں) شک ہو تو ان کی عذت تین جہینے ہے، اور جن لڑکیوں کو ابھی حیض نہیں آیا اُن کی بھی یہی

اس آیت میں یہ الفاظ کہ "اگر تم کو شک ہو" ان کا بظاہر کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ بعض اہل ظاہر نے ان الفاظ کی وجہ سے یہ کہہ ریا کہ اگر سن رکسیدہ عورت کو جس کا حیض بند ہو جکا ہو محل کے بالے میں کوئی شک نہ ہو تو اس پر کوئی عذر واجب نہیں ہے،^۲

لئے منہل العرفان، ص ۱۰۲، ج ۱، بحوالہ صحیح بخاری

سلہ الطلاق: ۳، ص ۲۰، ج ۱،

یکن سبب نزول این الفاظ کی وجہ بتاتا ہے، حضرت ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ جب سورہ نسا میں عورتوں کی عذت بیان کی گئی تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ؟ کچھ عورتیں ایسی ہیں جن کی عذت قرآن کریم میں بیان نہیں ہوئی، ایک تو چھوٹی بچیاں جیسیں جیسیں نہیں آئیں، دوسرا کہہ سن رسیدہ عورتیں جن کا جیسیں بند ہو گیا، اور تیسرے حاملہ عورتیں، اسپر آیت نازل ہوئی، اور اس میں تینوں قسموں کا حکم بیان کروایا گیا۔
یامشلاً سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:-

فَإِذَا أَقْضَيْتُمْ مَمْوَالَكُمْ فَإِذَا كُرْتُمْ
أَبْلَأْتُمْ كُمْ،

”پس جب تم افعالِ حج پورے کرچک تو اشد کو یاد کرو جیسے پہنچ آبا
کو یاد کرتے ہو۔“

اگر سبب نزول سامنے نہ ہو تو اس آیت کا یہ حصہ کہ ”جیسے اپنے آبا کو یاد کرتے ہو“ بے جوڑ معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ بات سمجھیں نہیں آئی کہ اس خاص مقام پر اشد کی یاد کو آبا واجداد کی یاد سے تشبیہ دینے کا کیا مطلب ہو؟ یکن سبب نزول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، بات یہ ہے کہ یہاں مزدلفہ کے وقوف کا ذکر ہو رہا ہے، اور مشرکین عرب کا یہ معمول تھا کہ وہ ارکانِ حج سے فارغ ہونے کے بعد یہاں اپنے اپنے آبا واجداد کے مقابر اور کارنامے بیان کیا کرتے تھے، باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اب یہاں باپ دادوں کی شیخیاں بھگانے کے بجائے اللہ کا ذکر کیا کرو۔

۳۔ قرآن کریم میں ایسے مقامات بھی تھوڑے نہیں ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے، اور جب تک واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا مطلب سمجھا جائی

نہیں جا سکتا، مثلاً ارشاد ہے:-

وَمَا أَهِبُّتْ إِذْ رَأَيْتَ وَلِكِنَّ اللَّهَ تَرْهِيْتْ
”اور جس وقت آپ نے (خاک کی نٹھی) پھیکی تو وہ آپ نے
نہیں پھیکی بلکہ اشنا نے پھیکی لے“

در اصل اس آیت میں عنز وہ بدر کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے نرغے کے وقت غاک کی ایک نٹھی اُن کی طرف پھینکی تھی اور اس کے بعد تر غمہ ٹوٹ گیا تھا، لیکن غور فرمائیے کہ اگر یہ سبب نزول ذہن میں ہو تو آیت کا مطلب کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

یہاں اسباب نزول کے تمام فوائد بیان کرنے مقصود نہیں ہیکن مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہو گئی کہ سوران کریم کی تفسیر میں اسباب نزول کی کیا اہمیت ہے، اسی وجہ سے ایسا ہمدری فرماتے ہیں:-

جب تک آیت کا سبب نزول اور متعلقہ واقعہ معلوم نہ ہو، اس وقت تک آیت کا مفہوم بیان کرنا ممکن نہیں۔

ہنزا جن لوگوں نے تفسیر سوران کے معاملے میں اسباب نزول کی اہمیت سے انکار کیا ہے وہ یا تو ناواقف ہیں یا اسباب نزول سے آزاد ہو کر سوران کے مضامین کو اپنا من مانا مفہوم پہنانے کے لئے ایسا کرتے ہیں،
اَسْبَابُ تَزْوُلٍ اُوْرَشَاهٍ وَلِيَ اللَّهِ؟

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”الغوز المکبیر“ میں اسباب نزول پر جو محققانہ بحث کی ہے بعض لوگ اُسے پوری طرح سمجھنہیں سکے، اس لئے انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے، کہ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ نے تفسیر میں اسباب نزول کو اہمیت نہیں دی، یا اس کی اہمیت کو کم کر دیا ہی لیکن

لئے انقال: ۱) لئے اسباب نزول للواحدی ص ۱۳۳، ۲) لئے ایضاً، ص ۷۲

درحقیقت یہ خیال حضرت شاہ صاحب کا مطلب نہ سمجھنے کا تجوہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جمہور امت کی طرح وہ بھی اس باب پر زرل کے علم کو تفسیر کرنے لازمی شرط ترار رہتے ہیں، لیکن انھوں نے جوبات تکمیل ہے وہ یہ ہے:-

وَيَذْكُرُ الْمُعْذُولُونَ فِي ذِيلِ آيَاتِ الْقُرْآنِ كَثِيرًا مِنَ الْأَمْشِيَاءِ
لِيَسْتَ مِنْ قَسْمِ بَبِ التَّزْرِيلِ فِي الْحَقِيقَةِ مُثْلِ استِهْنَادِ الصَّفَنَةِ
فِي مَنَاظِرِ أَهْمَامِ بَايَةِ اُولَى لَوْتَهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ لِلْاسْتِهْنَامِ
فِي كَلَامِهِ الشَّرِيفِ اور رَايَةِ حَدِيثٍ دَافِقِ الْأَيَّةِ فِي أَصْلِ الْغَرضِ
أو تَعْدِينِ مَوْضِعِ التَّزْرِيلِ أَو تَعْدِينِ اسْمَاءِ الْمَذْكُورِينَ بِطَرِيقِ
الْإِيهَامِ اور بَطْرِيقِ التَّلْفُظِ بِكَلْمَةِ قَرْآنِيَّةِ اَو فَضْلِ سُورَةِ رَأْيَاتِ
مِنَ الْقُرْآنِ اَو صُورَةِ اِمْتَشَالِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مَرْءَةَ
أَوْلَى الْقُرْآنِ وَنَحْوَذَلَكَ، وَلَيْسَ شَيْءٌ مِنْ هُنَّا فِي الْحَقِيقَةِ مِنْ
اسْبَابِ التَّزْرِيلِ لَهُ

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت کے تحت بعض اوقات دسیوں روایات تکمیل ہوتی ہیں، یہ تمام روایات اس باب پر زرل سے متعلق ہیں ہوئیں بلکہ اس میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہو جاتی ہیں:-

- ۱۔ بعض مرتبہ کسی علی مباحثہ میں کسی صحابی نے وہ آیت بطور دلیل پیش کر دی تھی سن
- یہ واقعہ اس آیت کے تحت ادنیٰ مناسبت سے ذکر کر دیتے ہیں،
- ۲۔ بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر اس آیت سے استہشانہ فرمایا مفسرین اُسے بھی آیت کے تحت نقل کر دیتے ہیں،
- ۳۔ جوبات کسی آیت میں بیان کی گئی ہے بعض مرتبہ وہی بات کسی حدیث میں بھی آپ نے ارشاد فرمائی، تفسیر کی کتابوں میں وہ حدیث بھی اس آیت کے

تحت روایت کر دی جائی ہے،

- ۳۔ بعض مرتبہ مفسرین کوئی روایت مخفی یہ بتانے کے لئے نقل کرتے ہیں کہ آیت کس مقام پر اذل ہوتی، یہ روایت بھی تفسیر کے ذیل میں درج ہو جاتی ہے،
- ۴۔ بعض رفع قدر آن کریم کچھ لوگوں کا ذکر مبہم طور پر فرماتا ہے، اور آن کا نااذکر نہیں کرتا، مفسرین روایتوں کے ذریعہ ان لوگوں کے نام مستعمل کر دیتے ہیں،
- ۵۔ بعض مرتبہ کسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے فلاں لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ تفسیر کی کتابوں میں ایسی روایات بھی درج ہوتی ہیں،
- ۶۔ بعض احادیث اور آیات میں قدر آن کریم کی مختلف سورتوں یا آیتوں کے فضائل بیان ہوئے ہیں، مفسرین ان روایات کو بھی متعلّم مقامات پر نقل کر دیتے ہیں،

- ۷۔ بعض مقامات پر ایسی احادیث بھی تفسیر کے ذیل میں منقول ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدر آن کے اس حکم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح عمل فرمایا؟

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی روایات نہ سب نزول کی تعریف میں داخل ہیں اور نہ مفسر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی تمام روایات سے پوری طرح واقع ہو،

البتہ جو روایات واقعۃ آیت کا سبب نزول ہیں ان کا جانتا مفسر کے لئے ہنایت ضروری ہے، اور اس کے بغیر علم تفسیر میں دخل دینا جائز نہیں، چنانچہ خود حضرت شاہ صاحبؒ آگے لکھتے ہیں:-

وَإِنْمَا شَرطَ الْمُفْتَرِ أَمْرًا، الْأَقْلَى مَا تَعْرِضُ بِهِ الْآيَاتُ مِنْ
الْقُصُصِ فَلَا يَتِيمُسْ فَهُمُ الْأَيَمَاءُ بِتِلْكَ الْآيَاتِ الْأَبْعَرُ فَة
تِلْكَ الْقُصُصُ، وَالثَّالِثُ مَا يَخْصِصُ الْعَالَمُ مِنَ الْفَقْتَةِ أَوْ مُشَلَّ
ذِلْكُ مَنْ وَجَدَ كَصْرَ الْكَلَامِ عَنِ الظَّاهِرِ فَلَا يَتِيمُسْ فَهُمْ

المقصود من الآيات بــونها

ابتدی مفسر کے لئے دو باتوں کا جاتا لازمی شرط کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک تو وہ واقعات جن کی طرف آیات میں اشارہ یا یا جاتا ہے، اور جبکہ وہ قصہ معلوم نہ ہوں آیات کے اشاروں کو سمجھنا آسان نہیں، دوسرا یہ کہ قصہ وغیرہ میں بعض اوقات الفاظ عام ہوتے ہیں، لیکن شانِ نزول سے اس میں تخصیص پیدا ہوتی ہے، یا کلام کا ظاہری مفہوم کچھ ہوتا ہے اور سببِ نزول کوئی دوسرا مفہوم متعین کرتا ہے، اس جیسی روایات کا علم حاصل کئے بغیر آیاتِ فترائی کو سمجھنا مشکل ہے۔

سبب نزول اور احکام کا عجم و خصوصیات:

کسی سبب نزول کے تحت قرآن کریم کی جو کیات نازل ہوتیں، وہ اپنے عموم و خصوص کے لحاظ سے چار قسم کی ہیں:-

۱- وہ آئیں جن میں کسی خاص شخص کا نام لے کر یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ آئیت کا مضمون اسی کے حق میں ہے، ایسی آیتوں کے بارے میں علماء کااتفاق ہے کہ ان کا مضمون صرف اُسی متعین شخص کے بارے میں قرار دیا جاتے گا، اور وہ دوسرے کو شامل نہیں ہو گا، مثلاً

مِنْتَهَىٰ آيَاتِ الْهَبِ (لَهُبٌ: ۱۱)

اُب لہبے دونوں ہاتھ ہلاک ہوں۔

اس آیت کا شان نزول معروف ہے، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
کوہ صفپر نکھلے ہو کر تمام قریش کے لوگوں کو اسلام کی تبلیغ فرمائی تو اس پر
ابوالہب بن کعب تھا:-

شَائِلَكَ، أَلْهَدَنَا دَعَوْتَنَا!

”تمہارے لئے بلاکتِ مذکور کام نے بہل سی لے بُلایا تھا؟

^{٢٣} الفوز الكبير في أصول المفهيم، ص

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اُدراس میں خاص ایوبت کا نام لے کر اس کے لئے دعید بیان فرماتی گئی ہے، اس لئے یہ دعید خاص اُسی کے لئے ہے،
 ۲۔ آیتوں کی دوسری قسم وہ ہے جن میں کسی خاص شخص یا گروہ یا چیز کا نام لئے بغیر اس کے کچھ اوصاف بیان کئے گئے ہیں اور ان اوصاف پر کوئی حکم لگایا گیا ہے، لیکن دو سکر دلائل سے یہ ثابت ہو کہ اس سے مراد فلاں معین شخص یا فلاں معین گروہ یا فلاں معین ہیز ہے، اس صورت کے بارے میں بھی تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ آیت کا ضمون یا حکم صرف اسی شخص یا گروہ یا چیز کی حرمت مخصوص رہے گا، جو قرآن کریم کی مراد ہے اور کوئی دوسرے اس میں داخل نہیں ہو گا، خواہ وہ اوصاف اس میں بھی پائے جاتے ہوں، مثلًا سورۃ اللیل میں ارشاد ہے:-

وَسَيَجْبِلُهُمَا الْأَنْقَاضُ مَالَنَّى مَتَالَةً يَدْرَكُ (اللیل: ۱۸)

اور اُس راگ سے دستی ترین شخص پجا یا جاتے گا جو اپنا مال

پاکیزگی حاصل کرنے کی غرض سے (محققین کو) دیتا ہے۔

یہ آیت بالفاظ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مفاسد غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کیا کرتے تھے، یہاں اگرچہ حضرت ابو بکر رضی کا نام مذکور نہیں، لیکن اوصاف اہنی کے بیان کئے گئے ہیں، اور روایات حدیث سے ثابت ہے کہ ان سے مراد حضرت ابو بکر رضی ہیں، لہذا اس آیت کی فضیلت بلاشبکت غیرے اہنی کو حاصل ہے، اسی لئے امام رازیؒ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام انسانوں سے افضل ہیں کیونکہ اس آیت میں انھیں انشقاق (متقد ترین شخص) کہا گیا ہے، اور دوسری آیت میں ارشاد ہے:-

إِنَّ أَكْرَمَ مَكْرُومٍ عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقْتَلُكُمْ (الحجات: ۱۳)

بلاشبہ تم میں سب سے زیادہ قابل اکرام شخص ہو جو تم میں سب سے زیادہ تقی ہو۔

۱۰۱۔ باب النزول للواحدی، ص ۲۹۱۔ ۲۵۵ ص ۲۹۱۔ ۳۲۳ ص ۲۹۱۔

بہ حال باوجود یک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہاں نام نہیں لیا گیا، لیکن جہوں مفسرین نے آیت کو اپنی کے حق میں خاص قرار دیا ہے، کیونکہ تخصیص کی دو دلیلیں موجود ہیں (ایک یہ کہ "الاتقى" کا لفظ (الف لام عمدہ کے ساتھ) صرف ایک ہی شخص کے لئے استعمال ہو سکتا ہے، دوسرے دو ایات حديث نے ان کی تعریف کر دی ہے، لہذا اگر کوئی اور شخص بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں حشر پ کرنے لگے تو وہ اس کے لئے کتنا ہی باعث اجر کیوں نہ ہو لیکن آیت بالا کا مصدقہ ہونے کی فضیلت اسے حاصل نہیں ہو سکتی یہ

۳۔ تیسرا قسم میں وہ آیتیں آتی ہیں جو نازل تو کسی خاص واقعہ میں ہوئی تھیں لیکن الفاظ عام ہیں، آیت کے صریح الفاظ یا اور کسی خارجی دلیل سے بھی یہ معلوم ہو گیا ہے، کہ آیت کا حکم اس واقعہ کے ساتھ مخصوص ہیں، بلکہ اس نوعیت کے ہر واقعہ کا یہی حکم ہے، اس قسم کے بائیے میں بھی تمام اہل علم متفق ہیں کہ اس صورت میں آیت کا حکم اس کے الفاظ کے تابع ہو کر عام رہ گا، صرف بسبب نزول کے واقعہ کے ساتھ خاص نہیں ہو گا، مثلاً سورہ مجادل کی ابتدائی آیات کے بائیے میں ثابت ہے کہ وہ حضرت خوازم کے بائیے میں نازل ہوئی تھیں، جن کے شوہرنے اُن سے یہ کہدیا تھا کہ آئتِ علیٰ کَتَّلَهُرَا اُمْتٰ (تم مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہو) لیکن آیت میں جن الفاظ کے ذریعہ حکم بیان کیا گیا وہ اس بات کی صراحت کر رہے ہیں کہ یہ حکم صرف خوازم کے شوہرنے کے لئے نہیں، بلکہ تمام ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنی بیوی سے خلہار کر لیں، (یعنی مذکورہ بالا الفاظ کہدیں) (ایسے تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے سے قبل ایک غلام آزاد کریں، یا شاٹھ روزے کھیں یا شاٹھ میکنزوں کو کھانا کھلائیں)

۴۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ آیت کسی خاص واقعہ کے تحت نازل ہوئی، لیکن الفاظ

لہ لہ اس قسم کی مزید تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو الاتفغان ص ۳۰ ج ۱
لہ اسباب انزول لواحدی، ص ۲۳۱

مام ستمعال کئے گئے، اور آیت یا کسی خارجی دلیل سے یہ صراحت معلوم نہیں ہوتی کہ آیت کا حکم یا مضمون صرف اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے، یا اس نوعیت کے ہر واقعہ کے لئے آم ہے، اس صورت میں اب علم کا تھوڑا اسا اختلاف رہا ہے، بعض حضرات کا کہنا یہ تھا کہ اس صورت میں آیت کو صرف سبب نزول کے واقعہ کے ساتھ مخصوص رکھا جائے، یعنی چہرہ علماء و فقہاء کی راستے اس کے بخلاف یہی، ہر کہ مذکورہ شکل میں سببِ تزویل کے خاص واقعہ کے بجائے الفاظ کے عموم کا اختیار ہو گا، اور آیت کے الفاظ جس جس صورت کو شامل ہوں ان کا حکم بھی ان سب پر تناد کیا جائے گا۔ اس قاعدہ کے لئے علماء اصول فقہ و تفسیر میں یہ جملہ مشہور ہے کہ:-

الْعِبْرَةُ لِعُوْدِ الْفَيْظَ لِلْخُصُوصِ لِسَيِّدِ

”اعتبار الفاظ کے عموم کا ہو گا نہ کہ سبب تزویل کے خالی داقعہ کا“

لیکن در حقیقت یہ اختلاف نظر یا قیمت نویعت کا ہے، عملًا اس سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا، کیونکہ جو حضرات آیات قرآنی کو ان کے سبب نزول کے ساتھ مخصوص فسرا ر دیتے ہیں وہ بھی عملًا آیت کا حکم اُس نویعت کے دوسرے واقعات میں جاری کر دیتے ہیں، لیکن فرق صرف استثنائے کہ جمہور علماء کے نزدیک تو اس حکم کا مأخذ وہی آیت ہوتی ہے، اور یہ حضرات اس کا مأخذ کسی دوسری دلیل شرعی مثلًا حدیثِ اجماع یا قیاس وغیرہ کو قرار دیتے ہیں،

دھناعت کے لئے ایک مثال یہ غور فرمائیے، سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:-

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِيرٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ

"اوگر (قرض دار) تنگ است ہو تو اسے کشادگی تک مہلت دیزد"

اس آیت کاشان نزول یہ ہے کہ بنو تمود بن عیر کا کچھ قرض بنو تمیزہ پر واجب تھا، جب سُود کی حرمت نازل ہوئی تو بنو تمود نے اپنے مقرضن قبیلے سے کہا کہ ہم سُود توجہ بڑتے ہیں لیکن اصل قرضہ واپس کرو، بنو تمیزہ نے کہا کہ اس وقت ہمارا ہاتھ تنگ ہے، اس لئے ہم کچھ چہلت دیدو، بنو تمود نے چہلت دینے سے انکار کیا تو اس پر یہ

آیت نازل ہوئی۔

اب آیت کا یہ حکم تو سب کے نزدیک عام ہے، ہر قرض خواہ کے لئے بہتر ہی ہے کہ وہ مقرض کو تنگ دست دیکھے تو اسے جملت دیدے، لیکن فرق اتنا ہے کہ جمیور کے نزدیک یہ عام حکم اسی آیت سے ثابت ہوا ہے، اور جو لوگ آیت کو سبب نزول کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں، کہ آیت کا حکم تو صرف بنو اسرائیل کے لئے تھا، لیکن دوسرے مسلمانوں کے لئے یہ حکم اُن احادیث سے ثابت ہوا ہے جس میں مفترض کو جملت دینے کی فضیلیتیں بیان کی گئی ہیں،

اس سے واضح ہے کہ اس اختلاف کا عملی طور پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا

سبب نزول اور اختلاف روایات:

اسباب نزول کے سلسلے میں تفسیر کے دروان ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ایک ہی آیت کے سبب نزول میں کتنی کمی مختلف روایتیں ملتی ہیں، اور جو شخص تفسیر کے اصول سے واقعہ نہ ہو دا بھن اور طرح طرح کے شبہات میں بدلنا ہو جاتا ہے، اس تو پہاں اس اختلاف روایت کی حقیقت سمجھ لینی ضروری ہے،

اصول تفسیر اور اصول فقہ کے علماء نے اس سلسلے میں بڑے کار آمد و قاعد بیان فرماتے ہیں، یہاں اُن کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:-

۱۔ صحابہ اور تابعین کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر میں یہ الفاظ استعمال فرماتے ہیں کہ نزلت الایة فی کذن ا (یہ آیت فلاں مسئلہ یا معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی) ان الفاظ سے بظاہر یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ آیت کا سبب نزول بین فرمائی ہیں، حالانکہ ان الفاظ سے اُن کا مقصد یہ ہے سبب نزول بیان کرنا نہیں ہوتا

لہ اسباب التزویل للواحدی، حصہ اہ
لہ یہاں اس مسئلہ کا ہمایت مختصر خلاصہ پیش کیا گیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، البراء
اللزکشی ص ۲۳۷، والاتفاق ص ۳۰۷ اور منہل العرفان ص ۱۸۸، اatas، ج ۱، ج ۲

بَلْ بِسَادَقَاتِ أَنْ كَمَا مُقْصِدِيْهِ هُوتَابِيْهِ كَفَلَانِ مُسْتَلِيْهِ يَا مُعَالَمَةِ آيَتِ كَهْكُمَ كَهْجَتْ دَاخِلَهِ بِهِ، مُشَاهِدَةِ نَسَارِيْهِ اِلَهِ تَعَالَى نَفَلَ نَقْلَ فَرِيَايَا هِيْهِ :-

وَلَا مُرْكُمْ قَلِيلُغَيْرِنَ خَلَقَ اِلَهُ،

”او بین ان رانسانوں کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلین

کو بدلوں ڈالیں گے“ (الناس: ۱۱۸)

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عکرمؓ خود غیرہ سے مردی ہر کی یہ آیت اختصار (خصیتین نکلوا دینے) کے بارے میں نازل ہوتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمدرسالت میں کسی نے خصیتین نکلوا دیتے تھے، اور یہ واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اختصار کا عمل بھی اپنی شیطانی افعال میں داخل ہے جنہیں شیطان نے اللہ کی تخلین بدل ڈالنے سے تعبیر کیا ہے، ورنہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آئندہ کی تخلین کو بدلوں دینا“ اختصار میں مختصر ہے بلکہ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، جن کی تفصیل کتب تفسیر میں موجود ہیں، صحابہؓ و تابعینؓ کا یہ اسلوب بیان معلوم ہونے سے شاہزادوں کے باب میں در قاعدہ واضح ہوتے ہیں:-

(الف) ایک قادر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو مختلف روایتیں ہوں، دونوں میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہوں کہ نزلت الایت فی کذنا ری آیت فلاں معاملے میں نازل ہوتی ہے، لیکن دونوں نے الگ الگ معاملات ذکر کئے ہوں تو درحقیقت دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے کسی کام مقصود بھی یہ نہیں ہوتا کہ یہ معاملہ آیت کا سبب نزول ہے، بلکہ منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ آیت کے مفہوم اور حکم میں داخل ہے۔

لہ ابن تیمیۃ: مقدمۃ فی اصول التفسیر، ص ۹، المکتبۃ العلییۃ لاہور ششماہی دلائل تلقان
تم اسٹیروٹی: الدار المنشورة، ص ۲۲۳ ج ۲

یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی، باری تعالیٰ نے اپنے نیک بند دل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

سَجَّافٌ جُحْمُونَ بِهِمْ عَنِ الْمَعْصَاجِ

”اُن کے پہلو بستروں سے جُملارہتے ہیں“

اس کی تفسیر میں حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اُن صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی جو مغرب اور عشاء کے درمیان نفلیں پڑھتے رہتے تھے، ایک اور روایت میں انہی سے مردی ہے کہ یہ آیت اُن حضرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو نماز عشا کے انتظار میں جلگتے رہتے تھے، اور بعض دوسرے صحابہؓ میں سے چونکہ گزر اور حضرات کے بارے میں قرار دیتے ہیں، اب بتا ہر یہ اختلاف شانِ نزوں کا اختلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ آیت کے مختلف مصادر ہیں، اور یہ تمام نیک اعمال آیت کے مفہوم میں داخل ہیں،

(ب) دوسرا قاعدہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں دو روایتیں ہوں ایک میں نقلت الایہ فی کن اکے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں اور دوسرا میں صراحةً کسی داقعہ کو آیت کا سبب نزوں فترار دیا گیا ہو، تو اس دوسری روایت پر اعتماد کیا جائے گا، اور یہی روایت چونکہ شانِ نزوں کے مفہوم میں صریح نہیں ہو اس نے اسے رادی کے اپنے اجتہاد و استنباط پر محول کیا جائے گا، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

رَسَّأْ وَ كَمْ حَرَثْ لَكُمْ فَأُتُوا حَرَثَكُمْ آتُ شِلَّتَمْ

تمہاری سورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس اپنی کھیتی میں آوجیاں

چاہو“ (البقرہ : ۲۲۳)

له المَسْجِدَةِ ، ۱۶ :

شہ ابن جریرؓ: تفسیر جامع البيان، ص ۵۵۸ ج ۲۱، میمنیہ، مصر،

اس آیت کے بارے میں امام بخاری^{رض} نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے فی ایمان النساء فی ادب ارہن^{لہ} ریہ آیت عورتوں کے ساتھ یقینت میں صحبت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے) لیکن حضرت جابر^{رض} اور حضرت عبد الله بن عباس^{رض} دغیرہ اس کا سبب نزول صراحت یہ بتاتے ہیں کہ یہودیوں کا خیال یہ تھا کہ اگر مباشرت پیچی کی جانب سے اگلے ہی حصہ میں کی جائے تو اولاد بھینگ پیدا ہوتی ہے، اس کی روایت کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے یہ واضح کر دیا کہ مباشرت کی جگہ تو ایک ہی ہی، (یعنی املاک احترم، جس سے اولاد پیدا ہو سکے، لیکن اس کے لئے راستہ کوئی بھی اختیار کیا جا سکتا ہے)۔

ان دونوں روایتوں میں حضرت جابر^{رض} اور حضرت ابن عباس^{رض} کی روایت چونکہ مفصل اور صریح ہے اس لئے اس کو ترجیح ہوگی، اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا استنباط قرار دیا جاتے گا۔ اور درحقیقت اُن کا مطلب یہ ہمیں ہے کہ یقینت میں صحبت کرنا اس آیت کی رو سے جائز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے عورتوں کے ساتھ لواطت کرنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے، (کیونکہ اس میں عورت کو کھیتی یعنی پیدائش اولاد کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور وہ لواطت میں ممکن نہیں)۔

۲۔ سبب نزول متعین کرنے کے لئے دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر ایک روایت صحیح سند کے ساتھ آئی ہو اور دسری ضعیف یا بخود رع سند کے ساتھ تو صحیح روایت کو اختیار کر لیا جاتے گا اور ضعیف کو ترک کر دیا جاتے گا، مثلاً سورہ ضحیٰ کی ابتدائی آیات ہیں:-

وَالضُّحْيَ، وَاللَّيْلِ إِذَا أَسْبَغَيْ، مَا وَدَّعَكَ
رَبِيعَ وَمَاقَلَى،

لہ الاتقان، ص ۱۴۳۲ ، ۲۰ و ۲۱ ،
کلم اسباب النزول للواحدی ص ۲۰ و ۲۱ ،

لہ الاتقان، ص ۱۰۸ ج ۱ ،
کلم منہل العرفان، ص ۱۰۸ ج ۱ ،

قسم و قسم چاشت کی اور رات کی جب وہ چھا جائے کہ آپ کے پر دردگار نہ آپ کو جھوڑا ہے اور رخفا ہوا ہے ॥

اس آیت کے شان نزول میں بخاریؓ مسلمؓ نے حضرت جند بن کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی تکلیف کی وجہ سے ایک یاد درتا تھی (تجھڈ کی) نماز نبڑھ سکے، اس پر ایک کافر عورت نے یہ طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے (معاذ اللہ) شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، دوسری طرف طبرانیؓ اور ابن ابی شیبہؓ نے حفص بن میسرہ کی نانی خولد پڑے رجو حضیرہ کی خادمہ تحسین) یہ روایت نقش کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک کٹھ کا پلا حضورؐ کے گھر میں اُکر جا رپانی کے نیچے بیٹھ گیا، اور وہیں اُسے موت آگئی، اس واقعہ کے بعد چاروں تک آپ پر دھنی نازل نہ ہوئی، آپ نے مجھ سے پوچھا کہ رسول اللہؐ کے گھر میں ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو حیرتیں ؟ میرے پاس نہیں آ رہے، میں نے دل میں کہا کہ مجھے گھر میں جھاڑ پوچھ کرنی چاہئے، چنانچہ میں نے جھاڑ جا رپانی کے نیچے مار کر صفائی کی تو پلانکل آیا، اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں،

یعنی دوسری روایت سنداً صحیح نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر عن فرمایا کہ اس کی سنداً میں بعض راوی مجبول ہیں، لہذا قابل اعتماد شان نزدل دہی ہے جو صحیح بخاریؓ میں ہو رہی ہے،

۳۔ بعض مرتبہ شان نزول کی دونوں روایتیں سندر کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں، لیکن کسی ایک روایت کے حق میں کوئی وجہ ترجیح پائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ ایک کی سندر دوسری کے مقابلہ میں زیادہ ضبط ہے، یا ایک کاراوی ایسا ہے جو واقعہ کے وقت موجود تھا اور دوسری روایت کاراوی واقعہ کے وقت موجود نہیں تھا، ایسی صورت میں اُس روایت کو اختیار کیا جاتے گا جس کے حق میں وجہ ترجیح موجود ہے۔

لہ الاتقان، ص ۳۲۷، ۱، اس کی مزید مثالیں بھی اسی مقام پر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں:

اس کی مثال سورہ اسراء کی یہ آیت ہے :-
 يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمُرْدُجِ قُلِ الْمُرْدُجُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ وَمَا
 أُوْتِيْدُ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قِيلَ لَاهُ
 یہ آپ سے رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ سمجھے کہ رُوح
 میرے پروردگار کے امر سے ہے، اور تمھیں نہیں دیا گیا عالم کا حصہ
 ”مگر تھوڑا“

اس آیت کے شان نزول میں ایک روایت تو امام بخاریؓ نے حضرت عبداللہ بن
 مسعودؓ سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
 ساتھ چار ہاتھا در آپؐ کبھر کی ایک شاخ کا سہارا لے کر چل رہے تھے، اتنے میں آپؐ کا
 گذر کچھ یہودیوں کے پاس سے ہوا تو انہوں نے آپؐ میں کہا کہ ان (حنوزہ) سے کچھ
 سوالات کرنے چاہتیں، چنانچہ انہوں نے آکر آپؐ سے کہا کہ: تمہیں رُوح کے بارے
 میں بتائیے، اس پر آپؐ رک گئے اور تھوڑی دیر بعد آپؐ نے سرِ اقدس اٹھایا، میں سمجھ گیا،
 کہ آپؐ پر درجی نازل ہو رہی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا قُلِ الْمُرْدُجُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ إِنْ
 دُوْسْرِي روایت امام ترمذیؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ ایک رجہ
 قبلیش مکتبے نے یہودیوں سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جو ہم ان صاحب (حنوزہ)
 صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھ سکیں، اس پر یہودیوں نے کہا کہ ان سے رُوح کے بارے
 میں سوال کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،
 پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، اور
 دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا، سندر کے اعتبار سے
 بھی دونوں روایتیں صحیح ہیں، لیکن پہلی روایت کے حق میں یہ وجہ ترجیح موجود
 ہے کہ اس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس واقعہ کے وقت خود موجود تھے
 اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ خود اس واقعہ کے وقت
 حاضر ہوں، اس لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت قابل ترجیح ہے،

۳، بعض مرتبہ ایک آیت کے اس باب نزول ایک سے زائد ہوتے ہیں، یعنی ایک جیسے کئی واقعات یک بعد دیگرے پیش آتے ہیں، اور ان سب کے بعد آیت نازل ہوتی ہے، اب کوئی رادی اس آیت کے شان نزول میں ایک واقعہ ذکر کرتا ہے، اور دوسرا کوئی اور واقعہ ذکر کر دیتا ہے، بظاہر ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت تعارض نہیں ہوتا، کیونکہ دونوں ہی واقعات بسپ نزول ہوتے ہیں، مثلاً سورہ نور کی آیات لعان کے بارے میں امام بخاریؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حلال بن امميةؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی پر زنا کی تهمت لگائی تھی، اس پر یہ آیات نازل ہوتیں، ﴿اللَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُنَّمُ الْخَرِفَةُ﴾، دوسری طرف امام بخاریؓ ہی نے ایک اور روایت حضرت ہشیل بن سعدؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرایا تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی اجنبی کے ساتھ ملوث دیکھے اور اس شخص کو قتل کر دے تو کیا اس سے قصاص دیا جائے گا؟ ایسے شخص کو کیا کرنا چاہیکا؟ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں قرآنی آیات نازل ہوئی ہیں اور پھر یہی آیات آپ نے سنائیں، تیسرا طرف ہشیل بن عزیزؓ میں حضرت عزیفہؓ سے مردی کہ کاسی قسم کا سوال و جواب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دو میان ہوا تھا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں ہیں،

و اقہد درحقیقت یہ ہر کہ یہ تینوں واقعات ان آیات کے نزول سے قبل پیش آپنے تھے، اس لئے ان میں سے ہر ایک کو سب سپ نزول قرار دینا درست ہے، ۵۔ بعض اوقات اس کے برعکس ایسا ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ہوتا ہے، مگر اس کے بعد سے کئی آیتیں نازل ہو جاتی ہیں، اب ایک رادی اس واقعہ کو نقتل کر کے کہتا ہے کہ اس پر فلاں آیت نازل ہوئی، اور دوسرا ایسی واقعہ کو نقتل کر کے

کسی دوسری آیت کا حوالہ دیتا ہے، اس سے ظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں کوئی تضاد نہیں ہوتا،

اس کی مثال یہ ہے کہ امام ترمذی[ؒ] اور حاکم[ؒ] نے حضرت اُمّہ سلمہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ حضور مسیح عرض کیا کہ یا رسول اللہ^ﷺ فترآن کریم میں بھرت وغیرہ کے باب میں مجھے عورتوں کا ذکر نہیں ملتا، اُس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ذَاسْتَجَابَ لِهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضْيِعَ عَمَلَ عَامِلٍ

إِنَّكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى، (آل عمران: ۱۹۵)

”پس ان کے رب نے ان کی دُعاویں کو قبول کر لیا، اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت“

اور امام حاکم[ؒ] نے حضرت اُمّہ سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضور^ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ^ﷺ فترآن کریم میں تردید ہی کا ذکر ہے، عورتوں کا کہیں تذکرہ نہیں، اس پر ایک آیت تو اے النَّسِيلُونَ وَالْمُشْلِمُونَ الْمُنَازِلُ ہوئی، اور دوسری ایشی ”لَا أُضْيِعَ عَمَلَ عَامِلٍ إِنَّكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى يَكُونُوا“ تکرار تزدیل اور اس کی حقیقت؟

۶۔ چھٹی صورت تکرار تزدیل کی ہے، یعنی بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی آیت ایک سے زائد مرتبہ نازل ہوئی، اور ہر مرتبہ اس کا نزول کسی نئے واقعہ کے پس منتظر میں ہوا، اب کسی راوی نے ایک تزدیل کا واقعہ ذکر کر دیا، اور کسی نئے دوسرے تزدیل کا، اس سے ظاہر ہی طور پر تضاد معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں تضاد اس لئے نہیں ہوتا کہ آیت دونوں واقعات میں دونوں مرتبہ نازل ہوئی،

سلہ یہ سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ ہے، اور اس میں بہت سے اعمال صالح کا ذکر کرتے ہوئے تردید اور عورتوں کا آگلہ الگ نام لیا گیا ہے، لہ العقان، ص ۳۵ ج ۱،

مثلاً امام بخاریؓ اور امام مسلمؓ نے نقل کیا ہے کہ جب ابوطالبؐ کی وفات کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آن سے فرمایا کہ ججا جان! آپ لا الا الا اللہ کہہ دیجئے اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے آپ کی سفارش کر دوں گا، اس وقت ابو جہل اور عبد اللہ ابن امیة بھی موجود تھے، انہوں نے ابوطالبؐ کو ایمان کی طرف مائل ہوتے دیکھا تو فوراً بولے: "کیا تم عبد المطلبؐ کے دین سے برگشتہ ہونا چاہتے ہو؟" اس کے بعد وہ دونوں بولتے ہی رہے، یہاں تک کہ ابوطالبؐ یہ کہہ اٹھئے کہ: "میں عبد المطلبؐ ہی کے دین پر ہوں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "میں آپ کے لئے الشدید مغفرت طلب کرتا رہوں گا، جب تک کہ مجھے اس سے روک نہ دیا جائے" اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ
"نبی کو اور مسلمانوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے

مغفرت طلب کریں"

درسری طرف امام ترمذیؓ نے حضرت علیؓ سے بسندخن نقل کیا ہے کہ میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک والدین کے لئے استغفار کرتے مٹا، میں نے اس سے کہا کہ تھا کہ والدین تو مشرک تھے، ان کے لئے استغفار کیسے کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے والد کے لئے استغفار کیا تھا حالانکہ ان کے والد بھی مشرک تھے، یہ بات میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو اُس پر یہ آیت نازل ہوئی،

یمنسری طرف امام حاکم وجعفر نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن قبرستان تشریف لے گئے، اور ایک قبر کے پاس بیٹھ کر در تک مناجات کرتے اور روتے رہے، پھر فرمایا کہ جس قبر کے پاس میں بیٹھا تھا خداوہ میری والدہ کی قبر تھی، میں نے اپنے پروردگار سے ان کے لئے دعا کرنیکی اجازت چاہی تو مجھے اجازت نہیں ملی، اور یہ آیت نازل ہوئی، مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا، الْخ ،

یہاں تینوں واقعات میں ایک ہی آیت کا نزول بیان کیا گیا ہے، چنانچہ

تفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت تینوں مرتبہ الگ الگ نازل ہوتی ہے۔

اب یہاں یہ سوال ہر سکتا ہے کہ جب ایک آیت ایک مرتبہ نازل ہو جگی، اُسے لہکر محفوظ کر دیا گیا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ رضوی کو یاد ہو گئی تو پھر دوبارہ ادرس بارہ اسے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا بہترین جواب حضرات شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے، اور وہ یہ کہ "مکر انزدال" کی مذکورہ بالا صورت میں آیت کا اصل نزول تو ایک ہی مرتبہ ہوتا ہے، لیکن وہ آیت جس دفعہ میں نازل ہوئی تھی، جب اُسی جیسا کوئی اور دفعہ پیش آتا ہے تو وہی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں دوبارہ ڈال دی جاتی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس دفعہ میں بھی اسی آیت سے رہنمائی ملے گی، یہ آیت کا قلب مبارک میں مستحضر ہو جانا چونکہ منجانب اللہ ہوتا ہے، اس لئے یہ وہی "نقث فی الردوع" ہے جو دحی کی ایک قسم ہے، اور جس کا مفہوم بیان دحی کے طریقوں میں پچھے گزر چکا ہے، اسی کو مفسرین "نزدال مکر" سے تعبیر فرمادیا ہے، یعنی یہی جتنی مرتبہ وہ آیت قلب میں منجانب اللہ دارد ہوئی، اتنی ہی مرتبہ اس کا نزول ہوا۔

اسباب نزول کے سلسلے میں روایات کے اندر جو تعارض یا اختلاف ہوتا ہے وہ مذکورہ بالا چھ اصولوں کے تحت ہموٹا بآسانی دُور ہو جاتا ہے، اور یہ چھ اصول ذہن میں رہیں تو اختلاف روایات کی صورت میں اُبھمن پیدا نہیں ہوتی ہے۔

لہ یہ مثال الاتقان ج اص ۳۲ سے ماخوذ ہے، لیکن یہ اس تقدیر پر ہے کہ تینوں روایات کو صحیح قرار دیا جائے گا۔
درہ نسیری رد ایت کی صحت میں کلام ہے، چنانچہ حافظہ زہبی اس کے باقی میں لکھتے ہیں: "قلت ایو
بن ہان ضعفہ ابن معین" (مسندر ک حصہ ۲۳۶۷ ج ۲) اور ابوبن ہالی کے باری میں حافظ ابن حجر عسقلانی
امیر جرج و تعلیم کے مختلف احوال نقل کرتے ہیں (ہندسیہ للہندسیہ حصہ ۲۱۲ ج ۱)، ہندا تو اس ردیت
کو موضع ہکہ سکتے ہیں اور نہ اس کو عقیدہ کے کسی نازک مسئلہ کی بنیاد نہیا جا سکتا ہے، چنانچہ اہل سنت
کی ایک بڑی جماعت بہت سے دلائل کی بنیاد پر اس بات کی قائل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
والدین ملکت ابراہیمی پرفت ہمیکی بنی پرتومن شخو خود علماء سیوطی نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ
محکمه دلائل و برائین سے مذین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بائب سوم

قرآن کے سات حروف

ایک صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أَنْتَرَلَ عَلَىٰ سَبْعَةِ آخْرُوفِ
فَاقْهُرْ عَوْنَادَمَا مَتَيَّسَ، وَمُنْدَهَ بِهِ

یہ قرآن کے سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، اس میں یہ
جو تمھارے لئے آسان ہو اُس طریقے سے پڑھ لو۔

اس حدیث میں قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟

یہ بڑی معکر کرد़ الار او طویل الذیل بحث ہے، اور بلاشبہ علوم قرآن کے
مشکل ترین مباحثت میں سے ہے، یہاں یہ پوری بحث تو نقل کرنا مشکل ہے، لیکن
اس کے متعلق ضروری مزروی باتیں پیش خدمت ہیں:-

جو حدیث اور نقل کی گئی ہے وہ معنی کے اعتبار سے متواتر ہے، چنانچہ مشہور

محمد بن ابی عبدِ قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اس کے تواتر کی تصریح کی ہے اور

الْمُسْجِحُ بْنُ حَارِئٍ مَعَ الْقَسْطَلَانِيِّ، ص ۲۵۳ ج ۴، کتاب فضائل القرآن،

حدیث و قرآن کے معروف ائمہ علماء ابن الجزری فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مستقل کتاب (رجزر) میں اس حدیث کے تمام طرق جمع کئے ہیں، اور ان کے مطابق یہ حدیث حضرت عمر بن خطابؓ، ہشام بن حسیم بن حرامؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ، أبي بن كعبؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابو سعید خدراؓ، حذیفہ بن یحیاؓ، ابو بکرؓ، عزد بن عاصؓ، زید بن ارفتمؓ، انس بن مالکؓ، سرہ بن جندبؓ، عمر بن ابی سلمہؓ، ابو جہمؓ، ابو طلحہؓ اور امام ایوب انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مردی ہے، اس کے علاوہ متعدد محدثین نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مبڑی پر یہ اعلان فرمایا کہ وہ تمام حضرات کھڑے ہو جائیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہو کہ :-

”قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہے“
چنانچہ صحابہ کرامؓ کی اتنی بڑی جماعت کھڑی ہو گئی جسے شمار نہیں کیا جاسکا ہے۔

حرروف سبعہ کا مفہوم [اس حدیث میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سات حروف پر فرشت آن کریم کے نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں آراء و نظریات کا شدید اختلاف ملتا ہے، یہاں تک کہ علامہ بن عربیؓ وغیرہ نے اس باب میں پنیتیں اقوال شمار کئے ہیں، لیکن ان میں سے چند مشہور اقوال پیشی خدمت ہیں :-]

۱۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراء سات مشہور قاریوں کی فتراتیں ہیں، لیکن یہ خیال تو بالکل غلط اور باطل ہے، کیونکہ فرشت آن کریم کی متواتر قراتیں ان سات قراءتوں میں مختصر نہیں ہیں، بلکہ اور بھی متعدد قراتیں تو اتر کے ساتھ ثابت

ملہ ابن الجزری؛ التشریف في القراءات العشر، ص ۲۱، ج ۱ دشنہ ۱۳۲۵ھ
تلہ ایضاً،

تلہ الترکشی؛ البرهان في علوم القرآن، ص ۲۱۲، ج ۱

یہن، سات قرائتیں تو محض اس لئے مشهور ہو گئیں کہ علامہ ابن ماجہ نے ایک کتاب میں ان سات مشہور قرائتیں جمع کر دی تھیں، نہ ان کا یہ مقصد تھا کہ قرائتیں سات میں مختصر ہیں، اور نہ وہ حروف سبعة کی تشریح ان سات قراءتوں سے کرواجا ہے تھے، جیسا کہ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آتے گی،

۲۔ اسی بناء پر بعض علماء نے خیال ظاہر کیا ہے کہ حروف سے مراد تمام قرائتیں ہیں، لیکن "سات" کے لفظ سے سات کا مخصوص عرد مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد کثرت ہے، اور عربی زبان میں سات کا لفظ محض کسی چیز کی کثرت بیان کرنے کے لئے اکثر استعمال ہو جاتا ہے، یہاں بھی حدیث کا مقصود یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم جن حروف پر نازل ہوا وہ مخصوص طور پر سات ہی ہیں، بلکہ مقصود یہ یہ کہ قرآن کریم "بہت سے" طریقوں سے نازل ہوا ہے، علماء مقدمین میں سے قافی عیاضن "کا یہی مسلک ہے، اور آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی" نے بھی یہی قول اختیار فرمایا ہے،

لیکن یہ قول اس لئے درست معلوم نہیں ہوتا کہ بخاری حادی مسلم رحمی ایک حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ اقرآنی جبریل علی حرف فراجعتہ، فلمرازل استزینہ

ویزینی ختی انتہی الی سبعة احرف

"مجھے جرسیل علیہ اسلام نے قرآن کریم ایک حرف پر بڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور میں زیادتی طلب کرتا رہا، اور وہ (قرآن کریم کے حروف میں) اضافہ کرتے رہی یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے" ۱

۱۔ او ج: المسالک الی موطاہ الام مالک، ص ۳۵۶ ح ۲ مطبوعہ سہا نپور ۱۳۵۵ھ

۲۔ مصنفی شرح موطاہ، ح ۱۸۷ مطبع فاروقی دہلی ۱۳۹۳ھ

۳۔ محوالہ متأہل الرفان، ح ۱۳۳ ح ۱،

اسی کی تفصیل صحیح مسلمؑ کی ایک ردایت میں حضرت ابو بن کعبؓ سے اس طرح حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو عفار کے تالاب کے پاس تھے۔ فٹاہ جب دیئیں علیہ السلام فقال ان الله يأمرك ان تلقى أمتك على حروف، فقال أسئل الله معافاته و مغفرته وان امتك أمتك القرآن على حرفين فقال أسئل الله معافاته و مغفرته وان امتك لا تطبق ذلك، ثم جاءته الثالثة فقال ان الله يأمرك ان تلقى أمتك على ثلاثة حروف فقال أسئل الله معافاته و مغفرته وان امتك لا تطبق ذلك ثم جاءه الرابعة فقال: ان الله يأمرك ان تلقى أمتك القرآن على سبعة حروف فائما حرب قرء واعليه فقد أصابوا

”پس حصرو کے پاس جرسیل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ کی رساری اُمّت قرآن کریم کو ایک ہی حرث پر پڑھے، اس پر آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معاافا اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمّت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جرسیل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمّت قرآن کریم کو دو حروف پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمّت میں اس کی طاقت نہیں ہے،

بھروسہ تیسرا بار آتے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ
آپ کی امت قرآن کریم کو تین حروف پر پڑھے، آپ نے بھروسہ فرمایا
کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری امت
میں اس کی طاقت نہیں ہے، بھروسہ چوتھی بار آتے اور فرمایا
کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کو سات
حروف پر پڑھے، پس وہ جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قرأت
درست ہو گئی ॥

ان روایات کا سیاق صاف بتارہا ہے کہ یہاں سات سے مراد مخصوص کثرت
نہیں، بلکہ سات کا مخصوص عدد ہے، اس لئے ان احادیث کی روشنی میں یہ قول
قابل قبول معلوم نہیں ہوتا، چنانچہ جمہور نے اس کی تردید کی ہے،
۳۔ بعض دوسرے علماء مثلاً حافظ ابن حجر الطبریؓ نے وغیرہ نے فرمایا کہ مذکور
حدیث میں سات حروف سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں، چونکہ اہل عرب
مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر قبیلہ کی زبان عربی ہونے کے باوجود دوسرے
قبیلہ سے خھوڑی خھوڑی مختلف تھی، اور یہ اختلاف ایسا ہی تھا جیسے ایک بڑی زبان
میں علاقائی طور پر خھوڑے خھوڑے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ
نے ان مختلف قبائل کی آسانی کے لئے قرآن کریم سات لغات پر نازل فرمایا،
تاکہ ہر قبیلہؓ سے اپنی لغت کے مطابق پڑھ سکے، امام ابو حاتمؓ سجستانی نے ان
قبائل کے نام بھی معین کر کے بتا دیتے ہیں، اور فرمایا ہے کہ قرآن کریم ان سات سات قبائل
کی لغات پر نازل ہوا ہے، قریش، هذیل، تیم الرباب، ازد، ربيعہ، ہوازن
اور سعد بن بحر، اور حافظ ابن عبد البرؓ نے بعض حضرات سے نقل کر کے اُن کی جگہ
قبائل بتاتے ہیں: هذیل، کنانہ، قیض، ضبیہ، تیم الرتاب، اسلاب خزیمہ اور قریشؓ

لہ تفسیر ابن حجرؓ، ص ۱۵۱ ج ۱، لہ فتح الباری، ص ۲۲۶ ج ۹ و درج المعانی، ص ۲۱ ج ۱

لیکن بہت سے محققین مثلاً حافظ ابن عبد البر[ؒ]، علامہ سیوطی[ؒ] اور علامہ ابن الجزری[ؒ] وغیرہ نے اس قول کی بھی تردید کی ہے، اول تو اس لئے کہ عرب کے قبائل بہت سے تھے، ان میں سے صرف ان شاٹ کے انتخاب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ دوسرا یہ کہ حضرت عمر[ؓ] اور حضرت ہشام بن حسکیم[ؓ] کے درمیان فتر آن کریم کی تلاوت میں اختلاف ہوا، جس کا مفصل واقعہ صحیح بخاری[ؒ] وغیرہ میں مردی ہے، حالانکہ یہ دونوں حفظات قریشی تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصدیق فرمائی، اور وجہ یہ بتائی کہ قرآن کریم شاٹ حروف پر نازل ہوا ہے، اگر شاٹ حروف سے مراد شاٹ مختلف قبائل کی لغات ہوں تو حضرت عمر[ؓ] اور حضرت ہشام[ؓ] میں اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہوئی چاہئے تھی، کیونکہ دونوں فتریشی تھے، لہ، اگرچہ علامہ الوسی[ؒ] نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے علاوہ کسی اور لغت پر قرآن پڑھایا ہو، لیکن یہ جواب کمزد رہے، کیونکہ مختلف لغات میں فتر آن کریم کے نازل ہونے کا منشاء یہی تو تھا کہ ہر قبیلہ والا اپنی لغت کے مطابق آسانی سے اُس کو پڑھ سکے، اس لئے یہ بات حکمت رسالت سے بعد معلوم ہوتی ہے، کہ ایک قریشی کو وسری لغت پر قرآن کریم پڑھایا گیا ہو، اس کے علاوہ اس پر امام طحاوی[ؒ] نے بھی یہ اخراج کیا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے تو یہ اس کے لئے کوئی مذکور نہیں، تو یہ اُس آیت کے خلاف ہو گا جس میں ارشاد ہے:-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِّبَلِّسَانٍ قَوْمَهُ

”اوہم نے نہیں سمجھا کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان میں“

اور یہ بات طشد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی، اس لئے ظاہری[ؒ]

سلسلہ التشریف القراءات العشر، ص ۲۵، ج ۱ درفعه الباری، ص ۲۳ ج ۹،
سلسلہ روح المعانی، ص ۲۱ ج ۱،

کہ قرآن صرف قریش کی لغت پر نازل ہوا ہے، امام طحاویؒ کی اس بات کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی جمع ثانی کا الارادہ فرمایا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کو مصحف تیار کرنے کا حکم دیا، اس وقت انھیں یہ ہدایت فرمائی تھی:-

إِذَا أَخْلَقْتُمُ أَنْثِيَّرْتُ فِي نَشْعَنِي مِنَ الْقُرْآنِ
فَأَكْتُبُونَهُ بِسِنَانِ فَرِيْشْ قَانِمَانَزَلَ بِلِسَانِهِمْ
جَبَ قَرْآنَ رَكَ كَتَبَتْ (میں تمہارے درمیان کوئی اختلاف
ہو تو اُسے قریش کی لغت پر لکھنا، کیونکہ قرآن اپنی کی زبان میں
نازل ہوا ہے) ^{علیٰ}

اس میں حضرت عثمانؓ نے تصریح فرمادی ہے کہ قرآن صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، رہایہ سوال کہ پھر اختلاف پیش آنے کا کیا مطلب ہے؟ سواس مفصل جواب انشاء اللہ آگے آئے گا،

اس کے علاوہ اس قول کے قائلین اس بات پر متفق ہیں کہ "احرف سبعہ" اور "قراءات" دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، قراءات کا اختلاف جو آج تک موجود ہے وہ صرف ایک حرف یعنی لغت قریش کے اندر ہے، اور باقی حروف یا نسخہ ہو گئے یا مصلحہ انھیں ختم کر دیا گیا، اس پر دس کراشکالات کے علاوہ ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ پورے ذخیرہ احادیث میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا، کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک "سبعة احرف" کے اور ایک قراءات کے بلکہ احادیث میں چہاں کہیں قرآن کریم کے کسی لفظی اختلاف کا ذکر آیا ہے وہاں صرف "احرف" کا اختلاف ذکر کیا گیا ہے، قراءات کا کوئی جدا گانہ اختلاف بیان نہیں

۱۔ الطحاوی؟ مشکل الاشرار، ص ۵۸۰ اور ۶۱۷ ج ۲، دائرۃ المعارف دکن ۱۳۳۲ھ

۲۔ صحیح بخاری؟ باب جمع القرآن،

سکیا گیا، ان وجہ کی بنا پر یہ قول بھی ہنایت کمزور معلوم ہوتا ہے،
 ۲۔ چوختا ہم شور قول امام طحاوی کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نازل تو
 صرف قریش کی لغت پر ہوا تھا، لیکن چونکہ اہل عرب مختلف علاقوں اور مختلف قبائل
 سے تعلق رکھتے تھے، اور ہر ایک کے لئے اس ایک لغت پر قرآن کریم کی تلاوت بہت
 دشوار تھی، اس لئے ابتداء اسلام میں بہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ اپنی علاقائی زبان
 کے مطابق مرادف الفاظ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ جن لوگوں
 کے لئے قرآن کریم کے اصل الفاظ سے تلاوت مشکل تھی، ان کے لئے خود آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرادفات متعین فرمادیئے تھے جن سے وہ تلاوت کر سکیں
 یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کی لغات سے منتخب کئے گئے تھے، اور یہ اہل
 ایسے تھے جیسے تعالیٰ کی جگہ ھلکتا یا آڈن پڑھ دیا جائے، معنی سب کے
 ایک ہی رہتے ہیں، لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی، جبکہ تما
 اہل عرب قرآنی زبان کے پوری طرح عادی نہیں ہوتے تھے، پھر فتحہ رفتہ اس قرآنی
 زبان کا دائرہ افریبڑ ہتا گیا، اہل عرب اس کے عادی ہو گئے، اور ان کے لئے اسی اصلی
 لغت پر قرآن کی تلاوت آسان ہو گئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے
 پہلے رمضان میں حضرت جبریل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دور کیا، جسے
 عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے، اس موقع پر یہ مرادفات سے پڑھنے کی اجازت ختم کر دی گئی،
 اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا،

اس قول کے مطابق "سات حروف" والی حدیث اُسی زمانے سے متعلق ہے،
 جب تلاوت میں مرادفات استعمال کرنے کی اجازت تھی، اور اس کا مطلب یہ
 نہیں تھا کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اُس
 وسعت کے ساتھ نازل ہوا ہے کہ اُسے ایک مخصوص زمانے تک شات حروف پر

پڑھا جاسکے گا، اور سات حروف سے بھی مرادیہ نہیں ہے کہ قرآن کریم کے ہر کلمہ میں سات مرادفات کی اجازت ہے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جتنے مرادفات استعمال کے جاسکتے ہیں اُن کی تعداد سائیٹ ہے، اور اس اجازت کا مفہوم بھی یہ نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو الفاظ چاہے استعمال کر لے، بلکہ متبادل الفاظ کی تعین بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی، اور ہر شخص کو آپ نے اس طرح قرآن سکھلایا تھا جو اس کے لئے آسان ہو، لہذا صرف اُن مرادفات کی اجازت دیجی تھی، جو حضور مسیح ثابت تھے ہے۔

ام طحاویؒ کے علاوہ حضرت سفیان بن عینہؓ، ابن وہبؓ اور حافظ ابن عبد البرؓ نے بھی یہی قول خستیار کیا ہے، بلکہ حافظ ابن عبد البرؓ نے تو اس قول کو اکثر علماء کی طرف منسوب کیا ہے۔

یہ قول کچھے تمام اقوال کے مقابلہ میں زیادہ قرین قیاس ہے، اور اس کے قائلین اپنی دلیل میں مسند احمدؓ کی دہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مردی ہے:-

أَتْجِبْرِيلُ قَالَ يَا عَمِّيْ أَقْرَأْ الْقُرْآنَ عَلَى حُرْفٍ، قَالَ
مِيكَائِيلُ أَسْتَزِدْهُ حَتَّى يَلْعَنَ سَبْعَةً أَحْرَفٍ، قَالَ كُلُّ
شَافِعٍ كَافِ مَالِمٍ تَخْلَطُ أَيْدِيْهُ عَذَابٌ بِرَحْمَةٍ أَوْ رَحْمَةٍ
بِعَذَابٍ، نَحْوُ قَوْلِكَ تَعَالَى حَرَقِيلُ وَهَلْمَقُ فَإِذْ هَبَ رَأْسُرِطَ
وَعَنْعِيلُ، إِلَهٌ

”تجبريل عليه السلام نے (حضرور مسیح) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک

۱۹ ج ۲۳ و ص ۲۲ فتح الباری،

۲۰ شرح المؤطا، ص ۱۱ ج ۲، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر ۱۳۵۵ھ

۲۱ اہل الفاظ روایت احمد و سنادہ جید (احجز الممالک، ص ۲۵ ج ۳)

حرف پر بڑھئے، میکا ایں علیہ السلام نے (حضرت مسیح) کہا اس میں اضافہ کروائی۔
 یہاں تک کہ معاملہ شات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جرج سلیمان علیہ السلام نے
 فرمایا، ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تا و قیکہ آپ عذاب کی ایت کو رحمت
 سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کر دیں، یہ ایسا ہی ہو گا جیسے آپ تعالیٰ (اے)
 کے معنی کو اُقبل، حُلُم، اِذْهَب، اَسْرِعْ اور عَجَلَ کے الفاظ سے ادا کریں یہ
 اس قول پر اور تو گوئی اشکال ہیں ہیں ہے، لیکن ایک اُبھن اس میں بھی باقی رہتی
 ہے، اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی جو مختلف قراءتیں آج تک متواتر چلی آ رہی ہیں، اس
 قول کے مطابق ان کی حیثیت واضح نہیں ہوتی، اگر ان قراءاتوں کو "سات حروف"
 سے الگ کوئی چیز قرار دیا جائے تو اس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، احادیث کے
 وسیع ذخیرے میں "احرف" کے اختلاف کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور لفظی اختلاف
 کا ذکر نہیں ملتا، پھر اپنی طرف سے یہ کیوں نکر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت
 میں "احرف سبعہ" کے علاوہ ایک اور قسم کا اختلاف بھی تھا، اس اُبھن کا کوئی
 اطمینان بخش حل اس قول کے قائلین کے یہاں مجھے نہیں مل سکا،

سبعة احرف کی راجح ترین تشریح ہمارے نزدیک قرآن کریم کے سات حروف کی سب سے بہتر تشریح اور تعبیر
 ہے کہ حدیث میں "حروف کے اختلاف" سے مراد "قراءات توں کا اختلاف" ہے، اور رشت
 حروف سے مراد "اختلاف قراءات" کی شات تو عتیں ہیں، چنانچہ قراءتیں تو اگرچہ
 شات سے زائد ہیں، لیکن ان قراءات توں میں جو اختلافات پائے جلتے ہیں، وہ شات
 اقسام میں مختصر ہیں، (ان سات اقسام کی تشرع آگے آرہی ہے)۔

ہمارے علم کے مطابق یہ قول متفقین میں سے سب سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
 کے یہاں ملتا ہے، مشہور مفسر قرآن علامہ نظام الدین قمی نیشاپوری "ابنی تفسیر"
 غواص القرآن میں لکھتے ہیں کہ احرف سبعہ کے بارے میں امام مالک کا یہ مہبہ مبتوق
 ہے کہ اس سے مراد قراءات میں مندرجہ ذیل شات قسم کے اختلافات ہیں :-

- ۱۔ مفرد اور جمع کا اختلاف، کہ ایک قرارت میں لفظ مفرد آیا ہوا اور دوسرا میں صیغہ جمع، مثلاً **وَتَعْتَدُ كَلِمَاتُ رَبِّكَ**، اور **كَلِمَاتُ رَبِّكَ**،
- ۲۔ تذکیرہ تائیش کا اختلاف، کہ ایک میں لفظ مذکور استعمال ہوا اور دوسرا میں **وَ** جیسے **لَا يُعْبَلُ** اور **لَا تُقْبَلُ**
- ۳۔ وجہ اعراب کا اختلاف، کہ زیر زبر وغیرہ بدل جائیں، **مُثْلًا هُنْ مِنْ حَالٍ** **غَيْرُ أُنْدَلِيْهِ** اور **غَيْرِ أُنْدَلِيْهِ**،
- ۴۔ صرف ہیئت کا اختلاف، جیسے **يَعْرِفُونَ** اور **لَعِيْرُ شُونَ**،
- ۵۔ ادوات (حرود بخوبی) کا اختلاف، جیسے **لِكِنَ الشَّيْءَ طَيْنٌ** اور **لِكِنَ الشَّيْءُ طَيْنٌ**
- ۶۔ لفظ کا ایسا اختلاف جس سے حرود بدل جائیں، جیسے **تَعْلَمُونَ** اور **يَعْلَمُونَ** اور **يُذَكِّرُهُ** اور **يَذَكِّرُهُ**،
- ۷۔ بھوکا اختلاف، جیسے تخفیف **الْفِحْمِ**، **الْأَمَدِ**، **الْمَدِ**، **الْقَصْرِ**، **الْأَطْهَارِ** اور **ادْعَامِ** وغیرہ، پھر کسی قول علامہ ابن قتیبهؓ، امام ابو الفضل رازیؓ، قاضی ابو بکر بن الطیب بافلانیؓ اور محقق ابن الجزری رحیم اللہ نے اختیار فرمایا ہے، محقق ابن الجزریؓ حوقاً ات کے مشہور امامیں اپنایہ قول بیان کرنے سے قبل تحریر فرماتے ہیں:-
- ”یہ اس حدیث کے بارے میں اشکالات میں مسترارہ، اور اس پر تمیں آسال سے زیادہ غور و فکر کر تارہ، یہاں تک کہ الشرعاً نے مجھ پر اس کی ایسی تشرع کھول دی جوانشا، الشدیح ہو گئی“
- ”یہ سب حضرات اس بات پر تو متفق ہیں کہ حدیث میں ”سات حرود“ سے مراد اختلاف قرارت کی ثابت نوعیتیں ہیں، لیکن پھر ان نوعیتوں کی تعین میں ان

سلسلہ ایشیا پوریؓ، غرائب القرآن و رغائب الفرقان، حامیش ابن جریر، ص ۲۱ ج ۱ المطبعہ المحتیسر
ملہ ابن قتیبهؓ، ابو الفضل رازیؓ اور ابن الجزریؓ کے اقوال، فتح الباری، ص ۲۵ د ۲۶ ج ۹،
اور الفرقان ص ۲۲ ج ۱ میں موجود ہیں، اور قاضی ابن الطیب کا قول تفسیر القرطبیؓ ص ۲۵ ج ۱ میں...
دیکھا جاسکتا ہی، سلسلہ التشریف فی الفرقاًات العشر، ص ۲۶ ج ۱،

حضرات کے اقوال میں تحفظ اسکوڑا فرق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک نے قرأت کا استقرار پنے طور پر الگ الگ کیا ہے، ان میں جن صاحب کا استقرأ سب سے زیادہ منضبط مستحکم اور جامع و مانع ہے، وہ امام ابو الفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، فرماتے ہیں، کہ وتر آت کا اختلاف ثابت اقسام میں مختصر ہے:-

۱۔ اسماء کا اختلاف، جس میں افراد، تثنیہ و جمع اور تذکیر و تائیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، (اس کی مثال وہی **ئمت سلمۃ رتبہ** ہے، جو ایک قراءت میں **ئمت سلمۃ رتبہ بھی پڑھا گیا ہے**)

۲۔ افعال کا اختلاف، کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہو، کسی میں مصادر اور کسی میں امر اس کی مثال **رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا** ہے کہ ایک قراءت میں اس کی جگہ **رَبَّنَا بَعَنْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا** بھی آیا ہے)

۳۔ وجہ اعراب کا اختلاف، جس میں اعراب یا حرکات مختلف قراءتوں میں مختلف ہوں را اس کی مثال **وَلَا يُصَارِخُ كَاتِبُهُ ادْرَأُهُ وَالْعَرْبُ شِ التَّعْجِيدِ** اور **وَالْعَرْبُ شِ التَّعْجِيدِ**

۴۔ الفاظ کی بیشی کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو (مثلاً ایک قراءت میں **وَمَا خَلَقْنَاهُ كَرَّاً لَّا نُنْشِي** ہے، اور دوسری میں **وَاللَّذُكَرَ وَاللَّذِنْشَيْ** ہے، اور اس میں **وَمَا خَلَقْنَاهُ** کا لفظ نہیں ہے، اسی طرح ایک قراءت میں **تَعْجِيْرِيْ مِنْ تَعْجِيْهِ الَّذِنْهَرُ** اور دوسری میں **تَعْجِيْرِيْ تَعْجِيْهِ الَّذِنْهَرُ** تقدیم و تاخیر کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم اور دوسری میں مؤخر ہے (مثلاً **فَجَاءَتْ مَسْكُرَةُ النَّوْمِ بِالْعَنْ اَرْجَاءَتْ سَكْرَةُ** اور **الْعَنِ بِالْتَّوْمِ**)

۵۔ بدیلت کا اختلاف، کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے، اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ دوسری لفظ (مثلاً **مُنْشِرُهَا** اور **نَشَرُهَا**، **نَزَفَتَبَدَّيْتُوْ**، **فَتَبَدَّيْتُوْ** اور **طَلِيْح** اور **طَلِيْم**)

۔ بھوں کا اختلاف، جس میں تفہیم، ترقیت، امال، قصر، مر، اخہار اور داغام وغیرہ کے اختلافات شامل ہیں، (مثلاً موسیٰ ایک قرار میں امال کے ساتھ ہے، اور اُسے موسیٰ کی طرح پڑھا جاتا ہے، اور وہ سری میں بغیر امال کے ہے) علامہ ابن الحبز رحیٰ، علامہ ابن قتیبہؓ اور فاضی ابو طیبؓ کی بیان کردہ وجہ اختلاف بھی اس سے ملتی جعلی ہیں، البتہ امام ابو الفضل رازیؓ کا استقرار اس لئے زیادہ جامع معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف چھوٹا نہیں ہے، اس کے برخلاف باقی تین حضرات کی بیان کردہ وجہ میں آخری قسم یعنی بھوں کے اختلاف کا بیان نہیں ہے، اور امام الائکت کی بیان کردہ وجہ میں بھوں کا اختلاف تو بیان کیا گیا ہے، لیکن الفاظ کی کمی بیشی، تقدیم و تاخیر اور بدلتیت کے اختلافات کی پوری وضاحت نہیں ہے، اس کے برخلاف امام ابو الفضل رازیؓ کے استقرار میں یہ تمام اختلافات وضاحت کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں، محقق ابن الحبز رحمۃ اللہ علیہ جھوں نے تیس سال سے زائد غور و فکر کرنے کے بعد سات احرفت کو سات وجوہ اختلاف پر محول کیا ہے، انھوں نے بھی امام ابو الفضلؓ کا قول بڑی وقعت کے ساتھ نقل فرمایا ہے، اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ ان کے مجموعی کلام سے مترجع ہوتا ہے کہ انھیں امام ابو الفضلؓ کا استقرار خود اپنے استقرار سے بھی زیادہ پسند آیا ہے، اس کے علاوہ حافظ ابن حجرؓ کے کلام سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان تینوں اقوال میں امام ابو الفضل رازیؓ کے ستھوار کو ترجیح دی ہے، کیونکہ انھوں نے علامہ ابن قتیبہؓ کا قول نقل کر کے لکھا ہوا کہ هذا وجہ حسن (یہ اچھی توجیہ ہے) پھر امام ابو الفضلؓ کی بیان کردہ ثابت وجوہ بیان کر کے تحریر فرمایا ہے:

قلت وقد أخذني كلام ابن قتيبة ونفعه،
ميرأني خيال يرى كلما، ابا الفضل رازى نے این قتيبة کا قول اختیار کر کے اُسے اور نحکار دیا ہے۔

لہ فتح الباری ص ۲۲ ج ۹، تله التشریف القرآن العظیم، ۲۸ ج ۱ تہ فتح الباری ۳۴

آخری دور میں شیخ عبدالعزیم الزرقانی نے بھی اسی کے قول کو اختیار کر کے اس کی تائید میں متعلق دلائل پیش کئے ہیں ۔
بہر کیفیت استقراء کی وجہ میں تفاوت ہے، لیکن اس بات پر امام مالکؓ علام ابن قتیبؓ، امام ابو الفضل رازیؓ، محقق ابن الجوزیؓ اور قاضی باقلانی پاچویں حضرات متفق ہیں کہ حدیث میں شات حروف سے مراد قراءت کے وہ اختلافات ہیں جو شات فویتوں میں مختصر ہیں،

احقر کی ناچیز راستے میں "سبعة احرف" کی تشریح سب سے زیادہ پہتر ہے، حدیث کامنشاہی محلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے، اور یہ مختلف طریقے اپنی فویتوں کے لحاظ سے شات ہیں، ان شات فویتوں کی کوئی تیھیں چونکہ کسی حدیث میں موجود نہیں ہے اس لئے یقین کیشا تو کسی کے استقراء کے باکر میں ہیں کہا جاسکتا کہ حدیث میں وہی مراد ہی، لیکن بطہر امام ابو الفضل رازیؓ کا استقراء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہی، کیونکہ وہ موجودہ قراءات کی تمام احوالوں کو جامع ہے،

اس قول کی وجہ ترجیح | علوم قرآن کی کتابوں میں بیان ہوئیں، ہمارے زریک آن سب میں یہ قول رکھے شات حروف سے مراد اختلاف قراءات کی شات فویتوں ہیں) سب سے زیادہ راجح، قابل اعتماد اور اطمینان بخش ہی، اور اس کی مندرجہ ذیل وجہ ہیں :-

۱۔ اس قول کے مطابق "حروف" اور "قراءات" کو دو الگ الگ چیزوں میں دیا ہے پر تا، علامہ ابن حبیرؓ اور امام طحاویؓ کے اقوال میں ایک مشترک البھن یہ ہے کہ ان میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک حروف کا اختلاف اور دوسرے قراءات کا اختلاف، حروف کا اختلاف اب ختم ہو گیا، اور قراءات کا اختلاف باقی ہے، حالانکہ احادیث کے لئے بڑی ذخیرہ

میں کوئی ایک ضعیف حدیث بھی ابھی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ "حروف" اور "قراءات" دو الگ الگ چیزیں ہیں، احادیث میں صرف حروف کے اختلاف کا ذکر ملتا ہے، اور اسی کے لئے کثرت سے "قراءة" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اگر "قراءات" ان "حرف" سے الگ ہوتیں تو کسی نہ کسی حدیث میں اُن کی طرف کوئی اشارہ تو ہونا چاہئے تھا، آخر کیا وہ ہو کہ "حروف" کے اختلاف کی احادیث تو قریبًا تو اترستک پھوپھی ہوئی ہیں، اور "قراءات" کے جدا گانہ اختلاف کا ذکر کسی ایک حدیث میں بھی نہیں ہے، محض اپنے قیاس سے یہ کہدینا یکیونکر ممکن ہے کہ اختلاف حروف کے علاوہ قرآن کریم کے الفاظ میں ایک دوسری قسم کا اختلاف بھی تھا؟

ذکورہ بالاقول میں یہ ابھیں بالکل رفع ہو جاتی ہے، اس لئے کاس میں "حروف" اور "قراءات" کو ایک ہی حیز قرار دیا گیا ہے،

۲۔ علامہ ابن حجر الرزق کے قول پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاہ حروف میں سے چھ حروف منسوب یا مرتود کہو گئے، اور صرف ایک حرف قریش باقی رہ گیا، موجودہ قراءات اسی حرف قریش کی ادائیگی کے اختلافات ہیں) اور اس نظریہ کی قباحتیں ہم آگے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے، ذکورہ بالآخری قول میں یہ قباحتیں نہیں ہیں، یکیونکہ اس کے مطابق ساتوں حروف آج بھی باقی اور محفوظ ہیں،

۳۔ اس قول کے مطابق "شایعات حروف" کے معنی بلا تکلف صحیح ہو جاتے ہیں جبکہ دوسرے اقوال میں یا "حروف" کے معنی میں تادیل کرنی پڑتی ہے یا شاہات" کے عذر میں ۴۔ "سبعة احرف" کے باب میں جتنے علماء کے اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں ان میں سبکے زیادہ جلیل الفدر اور عبد رسالت سے قریب ہستی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، اور وہ علامہ نیشاپوری کے بیان کے مطابق اسی قول کے قائل ہیں،

۵۔ علام ابن قتیبه اور محقق ابن الجوزی "دونوں علم قراءات کے مسلم الثبوت امام ہیں" اور دونوں اسی قول کے قائل ہیں، اور متوخرالذکر کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے کہ انہوں نے تین سال سے زائد اس حدیث پر غور کرنے کے بعد اس قول کو اختیار کیا، اسی

اس قول پر وارد ہونیوالے اب ایک نظر ان اعتراضات پر بھی ڈال لیجئے جو اس قول
اعتراضات اور ان کا جواب پر وارد ہو سکتے ہیں یاد رکھے گئے ہیں:-

۱۔ اس پر ایک اعتراض تو یہ کیا گیا ہے کہ اس قول میں جتنی وجہ اختلاف سان
کی گئی ہیں وہ زیادہ تر صرف اور سخنی تقسیمات پر مبنی ہیں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے جو وقت یہ خبرٹا ارشاد فرمائی اس وقت صرف دخوکی یہ فنی صطلاحات اور تقسیمات
راجح نہیں ہوئی تھیں، اُس وقت اکثر لوگ لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے، ایسی صورت
میں ان وجہ اختلافات کو "سبعة احرف" فتاراً دینا مشکل معلوم ہوتا ہے، حافظ ابن حجر
نے یہ اعتراض نقل کر کے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ:-

وَلَا يَدْرِمُ مِنْ ذَلِكَ تَوْهِينٌ مَّا ذَهَبَ إِلَيْهِ أَبْنَى قَتِيبَةَ
لِحَمَالٍ أَنْ يَكُونَ الْأَخْصَارُ الْمُذَكُورُ فِي ذَلِكَ وَقْعَةُ الْقَنَافِذِ
وَأَنَّهَا الظُّلُمُ عَلَيْهِ بِالْإِسْتِقْرَاءِ وَفِي ذَلِكَ مِنَ الْحِكْمَةِ
الْبَالِغَةِ مَلَأَ يَخْفِي لِهِ

"اس سے ابن قتیبہ کے قول کی کمزوری لازم نہیں آتی، اس لئے کہ
یہ ممکن ہے کہ مذکورہ اختصار اتفاقاً ہو گیا ہو، اور اس کی اطلاع استقرار
کے ذریعہ ہو گئی ہو، اور اس میں جو محکمت بالغہ ہو وہ پوشیدہ نہیں"

ہماری نایاب فرم کے مطابق اس جواب کا حامل یہ ہے کہ یہ درست ہو عہد رسالت
میں یہ اصطلاحات راجح نہ تھیں، اور شاید یہی وجہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
سبعة احرف" کی تشریح اس دور میں نہیں فرمائی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ فنی صطلاحات
جن مفہوم سے عبارت ہیں وہ مفہوم تواں و دور میں بھی موجود تھے، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مفہوم کے لحاظ سے وجہ اختلاف کو سات میں مختصر قرار دیدیا ہے تو
اس میں کیا تعجب ہے؟ ہاں اُس دور میں اگر سات وجہ اختلاف کی تفصیل بیان

کی جاتی، تو شاید عامۃ الناس کی سمجھتے ہے بالاتر ہوتی، اس لئے آپ نے اس کی تفصیل بیان فرمائے کے بجائے صرف اتنا واضح فرمادیا کہ وجوہ اختلاف مگل شات میں مختص ہیں بعد میں جب یہ مظلومات راجح ہو گئیں تو علماء نے سبق انتام کے ذریعہ ان وجوہ اختلاف کو اصطلاحی الفاظ سے تعییر کر دیا، یہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ کسی خاص شخص کے استغفار کے بالے میں یقین کامل سے یہ کہنا مشکل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی، لیکن جب مختلف لوگوں کا استغفار یہ ثابت کر رہا ہے کہ وجوہ اختلاف مگل شات ہیں، تو اس بات کا قریب قریب یقین ہو جاتا ہے کہ سبعہ احرف "سے آپ کی مراد شات وجوہ اختلاف تھیں، خواہ ان کی تفصیل بعینہ وہ نہ ہو جو بعد میں استغفار کے ذریعہ معین کی گئی ہے، بالخصوص جبکہ "سبعہ احرف" کی تشریح میں کوئی اور صور معقولیت کے ساتھ بنتی ہی نہیں ہے،

شات حروف کے ذریعہ (۲) اس قول پر دوسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہو کہ قرآن کیم کیا آسانی پیدا ہوئی؟[؟] کو شات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا، تاکہ امت انسانی علامہ ابن جبرییر کے قول پر تو سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ عرب میں مختلف قبائل کے لوگ تھے، اور ایک قبیلے کے لئے دوسرے قبیلے کی لفظ پر قرآن پڑھنا مشکل تھا لیکن امام مالک، امام رازی[؟] اور ابن الجزی[؟] وغیرہ کے اس قول پر تو ساتوں حروف ایک لفظ قریش ہی سے متعلق ہیں، اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جو قرآن کیم ایک ہی لفظ پر نازل کرنا تھا تو اس میں قرأت کا اختلاف باقی رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس اعتراض کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن میں شات حروف کی جو ہمولت امت کے لئے مانگی تھی اس میں قبائل غرب کا اختلاف لفظ آپ کے پیش نظر تھا، حافظ ابن جبرییر طبری[؟] نے اسی بناء پر "شات حروف" کو "شات لغات عرب" کے معنی پہنچاے ہیں، حالانکہ یہ وہ بات ہر جس کی تائید کسی حدیث سے نہیں ہوتی، اس کے بر عکس ایک حدیث میں ستر کا رد دعا م

صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت و صاحت کے ساتھ دیہ بیان فرمادیا ہے کہ سات حروف کی آسانی طلب کرتے ہوئے آپ کے پیش نظر کیا بات تھی؟ امام ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت اُبی بن کعبؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:-

لَقِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَبَرِيلَ عَنْدَ حِجَارَةِ الْمَرْأَةِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِجَبَرِيلَ: إِنَّ بُعْثَتَ إِلَى أُمَّةٍ أُمَّتِينَ فِيهِمُ الشَّيْخُ الْفَانِي وَالْمَحْوُ
الْكَبِيرَةُ وَالْعَلَامُ، قَالَ فَمُرِّهُمْ فَلِقَرْعَدًا وَالْقَلْانَ عَلَى
سَبْعَةِ أَحْرُفٍ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مردوں کے پھرودیں کے قریب حضرت جبریل علیہ السلام سے ہوئی، آپ نے حضرت جبریلؓ سے فرمایا: میں ایک آن پڑھ امت کی طرف سمجھا گیا ہوں جس میں لب گور بڑھے جھی ہیں، میں رسیدہ بوڑھیاں بھی، اور بچے بھی، حضرت جبریلؓ نے فرمایا کہ اُن کو حکم دیجئے کہ وہ قرآن کو سات حروف پر پڑھیں؟“ ترمذیؓ کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا:-

إِنَّ بُعْثَتَ إِلَى أُمَّةٍ أُمَّتِينَ مِنْهُمُ الْمَعْجُوزُ وَالشَّيْخُ
وَالْكَبِيرُ وَالْعَلَامُ وَالْجَارِيَةُ وَالْتِذْيِي تَمُّ يَقْرَأُ إِنَّتَابَا
كَطْلَةً لَهُ

”محظی ایک آن پڑھ امت کی طرف سمجھا گیا ہے، جس میں بوڑھیاں بھی ہیں، بوڑھے بھی، مسید بھی، اڑکے بھی اور رکھکیاں بھی اور ایسے لوگ بھی جھروں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی“

اس حدیث کے الفاظ صراحةً اور صاحت کے ساتھ تبلار ہی میں کہ امت کے لئے نہ سات حروف کی آسانی طلب کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر ہے بات صحی کہ آئی ایک اُمیٰ اور آن پڑھ قوم کی طرف مسحوت ہوئے ہیں، جس میں ہر طرح کے انسداد ہیں، اگر قرآن کریم کی تلاوت کے لئے صرف ایک ہی طریقہ متعین کر دیا گیا تو امت مشکل میں مبتلا ہو جائے گی، اس کے بر عکس اگر کئی طریقہ رکھے گئے تو وہ ممکن ہو گا کہ کوئی شخص ایک طریقہ سے تلاوت پر قادر نہیں ہو تو وہ دوسرے طریقہ سے انہی افوا کو ادا کر لے، اس طرح اس کی نماز اور تلاوت کی عبادات درست ہو جائیں گی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بولڑھوں، بولڑھیوں یا ان پڑھ لوگوں کی زبان پر ایک لفظ ایک طریقہ سے چڑھ جاتا ہے اور اس کے لئے زیر زبر کا معمولی فرق بھی دشوار ہوتا ہے، اس لئے آپ نے یہ آسانی طلب فرمائی کہ مثلاً کوئی شخص معروف کا صیغہ ادا نہیں کر سکتا تو اس کی جگہ دوسری قراءت کے مطابق مجھوں کا صیغہ ادا کر لے، یا کسی کی زبان پر صیغہ مفرد نہیں چڑھتا تو وہ اسی آیت کو صیغہ جمع سے پڑھ لے، کسی کے لئے بھجو کا ایک طریقہ مشکل ہو تو دوسرا اختیار کر لے، اور اس طرح اس کو پورے قرآن میں سات ستم کی آسانیاں مل جائیں گی،

آپ نے مذکورہ بالاحدیث میں ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کی آسانی طلب کرتے وقت یہ نہیں فرمایا کہ میں جس امت کی طرف بھجو گیا ہوں وہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتی ہے، اور آن میں سے ہر ایک کی لغت جُلا ہے، اس لئے قرآن کریم کو مختلف لغات پر پڑھنے کی اجازت دی جائی، اس کے برخلاف آپ نے قبائلی اختلافات سے قطع نظر ان کی عمروں کا تقادیر اور آن کے اُمیٰ ہونے کی صفت پر زور دیا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شاحر و ف کی آسانی دینے میں بنیادی عامل قبائل کا لغوی اختلاف نہ تھا، بلکہ امت کی ناخواندگی کے پیش نظر تلاوت میں ایک عام قسم کی ہبہ ولت دینا پیش نظر تھا، جس سے امت کے تمام افراد فائدہ اٹھا سکیں،

(۳) اس قول پر تکمیر اعراض یہ ہو سکتا ہے کہ اختلاف قراءت کی جو شاست نو عیتیں بیان کی گئی ہیں وہ خواہ مالک یا ابو الفضل رازیؑ کی بیان کی ہوئی ہوں یا علامہ ابن قتیبہؓ، محقق ابن الجزریؓ اور قاضی ابن الطیبؓ کی، ہر حال! ایک قیاس اور تجھنید کی حیثیت رکھتی ہیں، اسی وجہ سے ان حضرات میں سے ہر ایک نے ان شات و جوہ اختلاف کی تفصیل الگ الگ بیان کی ہے، ان کے باشے میں یقین کے ساتھ یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی تھی، اس کا جواب یہ ہو کہ ”سبعة احرف“ کی کوئی واضح تشریح کسی حدیث کی اس صحابی کے قول میں نہیں ملتی، اس لئے اس باب میں جتنے اقوال ہیں، ان سب میں روایات کو مجموعی طور پر مجھ کر کے کوئی نتیجہ نکالا گیا ہے، اس لحاظ سے یہ قول زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس پر کوئی بنیادی اعتراض واقع نہیں ہوتا، روایا کو مجموعی طور پر دیکھنے کے بعد میں اس بات کا تو قریب قریب یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث میں شات حروف سے مراد اختلاف قراءت کی شات نو عیتیں ہیں، اسی ان نو عیتوں کی تعین و تخصیص، سواس کے بارے میں ہم پہلے بھی یہ عرض کرچکے ہیں کہ اسے معلوم کرنے کا ذریعہ استقراء کے سوا کوئی اور نہیں، امام ابو الفضل رازیؑ کا استقراء ہمیں جامع و مانع ضرور معلوم ہوتا ہے، مگر یقین کے ساتھ ہم کسی کے استقرار کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، کہ حضورؐ کی مراد یہی تھی، لیکن اس سے یہ اصول حقیقت مجروح نہیں ہوئی کہ ”سبعة احرف“ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اختلاف قراءت کی شات نو عیتیں تھیں، جن کی تفصیل کا یقینی علم حاصل کرنے کا نہ ہمارے پاس کوئی رہستہ ہے اور نہ اُس کی چند احوال ضرورت ہے،

۴۔ اس قول پر جو تھا اعتراض یہ ممکن ہے کہ اس قول میں حروف سبعة سے انفاظ اور ان کی ادائیگی کے طریقوں کا اختلاف مراد لیا گیا ہے، معانی سے اس میں بحث نہیں ہے، حالانکہ ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد شاست قسم کے معانی ہیں، امام طحا واریؓ حضرت عبداللہ بن مسعود رضیؓ کی روایت سے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں :-

کان الکتاب الاول ینزل من باب واحد علی حرف
واحد و نزل القرآن من سبعة ابواب علی سبعة
احرف زاجرو امرو حلال و حرام و حکم و متشابه
و امثال الحج،

پہلے کتاب ایک باب سے ایک حرف پر تازل ہوتی تھی اور قرآن کریم
ثات ابواب سے ثات حروف پر تازل ہوا (وہ ثات حروف یہیں)
نا جائز رکسی بات سے روکنے والا) آمر (کسی حیز کا حکم دیزدالا) ،
حلال حرام، حکم (جس کے معنی معلوم ہیں) متشابہ (جس کے لئے
معنی معلوم نہیں، اور امثال یہیں)

اسی بنا پر بعض علماء سے منقول ہے کہ انہوں نے ثات حروف کی تفسیر ثاث
قسم کے معانی سے کی ہے،

اس کا بحوار یہ ہے کہ مذکورہ بالاردا یت سند کے اعتبار سے کمزور ہی، اما طایفی
اس کی سند پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسے ابوسلمؐ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ
سے روایت کیا ہے، حالانکہ ابوسلمؐ کی ملاقات حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے نہیں ہوتی
اس کے علاوہ قدیم زمانہ کے جن بزرگوں سے اس قسم کے اوائل منقول ہیں، ان کی
شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر یزبریؐ نے لکھا ہے کہ ان کا مقصد سبعة احرف ”
والی حدیث کی تشریع کرنا نہیں تھا، بلکہ ”سبعة احرف“ کے زیرِ حیث مسئلہ بالکل
الگ ہو کر یہ کہنا چاہتے تھے کہ قرآن کریم اس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے،
رہے وہ لوگ جنہوں نے ”سبعة احرف“ والی حدیث کی تشریع ہی میں اس قسم

کی باتیں کہی ہیں، ان کا قول بالکل بدی سی ابطالان ہے، اس لئے کہ پچھے جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں، ان کو سرسری نظر ہی سے دیکھ کر ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ حروف کے اختلاف سے مراد معانی اور مضامین کا ہنہیں، بلکہ الفاظ کا اختلاف ہر چنانچہ حقائق علما میں سے کسی ایک نے بھی اس قول کو ختیار نہیں کیا، بلکہ اس کی تردید کی ہے۔

حروف سبعہ اب بھی محفوظ ہیں متروک ہو گئے [سات حروف کے معنی متعین ہو جائے] کے بعد اہم بحث یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف

آج بھی باقی ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ میں متفقین سے تین قول منقول ہیں:-

(۱) پہلا قول حافظ ابن حجر ریاضی اور ان کے متبوعین کا ہے، پچھے ہم عرض کرچے ہیں کہ ان کے تزدیک "احرف سبعہ" سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں اسی بناء پر وہ یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک قرآن یہی ان ساتوں حروف پر پڑھا جاتا تھا، لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب اسلام دور دراز حمالک ٹک پھیلا تو ان حروف سبعہ کی حقیقت نہ جانتے کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑے ہونے لگے، مختلف لوگ مختلف حروف پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور ایک دوسرے کی تلاوت کو غلط شہرا تے تھے، اس فتنے کے انسداد کے نتے حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے پوری آنکتہ کو صرف ایک حرف یعنی لغت قریش کے مطابق سات مصاہف مرتب فرمائ کر مختلف صربوں میں بیحچ دیتے اور باقی تمام مصاہف کو نذر آتش کرایا، تاکہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو سکے، لہذا اب صرف لغت قریش کا حروف باقی رہ گیا ہے، اور باقی چھوٹے حروف محفوظ ہنہیں ہیں اور فتراء توں کا جواختلاف آج تک باقی چلا آتا ہے وہ اسی ایک حرف قریش کی ادائیگی کے مختلف طریقے ہیں ہے۔

۱۷ تفصیل تردید کے لئے ملاحظہ ہو الاتفاق ص ۲۹ ج ۱۶۴، اور النشر فی القرآنات عشر لابن الجوزی ص ۲۵ ج ۱، ۱۷ تفسیر ابن حجر ریاضی ص ۱۵ ج ۱

حافظ ابن حجر ریکا نظریہ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں بڑی تفصیل اور جزم و دلوقت اور اس کی قبیحتیں کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اس لئے یہ قول یہت مشہور ہے جو اس کے ساتھ علما نے اسے ختیار نہیں کیا، بلکہ اس کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے، سیونکہ اس قول پر متعدد دلجنیں ایسی کھڑی ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہے، اس نظریہ پر سب سے پہلا اعتراض تو دہی ہوتا ہے جو ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ اس میں "حروف" اور "قراءات" کو دراگ کچیزیں فسرا دیا گیا ہے، حالانکہ یہ بات کسی حدیث سے ثابت نہیں،

دوسرے اعتراض یہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر ریکا نظریہ ایک طرف تو یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ ساتوں حروف هنzel من اللہ تھے، دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کے مشورے سے چھ حروف کی تلاوت کو ختم فرمایا حالانکہ اس بات کو باور کرنا بہت مشکل ہے کہ صحابہؓ کرامؓ ان حروف کو یخس ختم کرنے پر متفق ہو گئے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی فرماش پر اعتماد کی آسانی کے لئے نازل فرمائے تھے، صحابہؓ کرامؓ کا اجماع بیشک دین میں مجبت ہے، لیکن صحابہؓ کرامؓ سے یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ جس چیز کا قرآن، ہونا تو اتر کے ساتھ ثابت ہوا سے دہ صفحو ہستی سے مثار کر پر متفق ہو جائیں،

حافظ ابن حجر ریکا نظریہ اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ دراصل امت کو قرآن کریم کی حفاظت کا حکم ہوا تھا اور اسے سانحہ یہ ختیار بھی دیا رکھا کہ وہ سات حروف میں سے جس حرف کو چاہے اختیار کر لے، چنانچہ امت نے اس اختیار سے فائدہ اٹھاتے ہوتے ایک اجتماعی مصلحت کی خاطر چھ حروف کی تلات پھوڑ دی

لے ان علماء کے اسماء راجعی آگے آرہے ہیں،

اور ایک حرف کی حفاظت پر متفق ہو گئی، اس اقدام کا منشاء ان حروف کو منسوخ فزار دینا تھا اور نہ ان کی تلاوت کو حرام قرار دینا تھا، بلکہ اپنے لئے اجتماعی طور پر ایک حرف کا استحباب تھا،

لیکن یہ جواب بھی اس نے کمر در معلوم ہوتا ہے کہ اگر صورت یہی تھی تو کیا یہ مناسباً نہ تھا کہ امت اپنے عمل کے لئے خواہ ایک حرف کو اختیار کر لیتی، باقی چھ حروف کا وجود سرکے سے ختم کرنے کے بجائے اُسے کم از کم سی ایک جگہ محفوظ رکھتی، تاکہ ان کا وجود حتم می ہو، قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے :-

إِنَّا نَعْلَمُ تَذَكَّرَتِ الْأَيْدِيَ كُنْزَةً لِّإِثْمَانَةِ تَحَفَّظُونَ ۝

بلاشہ ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم یہی اس کی حفاظت کر نیولے ہیں۔

جب ساتوں حروف قرآن تھے تو اس آیت کا صاف تقاضا یہ ہے کہ دہ ساتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں گے، اور کوئی شخص ان کی تلاوت چھوڑنا بھی جاہے تو وہ ختم نہیں ہو سکیں گے، حافظابن جسر ریطبری نے اس کی نظر میں یہ مسئلہ پیش کیا ہے کہ قرآن کریم نے جھوٹی قسم کھلنے کے کفارے میں انسانوں کو ہمیں باقیوں کا اختیار دیا ہے، یا تو وہ ایک غلام آزاد کرے یا دس سکینوں کو کھانا کھلاتے، یا دس سکینوں کو کپڑا شے، اب اگر امت باقی صورتوں کو ناجائز فترار دیتے بغیر اپنے عمل کے لئے ان میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لے تو یہ اُس کے لئے جائز ہے، اسی طرح قرآن کے سات حروف میں سے اُمت نے ایک حرف کو اجتماعی طور پر اختیار کر لیا، لیکن یہ مثال اس لئے درست نہیں کہ اگر اُمت کفارہ سکیں کی تین صورتوں میں سے ایک صورت اس طرح اختیار کر لے کر باقی صورتوں کو ناجائز تونہ کہے لیکن عملاً ان کا وجود بالکل ختم ہو کر رہ جائے، اور لوگوں کو صرف اتنا معلوم رہ جائے کہ کفارہ سکیں کی دو صورتیں اور تھیں جن پر اُمت نے عمل ترک کر دیا، لیکن وہ صورتیں کیا تھیں؟ ان کا جانے والا بھی کوئی کافی نہ رہے تو یقیناً اُمت کے لئے ایسے اقدام کی گنجائش نہیں ہے،

چھ سوال یہ ہے کہ باقی چھ حروف کو ترک کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی؟

حافظ ابن حجر ریزی نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں ان حروف کے اختلاف کی وجہ سے شدید جھگڑے ہوتے ہیں، اس لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشروہ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان سب کو ایک حرف پر تحدیک دیا جاتے، لیکن یہ بھی ایسی بات ہو جسے باور کرنا بہت مشکل ہے حروف کے اختلاف کی بنا پر مسلمانوں کا اختلاف تو خود سرکارِ دنیا مصلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بیش آیا تھا، احادیث میں ایسے متعدد واقعات مردی میں کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو مختلف طریقے سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے سناتا ہے میں اختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ صحیح بخاریؓ کی روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ کے گلے میں چادر ڈال کر انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے تھے، اور حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ حروف کا یہ اختلاف مُستکریہ دل میں زبردست شکوہ پیدا ہوئے لگئے تھے، لیکن اس قسم کے واقعات کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حروف سیعہ کو ختم کرنے کے بجائے انھیں حروف کی رخصت سے آگاہ فرمایا، اور اس طرح کوئی فتنہ پیدا نہیں ہو سکا، صحابہؓ کرامؓ سے یہ بعد ہو کہ انھوں نے اس اسوہ حسنة پر عمل کرنے کے بجائے چھ حروف ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوا،

پھر عجیب بات ہو کہ علامہ ابن حجر ریزیؓ کے قول کے مطابق صحابہؓ نے چھ حروف تو اختلاف کے ڈر سے ختم فرمادیتے، اور فترات میں رجوانؓ کے قول میں حروف سے الگ ہیں، جوں کی توں باقی رکھیں، جنابخواہ آج تک محفوظ چل آتی ہیں، سوال یہ ہے کہ افراقؓ اندیشہ قرأت کے اختلاف میں نہیں تھا؟ جبکہ ان فتراتوں کی روشنی میں بعض مرتبہ ایک ایک لفظ میں بیس مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے؟ اگر چھ حروف ختم کرنے کا منشاء یہی تھا کہ مسلمانوں میں استخارہ پیدا ہوا درود سب ایک طریقے سے قرآن کی تلاوت کیا کریں تو قراءتوں کے اختلاف کو آخر کیوں ختم نہیں کیا گیا؟ جب قرأت کے اختلاف کو باوجود مسلمانوں کے انتشار کرو کا جا سکتا تھا، مسلمانوں کو سمجھایا جائے گا

کہ ان تمام طریقوں سے تلاوت جائز ہے تو یہی تعلیم حروف سبعہ کے باب میں فتنہ کا سبب کیوں سمجھ لی گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر "حروف سبعہ" اور "قراءات" کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی طرف ایسی حیرت انگیز و دعیٰ نسبت کرنی پڑتی ہے جس کی کوئی معقول توجیہ سمجھ میں نہیں آتی،

پھر حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کی طرف اتنے بڑے اقدام کی نسبت کسی صریح اور صحیح روایت کی بناء پر نہیں بلکہ بعض محل الفاظ کی قیاسی شرح کے ذریعہ کی گئی ہے جن روایات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمیع قرآن کا واقعہ بیان ہوا ہے اس میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ انہوں نے چھ حروف کو ختم فرمادیا تھا بلکہ اس کے خلاف دلیلیں موجود ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، اب کسی صحیح اور صریح روایت کے بغیر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ان چھ حروف کو بالکل بے نشان کر دیا گواہ اکر لیا جاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار فرمائش پر بذریعہ وحی نازل ہوتے تھے،

حقیقت یہ ہے کہ جن صحابہ کرامؓ کو جمع و ترتیب قرآن کے نیک کام میں محض اس لئے تأمل رہا ہو کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، جھوٹوں نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھنے میں اپنی عمری کھپائی ہوں، اور جھوٹوں نے منسوخ التلاarah آیات تک کو محفوظ کر کے اہم ترین تک پہنچایا ہو، اُن سے یہ بات بے اہم باعید ہے کہ وہ سب کے سب چھ حروف کو ختم کرنے پر اس طرح متفق ہو جائیا کہ آج اُن حروف کا کوئی نام و نشان تک باقی نہ رہے، جن آیات کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی صحابہ کرامؓ نے انھیں بھی کم از کم تاریخی حیثیت میں باقی رکھ کر ہم تک پہنچایا ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ "حروف" جن کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ منسوخ نہیں ہوتے، بلکہ محض مصلحت اُن کی نتارت و نتنا ختم کر دی گئی، اُن کی کوئی ایک مثال کسی ضعیف روایت میں بھی محفوظ نہ رہ سکی، یہی وجہ ہے کہ بیشتر محقق علماء نے حافظ ابن حجر طبریؓ کے اس قول کی تردید

فرمائی ہے، جن کے اقوال کی تفصیل آگئے آرہی ہے،

ام طحاوی کا قول | پچھے گزر چکا ہے کہ اُن کے نزدیک قرآن کریم نازل تو صرف ایک لغتِ قریش پر ہوا تھا، لیکن امت کی آسانی کے خیال سے یہ اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ قرآن کی تلاوت میں شات کی حد تک دوسرے مرادفات استعمال کر سکتے ہیں اور یہ مرادفات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متین فرمادی رہنے، اسی اجازت کو حد تک میں قرآن کریم کے ساتھ وہ نازل ہونیے تعمیر کیا گیا ہے، لیکن یہ جائز استاد اسلام میں تھی بعد میں جب لوگ قرآنی لغت کے عادی ہو گئی تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اجازت مسوخ ہو گئی، اور جب آپ راضی وفات پہلے رضانہیں حضرت جبریلؐ سے قرآن کریم کا آخری درکیا تو اقوس مرادفات مسوخ کر دیئے گئے، اور اب صرف ہی حرفاً باتی ہی جس پر قرآن کریم نازل ہوا تھا، یعنی حرفاً قریش، باقی چھ مرادفات مسوخ ہو چکے، یہ قول حافظ ابن حجر ریڑؐ کے قول کے مقابلہ میں اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں صحابۃ کرام کی طرف یہ بات منسوب نہیں کی گئی کہ چھ حرفاً انہوں نے ترک کئے بلکہ فرض کی نسبت خود ہمدرسالت کی طرف کی گئی ہے، لیکن اُس پر ایک اشکال تریہ ہوتا ہے کہ اس قول کے مطابق چھ حرفاً منزل من اللہ نہیں تھے، حالانکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ کے درمیان جو اختلاف پیش آیا اس میں حضرت ہشامؓ نے حضورؐ کے سامنے سورہ فرقان اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، تو اُسے سُنکر آپنے فرمایا، هکذا اُنٹریتُ ریہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے، اور کچھ حضرت عمرؓ نے اپنے طریقہ سے تلاوت فرمائی، اُسے سُنکر بھی آپ نے فرمایا ہکذا اُنٹریتُ ریہ سورت اسی طرح نازل کی گئی ہے، ان الفاظ کا کھلا ہوا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طریقے منزل من اللہ تھے،

دوسرے جیسا کہ پچھے عرض کیا گیا اس قول میں بھی قرأت کی حیثیت واضح نہیں

لہ سیع بخاری، کتاب الخصومات میں عدۃ القاری، ص ۲۵۸ ج ۱۲، میمنیہ مصر،

ہوتی کہ وہ شات حروف میں داخل تھیں یا نہیں، اگر داخل تھیں تو چھ حروف کی طرح اُن کے بارے میں بھی یہ کہنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) وہ متزل من اللہ نہیں ہیں، حالانکہ یہ اجماع کے خلاف ہے، اور اگر داخل نہیں تھیں تو ان کے علاوہ دیکھ دپر کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس قول پر بھی شرح صدر نہیں ہوتا،

سب سے بہتر قول | تیسرا قول جو سب سے زیادہ اطمینان بخش اور بے غبار ہے وہ یہی ہے کہ شات احرف سے مراد چونکہ اختلاف قراءت ہی کی شات مختلف نوعیتیں ہیں جن کا ذکر پچھے آچکا ہے، اس لئے یہ ساتوں حروف آج بھی پوری طرح محفوظ ہیں اور باقی ہیں، اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے، البته اتنا فرق ضرور ہوا اور کہ ابتداء سلام میں قرار توں کے اختلافات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور ان ہی مراتب الفاظ کے اختلافات کی کثرت تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ لغت قرآن کے پوری طرح عادی نہیں ہوتے انھیں زیادہ سے زیادہ ہمولت دی جائے، بعد میں جب اہل عرب لغت قرآن کے عادی ہو گئے تو مرادفات دیگر کے بہت سے اختلافات ختم کر دیتے گئے، چنانچہ آخر پخت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے جو آخری ذور کیا، را اور جسے اصطلاح میں عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے، اُس وقت بہت سی قراءتیں منسوخ کر دی گئیں، جس کی دلیل آگے آرہی ہے، لیکن جتنی فتراتیں اُس وقت باقی رہ گئیں وہ ساری کی ساری آج تو اتر کے ساتھ چلی آتی ہیں، اور ان کی تلاوت ہوتی ہے، آحرن سبعہ کی چیزیہ بحث میں یہ وہ بے غبار رہتے ہو جس پر تمام روایات حدیث بھی اپنی جگہ صحیح بیٹھ جاتی ہیں، اور نہ اُن میں کوئی تعارض یا اختلاف باقی رہتا ہے، اور نہ کوئی اور معقول اشکال پیش آتا ہے، اس سلسلے میں مکنہ شبہات کا جواب ہم آگے تفصیل کے ساتھ دیں گے، جس سے اس قول کی حقانیت اچھی طرح واضح ہو سکے گی، لیکن پہلے یہ میں لیجئے کہ اس قول کے قائل کون حضرت ہیں؟ یہاں ہم اُن حضرات کے اسماء کو رکاوے پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اس قول کو اختیار کیا ہے یا حافظ ابن جبریل طبریؓ کی تردید کی ہے :-

اس قول کے قائلین حافظ ابوالخیر محمد بن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ جو قرأت کے ایام اعظم میثور ہیں، اور حدیث و فقہ میں حافظ ابن حیثہ کے شاگرد اور حافظ ابن حجر عسکری کے استاذ ہیں، اپنی مشہور کتاب "النشر فی القراءات عشرة" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اما تكون المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الاحرف السبعة فان هذه مسئلة كبيرة اختلف العلماء فيها فذهب جماعات من الفقهاء والقراء والتكلمين الى ان المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الاحرف السبعة وينوا ذلك على الله لا يجوز على الامة ان تكمل نقل شيء من الحروف السبعة التي نزل القرآن بها وقد اجمعوا على نقل المصاحف العثمانية من الصحف التي كتبها ابو بكر وعمر وارسال كل مصحف منها الى مصر من امساك المسلمين وأجمعوا على ترك ما مأسوی ذلك، قال هؤلاء ولا يجوز ان ينسى عن القراءة بعض الاخر السبعة ولأن يجمعوا على ترك شيء من القرآن، وذهب جماعات من العلماء من السلف والخلف وائمة المسلمين الى ان هذه المصاحف العثمانية مشتملة على ما يحتمل رسمها فقط جامدة للعرضة الاخيرة التي عرضها النبي صلى الله عليه وسلم على جبئيل عليه السلام متضمنة لها مالم تتراء حرفًا منها، قلت وهذا القول هو الذي يظهر صوابه لات الاحاديث الصحيحة والاحاد المشهورة المستفيضة تدل عليه وتشهد له" ॥

"ربما يسئل كه حضرت عثمان بن عيسى نے جو مصاحف تیار فرماتے تھے وہ ساتوں حرث پر مشتمل ہیں یا نہیں؟ سو یہ ایک بڑا مسئلہ ہے جن میں علماء کا اختلاف ہے،

چنانچہ فقہاء، فتاویٰ اور متكلین کی جماعتوں کا مذہب یہ ہے کہ عثمانی مصاحف ساقوں حروف پر مشتمل ہیں، اس کی بیانیاد اس بات پر ہے کہ امت کے لئے یہ جائز نہیں کردہ ان سائیت حروف میں سے کسی حرفاً کو نقل کرنا ترک کر دے جن پر قرآن نازل ہوا، اور مصحابہ نے اجماعی طور پر یہ عثمانی مصاحف اُن حیفون سے نقل کئے تھے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ معرفتے تھے، اور ان میں ہر ایک مصحف عالمہ اسلام کے مختلف شہروں میں صحیح دیا تھا، اور ان کے مساواۃ تین صحیحے تھے اُن کو چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہ یہ بات جائز ہے کہ حروف سبعہ میں سے کسی حرفاً کی قرامت روک دی جائے، اور نہ یہ کہ صاحبہ زدہ آن کے کسی حصہ کے چھوڑنے پر متفق ہو جائیں، اور سلف و خلف کے علماء کی اکثریت کا قول یہی ہے، کہ یہ عثمانی مصاحف اُن حروف پر مشتمل ہیں جو ان کے رسم الخط میں سماگئے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے قرآن کریم کا جو آخری دور کیا تھا، اُس کے تمام حروف اُن مصاحف میں جمع ہیں، اُن میں سے کوئی حرفاً ان مصاحف میں نہیں چھوٹا، میرا خیال یہ ہے کہ یہی وہ قول ہے جس کی صحت ظاہر ہے، کیونکہ صحیح احادیث اور مشہور آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں، اور اس کی شبادرت دیتے ہیں ^{للہ}

آور علامہ بدرا الدین علیؑ نقل فرماتے ہیں :-

فاختلت الاصوليون هل يقى أاليوم على مبعثة أحرف فمتعه الطبرى وغيرا و قال إنما يجوز حرف واحد اليوم وهو حرف زين وتحى اليه القاضى أبو بكر و قال ابوالحسن الاشترى اجمع المسلمين على انه لا يجوز حظر ما وسعه الله تعالى من المفوعة بالاحرف التي انزلها الله تعالى ولا يسع للأمة

ان تمنع مایطلهه اللہ تعالیٰ، بل هي موجودة في قراءاتنا مفترقة
في القرآن غير معلومة فيجوز على هذَا، وبه قال القاضي ان
يقْدِمُ بَعْلُ مَاقْدِلَهُ أَهْلُ التَّوَاتِرِ مِنْ غَيْرِ تَبْيَانِ حُرْفٍ مِنْ حُرْفٍ
فِي حِفْظِ حُرْفٍ نَافِعٍ بِعْرَفِ الْكَسَابِيِّ وَحِمْزَةٍ وَلَا حِرْجٌ فِي ذَلِكَ^۱
”اور اس بارے میں اصولی علاوہ کا اختلاف ہے، کہ قرآن کریم کو آج سات حروف پر
پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ علامہ (ابن حجر) طبری^۲ دیگرو نے اس سے انکار
کیا ہے اور کہا ہے کہ آج قرآن کی قراءت ایک ہی حرف پر جائز ہے، اور وہ حضرت
زید بن ثابتؑ کا حرف ہے، اور قاضی ابو بکرؓ بھی اسی طرف مائل ہیں، لیکن امام
ابو الحسن شہریؓ فرماتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
جو حروف نازل کر کے اُنہیں کو ہبھولت عطا فرمائی تھی اسے رد کنائسی کے لئے^۳
جاائز نہیں اور امت اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ جس جیز کی اجازت اللہ نے^۴
دی ہو اسے روک دے، بلکہ واقعیہ ہے کہ ساتوں حروف ہماری موجودہ^۵
میں موجود ہیں، اور قرآن کریم میں متفرق طور سے شامل ہیں، البته معین طور سے^۶
معلوم نہیں، اس لحاظ سے اُن کی قراءت آج بھی جائز ہے، اور یہی قول قائمی تھا
کا ہے، جتنے حروف تو اتر کے ساتھ منقول ہیں اُن سب کو پڑھنا جائز ہے، اور ایک
حروف کو دو حصے کے حروف سے ممتاز کرنے کی بھی ضرورت نہیں، چنانچہ نافع و حر کی
قراءت کو کسائی^۷ اور حمزہؓ کی قراءت کے ساتھ مخلوط کر کے ایاد کر لیا جائے تو
اُس میں کچھ حرج نہیں ہے^۸۔
اور علامہ بدرا الدین زركشیؓ قاضی ابو بکرؓ کا قول نقل کرتے ہیں :-

لِعَمَدةِ الْقَارِيِّ، كِتَابُ الْخُصُومَاتِ، ص ۲۵۸ ح ۱۲ :

لَهُ عَالِيَّاً قَاضِي عِيَاضٌ مَارِيٌّ،

لَهُ اسْمَاعِيلَ كَتَبَ تَفْصِيلَ كَتَبَ مُلَاحِظٌ هُوَ النَّشْرُ فِي الْقَرَاءَاتِ الْعَشْرِ، ص ۱۸ و ۱۹ ح ۱

والسابع اختارة القاضي ابو بکر، وقال: الصحيح ان هذة الاحرف السبعة ظهرت واستفاضت عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وضبطها عنه الاشنة واشتبه اعتمانُ والصحابةٌ في المصحف»
ساتوں قول قاضی ابو بکرؓ نے اختیار کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ صحیح یہ ہو کہ یہ ساتوں حروف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہرت کے ساتھ منقول ہیں، انکے نے اپنی محفوظ رکھا ہی، اور حضرت عثمانؓ اور صحابہؓ نے انھیں مصحف میں باقی رکھا ہے۔
اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حافظ ابن حجر ریڑؓ کے قول کی بڑے سخت الفاظ میں تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ چھے حروف کو ختم کرنے کا قول بالکل غلط ہے، اور اگر حضرت عثمانؓ ایسا کرنا بھی چاہتے تو نہ کر سکتے، کیونکہ عالم اسلام کا چھپے چپے ان حروف
بعد کے حافظوں سے بھرا ہوا تھا، وہ لکھتے ہیں :-

وَمَا قُولَّ مِنْ قَالَ أَبْطَلَ الْأَحْرَفَ السَّتَّةَ فَقَلَ كَنْ بِمِنْ قَالَ ذَلِكَ وَلَوْ فَعَلَ عَثَمَانُ ذَلِكَ أَوْ أَرَادَهُ لِخُرُجَ عَنِ الْإِسْلَامِ وَلِمَا مُطِلَّ سَاعَةً بِلِ الْأَحْرَفِ السَّبْعَةِ كُلُّهَا مَرْجُودَةٌ عَنْ نِيَاقَاتِهِ كَمَا كَمَا كَانَتْ مَثِيُوتَةً فِي الْقُرْآنِ الْمُشْهُورَةُ الْمَأْتُورَةُ ۝

برایا قول کہ حضرت عثمانؓ نے چھے حروف کو منسوخ کر دیا تو جس نے یہ بات کی ہے اس نے بالکل غلط کہا ہے، اگر حضرت عثمانؓ ایسا کرتے یا اس کا ارادہ کرتے تو ایک ساعت کے وقت کے بغیر اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہو-

لہا ببریان فی علوم القرآن، ص ۲۲۳ ج ۱ ۳۷۰ غالباً قاضی ابو بکر باقلانی حمدار ہیں، کیونکہ یہ عبارت علماء نوویؒ نے قاضی باقلانیؒ کے نام سے روایت کی ہے رنووی شرح مسلم، ص ۲۲، ج ۱)
سلہ ابن حزمؓ الفصل فی الملل دالاہوا، والخل، ص ۲، ج ۲، ۲۷، مکتبۃ المتنی بغداد،
لہا علامہ ابن حزمؓ کا یہ قول اس صورت میں ہے جبکہ یونہا جاگے کہ حضرت عثمانؓ نے رمعاذ اللہ
چھے حروف کو منسوخ کر دیا، لیکن اپنے ارض رکھ کر حافظ ابن حجر ریڑؓ کے قول کے مطابق انھوں نے چھے حروف
کو منسوخ نہیں کیا بلکہ انکی قرات ترک فرمائی تھی، اس لئے اگرچہ حافظ ابن حجر طبریؓ کا قول درست
ہو یعنی وہ اتنے سخت الفاظ کے ... مستحب نہیں ہیں،

کرساتوں کے ساتوں حروف ہمارے پاس بعینہ موجود اور مشہور اور قرامتوں
میں محفوظ ہیں۔^{۱۰}

اور مشہور شارح موطاً علامہ ابوالولید باجی مالکی رحمۃ اللہ علیہ رمتوفی ۹۳۷ھ
سبعة احرف "کی تشریح سات و جوہ قرات سے کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

فَإِنْ قِيلَ هُلْ تَقُولُونَ أَنْ جَمِيعَ هَذَا السَّبْعَةِ الْأَحْرَفِ ثَابِتَةٌ فِي
الْمُصْحَّفِ فَإِنَّ الْقِرَاءَةَ بِجَمِيعِهَا جَائِرَةٌ تَقِيلُ لَهُمْ كُلُّ ذَلِكَ نَقْوُلُ،
وَالدَّلِيلُ عَلَى صَحَّةِ ذَلِكَ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الْكِتَابَ
وَإِنَّا لَهُ لَهَا فَاعْظُمُونَ، وَلَا يَصِحُّ الْفَصَالُ إِنَّ كَرَمَنَا تَرْبِلُ مِنْ قَرْءَةٍ
فَيَكِنْ حَفْظَهُ دُونَهَا وَهَمَا يَدِلُ عَلَى صَحَّةِ مَا ذَهَبَنَا إِلَيْهِ أَنْ
ظَاهِرُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدِلُ عَلَى أَنَّ الْقُرْآنَ
أَنْتَرَلُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ تِيسِيرًا عَلَى مَنْ أَرَادَ قِرَاءَتَهُ لِيَقْرَأَ
كُلَّ رَجُلٍ مِنْهُمْ بِمَا تَيَسَّرَ عَلَيْهِ وَبِمَا هُوَ أَخْفَتُ عَلَى طَبْعِهِ وَ
أَقْرَبُ إِلَى لُغَتِهِ لِمَا يَلْعَنُ مِنَ الْمُشَقَّةِ بِذَلِكَ الْمَالُوفُ
مِنَ الْعَادَةِ فِي النُّطُقِ وَنَحْنُ الْيَوْمَ مَعْ جَمِيعِهِ الْسَّنَنَ وَ
بَعْدَ نَاهِنْ فِي صَاحَةِ الْعَرَبِ أَحْرَفَ^{۱۱}

"اگر یہ پوچھا جاتے کہ کیا آپ کا قول یہ ہے کہ یہ ساتوں حروف مصحف میں
راج بھی موجود ہیں، اس لئے کہ ان سب کی قرات رآپ کے نزدیک ()
جاائز ہے، تو ہم یہ کہیں گے کہ جی ہاں ہمارا قول ہی ہے، اور اس کی محت کی
دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الْكِتَابَ وَإِنَّا لَهُ
لَهَا فَاعْظُمُونَ وَهُمْ نَهَىٰ قُرْآنَ نَازِلٍ کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے
والے ہیں، اور قرآن کریم کو اس کی قرات سے الگ ہمیں کیا جا سکتا کہ قرآن تو

محفوظہ ہر اور اس کی قراءات ختم ہو جائیں اور ہمارے قول کی صحت پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تجھے طور پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کو سات حروف پر اس لئے نازل کیا گیا تاکہ اس کی قراءت کرنے والے کو آسانی ہو تاکہ ہر شخص اس طریقے سے تلاوت کر سکے جو اس کے لئے آسان ہو۔ اس کی طبیعت کے لحاظ سے زیادہ ہسل اور اس کی لغت سے زیادہ قریب ہوا، سیکونکہ گفتگو میں جو عادات پڑھاتی ہے اُسے ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے، اور آج ہم لوگ اپنی زبان کی بھیت اور عربی فصاحت سے دور ہونے کی بنا پر اس ہدایت کے زیادہ محتاج ہیں ॥

اور حضرت امام عنزیٰ؟ اصول فقہ پر اپنی مشہور کتاب "المستصلق" میں قرآن کریم کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں :-

ما نقل اليابین دفتی المصحف على الاحرف السبعة المشهورة
نقلاً متواتراً ۖ

"دہ کلام جو مصحف کی دروفیتوں میں مشہور ثانیات حروف کے مطابق متواتر طبقہ
پر تم تک پہنچا ہے" ۶

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام عنزیٰ بھی حروف سبع کے آج تک باقی رہنے کے قائل ہیں، اور مثلاً علی قاری رحمتو فی رکانۃ حکم تحریر فرماتے ہیں ۷:-

وَكَانَهُ عَلَيْهِ الْمُثْلُوَةُ وَالسَّلَامُ كَشْفُهُ إِنَّ الْقِرَاءَةَ الْمُتَوَاتِرَةَ تَسْقُرُ
فِي أَمْتَهُ عَلَى سَبِيعٍ وَهِيَ الْمُوَجُودَةُ إِذَاً مَتَّفِقٌ عَلَى تَوَاتِرِهَا وَالْمُجْهُوَّ
عَلَى أَنْ مَا فُوْقَهَا شَذٌّ لَا يَحِلُّ الْقِرَاءَةُ بِهِ ۸

"او رایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ مکشف ہو گیا تھا، کہ

له المستصلق، ص ۹۵ ج ۱، المكتبة التجارية الکبرى، مصر ۱۴۰۷ھ

سلہ مرقة المفاتیح، ص ۱۶ ج ۵، مکتبۃ امدادیہ ملکان، ۱۴۰۸ھ

متواتر قراتیں آپ کی امت میں آخر کار سات رہ جائیں گی، چنانچہ وہی آج بوجو
یہ اور ان کے متواتر اتفاق ہے، اور جہور کا مسلک یہ ہے کہ اس کے علاوہ جو ذرایں
ہیں وہ شاذ ہیں اور ان کی تلاوت جائز نہیں ہے۔

اس میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان ا تو درست ہے کہ سات قتراء توں کے
ماسوا جتنی قتراء ہیں وہ سب شاذ ہیں، کیونکہ علماء قرآن نے اس کی سخت تردید کی
ہے، لیکن اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک احرف سبعہ آج بھی باقی ہیں
اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دھلویؒ کا قول صحیح گذرا چکا ہے، کہ ”سبعۃ احرف“
یہ سات کے عدد کو کثرت کے معنی پر محمول کرتے ہیں، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ
لکھتے ہیں :-

”وَدِلِيلٍ بِرَأْنَاكَهُ ذَكَرْ سبْعَهُ سَبْعَهٌ تَكْثِيرٌ اسْتَ زِيرَاتِهِ تَحْدِيدٌ اقْتَاقَ امْرَهُسْتَ
بِرْ قَرَآتِ عَشْرَ دِهْرَ قَرَآتِهِ رَازِيْنِ عَشْرَهُ دِهْرَادِيْ سَتَ دِهْرَيْكَهُ بَارِيْگَرَهُ
مُخْلِفَ سَتَ پِسَ مُرْتَقِ شَدَ عَدْدَ قَرَآتَهُ تَابِيْسَتَ لَهُ“

”اور اس بات کی دلیل کہ سات کا عدد حدیث میں تکثیر کے لئے ہے مذکور تحدید کے لئے
دش قراء، توں پر ائمہ کا اتفاق ہے، اور ان دش قراء، توں میں سے ہر ایک کے دراوی
یہیں، اور ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے، پس قرآن کی تعداد بینیں تک پہنچ گئی ہیں“
اس عبارت میں اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے
لفظ ”سبعہ“ کو جہور کے خلاف تکثیر کے لئے قرار دیا ہے، (کیونکہ شاید بینیں قتراء، توں کو
سات وجہ اخلاق میں محصر قرار دینا ان پر واضح نہیں ہو سکا) لیکن اس سے یہ بات
باکل ظاہر ہے کہ جن حدیث کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے وہ حضرت شاہ صاحب محمد اللہ
علیہ کے نزدیک قراتیں ہی ہیں، اور وہ منسوخ یا متروک نہیں ہوئے، بلکہ آج بھی باقی ہیں۔

لہ ملاحظہ ہو انتشر فی القراءات العشر ج ۳۲ و مابعد، ج ۱،
د المصنف، ص، ۱۸ مطبوعہ فاردقی دھلی

آخری دو میں دینی علوم کے اہم محقق عصر، اور حافظ حدیث حضرت عَلَامُ
اور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تحقیق کرتے ہوئے مسئلہ کی
حقیقت مختصر الفاظ میں اس طرح واضح فرمادی ہے کہ اسے حرفاً آخر کہنا چاہئے، یہاں
ہم ان کی پوری تحقیق نقل کرتے ہیں :-

واعلم اهتمم التقواعلی انه ليس المراد من سبعة احرف القراءة
السبعة المشهورة، بان يكون كل حرف منها قراءة من تلك
القراءات، اعني انه لا انطباق بين القراءات السبع والآخر
السبعة كمابين هب اليه او هم بالنظر إلى لفظ السبعة في
الموضعين، بل بين تلك الاحرف والقراءة علوم وخصوص
وحجج، كيف، وان القراءات لا تتحصل في السبعة، كما صرخ
ابن الجزری في رسالة النشر في قراءة العشرين، وانما اشتهرت
السبعة على الالسنة لأنها التي جمعها الشاطبی ثم اعلم
ان بعضهم فهم ان بين تلك الاحرف تغايرات من كل وجه،
بحيث لا دریط بینها وليس كذلك، بل قد يكون الفرق بالبعد
والترتيب واخری بالابواب، ومرة باعتبار الصيغ من الغائب
والعاشر، وطوراً بتحقيق المعنی وتسمیتها، تكون هذه
التغييرات يسيرة او كانت او كثيرة حرفاً برأسه، وغلط من
فهم ان هنـ الاحرف متغايرـة كلها بحیث یتعذر راجتاها
اما انه یکتفعـ بالسبعة فنـ توجهـ اليـ ابنـ الجـزـرـیـ حقـ
ان التصرفات كلها تترجمـ الى السبعة وراجـم القـسطـلـانـ وـ
الذرـقـانـ، بـقـىـ الـکـلامـ فـ انـ تـلـكـ الـاحـرـفـ كـلـهـاـ مـوجـودـةـ اوـ رـفعـ
بعـضـهاـ اوـ بـقـىـ الـبـعـضـ فـ اـعـلـمـ انـ ماـ قـرـأـهـ جـبـرـیـلـ عـلـیـهـ السـلـامـ
فـیـ الـعـرـضـةـ الـاخـیرـةـ عـلـیـ النـبـیـ صـلـیـ اللـہـ عـلـیـهـ وـسـلـمـ کـلـهـ

ثابت فی مصحف عثمان، ولما يتعين معنى الاحرف عن ابن حجر
 ذهب إلى رقم الاحرف الثالث منها وبقي واحد فقط^{لہ}
 یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ تمام علماء اس بات پر تو متفق ہیں کہ شاٹ حروف سے مراد
 مشہور شاٹ قراتین ہمیں اور یہ بات ہمیں ہے کہ ہر حرف ان شاٹ قراتوں
 میں سے ایک قراۃت ہو، مطلب یہ کہ شاٹ قراتین اور شاٹ حروف ایک
 چیز ہمیں جیسے کہ شاٹ کے لفظ سے پہلی نظر میں وہ ہوتا ہے، بلکہ ان حروف اور
 شاٹ قراتوں میں عموم و خصوص من دلکھ کی نسبت ہے، اور یہ دونوں ایک کیوں
 ہو سکتے ہیں جبکہ قراتین شاٹ میں مخصوص ہمیں، جیسا کہ علامہ ابن الجوزی نے
 النشر فی قراءة العشر میں تصریح کی ہے، البتہ شاٹ قراتوں کا لفظ زبان پر
 اس نے مشہور ہو گیا کہ علامہ شاطبی نے انہی شاٹ قراتوں کو جمع کیا ہے،
 پھر یہ سمجھی یاد رکھتے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاٹ حروف کے درمیان
 کلی تغایر ہے، اور ان میں کوئی باہم ربط نہیں ہے، حالانکہ واقع ایسا نہیں
 بلکہ بعض اوقات دو حروف میں فرق صرف صیغہ مجرد اور صیغہ مزید کا ہوتا
 ہے اور بعض مرتبہ صرف (صرف) ابواب کا، اور بعض دفعہ غائب و حاضر کے
 صیغوں کا اور کبھی صرف ہمزہ کو باقی رکھنے اور اس کی تسہیل کرنے کا، پس یہ
 تمام تغیرات خواہ معقولی ہوں یا برطے برطے مستقل حرف ہیں، اور جو لوگ یہ سمجھو
 ہیں کہ حروف کے درمیان کلی تغایر ہے، اور ان کا ایک کلمہ میں (جمع ہنزا نامکن) ہے

لہ فیض الباری، ص ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳ ج ۳، ۳۷ مطلب یہ کہ شاٹ قراتوں میں سے بعض قراتین
 احراف سبعہ میں سے ہیں، جیسے کہ تمام متواتر قرات اور بعض قراتین ایسی ہیں جو احراف سبعہ میں اصل
 ہمیں، مثلاً قرات سیمہ کی شاذ قراتین، یا وہ قراتین جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور احراف سبعہ
 کے بعض اختلافات ایسے ہیں جو قرات سبعہ میں شامل نہیں، مثلاً امام یعقوب، امام ابو جعفر اور
 خلفت کی متواتر قراتین کیہ احراف سبعہ میں ہیں، مگر معروفت قرات سبعہ میں سے نہیں ۱۲ محترفی

آن سے غلطی ہوئی ہے، تہی یہ بات کہ حدیث میں سات کے عدد کا کیا مطلب ہے؟ سو اس کا جواب علامہ ابن الجزری چنے دیا ہے، اور تحقیق یہ بیان کی ہے کہ یہ سالی تینی رات سات قسم کے ہیں، اور اس سلسلے میں قسطلانیؒ اور زرقانؒ کی مراجعت بھی کر لیجئے،

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ یہ تمام حروف موجود ہیں، یا ان میں سے بعض ختم کر دیتے گئے، اور بعض باقی ہیں، پس یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جتنے حروف حضورؐ کے ساتھ قرآن کے دوسرے پڑھتے تھے وہ سب حضرت عثمانؓ کے مصحف میں موجود ہیں، اور چونکہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ پر حروف کے معنی واضح نہیں ہو سکے، اس لئے انھوں نے یہ مذہب اختیار کر لیا کہ چھ حروف ختم ہو گئے، اور صرف ایک باقی رہ گیا؎

اسی طرح مصر کے علماء متأخرین میں سے مشہور حجت علامہ زادہ الکوثریؒ (متوفی ۷۲۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:-

والدائل رأى القاتلين بان الاحرف السبعة كانت في ميدان الامر ثم نسخت بالعرضة الاخيرة في عهدين النبي صلى الله عليه وسلم فلم يبق الاحرف واحداً ورأى القاتلين بان عثمان رضي الله عنه، جسم الناس على حرف واحد ومن من استثنى فتابعوه لكن هذان رأى خطير قام ابن حزم باشتذن النكير عليه في الفصل وفي الاحكام أدل له الحق في ذلك، اثنان رأى القاتلين باهلاه الاحرف السبعة المحفوظة كما هي في العرضة الاخيرة، ثم

”ہمیں راتے رکم موجودہ قرآن ایک ہی حرف کی مختلف شکلیں ہیں) اُن حفڑت کی ہو جو یہ کہتے ہیں کہ شاہزاد حروف ابتداء اسلام میں تھے، پھر عرضہ اخیرہ (حضرت جبریلؑ سے حضور مسیح کے آخری دور) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمان میں منسُوخ ہو گئے، اور اب حرف ایک باقی رہ گیا، نیز ہی راتے اُن حفڑت کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو ایک حرف پر بحث کر دیا تھا، اور ایک مصلحت کی وجہ سے باقی چھ حروف کی تراتے روک دی تھی، حافظ ابن جبریلؑ کا یہی مسلک ہے، اور یہیت سے لوگ اس معامل میں اُن سے مرعوب ہو کر اُن کے پیچے لگتے گئے، لیکن درحقیقت یہ بڑی سنگین اور خطرناک راستے ہے، اور علامہ ابن حزمؓ نے ”الفصل“ اور ”الاحکام“ میں اس پر بحث ترین نکیرے ہے، جس کا انھیں حق تھا، اور دوسری راستے رکم موجودہ قرآن ہی) احرف سبعہ ہیں، اُن حفڑت کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہی وہ حروف ہیں جو عرضہ اخیرہ کے مطابق محفوظ چلے آتے ہیں۔“

ہم نے یہ تمام اقوال تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کئے ہیں کہ آجکل علامہ ابن جبریل طبریؑ کا قول ہی زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اور علامہ ابن جبریلؑ کی جلیل القدر شخصیت کے پیش نظر اسے عموماً ہرشک و شبہ سے بالاتر سمجھا جاتا ہے، اس کی بناء پر ابن الجزریؑ کا یہ بے غبار قول یا تو لوگوں کو معلوم نہیں ہے، یا اگر معلوم ہے تو اسے ایک ضعیف قول سمجھا جاتا ہے، حالانکہ گذشتہ بحث کی روشنی میں یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ امام مالکؓ، علامہ ابن قتیبیؓ، علامہ ابو الفضل رازیؓ، قاضی ابو بکر این الطیبؓ، امام ابوالحسن شعریؓ، قاضی عیاضؓ، علامہ ابن حزمؓ، علامہ ابوالولید باجیؓ، امام غزالیؓ اور ملا علی قاریؓ جیسے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ساتوں حروف آج بھی محفوظ اور باقی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عرضہ اخیرہ کے وقت جتنے حروف باقی رہ گئے تھے اُن میں سے کوئی نہ منسُوخ ہوا، نہ اسے ترک کیا گیا، بلکہ محقق ابن الجزریؓ نے اپنے اس قول کو اپنے سے پہلے جہور علماء کا

مسلم قرار دیا ہے، علماء متأخرین میں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا نور شاہ صاحب کشمیری اور علامہ زاحد کوثریؒ کا بھی یہی قول ہے، نیز مصر کے مشہور علامہ محمد بن جیت مطیعیؒ، علامہ خضری دمیاطیؒ اور شیخ عبدالعزیزم رقانی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، ہنذا دلائل سے قطع نظر، محض شخصیات کے لحاظ سے بھی یہ قول بڑا ذریق قول ہے،

اس قول کے دلائل اب وہ دلائل ذیل میں پیشِ خدمت ہیں جن سے اس قول کی تائید ہوتی ہے، اس کے کچھ دلائل تو مذکورہ بالا

اقوال میں آجھے ہیں، مزید مندرجہ ذیل ہیں:-

- ۱۔ قرآن کریم کی آیت **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الْكِتَابَ دَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** (رسم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) صراحة کے ساتھ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جو آیاتِ قرآنی خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ نہ فرمائی ہوں وہ قیامت تک باقی رہیں گی، دوسری طرف پیچے وہ احادیث گر جکی ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ قرآن کے شاتوں حروف منزّل من اللہ تھے، اس تو مذکورہ آیت کا واضح تقاضا ہی ہے کہ وہ شاتوں حروف قیامت تک محفوظ رہیں گے۔
- ۲۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ حروف کو ختم کر کے صرف ایک حرف پر مصحف تیار کیا ہوتا تو اس کی کہیں کوئی صراحة تو ملنی چاہئے تھی، حالانکہ نہ صرف اس کی کوئی صراحة موجود تھیں ہے، بلکہ ردا یات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحف عثمانی میں شاتوں حروف موجود تھے، مثلاً ردا یات میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا مصحف حضرت ابو بکر رضی کے جمع فرمودہ صحیفوں کے مطابق لکھوا یا تھا، اور لکھنے کے بعد دونوں کا مقابلہ بھی کیا گیا، جس کے باوجود خود حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں :-

فحضرت المصطفى عليهما فلم يختلفنا في شئٍ،^{۱۷}
 ”بَلْ نَعْلَمُ مِنْ كُلِّ أَنْوَارٍ“
 اور ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر ریاضیؒ بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے
 میں ساتوں حرودت موجود تھے، اس لئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں میں قرآن کریم کو لفظی
 ان ساتوں حرودت پر لکھا گیا ہو گا، لہذا اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تچھے حرودت کو ختم کر دیا ہوتا
 تو حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ ارشاد کیسے درست ہو سکتا ہے کہ ”دو نوں میں کوئی اختلاف
 نہیں تھا“^{۱۸}

۳۔ علامہ ابن الانباریؓ نے کتاب المصاحف میں حضرت عبیدہ سملانی رضی اللہ عنہ کا جو
 مشہور تابعی ہیں یہ قول نقل فرمایا ہے :-

قراءتنا التي جهم الناس عثمانٌ عليهما هى العرضة الأخرى الله
 ہماری وہ قراءت جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع فرمایا وہ عرضة اخیرہ
 کی قراءت تھی؎^{۱۹}

حضرت عبیدہ کا یہ قول اس بات پر باکل صریح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے
 اُن حرودت میں سے کوئی نہیں چھوڑا، جو عرضہ اخیرہ (حضرت جرجسیلؓ کے ساتھ حضورؐ)
 کے آخری قرآنی دور) کے وقت باقی تھے، اس پر بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ
 کا آخری مذہر صرف ایک حرفت قریش پر ہوا تھا، اور اسی پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کو
 جمع کر دیا، لیکن یہ بات بہت بعد ہو گئی جو حرودت منسون خ نہیں ہوئے تھے وہ اس
 دور سے خارج رہے ہوں،^{۲۰}

۵۔ حضرت محمد بن سیرینؓ بھی مشہور تابعی ہیں، علامہ ابن سعدؓ نے اُن کا یہ قول

له مشکل الآثار، ص ۱۹۳ ج ۳، تله کنز الحال، حدیث نمبر ۲۸۲ ج ۱، دائرة المعارف
 دکن عسلام، یہی روایت حافظ ابن حجر نے بھی مسند احمد، ابن الجوزی، ابی داؤدؓ اور طبریؒ کے حوالہ سے
 نقل کی ہے رفتح الباری، ص ۳۶ ج ۹۔

نقل فرمایا ہے :-

”کان جب تیل یعنی حضرت القرآن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
کل عام مرّۃ فی رمضان فلم کان العام الاعوام الذی توفی فیه
عرضه علیہ مرتین، قال محمد، فأنما رجوان تكون قراءتنا
العرضة الاخیرۃ“^{۱۶}

حضرت جرجسیل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ رمضان میں حضورؐ کے سامنے
قرآن پیش کیا کرتے تھے، چنانچہ جب وہ سال آیا جس میں آپؐ کی وفات ہوئی
تو حضرت جرجسیل علیہ السلام نے دو مرتبہ قرآن پیش کیا، پس مجھے امید ہو کر
ہماری موجودہ قراءت اس عرضۃِ اخیرہ کے مطابق ہے۔“

- حضرت عامر شعبیؓ بھی مشہور تابعی ہیں، اور انہوں نے ساسو جاہی استفادہ کیا ہے،
علامہ ابن الجوزیؓ نے ان سے بھی اسی قسم کا قول نقل کیا ہے،
یہ تینوں حضرات تابعی ہیں اور حضرت عثمانؓ کے ہمدرد سے ہنایت قریب ہیں،
اس لئے اُن کا قول اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے،

- پولے ذیخراً احادیث میں ہمیں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے
یہ ثابت ہو کہ فتنہ آن کریمؐ کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک سائٹ
حروف کا اختلاف اور دوسرے قراءتوں کا اختلاف، اس کے بجائے بہت سی روایتوں
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں، کیونکہ ایک ہی قسم کے اختلاف پر سیکوقت
اختلاف قراءت اور ”اختلاف احرف“ دونوں الفاظ کا اطلاق کیا گیا ہے، مثال
کے طور پر حضرت اُبی بن کعبؓ فرماتے ہیں:-

كَدْتُ بِالْمَسْجِدِ فَخَلَ رَجُلٌ يَصْلِي فَقَرَأَ قِرَاءَةً أَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ وَ

له ابن سعدؓ: الطبقات الکبری، ص ۱۹۵ ج ۲ جزء ۶ دار صادر بیروت مکتبہ
سلیمان النشر، ص ۸ ج ۱

و دخل اخْر قراءة سُورَى قراءة صاحبہ فلما قصینا الصلوٰة
 / دخلنا جمیعاً علی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فقلت آن
 هن اقرأ قراءة انکر کھا علیہ و دخل اخْر قراءة سُورَى
 قراءة صاحبہ فامرہ مارسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فقرأ
 فحسن النبي صلی اللہ علیہ وسلم شائخہ ما فسق طفی نفی
 من التکذیب ولا ذکرت فی الجاهلیة فلم تار آئی رسول الله صلی^{لہ علیہ وسلم}
 اللہ علیہ وسلم ما قد غشینی ضرب فی صدری ففضحت
 عرقا و کانما الظراء ای اللہ فرقا فقال لی یا ابی آن ربی عزوجل
 ارسِل لی آن اقرأ القرآن الی حرف فرددت الیه آن هؤون
 علی امّتی فردا لی الثانية اقرأہ علی حرفین فرددت الیه
 آن هؤون علی امّتی فردا لی الثالثة اقرأہ علی سبعۃ احروف
 میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص داخل ہو کر ناز پڑھنے لگا، اس نے ایک ایسی قراءت
 پڑھی جو مجھے اجنبی معلوم ہوتی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اُس نے پہلے شخص کی
 قراءت کے سوا ایک اور قراءت پڑھی، پس جب ہم نے نماز ختم کر لی تو ہم سب
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، میں نے عرض کیا کہ اس شخص
 نے ایک ایسی قراءت پڑھی ہے جو مجھے اجنبی معلوم ہوتی، پھر ایک دوسرا شخص
 آیا اس نے پہلے شخص کی قراءت کے سوا ایک دوسرا قراءت پڑھی، اس پر
 آپ نے دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا، ان دونوں نے قراءات کی توحضوں نے
 دونوں کی تحسین فرمائی، اس پر میرے دل میں تکذیب کے لیے وسوسے آئے لگے
 کہ جاہلیت میں بھی ایسے خیالات ہمیں آئے تھے، پس جب رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم نے میری حالت دیکھی تو میرے سینے پر مار جس سے میں پسینہ میں

میں شرایور ہو گیا، اور حروف کی حالت میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اللہ کو دیکھ رہا ہوں، پھر آپ نے فرمایا کہ اے اُمیٰز! امیرے پروردگار نے میرے پاس پیغام بھیجا تھا، کہ میں قرآن کو ایک حرف پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمّت پر آسانی فرمائیے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ پیغام بھیجا کہ میں قرآن دو حروف پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمّت پر آسانی فرمائیے، تو اللہ تعالیٰ نے تیسرا بار پیغام بھیجا کہ میں اسے سات حروف پر پڑھوں ॥

اصل روایت میں حضرت اُبی بن کعبؓ دنوں اشخاص کے اختلاف تلاوت کو بار بار اختلاف قراءت سے تعبیر فرمائے ہیں، اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات حروف کے اختلاف سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ قراءت کے اختلاف اور حروف کے اختلاف کو ہمدرد رسالت میں ایک ہی چیز سمجھا جاتا تھا، اور اس کے خلاف کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جو دنوں کی جداگانہ حیثیت پر دلالت کرتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دنوں ایک ہی چیز ہیں، اور جب قرأت کا محفوظ ہونا تو اتر اور اجماع سے ثابت ہر، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ احرفہ سبعہ آج بھی محفوظ ہیں،

مذکورہ بالادلائل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حروف سبعہ کا جتنا حصہ عرضہ اخیرہ کے وقت باقی رہ گیا تھا وہ سارا کاسارا عثمانی مصاحتیں محفوظ کر لیا گیا تھا، اور وہ آج تک محفوظ چلا آتا ہے، نہ اسے کسی نے منسوخ کیا اور نہ اس کی قراءت ممنوع قرار دی گئی، لیکن ضروری ہے کہ مکمل وضاحت کے لئے ان ممکنہ سوالات کا جواب بھی دیا جائے جو اس قول پر وارد ہو سکتے ہیں،

اس قول پر وارد ہونیوالے [۱] اس قول پر سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ساتوں حروف کو باقی سوالات اور ان کا جواب رکھا ہے تو پھر ان کا وہ امتیازی کا زانہ کیا تھا جسکی

دجہ سے اُن کو "جامع قرآن" کہا جاتا ہے ۹

اس کا براہی ہو کہ آگرچہ قرآن کریم بے شمار صحابہ کو پورا یاد تھا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک قرآن کریم کا معیاری نسخہ صرف ایک تھا جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتب فرمایا تھا، یہ نسخہ بھی مصحف کی نسلک میں نہیں تھا، بلکہ ایک ایک سورت علیحدہ علیحدہ صحیفوں میں لکھی ہوئی تھی، لیکن بعض صحابہؓ نے الفزادی طور پر اپنے اپنے مصاحت اگل اگل تیار کر کے تھے، اُن میں نہ رسم الخط متحرک تھا، نہ سورتوں کی ترتیب بیساکھی، اور نہ ساتوں حروف بجمع تھے، بلکہ ہر شخص نے آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس حرف کے مطابق قرآن سیکھا تھا اسی کو اپنے طور پر لکھ دیا تھا، اس لئے کسی مصحف میں کوئی آیت کسی حرف کے مطابق لکھی ہوئی تھی، اور دوسرے مصحف میں کسی اور حرف کے مطابق، جب تک ہمدرد رسالت قریب تھا اور مسلمانوں کا تعلق مرکز اسلام یعنی مدینہ طیبہ سے مضمبوطاً اور تحکم تھا، مصاحت کے اس اختلاف سے کوئی قابل ذکر خرابی اس لئے پیدا نہ ہو سکی کہ قرآن کریم کی حفاظت میں اصل مدار مصاحت کے بجائے حافظہ پر تھا، اور صحابہؓ کی اکثریت اس بات سے باخبر تھی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، لیکن جب اسلام دور دراز حوالک تک پھیلا اور نئے نئے لوگ مسلمان ہوتے تو انہوں نے صرف ایک طریقے سے قرآن سیکھا، اور یہ بات ان میں عام نہ ہو سکی کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، اس لئے ان میں اختلاف پیش آنے لگا، بعض لوگ اپنی قرائت کو حق اور دوسرے کی قراءت کو باطل سمجھنے لگے، اور ھر چونکہ الفزادی طور پر تیار کئے ہوئے مصاحت بھی، حرف اور رسم الخط کے اعتبار سے مختلف تھے، اور ان میں حروف سبعہ یہجا کرنے کا استمام نہیں تھا، اس لئے کوئی ایسا معیاری نسخہ ان کے پاس موجود نہیں تھا جس کی طرف رجوع کر کے اختلاف رفع کیا جاسکے،

ان حالات میں حضرت عثمانؓ نے محسوس کیا کہ اگر یہ صورت حال برقرار رہی اور الفزادی مصاحت کو ختم کر کے قرآن کریم کے معیاری نسخہ عالم اسلام میں نہ پھیلا دے گئے تو زبردست فتنہ روپا ہو جائے گا، اس لئے انہوں نے مندرجہ ذیل کام کئے :-

- ۱۔ قرآن کریم کے شات معیاری نسخ تیار کرنے اور انہیں مختلف اطراف میں روانہ کر دیا،
- ۲۔ ان مصاحت کا رسم الخط ایسا رکھا، کہ اس میں ساتوں حروف سما جائیں، چنانچہ سب مصاحت نقطوں اور حرکات سے خالی تھے، اور انہیں ہر حرفت کے مطابق ٹریا جاسکتا تھا۔
- ۳۔ جتنے انفرادی مصاحت لوگوں نے تیار کر کر کھے تھے ان سب کو نذر آتش کر کے دن کر دیا،
- ۴۔ یہ پابندی عائد کر دی کہ آئندہ جتنے مصاحت لکھے جائیں وہ سب ان شاہ مصاحت کے مطابق ہونے چاہئے،
- ۵۔ حضرت ابو بکر رضی کے صحیفے الگ الگ سورتوں کی شکل میں تھے، حضرت عثمان بن عفی نے ان سورتوں کو مرتب کر کے ایک مصحف کی شکل دیدی،
- ان اقدامات سے حضرت عثمان بن عفی کا مقصد یہ تھا کہ پویے عالم اسلام میں رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحت یکسان ہو جائیں، اور ان میں حروف سبعہ اس طرح جمع ہو جائیں کہ بعد میں کسی شخص کو کسی صحیح قراءت سے انکار کرنے یا غلط قراءت پر اصرار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے، اور اگر کبھی قراءت میں کوئی اخلاقی رومنا ہو تو مصحف کی طرف رجوع کر کے اُسے آسانی رفع کیا جاسکے،
- یہ بات حضرت علی رضا کے ایک ارشاد سے واضح ہے جو امام ابن ابو داؤد نے کتاب المصنفات میں صحیح سندر کے ساتھ نقل کی ہے:-

قال علی رضا لا تقولوا في عثمان بن عفی الا خیراً فوا لله ما فعل الذي فعل في المصاحت الا عن ملء امتنا، قال ما تقولون في هذا الفعل عامة فقد بلغنى ان بعضهم يقول ان قراءتي خيرا من قراءة تلك، وهذ ایک احادیث ایکاد ان یکون کفرا، قلت فما ترئي؟ قال أرى أن نجمم الناس على مصحف واحد فلا تكون فرقة ولا اخلاف، قلت فنعم ما رأيت،

لہ کتاب المصاحت، لابن ابی داؤد، ص ۲۲ مطبع رحمانیہ مصر ۱۹۵۵ء احمد و فتح الباری ص ۱۵۱ ج ۹

حضرت علیؑ نے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات ان کی بھلانی کے سوا نہ کرو، یونکہ اللہ کی قسم انہوں نے مصاحت کے معاملے میں بحکام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں کیا، انہوں نے ہم سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ ان قرائتوں کے بارے میں تھمارا کیا خیال ہے؟ یونکہ مجھے یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ بعض لوگ دوسروں سے کہتے ہیں کہ "میری قراءت تھماری قراءت سے پہتر ہے" حالانکہ یہ ایسی بات ہے جو کفر کے قریب تک پہنچتی ہے۔ اس پر ہم نے حضرت عثمان سے کہا: "پھر آپ کی کیا راستے ہے؟" انہوں نے فرمایا میری راستے ہیں ہم سب لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تاکہ پھر کوئی افتراق و اختلاف باقی نہ رہے، ہم سب نے کہا آپ نے بڑی اچھی راستے قائم کی ہے" ॥

یہ حدیث حضرت عثمانؓ کے کام کے بارے میں واضح ترین حدیث ہے، اس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے "جمع الناس علی مصحف واحد" فرما کر یہ ارادہ ظاہر فرمایا ہے کہ ہم ایک ایسا مصحف تیار کرنا چاہتے ہیں جو پوئے عالم اسلام کے لئے یکسان ہو، اور اس کے ذریعہ باہمی اختلافات کو ختم کیا جاسکے، اور اس کے بعد کسی صحیح قراءت کے انکار اور منسوخ یا شاذ قراءت پر اصرار کی گنجائش باقی نہ رہے، نیز ابن ارشد نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ:-

اختلفوا في القرآن على عهد عثمان حتى اقتل الغلامان المعلمون
فبلغ ذلك عثمان بن عفان فقال عندى تكذن بون وتلعنون فيه
فمن نأى عنّي كان أشد تكذن بياؤ أكثر لينا، يا أصحاب محمد
اجتمعوا فاكتروا اللناس اماماً

حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن کے بارے میں اختلاف ہوا، یہاں تک کہ پچھے اور معلمین لڑنے لگے، یہ اطلاع حضرت عثمانؓ کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا

کہ تم میرے قریب رہتے ہوئے صحیح قراءتوں کی تکنیک کرتے ہو اور اس میں غلطیاں کرتے ہو، لہذا جو لوگ مجھ سے دُور ہیں وہ تو اور کبھی زیادہ تکنیک اور غلطیاں کرتے ہوں گے، پس اے اصحابِ محمدؐ صحیح ہو جاؤ، اور لوگوں کے لئے ایک ایسا نسخہ تیار کرو جس کی اقتدار کی جائے یہ

اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت عثمانؓ کا مقصد قرآن کے کسی حرف کا ختم کرنا ہمیں تھا، بلکہ انھیں تو اس بات کا افسوس تھا کہ بعض لوگ صحیح حروف کا انکار کر رہے ہیں اور بعض لوگ غلط طریقے سے تلاوت پڑا صراحت رہ رہے ہیں، اس لئے وہ ایک معیاری نسخہ تیار کرنا چاہتے تھے، جو پوری دنیا سے ہسلام کئے یکجا ہو۔
لغتِ قریش پر لکھنے کا مطلب | (۲) یہاں دوسرے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی تیاری میں مصحف قرآنی مرتقب کرنے کے لئے صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، تو ان سے فرمایا تھا:-

اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت في شع من القرآن فاكتبوه

بلسان قریش فانما نزل بلسانكم

جب تھا اسی اور حضرت زید بن ثابتؓ کے درمیان قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہوا تو اسے قریش کی زبان پر لکھنا، کیونکہ قرآن انہی کی زبان پر نازل ہوا ہے ॥

لہ بہت سے علماء نے حضرت عثمانؓ کے عمل کی یہی تشریح فرمائی ہے، ملاحظہ ہو الفصل فی الملل و الاحواه والخل: ابن حزمؓ، ص، ج، مکتبۃ المثلثی ببغداد، اور البيان فی علوم القرآن: مولانا عبد الرحمن حقانی، باب بہرؒ، فصل بہرؒ، ص ۷۲ مطبوعہ نعیمیہ ولیوند و مہال العرفان:

للزمر قانی ۲۲۸ تا ۲۵۶ ج ۱

سلہ صحیح بخاری باب صحیح القرآن مع فتح الباری ص ۱۶ ج ۹

.... اگر حضرت عثمانؓ نے ساتوں حروف باقی رکھے تھے تو اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟
 اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضرت عثمانؓ صنی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی ردِ جملہ ہے
 جس سے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے علماء نے یہ بحاجا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حروف
 ختم کر کے صرف ایک حرف قریش کو مصحف میں باقی رکھا تھا، لیکن درحقیقت اگر حضرت
 عثمانؓ کے اس ارشاد پر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ مطلب سمجھنا
 درست نہیں ہے کہ انہوں نے حرف قریش کے علاوہ باقی چھ حروف کو ختم فرمادیا تھا بلکہ
 مجموعی روایات دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے حضرت عثمانؓ نے کیا مطلب
 تھا کہ اگر قرآن کریم کی کتابت کے دران رسم الخط کے طریقے میں کوئی اختلاف ہو تو
 قریش کے رسم الخط کو خستیار کیا جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی اس ہدایت
 کے بعد صحابہؓ کی جماعت نے جب کتابت قرآن کا کام شروع کیا تو پورے قرآن کریم میں
 اُن کے درمیان صرف ایک اختلاف پیش کیا، جس کا ذکر امام زہریؓ نے اس طرح فرمایا ہے۔

فَأَخْتَلَفُوا يَا مَعْذِنْدِي التَّابُوتِ وَالْتَّابُوْهُ فَقَالَ النَّفْرُ الْقَرْ شِيُونْ

التَّابُوتُ وَقَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابَتٍ التَّابُوْهُ فَرَفِمَ اخْتِلَافُهُمْ إِلَى عَنْهُ

فَقَالَ أَكْتَبُوهُ التَّابُوتُ فَانْهَ بِلْسَانَ قَرِيشٍ نَزَلَ^ل

”چنانچہ اس موقع پر قرآن کے درمیان ”تابوت“ اور ”تابوہ“ میں اختلاف ہوا،
 قریشی صحابہؓ کہتے تھے کہ تابوت (بڑی تار سے لکھا جائے) اور حضرت زید بن
 ثابتؓ فرماتے تھے کہ تابوہ (گول تار سے لکھا جائے)، لیں اس اختلاف
 کا معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا جس پر انہوں نے فرمایا کہ
 اسے اتابوت لکھو، کیونکہ قرآن قریش کی زبان پر نازل ہوا ہے۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت زیدؓ اور قریشی صحابہؓ
 کے درمیان جس اختلاف کا ذکر فرمایا اس سے مراد رسم الخط کا اختلاف تھا نہ کہ لغات کا۔

ل کنز العمال، ص ۲۸۲ ج ۲۸۲، حديث ۸۳، بحولہ ابن سعد عیہ وفتح الباری، ص ۱۶۴ ج ۹،
 بحولہ ترمذی،

مرادف الفاظ سے | رسم تیسرا سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سبعہ احراف کے اختلاف کی جو شریع فرمائی ہے مثلاً دوت کا سئلہ | بنظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات حروف مصاحف عثمانی میں شامل نہیں ہو سکے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں :-

ان جبریل قال ياخذن اقرأ القرآن على حرف، قال ميكائيل
استزدہ حتى يلغى سبعة أحرف، قال كل شاف كاف ماليم
تخلط آية عذاب برحمه او رحمة بعد اب نحو قوله تعالى
وأقْلِمْ وَهَلْمْ وَذَهَبْ وَآسْمَاعْ وَعَجَلْ

”جبریل علیہ السلام نے (حضور مسی) کہا کہ اے محمد! قرآن کریم کو ایک حرف پر پڑھئے، میکائیل علیہ السلام نے حضور مسی کہا اس میں اضافہ کروائیے، یہاں تک کہ معاملہ سات حروف تک پہنچ گیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا ان میں سے ہر ایک شافی کافی ہے، تا و قتیک آپ عذاب کی آیت کو رحمت سے یا رحمت کو عذاب سے مخلوط نہ کر دیں، یہ ایسا ہی ہو گا، جیسے آپ تعالیٰ رآؤ کے معنی کو آقِل، علم، اذہب، آمنزخ اور عجل کے الفاظ سے ادا کریں یا۔“

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبعة احراف کا اختلاف درحقیقت مراد فاظ کا اختلاف تھا، یعنی ایک حرف میں کوئی ایک لفظ اختیار کیا گیا تھا، اور دوسرے حرف میں اسی کا ہم معنی کوئی دوسرا لفظ، حالانکہ عثمانی مصاحف میں جو قراتیں جمع ہیں اُن کے درمیان مرادفات کا یہ اختلاف بہت تھا، ان قراتیں میں جو اختلاف ہے وہ زیادہ تر حرکات، صیغوں، تذکیر و تائیش اور الجوں کا اختلاف ہے،

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم نے ”سات حروف“ کی جو شریع کو اختیار کیا ہے اس میں قراتیں کے درمیان سات قسم کے اختلافات بیان کئے گئے ہیں، اُن سات

لہ یہ الفاظ مسند احمد میں صحیح سندر کے ساتھ مروی ہیں (راجح المسالک، ص ۲۳۵)

اقسام میں سے ایک قسم بدلیت مراد فہم کا اختلاف ہے، حضرت ابو بکرہؓ نے یہاں سات حدود کے محل تشریع تھیں فرمائی، بلکہ اس کی صرف ایک مثال دی ہے، اس نے اختلاف کی صرف ایک قسم یعنی اختلاف الفاظ بدلیت کا ذکر فرمایا ہے،

اب اختلاف قراءات کی یہ قسم یعنی اختلاف الفاظ ابتداءِ اسلام میں بہت زیادہ تھی، چونکہ تمام اہل عرب لغتِ قریش کے پوری طرح عادی نہ تھی، اس لئے شروع میں انھیں یہ سہولت زیادہ سے زیادہ دی گئی تھی، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنّتے ہوئے متباadal الفاظ میں سے جس لفظ کے ساتھ چاہیں تلاوت کر لیا کریں، چنانچہ شروع میں ایسا بکثرت تھا کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہوا دردوس ری قراءت میں اس کا ہم معنی دردوس لفظ، یعنی جب لوگ لغتِ قرآن سے پوری طرح مافوس ہو گئے تا اختلاف قراءت کی یہ قسم رفتہ رفتہ کم کر دی گئی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ سے قرآن کریم دو مرتبہ دور فرمایا، اس وقت بہت سے الفاظ منسوخ کر دیئے گئے، اور اس طرح الفاظ مراد فہم کا اختلاف بہت کم رہ گیا،

اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ود الفاظِ مراد فہم پسند مصاحف میں جمع نہیں فرمائے، جو اس آخری دور میں منسوخ ہو چکے تھے، کیونکہ ان کی حیثیت اب منسوخ التلاوة آیات کی تھی، البتہ قسراً، توں کا جو اختلاف آخری دور میں بھی باقی رکھا گیا تھا، اسے حضرت عثمانؓ نے جوں کا توں باقی رکھا، لہذا حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے حدود کے اختلاف کی جو قسم مذکورہ حدیث میں بطور مثال مذکور فرمائی ہے وہ قسم ہے جس کی بیشتر جزئیات عرضہ اخیرہ کے وقت منسوخ ہو چکی تھیں، چنانچہ وہ مصاحف عثمانی میں شامل نہیں ہو سکیں، اور نہ موجودہ قراءات ان پر مشتمل ہیں،

مذکورہ بالاتجھ تین مقدمات سے مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) عرضہ اخیرہ (حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ حضور مکرمؐ کے آخری قرآنی دفعہ)

کے وقت قرآن کریم کی متعارض فتراتین منسوخ کی گئی تھیں،
 (۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحبہ عثمانی کو عرضہ اخیرہ کے مطابق
 ترتیب دیا،

(۳) حضرت عثمانؓ کے مصحف میں مراد الفاظ کا وہ اختلاف موجود نہیں
 ہے جو حضرت ابو بکرؓ نے بیان فرمایا ہے،

جہاں تک تیسرا مقدمہ کا تعلق ہے وہ تو بالکل ظاہر ہے، اور دوسرا
 مقدمہ کے دلائل ہم سمجھے بیان کرچکے ہیں، جن میں سے صریح ترین دلیل حضرت
 عبیدہ سلمانیؓ کا یہ ارشاد ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ہمیں جس قراءت پر جمع کیا وہ عرضہ
 اخیرہ کے مطابق تھی۔

اب پہلا مقدمہ باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ عرضہ اخیرہ کے وقت متعارض
 قراتین منسوخ ہو گئی تھیں، اس کی دلیل محقق ابن الجھریؓ کا یہ ارشاد ہے:-

وَلَا شَكَّ أَنَّ الْقُرْآنَ نَسْخٌ مِنْهُ وَغَيْرُ فِيهِ فِي الْعِرْضَةِ الْخَيْرَةِ
 فَقَدْ صَحَّ التَّصَّصُ بِذِلِّكَ عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ وَرَوَيْنَا
 بِاسْنَادٍ صَحِيحٍ عَنْ زَرَّاً بْنَ جَيْشٍ قَالَ قَالَ لِي أَبْنَ عَبَّاسٍ
 أَمَّا الْمُقْرَأُ إِذْنَنْ تَقْرَأُ أَقْلَتُ الْأَخْيَرَةِ قَالَ فَإِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَعْرِضُ الْقُرْآنَ عَلَى جَبَرِيلٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي
 كُلِّ عَامٍ مَرَّةً قَالَ فَعَرَضَ عَلَيْهِ الْقُرْآنَ فِي الْعَامِ الَّذِي قُبِضَ
 فِيهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّتَيْنِ فَشَهَدَ عَبْدُ اللَّهِ
 يَعْنِي أَبْنَ مُسَعُودٍ مَا نَسَخَ مِنْهُ وَمَا بَدَّلَ،

”اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عرضہ اخیرہ کے موقع پر قرآن کریم میں بہت کچھ

لَهُ كَنزُ الْعَالَمِ، حدیث ۲۸۶ ص ۲۸۶ ج ۱،

لَهُ الشَّرْفُ الْفَرَاءُ الْعَشْرُ، ص ۲۲ ج ۱،

منسوخ کیا گیا اور بدل لائیا ہے، کیونکہ اس کی تصریح متفق بر صحابہؓ سے منقول ہے۔ ہم تک صحیح سنن کے ساتھ حضرت گرین جبیشؓ کا یہ قول پہنچا ہے کہ مجھ سے ابر عباسؓ نے پوچھا تم کونسی قراۃ پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ آخری قراۃ، انھوں نے فرمایا کہ آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، پس جس سال آپ کی وفات ہوئی اُس سال آپ نے دو مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا، اس موقع پر جو کچھ منسوخ ہوا اور جس قدر تبدیلی کی گئی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس کے شاہد تھے یہ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عرضہ اخیرہ کے وقت بہت سی فترات میں خود اللہ عنہ کی جانب سے منسوخ قرار دیدی گئی تھیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مراد فاظ کے جس اختلاف کا ذکر فرمایا ہے اُس کی بہت سی جزویات بھی یقیناً اسی وقت منسوخ ہو گئی ہوں گی، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے عرضہ اخیرہ کے مطابق مصحف تیار کرائے ہیں، ان میں الفاظ مراد فاظ کا اختلاف بہت شاذ و نادر ہے،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۴۲) مذکورہ بالا تحقیق پر چوتھا اشکال ہے ہو سکتا ہو کہ متعدد روایات سے ثابت ہو کہ حضرت اور آن کا مصحف ؟ عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کا جو کارنامہ

انجام دیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس سے خوش نہیں تھے، اور انھوں نے اپنا مصحف بھی نذر را تنش نہیں ہونے دیا، اگر حضرت عثمانؓ نے چھ حروف ختم نہیں فرمائی تھی تو پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وجہ اعتراض کیا تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عثمانؓ کے کام پر دو اعتراض تھے، ایک یہ کہ کتابت قرآن کے کام میں انھیں کیوں شریک

لے حافظ ابن حجرؓ نے بھی اس مضمون کی متعدد روایات مختلف محدثین کے حوالوں سے نقی کی ہیں،
(فتح الباری، ص ۳۶ ج ۹)

ہمیں کیا گیا؟ دوسرے یہ کہ دوسرے مصاحف کو نذر آتش کیوں کیا گیا؟ پہلے اعتراض کا ذکر صحیح ترمذی کی ایک روایت میں امام زہریؓ نے فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو یہ شکایت تھی کہ کتابت قرآن کا کام اُن کے حوالے کیوں ہمیں کیا گیا جبکہ انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے مقابلہ میں زیادہ طویل عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کیا تھا حافظ ابن حجرؓ اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں حضرت عثمانؓ کا عذر یہ تھا کہ انہوں نے یہ کام مدینہ طیبہ میں شروع کیا تھا اور حضرت ابن مسعودؓ اس وقت کو فرمیں تھے، اور حضرت عثمانؓ اُن کے انتظار میں یہ کار بخیر موضع فرمانا ہمیں چاہتے تھے، اس کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ نے بھی حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ کام سونپا تھا، اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ جمع و ترتیب قرآن کا یہ جملہ بھی اُنہی کے ہاتھوں انجام پاتے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو دوسرے اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ نے یہ تحریک تیار کرنے کے بعد باقی تمام انفرادی مصاحف کو نذر آتش کرنے کا حکم دیدیا تھا، اور وہ اپنا مصحف نذر آتش کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، حضرت ابو موسی اشعریؓ اور حضرت حزیفہ بن یحیاؓ اُنھیں سمجھانے کے لئے تشریف لے گئے، لیکن انہوں نے فرمایا کہ:

وَاللهِ لَا إِدْفَعَهُ إِلَيْهِمْ، اَفْتَأْلَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بِضَعَادِ سَبْعِينَ سُورَةً ثُمَّ اَدْفَعَهُ إِلَيْهِمْ، وَاللهِ لَا إِدْفَعَهُ إِلَيْهِمْ

ثُنْدَكَى قَسْمٍ يَمْعَنُ مِنْ مَحْفَتِ اَنَّ كَوَافِرَ الْمُنْهَىٰ كَوَافِرَ اَنَّ

عَلِيَّ وَسَلَّمَ لَنْ سَنْرَسَ زِيَارَهُ سُورَتِيْنِ سَكْحَانِيْنِ، پَھْرَمِيْنِ يَمْعَنُ مِنْ مَحْفَتِ اَنَّ

لَهُ فَتحُ الْبَارِي، ص ۶۱۶ ج ۴

لَهُ مُسْتَرِكُ حَاكِمٌ ح ص ۲۲۸ ج ۲، دَارَةُ الْمَعَارِفِ دَكْنَسُلَّمَهُ، قَالَ الْحَاكِمُ ح "هذا حديث صحيح الاستناد واقرءه الذي به"

خدا کی قسم میں انھیں ہنیں دوں گا،“

جن حضرات نے کوئی میں حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف کے مطابق اپنے مصاحف لکھ رکھ تھے، حضرت ابن مسعودؓ نے انھیں بھی یہی ترغیب دی کہ وہ اپنے مصاحف حوالہ نہ کریں حضرت خمیر بن مالکؓ فرماتے ہیں :-

”لَمْ يَرِبْ الْمَصَاحِفَ أَنْ تَغْيِيرَ، قَالَ أَبْنُ مَسُودَةَ مِنْ أَسْطِاعَ
مَنْ كَمْ أَنْ يَلْعُلَّ مَصَاحِفَهُ فَلَيَلْعُلَّهُ، ثُمَّ قَالَ قَرَأْتُ مِنْ فِيمَا
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعِينَ سُورَةً، أَفَأَتَرَكَ مَا
أَخْذَتْ مِنْ فِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَى الرَّوْضَةِ
وَسَلَّمَ لَهُ“

(مصاحف میں تبدیلی کا حکم دیا گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے (لوگوں سے) فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے مصحف کو چھپا کے وہ مزدوج چھپائے پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سورتیں بڑھی ہیں تو کیا میں وہ چیز چھوڑ دوں جو میں نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درین مبارک سے حاصل کی ہے؟“)

اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف عثمانی مصاحف سے کچھ مختلف تھا، اور آپ اسے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، لیکن اس میں کیا چیزیں عثمانی مصحف سے مختلف تھیں؟ اس کی صراحة صحیح روایات میں نہیں ملتی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جن صحف میں فرآن کریم کو جمع فرمایا تھا ان میں سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں، اور ان میں ترتیب نہیں تھی، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف بخواتے ان میں سورتوں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیا گیا تھا،

امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں :-

اُن جمِ القرآن لہریکن مرہ واحده فقط جمِ یعنی بحضورت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم جمِ بعضہ بحضورت ابی بکر
الصلیٰ، والبعیم الثالث ہو فی ترتیب السورۃ کان فی
خلافۃ امیر المؤمنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہمؐ^۱
”جمع قرآن کا کام ایک ہے مزینہ میں مکمل نہیں ہوا بلکہ قرآن کا یہ کچھ حصہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جمع ہو گیا تھا پھر کچھ حصہ حضرت
ابو بکر صدیق رضی کے زمانے میں ہوا اور جمِ قرآن کا تیسرا مرحلہ وہ تھا جن میں
سورتوں کو مرتب کیا گیا، یہ کام امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی کے
بعد خلافت میں ہوا۔^۲

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف حضرت عثمان رضی کے مصاہف سے ترتیب میں
بہت مختلف تھا، مثلاً اس میں سورۃ نسا پہلی اور سورۃ آل عمران بعد میں تھی، اور
حضرت ابن مسعودؓ نے شاید اسی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
قرآن کریم سیکھا ہو گا، اس لئے اُن کی خواہش تھی کہ یہ مصحف اسی ترتیب پر باقی رہے
اس کی تائید صحیح بخاریؓ کی ایک روایت سے ہوتی ہے، کہ عراق کا ایک باشندہ
ایک دن حضرت عائشہ رضی کے پاس آیا اور :-

قال یا امّ المؤمنین اربیعی مصحفك، قالت لِمَ؟ قال لعلی
أَعْلَمُ الْقُرْآنَ عَلَيْهِ، فَانَّهُ يُقْرَأُ أُغْيِرُ مَوْلَفِهِ، قالت وَمَا يُضُرُّهُ
أَيْهُ قَرَأَتْ قَبْلُهُ،^۳

لہ المستدرک للحاکمؒ ص ۲۲۹ ج ۲ ملہ علامہ سیوطیؒ نے ابن حشرونؒ کے حوالہ سے حضرت ابی
مسعودؓ کے مصحف کی پوری ترتیب نقل کی ہے جو مصاہف عثمان سے بہت مختلف ہے والا تلقاً
ص ۶۶ ج ۱) ملہ صحیح بخاریؓ باب تایفۃ القرآن،

”اس نے کہا کہ اُمّ المُؤمنین مجھے اپنا مصحف دکھلایئے، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگتا تھا میں راپنے (قرآنی مصحف) کو اس کے مطابق ترتیب دے لوں، اس لئے کہ وہ رہارے علاقے میں) غیر مرتب علیقہ سے پڑھا جاتا ہی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآن کا جو حصہ بھی تم پہلے پڑھ لو تمہارے لئے مصروف نہیں یا“

اس حدیث کی سترخ میں حافظ ابن حجرؓ نے لکھا ہے کہ یہ عاتی شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پر کاربند رکھا، اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنا مصحف نہ پدلاتھا اور نہ اُسے نابود کیا رکھا، اس لئے اس کی ترتیب عثمانی مصاحف سے مختلف تھی، اور ظاہر ہے کہ عثمانی مصاحف کی ترتیب میں مnasibتوں کی رعایت دوسرے مصاحف کے مقابلہ میں غیر مرتب قرار دیا گئے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں بنیادی فرق سورتوں کی ترتیب کا تھا، اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ رسم الخط کافر ق بھی ہوا، اور اس میں ایسا رسم الخط اختیار کیا گیا، جو جس میں عثمانی مصاحف کی طرح تمام سوراء توں کی آنچھائش ہے، درنہ اگر حافظ ابن حجر ریزؓ کے بیان کے مطابق یہ کہا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے چھ حردوں کو ختم کر کے صرف ایک حرفت پر قرآن لکھوا یا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ کا مصحف انہی متردک حردوں میں سے کبھی حرفت پر لکھا ہوا تھا تو اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات واقع ہوتے ہیں :-

(۱) صحیح بخاریؓ کی مذکورہ بالاحدیث میں عاتی باشدے نے صرف سورتوں کی ترتیب کا اختلاف کا ذکر کیا ہے اور نہ اگر حرفت کا اختلاف بھی ہوتا تو وہ زیادہ اہم تھا، اسے زیادہ اہتمام سے ذکر کیا جاتا،

(۲) حافظ ابن جسر ریڑھ دغیرہ کے قول کے مطابق سات حروف سے مراد سات مختلف قبائل کی لغات ہیں، اگر یہ بات صحیح ہوتی تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓؑ کے مصحف میں اور عثمانی مصاححت میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس قول کے مطابق حضرت عثمانؓؑ نے سب کو حرف قریش پر جمع کر کے اسی کے مطابق مصاححت لکھوائی تھی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓؑ بھی دستیشی تھے،

(۳) حافظ ابن جسر ریڑھ اور ان کے متبوعین نے چھ حروف کو ختم کرنے پر سب بڑی دلیل اجماع صحابہؓؑ پلیش کی ہے، لیکن اگر حضرت ابن مسعودؓؑ کسی اور حرف پر پڑھتے اور اس کی کتابت کو جائز سمجھتے تھے تو یہ اجماع کیسے متحقق ہو سکتا ہے، جس اجماع میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓؑ یہی فقیہ صحابی شامل نہ ہوں وہ اجماع کہ ملائکہ متحقق ہی کہاں ہے؟ بعض حضرات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓؑ نے بعد میں حضرت عثمانؓؑ کی راستے کو قبول کر لیا تھا، لیکن اس بارے میں کوئی صریح روایت موجود نہیں ہے۔
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تھے میں :-

”ابن ابان راذنے ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے، کہ ”ابن مسعودؓؑ کا بعد میں حضرت عثمانؓؑ کے عمل پر راضی ہو جانا“ لیکن اس باب کے تحت کوئی ایسی صریح روایت نہیں لاسکے جو اس عنوان کے مطابق ہو۔“

حافظ ابن جسر ریڑھ دغیرہ کے قول پر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ملتا، لہذا صحیح ہی ہے کہ حضرت عثمانؓؑ نے ساتوں حروف عثمانی مصاححت میں باقی رکھے ہیں، اور حضرت ابن مسعودؓؑ کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ چھ حروف کیوں ختم کر دیتے گئے؟ بلکہ فی الواقع ایسا

لہ فتح الباری، ص ۲۰، ج ۹،

لہ صرف ایک روایت مسنداً حدیث میں ایسی ملتی ہے جس سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓؑ نے چھ حروف ختم فرمادیتے تھے، اور حضرت ابن مسعودؓؑ کو اسی پر اعتراض کیا دریکھنے الفت الربانی، ص ۳۶ ج ۱۸ (لیکن وہ ایک بھول خفی سے مردی ہے، اس نے مستند نہیں ہے)،

ہوا ہی نہیں تھا، بلکہ اعتراف ہے تھا کہ جو مصاحت پہلے سے لکھے ہوئے موجود ہیں اور جن کی ترتیب اور رسم الخط عثمانی مصاحت کے مطابق نہیں ہے اُنھیں ضائع کیوں کیا جائے ہے جبکہ وہ بھی درست ہیں،

نتاں سچ بحث | "حرود سیدھہ" کی یہ بحث اندازے سے زیادہ طویل ہو گئی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والے نتائج کا خلا
آخرين پيش کر دیا جائے، تاکہ اسے یاد رکھنا آسان ہو۔

(۱) امت کی آسانی کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ فرشتہ کی کہ قرآن کریم کی تلاوت کو صرف ایک ہی طریقے میں مختصر نہ رکھا جائے، بلکہ اُسے مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ قرآن کریم شات حرود پر نازل کر دیا گیا،

۲۔ سات حرود پر نازل کرنے کا راجح ترین مطلب یہ ہے کہ اس کی قراءت میں سات نوعیتوں کے اختلافات رکھے گئے، جن کے تحت بہت سی قراءتیں وجود میں آگئیں،

۳۔ شروع ستروع میں ان سات وجہ اختلاف میں سے اختلاف الفاظ و مراد فاؤ کی قسم بہت عام تھی، یعنی ایسا بحث تھا کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہوتا تھا اور دوسری قراءت میں اس کا ہم معنی کوئی دوسرالفاظ، لیکن رفتہ رفتہ جس اہل عرب قرآنی زبان سے پوری طرح مانوس ہو گئے تو یہ قسم کم ہوتی گئی یہاں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دفاتر سے پہلے رمضان میں حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا آخری ذریکار جسے اصطلاح میں عرضہ انہرہ کہتے ہیں تو اس میں اس قسم کے اختلافات بہت کم کر دیتے گئے، اور زیادہ تر صیغوں کی بنادٹ، تذکیر و تائیث، افراد و جمیع، معروف و مجهول اور لہجوں کے اختلافات باقی رہے،

۴۔ جتنے اختلافات عرضہ انہرہ کے وقت باقی رہ گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ

تعالیٰ عنہ نے ان سب کو اپنے مصاہف میں اس طرح جمع فرمادیا کہ ان کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا، لہذا قرارتوں کے بیشتر اختلافات اس میں سما گئے، اور جو قرأتیں اس طرح ایک مصحف میں نہیں سما سکیں انھیں دوسرے مصاہف میں ظاہر کر دیا، اسی بناء پر عثمانی مصاہف میں کہیں کہیں ایک ایک دو دو لفظ کا اختلاف پیدا ہوا،

- ۵۔ حضرت عثمانؓ نے اس طرح سات مصاہف لکھوائے، اور ان میں سورتوں کو بھی مرتب فرمادیا جبکہ حضرت ابو بکرؓ کے صحیفوں میں سورتیں غیر مرتب تھیں، نیز قرآن کریم کے نئے ایک رسم الخط معین کر دیا، اور جو مصاہف اس ترتیب اور اس رسم الخط کے خلاف تھے انھیں نذرِ آتش کر دیا،
- ۶۔ حضرت عائشہ بن مسعودؓ نے مصاہف کی ترتیب عثمانی مصاہف سے مختلف تھی، اور وہ اس ترتیب کو باقی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنا مصاہف نذرِ آتش کرنے کے لئے حضرت عثمانؓ کے حوالے نہیں کیا،

سات حروف کے بالے میں | آخر میں ایک اور بنیادی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا اختلاف آراء کی حقیقت، ضروری ہے، اور وہ یہ ہو کہ "سبعة احرف" کی مذکورہ بحث کو پڑھنے والا سرسری طور پر اس شبہ ایک غلط فہمی کا ازالہ، میں مستلا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم جیسی بہنیادی کتاب کے بالے میں جو حفاظت خداوندی کے تحت آج تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے محفوظ چلی آرہی ہے مسلمانوں میں اتنا زبردست اختلاف آ رہا کیسے پیدا ہو گیا؟ لیکن "سبعة احرف" کی بحث میں جزاً تو الہم نے پیچھے نقل کئے ہیں اگر ان کا بغور سے مطالعہ کیا جائے تو اس شبہ کا جواب بآسانی معلوم ہو جاتا ہے، جو شخص بھی اس اختلاف آراء کی حقیقت پر غور کرے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سارا اختلاف محض نظریاتی نوعیت کا ہے، اور عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقائقیت و صداقت اور اس کے بعضی محفوظ رہنے پر اس اختلاف کا کوئی ادنیٰ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا،

یکونکہ اس بات پر سب کا بلا استثناء اتفاق ہے کہ قرآن کریم جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے وہ تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے، اس میں کوئی ادنیٰ تغیر نہیں ہوا، اس بات پر بھی تمام اہل علم متفق ہیں کہ قرآن کریم کی جتنی قراءتیں تواتر کے ساتھ ہم تک بخوبی ہیں وہ سب صحیح ہیں، اور قرآن کریم کی تلاوت ان میں سے ہر ایک کے مطابق کی جاسکتی ہے، اس بات پر بھی پوری امت کا اجماع ہے کہ متواتر قرار قول کے علاوہ جو شاذ قراءتیں مروی ہیں انھیں قرآن کریم کا جزو قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ ”عرضۃ اخیرہ“ یا اس سے پہلے جو قراءتیں منسوخ کر دی گئیں، وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب قرآن کا جزو نہیں رہیں، یہ بات بھی سب کے نزدیک ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن کے سات حرفاً میں جو اختلاف تکہارہ صرف لفظی تھا، مفہوم کے اعتبار سے تمام حروف بالکل متحد تھے، لہذا اگر کسی شخص نے قرآن کریم صرف ایک قراءت یا حرفاً کے مطابق پڑھا تو تو اسے قرآنی معنا میں حاصل ہو جائیں گے، اور قرآن کی ہدایات حاصل کرنے کے لئے اسے کسی دوسرے حرفاً کو معلوم کرنے کی احتیاج نہیں ہوگی، اس میں بھی کوئی ادنیٰ اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف تیار کرائے وہ کامل احتیاط، سینکڑوں صحابہ کرام میں کی گواہی اور پوری امت مسلمہ کی تصدیق کے ساتھ تیار ہوتے تھے، اور ان میں قرآن کریم صحیک اس طرح لکھ دیا گیا تھا جس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اور اس میں کسی ایک متفق نہیں کو بھی اختلاف نہیں ہوا،

لہذا جس اختلاف کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے وہ صرف اتنی بات میں ہے کہ حدیث میں ”سات حروف“ سے کیا مراد تھی؟ اب جتنی متواتر قراءتیں موجود

ملے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی پیر مصحف کو باقی رکھنے پر تو مصر رہے، یعنی مصاحف عثمانی کی کسی بات پر انہوں نے ادنیٰ اختلاف نہیں فرمایا،

ہیں، وہ "سات حروف" پر مشتمل ہیں یا عرف ایک حرف پر؟ یہ عرض یک علمی نظریائی تھے اختلاف ہے جس سے کوئی علمی فرق واقع نہیں ہوتا، اس نے اس سے یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ان اختلافات کی بناء پر فتر آن کریم معاذ اللہ مختلف فیہ ہو گیا ہے، اس کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے ایک کتاب کے بارے میں ساری دنیا اس بات پر متفق ہو کہ یہ فلاں مصنف کی لکھی ہوئی ہے، اس مصنفت کی طوف اس کی نسبت قابلِ اعتماد ہے اور خود اُس نے اُسے چھاپ کر تصدیق کر دی کہ یہ میری لکھی ہوئی کتاب ہے، اور اس نسخے کے مطابق قیامت تک اسے شائع کیا جاسکتا ہے، لیکن بعد میں لوگوں کے درمیان یہ اختلاف پیدا ہو جائے کہ مصنف نے اپنے مسودے میں طباعت کے قبل کوئی لفظی ترمیم کی تھی یا جیسا شروع میں لکھا تھا دیسا ہی شائع کر دیا، ظاہر ہے کہ عرض اتنے سے نظری اختلاف کی بناء پر وہ روشن حقیقت مختلف فیہ ہمیں بخاتی جس پر سب کا اتفاق ہے، یعنی یہ کہ وہ کتاب اُسی مصنفت نے اپنی ذمہ داری پر طبع کی ہے، اُسے اپنی طوف منسوب کیا ہے، اور قیامت تک اپنی طوف منسوب کر کے شائع کرنے کی اجازت دی ہے، اسی طرح جب پوری امانت اس بات پر متفق ہو کہ فتر آن کریم کو مصافتِ عثمانی میں ٹھیک اُسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح وہ نازل ہوا تھا، اور اس کی تمام متواتر فترات تین صحیح اور منزل من اللہ ہیں تو یہ حقائق اُن نظری اختلافات کی بناء پر مختلف فیہ ہمیں بن سکتے، جو حروف سبعہ کی تشرع میں پیش آئے ہیں، دا اللہ سُبْخَانَهُ تَعَالَى أَعْلَمُ

باب چہارم

نَسْخٌ وَمُنسُوخٌ

نسخ کی حقیقت علوم قرآن میں ایک اور اہم بحث ناسخ و منسوخ کی ہے، یہ بحث بڑی سہلودار اور طویل الذیل ہے، لیکن یہاں اس کی مسام تفصیلات بیان کرنے کے بجائے اس کے متعلق صرف بنیادی معلومات پیش مختصر ہیں؛ ”نسخ“ کے لغوی معنی ہیں ”ہٹانا“، ”ازالہ کرنا“ اور اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے:-

رَفْعُ الْحَكْمِ إِلَى الشَّرْعِ بِدِلْلَيْلِ شَرْعِيِّ
کسی حکم شرعی کو کسی شرعی دلیل سے ختم کر دینا

مطلوب یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کسی زمانے کے حالات کے مناسب ایک شرعی حکم نافذ فرماتا ہے، پھر کسی دوسرے زمانے میں اپنی حکمت بالغہ کے پیش نظر اس حکم کو ختم کر کے اس کی جگہ کوئی نیا حکم عطا فرمادیتا ہے، اس عمل کو ”نسخ“ کہا جاتا ہے، اور اس طرح جو پرانا حکم ختم کیا جاتا ہے اسے ”منسوخ“ اور جو نیا حکم آتا ہے اُتنے ”ناسخ“ ہے۔

نسخ کا عقلی نقل ثبوت یہ دلیلوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں ”نسخ“ نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اگر ”نسخ“

کو تسلیم کر لیا جاتے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ بھی اپنی رائے میں تبدیلی کر لیتا ہے، اُن کا یہ کہنا ہے کہ اگر حکمِ الگی میں ناسخ و منسوخ کو تسلیم کر لیا جاتے تو اس کا مطلب یہ ہو کے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم کو مناسب سمجھا تھا بعد میں (معاذ اللہ) اپنی غلطی واضح ہونے پر اسے واپس لے لیا جسے اصطلاح میں ”بُدَار“ کہتے ہیں،

لیکن یہودیوں کا یہ اعتراض بہت سطحی ذمہ دار ہے، اور ذرا سا بھلی غور کیا جاتے تو اس کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ”نسخ“ کا مطلب رائے کی تبدیلی نہیں ہوتا، بلکہ ہر زمانے میں اُس دو رکے مناسب احکام دینا ہوتا ہے، ناسخ کا کام یہ نہیں ہے۔ اکر وہ منسوخ کو غلط قرار دے، بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے حکم کی مدتِ نفاذ متعین کر دے، اور یہ بتادے کہ پہلا حکم جتنے زمانے تک نافذ رہا اس زمانے کے لحاظ سے تو وہی مناسب تھا، لیکن ہب حالات کی تبدیلی کی بناء پر ایک نئے حکم کی ضرورت ہے، جو شخص بھی سلامتِ فلک کے ساتھ غور کر گیا وہ اس پتچے پر سچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تبدیلی حکمتِ اہمیم کے عین مطابق ہے، اور اسے کسی بھی اعتبار سے کوئی عیب نہیں کہا جاستا، حکیم وہ نہیں ہو جو قسم کے حالات میں ایک ہی نسخہ پلاتا رہے، بلکہ حکیم وہ ہے جو مریض اور مرض بدلتے ہوئے حالات پر بالغ نظری کے ساتھ غور کر کے نسخے میں اُن کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے اور یہ بات صرف شرعی احکام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کائنات کا سارا کارخانہ اسی اصول پر چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغ سے مبوحہ میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی بہار، کبھی خزان، کبھی برسات، کبھی خشک سالی، یہ سالے تغیرات اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغ کے عین مطابق ہے، اور اگر کوئی شخص اسے ”بُدَار“ قرار دے کر اس پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس سے معاذ اللہ خدا کی رائے میں تبدیلی لازم آتی ہے کہ اس نے ایک قلت سردی کو پسند کیا تھا، بعد میں غلطی واضح ہوئی، اور اس کی جگہ گرمی پیچ ڈی تو اسے

اجمٰع کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، بعدینہ یہی معاملہ شرعی احکام کے نسخ کا ہے کہ اُسے "بُدْرَاء" قرار دیکر کوئی عیب سمجھنا انہتار درجہ کی کرتا نظری اور حقائق سے بیگانگی ہے، چنانچہ "نسخ" صرف امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کی خصوصیت ہے، بلکہ چھپے انہیاً علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی ناخ و منسوخ کا سلسہ جاری رہا ہے، جس کی بہت سی مثالیں موجودہ باہل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً باہل میں ہے کہ "حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دُو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا جائز تھا، اور خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی دُو بیویاں لیا ہوا راستیں تھیں" لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے ناجائز قرار دیدیا گیا، حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں ہر طبقاً پھر تا جاندار حلال تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بہت سے جانور حرام کردیتے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں طلاق کی عام اجازت تھی، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں عورت کے زنا کا ہونے کے سوا اُسے طلاق دینے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی "غرض باہل کے عہد نامہ جدید و قدیم میں ایسی بیسوں مثالیں ملتی ہیں جن میں کسی پُرانے حکم کو نئے حکم کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا،

نسخ کے بازے میں متقدّر میں اور متاخر میں لفظ "نسخ" کے استعمال میں علت اور متفقّد میں اور علامہ متاخرین کے درمیان اصطلاحات کا فرق

سمجھ لینا ضروری ہے،
متقدّر میں کی اصطلاح میں لفظ "نسخ" ایک وسیع مفہوم کا حامل تھا، اور

لہ باہل، کتاب پیریائش ۲۹: ۳۰ تا ۲۳: ۱۸، لہ احبار ۱۸: ۱۸،

لہ پیریائش ۹: ۳، لہ احبار ۱۱: ۷، اور استثناء ۱۷: ۷،

۵۵ استثناء ۲۸: ۱۹، ۱۵: ۳

اس میں بہت سی رہ صورتیں داخل تھیں جو بعد کے علماء کی اصطلاح میں "نسخ" نہیں کہلاتیں، مثلاً متفقین کے نزدیک عام کی تخصیص اور مطلق کی تقسیم وغیرہ بھی "نسخ" کے مفہوم میں داخل تھیں، چنانچہ اگر ایک آیت میں عام الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور دوسری میں انھیں کسی خاص صورت سے مخصوص کر دیا گیا ہی، تو علماء متفقین پہلی کو منسوخ اور دوسری کو ناجائز قرار دیدیتے ہیں، جس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ پہلا حکم بالکل ختم ہو گیا، بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہلی آیت سے جو عوم سمجھیں آتا تھا دوسری آیت نے اس کو ختم کر دیا ہے،

مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ
مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ
ایمان لے آئیں ۔

اس میں مشرک عورتوں کا لفظ عام ہے، اور اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مشرک عورتوں سے نکاح حرام ہے، خواہ وہ بنت پرست ہوں یا اہل کتاب، لیکن ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:-

وَالْمُحْصَنَاتِ مِنَ الَّذِينَ لَمْ تُؤْتُوا الْكِتَابَ
اور (تحارے لئے حلال ہیں) اہل کتاب میں سے
باعقبت عورتوں ۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں مشرک عورتوں سے مراد وہ مشرک عورتوں تھیں جو اہل کتاب نہ ہوں، لہذا اس دوسری آیت نے پہلی آیت کے عام الفاظ میں تخصیص پسیداً کر دی ہے، اور بتا دیا ہے کہ ان الفاظ سے مراد مخصوص قسم کی مشرک عورتوں یعنی متفقین اس کو بھی "نسخ" کہتے ہیں، اور پہلی آیت کو منسوخ اور دوسری کو ناجائز قرار دیتے ہیں،

اس کے برخلاف متاخرین کے نزدیک "نسخ" کا مفہوم اتنا وسیع نہیں، وہ

صرف اس صورت کو ”نسخ“ فرار دیتے ہیں، جس میں سابقہ حکم کو بالکلیٰ ختم کر دیا گیا ہو
محض عام میں تخصیص یا مطلوں میں تقیید پیدا ہو جائے تو اسے وہ ”نسخ“ نہیں کہتے،
چنانچہ مذکورہ بالامثال میں متاخرین یہ کہتے ہیں کہ اس میں نسخ نہیں ہوا، یعنی مذکورہ حکم
حکم (یعنی مشترک عورتوں سے بکار کی ممانعت) بدستور یا قبیلے ہے، صرف اتنا ہوا، جو
کہ دوسری آیت سے یہ واضح ہو گیا کہ پہلی آیت کا مفہوم اتنا عام نہیں تھا کہ اس میں
اہل کتاب عورتیں بھی داخل ہو جائیں، بلکہ وہ صرف غیر احل کتاب کے ساتھ
مخصوص تھی،

اصطلاح کے اس فرق کی وجہ سے متقدمین کے نزدیک قرآن کریم میں منسوخ
آیات کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور رہہ معمولی فرق کی وجہ سے ایک آیت کو منسوخ
اور دوسری کو ناسخ قرار دیتے تھے، لیکن متاخرین کی اصطلاح کے مطابق منسوخ
آیات کی تعداد بہت کم ہے۔

قرآن کریم میں نسخ کی بحث

اس بات میں تو امت کے کسی فرد کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں ہے کہ شرعی
احکام نسخ کا سلسلہ پچھلی امتیوں کے وقت سے جاری رہا ہے، اور امتِ محمدیہ
علیٰ صاحبہ اسلام میں بہت سے احکام منسوخ ہوتے ہیں، مثلاً پہلے حکم یہ تھا کہ
نمایں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جائے، بعد میں اس حکم کو منسوخ
کر کے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا، اس میں مسلمانوں میں سے کسی کا اختلاف
نہیں ہے،

لیکن اس میں آراء کا کچھ اختلاف ہے کہ قرآن کریم میں نسخ ہو لے یا نہیں؟
دوسرا الفاظ میں یہ سلسلہ زیر بحث آیا ہے کہ کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت موجود

۱- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الائقان، ص ۲۲ ج ۲ ۲- ٹہجیال الدین القاسمی، تفسیر
القاسمی، ص ۲۲ ج ۱، عیسیٰ ابیان الحلبی مصریل، ۲۳۸۰

ہے جس کا حکم منسوخ ہو جکا ہوا دراس کی تلاوت اب بھی کی جاتی ہو؟ جمہور اہل سنت کا مسلک یہ ہو کہ قرآن کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم منسوخ ہے، لیکن معتبر علماء میں سے ابوسلم اصفہانی کا ہبنا یہ ہو کہ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہوتی، بلکہ تمام آیات اب بھی واجب العمل ہیں، ابوسلم اصفہانی کی اتباع میں بعض دوسرے حضرات نے بھی یہی راستے ظاہر کی ہے، اور ہمارے زمانے میں اکثر تجدید پسند حضرات اسی کے قائل ہیں، چنان پسخت جن آئتوں میں نسخ معلوم ہوتا ہو یہ حضرات ان کی ایسی شرح کرتے ہیں جس سے نسخ تسلیم نہ کرنا پڑتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ موقف دلائل کے لحاظ سے کمزور ہے، اور اسے اختیار کرنے کے بعد بعض مترآن آیات کی تفسیر میں ایسی کھینچ تان کرنی پڑتی ہے جو اصول تفسیر کے بالکل خلاف ہے، جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے وجود کے قائل نہیں ہیں، دراصل ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ”نسخ“ ایک عیب ہو جس سے قرآن کریم کو خالی ہونا چاہتے ہیں، حالانکہ آپ پچھے دیکھ چکے ہیں کہ ”نسخ“ کو عیب سمجھنا لکھنی کوتاہ نظری کی بات ہے، پھر عجیب بات یہ ہے کہ ابوسلم اصفہانی اور ان کے متبوعین عموماً ہود و نصاریق کی طرح اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام میں نسخ ہوتا ہے بلکہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں نسخ نہیں ہے، اب اگر نسخ“ کوئی عیب تو غیر قرآنی احکام میں یہ عیب کیسے پیدا ہو گیا؟ جبکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں، اور اگر یہ کوئی عیب نہیں ہے تو جو چیز غیر قرآنی احکام میں عیب نہیں تھی وہ قرآنی احکام میں عیب کیونکہ قرار دلگی؟ کہا جاتا ہے کہ یہ بات حکمتِ اہلی کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں کوئی آیت محض تبریز کا تلاوت کے لئے باقی رہ جاوے اور اس پر عمل کا سلسہ ختم کر دیا گیا ہو۔ لیکن نہ جانے اس بات کو حکمتِ اہلی کے خلاف کس بناء پر قرار دیدیا گیا ہے؟

لہ قرآن حکم از مولانا عبدالصمد رحمانی صفحہ ۱۲، مجلہ معارف القرآن، دیوبند ۱۳۸۷ھ

حالانکہ قرآن کریم کی منسوخ الحکم آیات کے باقی رہنے میں بہت سی مصلحتیں ہو سکتی ہیں مثلاً اس سے احکام شرعیہ میں تدریج کی حکمت واضح ہوتی ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنے احکام کا پابند بنانے میں کہنے کیماں طریقے سے کام لیا ہے؟ نیز اس سے شرعی احکام کی تایخ کا علم ہوتا ہے، اور یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر کب اور کیا حکم نافذ کیا گیا تھا؟ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر بچھلی امتنوں کے آن احکام کا ذکر فرمایا ہے جو امرتت محترمہ (علی صاحبہ السلام) میں منسوخ ہو گئے، مثلاً ارشاد ہے:-

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَدْرَ مِنَ الْجَنَاحِ لِذِي الْظُّفَرِ ۝ وَمَنِ الْبَقْرِ وَالْعَنْتَرِ
حَرَّ مِنَ الْأَعْنَادِ لِهُمْ شُجُونُهُمَا إِلَّا مَا حَمَدَتْ ظُهُورُهُمَا أَوْ الْحَوَالِيَّةُ
أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَطْلِيمِ رَانِعِمٍ (۱۲۶)

”اور ہر ہو دپہ ہم نے تمام ناخن دلے جاؤ رحرا م کر دیتے تھے، اور جگائے اور بکری رکے اجزا میں سے، ان دونوں کی جسربیاں ان پر ہم نے حرام کر دی تھیں، لیکن وہ (چربی) جو ان دونوں کی پشت پر پیا آن توں میں لگی ہوا یا جو بڑی سے ملی ہوئی ہوئی“

ظاہر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک منسوخ حکم کا تذکرہ اسی لئے فرمایا ہے کہ اس سے عبرت و موعظت حاصل کی جائے، اگر قرآن کریم میں بعض منسوخ الحکم آیات کی تلاوت اسی مقصدر کے لئے باقی رکھی گئی ہو تو اس میں کوئی بات حکمت اہمیت کے خلاف ہے؟ پھر یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کے ہر کام کی حکمت معلوم ہے؟ یاد رہ آئیت قرآنی کے بالے میں یہ جانتا ہے کہ اُس کے نزدیک میں کیا کیا حکمتیں تھیں؟ اگر کسی شخص کا یہ دعویٰ درست نہیں ہو سکتا، اور یقیناً نہیں ہو سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ کے کسی کام سے محض اس بنا پر کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس کی حکمت، ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، جبکہ اس کام کا دروغ شرعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہو، لہذا حقیقت یہ ہے کہ جو حضرات قرآن کریم میں نسخ کے قائل نہیں ہیں، ان کا وہ

بنیادی مفرد صنہ ہی سرے سے غلط ہو، جس پر انہوں نے اپنے نظریے کی ساری عمارت کھڑی کی ہے، انہوں نے بعض قرآنی آیات کو در در راز کے معانی صرف اس لئے پہنچا ہے میں کہ اُن کی نظر میں "نسخ" ایک عیب ہے، جس سے وہ قرآن کریم کو خالی دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے، اور اگر ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ نسخ کوئی عیب نہیں بلکہ حکمتِ اُنہی کا عین تقاضا ہے تو وہ ایسی آیتوں کی تفسیر دہی کریں گے جو عام طور سے کی جاتی ہے، کیونکہ ظاہر اور منبادر تفسیر دہی ہے،

قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

مَا نَسْخَهُ مِنْ آيَةٍ أَرْجِعُهَا تَأْكِلْتُ بِنَحْيِرْ مَهْمَهَا أَوْ مُثْلِهَا، آتَهُ

كَعْلَمَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدْ يُرَدُّ (البقرہ: ۱۰۶)

"جس آیت کو بھی ہم ملسوخ کر دیں گے یا بھلا دیں گے، اس سے بہتر یا اس حیثی آیت لے آئیں گے، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے" ॥

اس آیت کو جو شخص بھی غیر جانب داری کے ساتھ خالی الذہن ہو کر پڑھے گا وہ اس سے یہ ترجیح نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن کریم کی آیات میں نسخ کا سلسلہ خود قرآن کریم کی تصریح کے مطابق جاری رہا ہے، لیکن ابو مسلم اصفہانی اور ان کے ہم نواجو نسخ کو شوری یا غیر شوری طور پر ایک عیب سمجھ کر قرآن کریم کو اس سے خالی قرار دینا چاہتے ہیں، وہ مذکورہ آیت میں ذور از کا ز تاریخات کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ اس آیت میں ایک فرضی صورت کا بیان کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض ہم نے کسی آیت کو منسوخ کیا تو اس سے بہتر یا اس حیثی آیت نازل کر دیں گے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی کوئی آیت ضرور منسوخ کی جاتے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک آیت میں ارشاد ہے:-

إِنَّ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَإِنَّا آتَيْنَا لِلنَّعَمَاءِ نِعْمَةً

"اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی لڑکا ہو تو میں سب سے پہلے اس کی پرستش کروں گا"

منکریں نسخ کہتے ہیں کہ جس طرح یہاں ایک فرضی صورت کا بیان ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی لڑکا ہو گا، اسی طرح مذکورہ بالا آیت

میں نجح کا ذکر صرف ایک فرضی صورت کے طور پر کیا گیا ہے جس کا واقعہ میں موجود ہبنا ضروری ہنیں ہے،

لیکن آیت مذکورہ کی یہ تشریع ایک دراز کارتاویں سے زیادہ حیثیت ہمیں کھٹی اس لئے کہ اگر قرآن کریم کی آیات میں کبھی نسخ واقع نہیں ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ کو بطل فرض ہی سہی اس کا ذکر فرمائے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ قرآن کریم کا یہ منصب ہرگز نہیں ہے کہ جو واقعات کبھی پیش نہ آئے ولے ہوں، انھیں بلا دفعہ فرض کر کر کے اُن پر کوئی حکم لگاتے، رہی ان کا ان للہ نہیں ولہ الہ والی آیت، سواس میں اور نسخ کی مذکورہ آیت میں زین و آسمان کا فرق ہے، اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) کسی طریکے کی پیدائش ایک بالکل ناممکن چیز ہے، لہذا اس آیت کو پڑھنے والا ہر شخص فوراً یہ سمجھ لیگا کہ یہ بات محض ایک مفروضہ کے طور پر کہی گئی ہے، جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے اولاد ہوتی تو یہ سبک پہلے اس کی عبادت کرتا، لیکن چونکہ اس کی اولاد نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ کے سو اکسی اور کی عبادت کا سوال ہی نہیں ہے، اس کے بر عکس "نسخ" کا وقوع خود ابو مسلم اصفہانی کے نزویک عقل طور پر ناممکن نہیں ہے اس لئے اُسے محض ایک فرضی صورت قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہے،

یہ بات مذکورہ آیت کے شانِ نزول سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کتنے تفسیر میں مردی ہے کہ بعض کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ اپنے متبوعین کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں پھر اس کی ممانعت کر دیتے ہیں اور کوئی نیا حکم لے آتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں نسخ کو تسلیم کر کے اس کی حکمت بیان کی گئی ہے، نسخ کا انکار نہیں کیا گیا، منسوخ آیات قرآنی کی تعداد جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متفقہ میں کی اصطلاح میں

لہ قرآن محکم از مولانا عبدالصمد رحمن، ص ۲۱، مجلس معارف القرآن، دیوبند،
لہ ردح المعانی، علامہ آلوسیؒ، ص ۱۵۳ ج ۱،

نسخ کا مفہوم بہت وسیع تھا، اسی لئے انھوں نے منسوب خاتمیات کی تعداد بہت زیادہ بتائی ہے، لیکن علامہ جب اللال الدین سیوطیؒ نے متاخرین کی اصطلاح کے مطابق لکھا ہے کہ پولے قرآن میں مغل اُنیس آیتیں منسوب ہیں لیلہ، پھر آخری ذور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان اُنیس آیتوں پر مفصل تبصرہ کر کے صرف پانچ آیتوں میں نسخ تسلیم کیا ہے، اور باقی آیات میں اُن تفسیروں کو ترجیح دی ہے جن کے مطابق انھیں منسوب نہ نہیں پڑتا، ان میں سے اکثر آیتوں کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہات ہنایت معقول اور قابل قبول ہیں، لیکن بعض توجیہات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، بہرحال جن پانچ آیتوں کو انھوں نے منسوب تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں :-

كُتُبَ عَلَيْكُمُ الْحُدُودُ إِذَا حَضَرَ أَهْنَ كُمُ الْمُوْتُ، إِنْ شَرِّقَ خَيْرٌ
لِلْوَصِيَّةِ لِلَّوْلَدَيْنِ وَإِنْ قَرَبَيْنَ بِالْمَعْرُوفِ فِي حَقَّاعَتِي
الْمُتَقِيَّيْنِ ۵ (المقرہ : ۱۸۰)

جب تم میں سے کسی کے سامنے موت حاضر ہو جاتے اگر وہ ماں چھوڑ رہا ہو تو اس پر والدین اور اقرباء کے لئے وصیت بالمعروف کرنا فرض قرار دیدیا گیا ہے، یہ حکم متقیری پر لازم ہے ॥

یہ آیت اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب میراث کے احکام نہیں آتے تھے، اور اس میں ہر شخص کے ذمہ یہ فرض فسرا دیا گیا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترک کے بالے میں وصیت کر کے جائے کہ اس کے والدین یادوں کے رشتہ داروں کو کتنا کتنا مال تقسیم کیا جائے؟ بعد میں آیت میراث یعنی گیوچیخ کم از کم اخونے اس کو منسوب کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نے تمام رشتہ داروں میں ترک کی تقسیم کا ایک مطابق خود متعین کر دیا، اب کسی شخص پر مرنے سے پہلے وصیت کرنا فرض نہیں رہا،

(۲) سورہ النفال میں ارشاد ہے :-

إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشَرَ قَوْنَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا إِمَّا تَيْمَنَ وَإِنْ
يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا الْأَلْفَيْنَ إِنَّ الظَّالِمِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا
قَوْمٌ لَا يَفْقِهُونَ ه (النفال: ۴۵)

لب
”اگر تم میں سے بیس آدمی استقامت رکھنے والے ہوں گے تو وہ دوسو پر غافل
آجائیں گے، اور اگر تم میں سے ستو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کافر دیں پر غالب
آجائیں گے، کیونکہ یہ کافر ایسے لوگ ہیں جو صحیح سمجھ نہیں رکھتے۔“

یہ آیت اگرچہ ظاہراً ایک جزیرے، لیکن معنی کے لحاظ سے ایک حکم ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان
کو اپنے سے دس گناہ اور دشمن کے مقابلہ سے بھاگانا جائز نہیں، یہ حکم اگلی آیت کے
ذریعہ منسوخ کر دیا گیا،

أَلَّا نَخَفَقَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعِلِمَ أَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا، فَإِنْ يَكُنْ
مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا إِمَّا تَيْمَنَ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ
يَغْلِبُوا الْأَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَإِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ه (النفال: ۶۶)

”اب اللہ نے تمھارے لئے آسانی پیدا کر دی ہے، اور اللہ کو علم ہے کہ راب تم میں
کچھ کمزوری ہے، پس (اب) اگر تم میں سے نتواء فراد استقامت رکھنے والے ہوئے
تو وہ دوسو پر غالب رہیں گے، اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر
اللہ کے حکم سے غالب ہوں گے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اس آیت نے پہلی آیت کے حکم میں تحقیقت پیدا کر دی، اور دشمن گنے دشمن کے بجائے
دو گنے کی حد مقرر کر دی، کہ اس حد تک راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں،

۳۲، تیسرا آیت جسے حضرت شاہ صاحبؒ نے منسوخ قرار دیا ہے، سورہ آحزاہ
کی یہ آیت ہے :-

لَا يَعْلُمُ لَكُمُ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تُبَلَّ لِإِيمَنِي مِنْ آزْوَاجِ
قَلُوْأَعْجَبَكَ حَسْنُهُنَّ، (الاحزاب: ۵۱)

”دا نے نبی، آپ کے نئے اس کے بعد عورتیں حلال بھیں ہیں اور نہ یہ حلال ہر کوئی رموحردہ ازدواج کو بدل کر دوسرا عورت قول سنتے نکال کریں، خواہ ابکو آن کا حسن یسنا دائے یا

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید نکاح کرنے سے منع فرمادیا گیا تھا بعد میں یہ حکم منسوب کر دیا گیا اور اس کی ناتھ آیت وہ ہے جو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب میں مذکورہ بالا آیت سے پہلے مذکور سے یعنی :-

لَا يَأْتِيهَا النَّبَيُّ إِنَّا أَخْلَقْنَاكَ أَرْوَاحَكَ الَّذِي أَتَيْتَ أُجُورَهُنَّ إِلَيْ

سلے تھی، ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ ازواج حلال کر دی ہیں جنہیں آپ نے

اُن کا ہمدردیا ہو، الخ (الاحزاب: ۵۰)

حضرت شاہ صاحبؒ دعیہ کا ہنسا ہے کہ اس کے ذریعہ سابقہ ممانعت ملسوخ ہو گئی ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں نہ یقینی نہیں ہے، بلکہ اس کی وہ تفسیر بھی بڑی حد تک بے تکلف اور سادہ ہے، جو حافظ ابن حجریر طبریؒ نے اختیار کی ہے، یعنی یہ کہ یہ دونوں آیتیں اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی نازل ہوئی ہیں، یا آیہُا النَّبِيُّ
إِذَا أَخْلَقَنَا لَكَ آذْنَاجَكَ الْخَ دالی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مخصوص عورتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کے ساتھ نکاح آپؑ کے لئے حلال ہے، پھر اگلی آیت لَا يَحِلُّ لَكُنَّ الْسَّيَاءُ مِنْ بَعْدِ مَیْسِ ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپؑ کے لئے حلال نہیں، (۲) چوتھی آیت جو حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک منسوخ ہے، سورہ مجادلہ کی یہ آیت:-

سَيِّدُ الْجَمِيعِ الْأَنْبِيَاءِ مُحَمَّدُ الرَّسُولُ فَقِيَّ مُوَالِيَّنَ يَدِيَ

نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ ذِلِّيَّةٌ خَيْرٌ لَّهُمْ وَأَطْهَرُ مِنَ الْمَنَامِ لَمْ تَعْمَلُوا

فَإِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (المجادلة : ١٢)

لہٰ تفسیر ابن حجر عسکری

لے ایمان والواجب تم کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرگوشی کرنی ہو تو سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کر وایہ تھا راستے باعث خیر و طہارت ہی پھر اگر تھا راستے پاس صدقہ کرنے کے لئے کچھ نہ ہو تو انش تعالیٰ بختی والا اور ہربان ہے۔

یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہو گئی:-

ءَأَشْفَقْتُمُ أَنْ تُهْلِكَ مُؤْمِنَاتٍ يَذْكُرْنَ كُلُّ مُصَدَّقَاتٍ فَإِذَا كُنْتُمْ تَفْعَلُونَ أَوْ تَأْتِبَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَارْقَبُوهُ إِنَّ الْمُصْلَوَةَ قَوْلُوا الْزَكُوْرَةَ وَ أَطْبِعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ، (المجادل : ۱۳)

”کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات پیش کرو، پس جب تم نے ایسا ہمیں کیا اور اللہ نے تھا راستے توبہ قبول کر لی تو (اب) نماز فاقہم رکھو، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور انشاد در اس کے رسول کی اطاعت کرو“

اس طرح سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم منسوخ کر دیا گیا،

(۵) پانچوں آیت سورہ مزمل کی مندرجہ ذیل آیت ہے:-

يَا أَيُّهَا الْمُذَمِّلُ فِيمَا اللَّيْلَ إِلَّا قِيلَالا نِسْفَهَ أَوْ أَنْفَضْ مِنْهُ قِيلَالا
تَهْ مَزْمَلْ رَأَى نَحْفَرَتْ صَلِي اللَّهُ عَلِيهِ وَسَلَّمَ هَرَادِيْنْ (رَاتِ) رَاتِ كُوْرَ تَجْدِيْنْ (کھڑے رہتے)
مَگَرْ تَحْوِرَ اسْاحَصَهَ آدَمِيْ رَاتِ يَا اسِ مِنْ سے بھی کچھ کم کر دیجئے۔“ (المزمل : ۱)

اس آیت میں رات کے کم از کم آدھے حصہ میں تھجد کی نماز کا حکم دیا گیا تھا، بعد میں اگلی آیتوں نے اس میں آسانی پیدا کر کے سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا، وہ آیتیں یہ ہیں:-

عَلِمَنَ أَنْ تَنْ تُخْصُمُونَ فَتَأْبِ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُ وَآمَاتِيَّسَ حَرَتْ
الْقُلُّ أَنْ (المزمل : ۲۰)

”اللہ کو معلوم ہو کہ تم (آئندہ) اس حکم کی پابندی نہیں کر سکو گے، اس لئے اللہ نے تھیں معاف کر دیا، پس راب (تم قرآن کا اتنا حضرت پڑھو یا کرو،

جو تمہارے لئے آسان ہو۔“

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ تہجد کا حکم واجب تو پہلے بھی نہیں تھا، لیکن پہلے اس میں زیادہ تاکید بھی تھی اور اس کا وقت بھی زیادہ وسیع تھا، بعد میں تاکید بھی کم ہو گئی، اور وقت کی اتنی پابندی بھی نہ رہی،

یہ یہیں وہ پانچ آیتیں جن میں حضرت شاہ صاحبؒ کے قول کے مطابق نسخ ہوا ہر لیکن یہ واضح رہے کہ یہ پانچ مثالیں صرف اس صورت کی ہیں جن میں ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن کریم کے اندر موجود ہیں، اس کے علاوہ ایسی مثالیں قرآن کریم میں باقاعدہ بہت سی ہیں جن میں ناسخ تو قرآن کریم میں موجود ہے، لیکن منسوخ موجود نہیں مثلاً تحول قبلہ کی آیات دغیرہ،

نیجہ بحث | نذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد دراصل یہ بتانے ہے کہ قرآن کریم کی آیتوں میں نسخ کا وجود رمعاذ اللہ کوئی عیب نہیں ہے، جن سے قرآن کریم کو خالی دکھانے کی کوشش کی جاتے، بلکہ یہ حکمت الہی کا یعنی تقاضا ہے، لہذا اسی آیت کی کسی تفسیر کو محض اس بناء پر رونہیں کرنا چاہئے کہ اس کے مطابق قرآن میں نسخ لازم آتا ہے، بلکہ اصول تفسیر کے مطابق جو تفسیر راجح ہو اُسے اختیار کر لینے میں کوئی قباحت نہیں، نواہ اس میں آیت کو منسوخ قرار دینا پر طبقاً ہو،
واللہ بحکامہ اعلم ۔

— ﴿۱۷۲﴾

باب سیم

تاریخ حفاظتِ قرآن

نزوںِ قرآن کی تاریخ اور اس کے متعلق مباحثت سے صدری حدیک فارغ ہونے کے بعد اب "تاریخ حفاظتِ قرآن" کے موضوع پر گفتگو پیش نظر ہے جس میں یہ بتایا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے زمانوں میں قرآن کریم کی حفاظت کس طرح کی گئی؟ اُسے کس طرح لکھا گیا؟ اور یہ کوششیں کتنے مراحل سے گذری ہیں؟ نیز اس سلسلے میں غیر مسلموں اور ملحدوں کی طرف سے جوشک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جانی ہے اُن کا انشاء اللہ مکمل اور اطمینان بخش جواب دیا جائیگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن کریم جو تم ایک بھی دفعہ پر اکاپورا نمازیں ہووا، بلکہ اس کی مختلف آیات صدرت اور حالاً زمانے میں حفاظتِ قرآن کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے ہمدر سالٹ میں یہ ممکن ہمیں تھا کہ شروعی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو وسمی آسمانی کتابوں کے مقابلے میں یہ امتیاز عطا فریا تھا کہ اس کی حفاظت قلم اور کاغذ سے زیادہ حفاظت کے سینوں پر کرائی چنا پچھے صحیح مسلم میں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا:-

وَمَنْزِلٌ عَلَيْكَ كَتَابًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ
تَعْنِي میں تم پر ایک ایسی کتاب نازل کرنے والا ہوں ہے
پانی ہمیں دھو سکے گا۔

مطلوب یہ ہے کہ دنیا کی عام کتابوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ دنیوی آفات کی وجہ سے منائع ہو جاتی ہیں، چنانچہ تورات، انجیل، اور دوسرے آسمانی صحیفے اسی طرح نابود ہو گئے لیکن قرآن کریم کو سیزوں میں اس طرح محفوظ کر دیا جائے گا کہ اس کے ضلع ہونکا کوئی خطرہ باقی نہ رہے، چنانچہ ابتداء سے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دریا گیا، شروع شروع میں جب دھی نازل ہوتی تو آپ اس کے الفاظ کو اُسی وقت دھرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:-

لَا تُحِرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمِيعَهُ وَقُرْآنَهُ
آپ قرآن کریم کو جلدی سے یاد کر لینے کے خیال سے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے، (کیونکہ) اس رقرآن (کو جمع کرنا اور پڑھوانا تو ہم نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔)

(القیمه: ۱۶ و ۱۷)

اس آیت میں یہ بات واضح کردی گئی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپ کو عین نزولِ دھی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دھرانے کی صدررت ہمیں، اللہ تعالیٰ اخود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ دھی کے بعد آپ اُسے بھول ہمیں سمجھیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپ پر آیاتِ قرآن نازل ہوتیں اور ادھر وہ آپ کو یاد ہو جاتیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ آجنبینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپ مزید احتیاط کے طور پر ہرسال رمضان کے چینے میں حضرت

جریل علیہ اسلام کو قرآن سُننا یا کرتے تھے، اور جس سال آپ کی دفات ہوئی اس سال آپ نے دو مرتبہ حضرت جرجیل علیہ السلام کے ساتھ دُر کیا۔^{۱۰}

پھر آپ صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے صرف معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اس کے الفاظ بھی پاد کرتے تھے، اور خود صحابہ کرام کو قرآن کریم سمجھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملے میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہر دی سے سواتے اس کے کوئی ہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسٹے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقفت کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اُسے ذہراتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں کجب کوئی شخص سمجھتے کہ کسے مکمل کرم سے مریئی طبیہ آتا تو آپ لے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرمائیتے تاکہ رہ اسے قرآن سمجھاتے، اور مسجد نبوی میں قرآن سمجھنے اور سکھانے والوں کی آوازیں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمائی پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مخالف طبق پیش نہ آئے۔^{۱۱}

اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، اور انھیں صد بولن تک گمراہی کے اندر بیرون میں بھٹکنے کے بعد قرآن کریم کی کوہ منزل ہدایت نصیب ہوئی جسے وہ اپنی زندگی کی سب سے عزیز پوربجخی تصور کرتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے یاد رکھنے کے لئے کیا کچھ اہتمام کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو ان کے مزاج اور افتادہ طبع سے واقع ہے، چنانچہ تھوڑی یہ نہت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی تعداد تیار ہو گئی جسے قرآن کریم از بر یاد کیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظۃ قرآن کی اس جماعت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

لدی صحیح بخاری و مجمع فتح ابیاری، ص ۳۶۷ ج ۹
تہ مسائل المرفان، ص ۲۳۴ ج ۱۱

عمرہ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالم مولیؓ ای حذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت غفران بن ناسؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبد اللہ ابن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن اسماؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام ورقہؓ، حضرت ابی آن کعبؓ، حضرت معاویہ بن جبلؓ، ابو طیمہ معاویہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو الداؤدؓ، حضرت مجتبی بن جبارؓ، مسلمہ بن مخلدؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت یحییٰ دارمیؓ، حضرت ابو موسیٰ الشعراًیؓ، اور حضرت ابو زید رضی اللہ عنہم جیسے حضرات شامل تھے۔

پھر یہ تو صرف اُن صحابہ کرامؓ کے اسماء گرامی ہیں جن کا نام حافظتِ قرآن کی جیشیت سے روایات میں محفوظ رہ گیا، ورنہ ایسے صحابہؓ تو بے شمار ہوں گے جنہوں نے پورا قرآن کریم یاد کیا تھا، لیکن اس جیشیت سے اُن کا نام روایات میں محفوظ نہیں رکھا، اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ادوات ایک قبیلے میں مشترک قراری فتران کی تعلیم کے لئے بھیج ہیں، چنانچہ صرف غزہ بہرہ زمین کے موقع پر مشترک قرار، صحابہؓ کے شہید ہونے کا ذکر روایات میں موجود ہے، اور حفاظتِ حجۃ کی تقریباً اتنی ہی تعداد آپ کے بعد جنگ یامہ میں شہید ہوئی ہے بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ جنگ یامہ کے موقع پر راست سو قرار صحابہؓ شہید ہوتے تھے،

اس کے علاوہ یہ تو صرف اُن صحابہؓ کا ذکر ہے جن کو پورا قرآن کریم یاد کیا، ایسے ایسے صحابہؓ کا تو کوئی شمارہ بھی نہیں ہے جنہوں نے قرآن کریم کے متفق حصے یاد کر رکھے ہوئے لئے،

لکھ الاتقان، ص ۲۷ ج ۱

تلہ عمدۃ القاری ص ۱۶ و ۱۷ ج ۲۰ مطبوعہ دمشق،

لکھ البر بان فی علوم القرآن للزرکشی وص ۲۳۱ تا ۲۷۳ ج ۱

غرض ابتداء سلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے بنیادی طریقہ یہی اختیار کیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کو یاد کرایا گیا، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ سب سے زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس دیگر کے ذریعہ موجود تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ فرقہ قرآن کریم کی دینی پیاسے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی، کہ ایک ایک شخص ہزاروں شمار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے ہمیں اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اس قوت حافظت سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پھر پڑ گئیں،

اس طریقہ سے قرآن کریم کی نشر و اشاعت کس تیزی کے ساتھ ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر بن مسلمؓ ہمدرسالتؓ کے ایک کمین صحابی تھے، ان کا گھر ایک چشمہ کے کنارے واقع تھا، جہاں آنے جانے والے مسافر آرام کیا کرتے تھے، اُن کی عرشات سال تھی اور ابھی مسلمان بھی ہمیں ہوتے تھے، لیکن آنے جانے والوں سے قرآن کریم کی مختلف آئیتیں اور سورتیں من گرا خیس مسلمان ہونے سے پہلے ہی قرآن کریم کا ایک اچھا خاصا حصہ یاد ہو گیا تھا۔^{۱۰}

۱۰ ہمدرسالت میں کتابت قرآن

پہلا مرحلہ

حافظت قرآن کا اصل مدار تو اگرچہ حافظہ پر تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی تھا

لہ صحیح بخاری؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا، کتابت کا طریق کا رحیم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں یہ بیان فرمایا ہے کہ:-

سنت اکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان اذ انزل
علیه الوحی اخذ تھے بر جاء شدید تھے و عرقاً مثل الجماں ثم سری
عنه، نکنت ادخل عليه بقطعة الکتف او کسوہ فاکتب و هو یعنی
علی فدا الفرع حتی تکادر جلی تنسمر من نقل القرآن حتی افول
لا امشی علی رجلی ابد افادا فرغت قال اقرأ فاقرئہ فان کان
فیہ سقط اقامہ ثم اخراج به الی الناس

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دھی کی کتابت کرتا تھا، جب آپ پر
وھی نازل ہوئی تو آپ گوخت گرمی لگتی تھی، اور آپ کے جسم اہم پر پیش کے
قطرے موتوں کی طرح ڈھلنکنے لگتے تھے، پھر آپ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی،
تو میں مونڈھ سے کی کوئی ہڈی ریاسی اور پیر کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہو
آپ لکھواتے رہتے اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھکر فارغ ہوتا
تو قرآن کو نقل کرنے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ
ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی جل بینیں سکوں گا، بہر حال اجنب میں فارغ ہوتا
تو آپ فرماتے: "پڑھو" میں پڑھ کر سنا تا اگر اس میں کوئی فرد گذاشت
ہوئی تو آپ اس کی اصلاح فرمادیتے، اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے
کتابت دھی کا کام صرف حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے سپرد نہ تھا، بلکہ آپ نے بہتے
صحابہؓ کو اس مقصد کے لئے مقرر فرمایا ہوا تھا، جو حسب ضرورت کتابت دھی کے

لہ رواہ البطرانی حفظہ اللہ علیہما وآلہ وساتھی موثقون الزان فیہ وجہت فی کتاب خالی فہر جمال (مجموع الزیارات)
نیز الرذیں الہیشی حصہ ۱۵۲ ص ۱، باب عرض الکتابت بعد اسلام، دارالکتاب العربي، بیروت

سال ۱۹۷۴ء

فرازف انجام دیتے تھے، کا تبینِ دحی کی تعداد جاں نسیم تک شمار کر گئی بھے لیکن ان میں سے زیادہ مشهور یہ حضرات ہیں :-

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بکرؓ،
حضرت عبداللہ بن ابی سرخؓ، حضرت زیر بن عوامؓ، حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ،
حضرت ابیان بن سعید بن العاصؓ، حضرت حنظله بن الریسؓ، حضرت معقب بن ابی
فاطمؓ، حضرت عبداللہ بن ارقم الزہریؓ، حضرت شرجیل بن حسنةؓ، حضرت عبداللہ
بن رواحةؓ، حضرت عامر بن فہیرؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ثابت بن قیس بن
شماسؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ،
حضرت زید بن ثابتؓ

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قران کی
کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبِ دحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سوڑہ
میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے، چنانچہ اسے آپ کی ہدایت کے مطابق لکھا جائے
تھا، اس زمانے میں پونکہ عرب میں کاغذ کی کتاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر تحریر
کی سلوں، اور چھپٹے کے پارچوں، کجھو کی شاخوں، یا نس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں
اور جا نوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال
کئے گئے ہیں،

لہ علوم القرآن، صحیح صالح، ترجمہ اردو غلام احمد حبیری، ص ۱۰، جواہ مستشرق بلڈ شریور ۱۹۶۸ء
ملک برادر زلائل پور ۱۹۶۸ء)

لہ یہاں تک کے نام فتح الباری، ص ۱۸، ج ۹ سے ماخذ ہیں،
لہ ان حضرات کے اساتے گرامی کیلئے دیکھے زاد المعاد لابن قیمؓ ص ۳، ج ۱ مطبوعہ دینیتہ مصر
لہ فتح الباری، ص ۱۸، ج ۹ جواہ مسند احمد، ترمذی، نسائی، گ، ابو داؤد، ابن حبان و حاکم و صحیح،
ابن حبان و الحاکم، ۵ ایضاً ص ۱۸، ج ۹ دعۃ القاری میں، ج ۲۰، ادارۃ الطباعة المیریہ وہشت

اس طرح ہمدردِ سالت میں وتر آن کریم کا ایک فتحہ تورہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوا یا تھدا اگرچہ وہ کتابی شکل میں نہ تھا بلکہ منفرد پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے قرآن کریم کی آیات اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے بالکل ابتدائی دورے جاری تھا جس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت الخطابؓ اور سہنونؓ حضرت سعید بن زید حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے، اور جب حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے کی خبر سننکر غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، تو ان کے سامنے ایک صحیفہ رکھا ہوا تھا، جس میں سورہ ظلہ کی آیات درج تھیں، اور حضرت خطاب بن ارتؓ نے اسخیں پڑھا رہے تھے۔^۱

اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ان فزادی طریقے اپنے پاس وتر آن کریم کے مکمل یا نامکمل نسخے لکھ رہے تھے ہشلاً صحیح بخاریؓ میں حضرت ابن عمرؓ سے ہر دوی ہے کہ:-

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَىٰ أَنْ يَسَافِرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى
أَصْحَى الْعَدُوِّ^۲،

رَسُولُ النَّاسِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَىٰ قُرْآنَ كَرِيمَ كَوْلَىٰ كَرْ دَشْمَنَ كَيْ زَمِينَ مِنْ سَفَرٍ
كَرْ نَفَ سَمْنَعْ فَرْمَايَا^۳،

لـ سنن دارقطنی ص ۱۲۳ ج ۱ طبع مدینہ طبیبہ، باب نہیٰ الحدث عن عیش القرآن دمحج الزوابدی،
للہبیشی، ج ۱۱ ج ۹ طبع بیروت، مناقب عمرؓ و سیرت ابن ہشام ہیامش، زاد المعاد ص ۶۷، ۱۸۰،
ج، احافظ ریحیؓ نے اس واقعہ کو سندًا جبید قرار دیا ہے، (نصب المزید)
لـ صحیح بخاریؓ، کتاب الجہاد، ص ۳۱۹ و ۳۲۰ ج ۱، اصح المطابع،

نیز مجمع طبرانیؒ میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے
 قرآن الْجَلْ فِي غَيْرِ الْمُصْحَّفِ الْفَتَدْرِجَةُ وَقِرَأْعَتَهُ فِي الْمُصْحَّفِ
 تضاعفت عَلَى ذَلِكَ الْفَتَدْرِجَةِ،
 ”کوئی شخص قرآن کریم کے نسخہ میں دیکھے بغیر تلاوت کرے تو اس کا ثواب
 ایک ہزار درجہ ہے، اور اگر قرآن کے نسخہ میں دیکھ کر تلاوت کرے تو دوہزار
 درجہ ہے“ ॥

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؐ کے پاس ہمدرسالت، ہی میں
 قرآن کریم کے لکھے ہوئے صحیفے موجود تھے، ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کو دیکھ کر تلاوت
 کرنے والے لے کر دشمن کے علاقے میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا،

حضرت ابو بکرؓ کے ہمہ میں جمع قرآن

دوسرے مرحلے

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے
 گئے تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوتے تھے، کوئی آیہ
 چھڑپے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہٹڑی پر، زیادہ مکمل نسخہ نہیں تھے، کبھی صحابی
 کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں، اور کسی کے
 پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؐ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھی
 ہوئے تھے،

اس بناء پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہمدرد خلافت میں یہ ہمدردی سمجھا
 کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصتوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انہوں نے یہ

له مجمع الزوائد، ص ۱۶۵، مطبوعہ بیردت، قال المیشی رواه الطبرانی وفیہ ابوسعید بن
 عون و ثقة ابن عبد نبی روایت وضعف في أخرى و بقية رجاله ثقات،

کار نام جن محسر کات کے تحت اور جب طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابت، رضی نے یہ بیان فشر مانی ہے کہ جنگ یمانہ کے فوراً بعد حضرت ابو بکر رضی تھے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر گلوایا، میں اُن کے پاس بیچا، تو وہاں حضرت عمر بن جبی موجود تھے، حضرت ابو بکر رضی نے مجھ سے فرمایا کہ ”عمر نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمانہ میں قتل آن کریم کے حفاظت کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہمیں قتل آن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپیدا نہ ہو جائے، لہذا میری راستے یہ ہی کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام متعدد کر دیں،“ میں نے عمر رضی سے کہا، کہ جو کام آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ عمر نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمر بن جبی سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا، اور اب میری راستے بھی وہی ہے جو عمر رضی کی ہے،“ اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی نے مجھ سے فرمایا کہ: ”تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، سہیں تمھارے بائے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابتِ درجی کا کام بھی کرتے رہے ہو، لہذا تم قتل آن کریم کی آئیوں کو تلاش کر کر کے اپنیں جمع کرو“

حضرت زید بن ثابت نے فرمائے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا یو جو جدہ ہوتا جتنا جمعِ قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کریں یہی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابو بکر رضی نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی... مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی راستے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابو بکر رضی و عمر رضی کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا متعدد کیا، اور بھجو کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا۔

لئے صحیح بخاری ”مع فتح الباری، ص ۲۶۱“

اس موقع پر صحیح قرآن کے سلسلہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، جیسا کہ پچھے ذکر آچکا ہے وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظات اس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بننا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا، نیز قرآن کریم کے جو مکمل نسخہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے، حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرمائے تھے، لیکن انہوں نے احتیاط کے پیش نظر ان میں سے صرف کسی ایک طریقہ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اُس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جسکے اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ نیا اخراج ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی کوئی آیات نکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئیں، اور جب کوئی شخص ان کے پاس فترآن کریم کی کوئی نکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:-

۱۔ سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے تھے،

۲۔ پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ان کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگادیا تھا، اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے یہ لہذا حضرت زیدؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ بھی اپنے حافظ سے اس کی توثیق فرماتے تھے،

لہ فتح الباری ص ۱۱۹ بحوالہ ابن ابی داؤد فی کتاب المعاطف کہ ایضاً بحوالہ مذکور،

۳۔ کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہ کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دی دی ہو کر یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ بظاہر ہر یہ گواہیاں اس بات پر بھی لی جاتی تھیں کہ یہ لکھی ہوئی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفات کے سال آپ پر میش کر دی گئی تھی، اور آپ نے اس بات کی تصریح فرمادی تھی کہ یہ اُن حروف سبع کے مطابق ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے، علامہ سیوطی چکی اس بات کی تایید متعذر دروایات سے بھی ہوتی ہے،

۴۔ اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا ان مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، امام ابو شامةؓ ذلتی ہیں کہ اس طبق کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کی کتابت میں زیادہ سے زیادہ حستیا طسے کام لیا جائے، اور قرآن حافظہ پر التفاہ کرنے کے جایے لعینہ اُن آیات سے نقل کیا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں،

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمیع قرآن کا یہ طریق کارڈ ہیں میں لہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب ابھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ سورہ براءۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ الْمُنْجِي صرف حضرت ابو حنزیمہؓ کے پاس ملیں، اُن کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں، اس کا مطلب یہ ہے نہیں ہے کہ یہ آیتوں سواتے حضرت ابو حنزیمہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو اُن کا جگز دفتر آن ہونا معلوم نہ تھا،

لہ الاتقان، ص ۶۰ ج ۲، ۳۷

۳۷ د ناطلب القرآن متفرق ایضاً عرض بالمجتمع عند من بقى ممن جمع القرآن ليشترك الجميع في علم ما جمع رالبريان في علوم القرآن، ص ۲۳۸ ج ۱)

لہ الاتقان، ص ۶۰ ج ۲، ۳۷

بلکہ مطلب یہ ہر کو جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی قرآن کریم کی متفرغی آیتیں لے کر آ رہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوابی حضرت خرمیرہؓ کے سکی کے پاس نہیں ملیں ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہر یہ بات تو اتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، اُول توجہ سینکڑوں حفاظاً کو پورا قرآن کریم یاد کھا، انھیں یہ آیات بھی یاد تھیں، دوسرے آیات قرآنی کے جو مکمل مجموع مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے ان میں بھی یہ آیت لکھی ہوئی تھی، لیکن چونکہ حضرت زید بن ثابت نے مزید احتیاط کے لئے مذکورہ بالاذراع پر اتفاق کرنے کے بجائے متفرق طور سے لکھی ہوئی آیتوں کو جمع کرنے کا بڑا بھی اٹھایا تھا، اس لئے انھوں نے یہ آیت اس وقت تک اس سی مجموع میں درج نہیں کی، جب تک اس تیسرے طریقہ سے بھی وہ آپ کو دستیاب نہیں ہو گئی دوسری آیات کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ حفاظ صحابہؓ گویا ہونے اور عہد رسالت کے مکمل مجموعوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ کسی کمی صحابہؓ کے پاس الگ سے لکھی ہوئی تھیں، چنانچہ ایک ایک آیت کسی کمی صحابہؓ نے کر آ رہے تھے، اس کے بر عکس سورہ براءت کی یہ آخری آیات سینکڑوں صحابہؓ گویا تو تھیں، اور جن حضرات کے پاس آیات فتر آنی کے مکمل مجموع تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابو خزیرہؓ کے پاس ملیں کسی اور کے پاس نہیں۔^{۱۰}

بہرحال، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو صحیح کر کے انھیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا، لیکن ہر سورۃ علحدہ صحیفہ میں لکھی گئی، اس لئے یہ فتح بہت سے صحیفوں میں مشتمل تھا، مصطلح

له ابریان فی علم القرآن، ص ۲۳۷ و ۲۳۵ ج ۱، ۳۰۵ عن سالم قال جمع ابو بکر لقرآن فی قرطیس رالقان ص ۶۰ ج ۱) ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ نسخہ بھی جوڑے کے پارچوں پر لکھا گیا تھا لیکن حافظ ابن حجر عسکری اس کی تردید کی ہے، (الیضا)

میں اس نسخہ کو "امم" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:-

(۱) اس نسخہ میں آیات قرآن تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہ تھیں، ہر سورت الگ الگ
یکھی ہوئی تھی۔^۱

(۲) اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے ہے۔

(۳) یہ نسخہ خطہ حیری میں لکھا گیا تھا، لہ

(۴) اس میں صرف وہ آیتیں درج کیگئی تھیں جنکی تلاوت منسوب نہیں ہوئی تھی،
(۵) اس کو لکھوںے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی اجتماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے،

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جمیع قرآن سے متعلق یہ تفصیلات ذہن میں یہی تو اس روایت کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے جس میں بیان کیا گیا، ہر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد حضرت علیؓ نے قرآن کریم جبیح حضرت علیؓ نے کہ جہاں تک آیات قرآنی کے انفرادی مجموعوں کا تعلق ہے وہ صر کر دیا تھا، اس لئے کہ جہاں ہی نہیں اور بھی متعدد صوراً پر نے تیار کر رکھے تھے، لیکن ایسا معیار یہ نہ چوپو ری اُمّت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو سبے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تیار کروایا،

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمر رضی کے پاس رہے، حضرت عمر رضی کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اخھیس ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے پاس منتقل

سلہ اتقان ۱۰۷

سلہ مقابل العرفان، ص ۲۳۶ و ۲۳۷ ج اوتاریخ القرآن للکردی ص ۲۸۲

سلہ تاریخ القرآن از عبدالصمد صارم، ص ۲۳ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء

کرد یا گیا۔ پھر و ان بن حکم نے اپنے عہد حکومت میں حضرت حفصہؓ سے یہ صحیفے طلب کئے تو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ جب حضرت حفصہؓ کی وفا ہو گئی تو وہ ان نے وہ صحیفے منگوائے اور انھیں اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور ترتیب سور کے لحاظ سے حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحدت کی اجتیاح لازمی ہے، اور کوئی ایسا نجہ باقی نہ رہنا چاہئے جو ان کے رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمیع قرآن

تیسرا مرحلہ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ کا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاهدین اسلام یا ان تاجر وی سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، ادھر آپ پھیپھی پڑھ پڑھ کر ہیں کہ قرآن کریم شاہزادی سے حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرام نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس نئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود اُس نے حضور مسیح پڑھا تھا، اس طرح قراء، تو ان کا یہ اختلاف دور دراز مالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم شاہ حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس خلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز مالک میں پہنچا، اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم شاہ حروف پر نازل ہوا ہے، تو اُس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے

کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو می خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سلسلیں غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرا سے سوائے حضرت زیدؑ کے لئے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طبیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا عیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے جنت بن سکے، کیونکہ دوسرا نسخہ الفزادی طور پر لکھے ہوئے تھے اور ان میں ساتوں حدود کو صحیح کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے اُن جھگڑوں کے تصفیہ کی کوئی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخہ پر سے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حدود صحیح ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ دیصکل کیا جاسکے کہ کوئی فترات صحیح اور کوئی غلط ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عبدالخلافت میں یہی عظیم اشان کا رسمہ انجام دیا،

اس کا رسمہ کی تفصیل ردا یافت حدیث کے ذریعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذربایجان کے محاذ پر جہار میں مشغول تھے، دہل انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں دستران کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہوا رہا ہے، چنانچہ مدینہ طبیبہ والپس آتے، سی وہ سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچئے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہو و نصاریٰ کی طرح اختلافات کا شکار ہوا اپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمان نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیہ کے محاذ پر جہار میں شامل تھا، دہل میں دیکھا کہ شام کے لوگ ابی بن کعبؑ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سُنی، ہوتی، اور اہل عراق عبد اللہ بن مسعودؑ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سُنی ہوتی، اس کے تجھ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں،

حضرت عثمان خود بھی اس خطرے کا احساس پہنچئے ہی کرچے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طبیبہ میں ایسے واقعات پہنچ آتے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا اور دوسرے معلم نے دوسرا قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد بابهم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا

اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قرار تک
غلط فتوار دیتے، جب حضرت حدیث بن یحیاؓ نے بھی اس خطے کی طرف توجہ دلائی
تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا، اور فرمایا کہ ”مجھے یہ
اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قرار
تمہاری قرار سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہذا آپ لوگوں
کی اس باتیں میں کیا راستے ہے؟“ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ ”آپ نے کیا
سوچا ہے؟“ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ”میری راستے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف
پر جمع کر دیں، تاکہ کوئی اختلاف اور افراق پیش نہ آئے“ صحابہؓ نے اس راستے کو پسند
کر کے حضرت عثمانؓ نے کی تائید فرمائی،

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ
”تم لوگ مدینہ طلبیہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءت توں کے بارعے
میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر
ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے،
لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الافتہ ہو،“
اس غرض کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام
بھیجا کہ آپ کے پاس رحمت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے
پاس بھیج دیجیے، ہم ان کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو داہیں کر دیں گے، حضرت
حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیتے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے
چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنالی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ،
حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی،
اس جماعت کو اس کام پر مأمور کیا گیا کہ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں سے نقل کر کے
کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان صحابہؓ میں سے چار حضرت
زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی تھے، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے

اُن سے فرمایا کہ متحب مختار اور زیرِ مذکور کا قرآن کے کسی حصت میں اختلاف ہو رہی ہی اس میں اختلاف ہو کر کون سا لفظ اس طرح لکھا جائے؟ تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم ابھی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔
بیانی طور پر یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر وہ سرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگادیا گیا، یہاں تک کہ ابن الی داؤدؓ کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، جن میں حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت کثیر بن افلاجؓ، حضرت مالک بن ابی عامرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے، ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیتے ہیں:-

(۱) حضرت ابو بکر رضی کے زمانے میں جو فخر تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب ہیں تھیں، بلکہ ہر سورت اللگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی صحف میں لکھا۔

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قرائیں سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ فقط لگاتے گئے اور نہ حرکات (زیرِ زبر، پیش) تکارکے سے تمام متواتر قرأتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلًا مسرها لکھا، تکارکے نئُشُرَهَا اور نئُشُرُهَا دونوں طرح پڑھا جاسکے، کیونکہ یہ دونوں قتراتیں درست ہیں۔^۱

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب صحف کی

۱۔ یہ پوری تفصیل فتح الباری ص ۱۳ تا ۱۵ ج ۹ سے ماخوذ ہے،

ٹہہ مستدرک حاکمؒ، ص ۲۲۹ ج ۲ ،

ٹہہ مناہل العرفان ص ۲۵۳ و ۲۵۴ ج ۱ ،

ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم سجستانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ مکمل سات نسخہ تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکمل مکرہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بیچج ریا گیا، اور ایک مذین طبیہ میں محفوظ رکھا گیا،^{لہ}

(۲) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو اپنی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے دہی طریق کا خشتیار فرمایا، جو حضرت ابو بکرؓ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خشتیار کیا گیا تھا، چنانچہ آخر حضرت صلی اللہ علیہ کے زمانے کی جو متفق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، انھیں دوبارہ طلب کیا گیا اور اُن کے ساتھ از سر نو مقابلہ کر کے یہ نئے نسخہ تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورہ احزاب کی ایک آیت وَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَنَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهُ عَلَيْهِ عَلِيهِ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت الانصاریؓ کے پاس ملی، پچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یادیں نہیں، اکیونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

فَقَدْ أَيَّةٌ مِنَ الْأَحْزَابِ حِينَ نَسْخَنَا الْمَصْحَفَ قَلَّ كَنْتَ
اَسْمَعُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُهَا، فَالْمُتَسْمِتاً
فُوجِدَنَا هَا مَعَ خَرْبِيَّةَ بْنَ ثَابَتَ الْأَنْصَارِيَّةَ،

”بھی مصحف لکھتے وقت سورہ احزاب کی آیت نہ مل جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنائی تاھم نے اسے تلاش کیا تو وہ خرْبِیَّہ بن ثابت الانصاریؓ کے پاس ملی“

لہ صحیح بخاری فتح الباری، ص، ۱۴۹

لہ صحیح بخاری مع فتح الباری، ص، ۱۴۹

اس سے ساف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؑ اور دس سکر صحابہؓ کا پھی طب یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی تھی، کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دس سکر صحابہؓ کے پاس فتوان کریم کے جوان فزادی طور پر لکھ ہوئے نسخ موجود نہیں ہیں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق ستر دروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہؓ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، اس نئے حضرت زیدؑ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک ان ستر دروں میں بھی دہ دہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعارض صحابہؓ کے پاس علّحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورہ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی،

(۵) قرآن کریم کے یہ متعارض معیاری نسخ تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انزادی نسخ نذر آتش کر دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، سلسلہ فتواءً توں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنالہ کو پوری امتت نے بہ نظر احسان و سکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رجھت ہوئی تھی، جس کے اسباب "سبعة احرف" کی بحث میں گزر چکے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:-
لَا تَقْرُلُونَ فِي عَمَانٍ إِلَّا خَيْرًا فَوَاللَّهِ مَا فَعَلَ الَّذِي فَلَلِ فِي الْمَصْنَعِ
الْأَعْنَى مَلَأَ مَنَّا بِهِ

عثمانؓ کے بائیے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہے، انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں را در بہم

لئے فتح الباری، ص ۱۴۹، بحوالہ ابن ابی اُوذر جلندی صحیح،

تہبیلِ تلاوت کے اقدامات

چوتحار حمل

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کا زمانے کے بعد امت کا اس پر جائز ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ و تابعینؓ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی دیسیح پیانے پر اشاعت کی،

یہکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور ریزیز پیش سے خالی تھے، اس لئے اہل حجہ کو آن کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی مالک میں اور زیادہ پھیلاؤ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے جن کی مختصر تایخ درج ذیل ہے،

نقط اہل عرب میں ابتداءً حروف پر نقط لگانے کا رواج نہیں تھا، بلکہ لکھنے والا خالی حروف لکھنے پر اکتفا کرتا تھا، اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، سیاق و سبق کی مرد سے مشتبہ حروف میں امتیاز بھی بآسانی ہو جاتا تھا، بلکہ بسا اوقات نقطے ڈلنے کو میوب سمجھا جاتا تھا، متوجه مارٹنی ہونے ایک اوپر کا مقولہ نقل کیا ہے کہ:-

کثرة النقط في الكتاب سوءظن بالمحظى عليه
نقط میں کثرت سے نقطہ ڈالنا مکتب ایہ رکی فہم) سے بدگمانی
کے مراد ہے ॥

چنانچہ مصاہفِ عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے، اور عمومی رواج کے علاوہ اسکا ایک بڑا مقصدر یہ بھی تھا کہ اس رسم الخط میں تمام متواتر قراتیں سما سکیں، لیکن بعد میں بھی اور کم پڑھے تکمیل مسلمانوں کی ہمولت کے لئے قرآن کریم پر فقط ڈال لگئے، اس میں روایات مختلف ہیں کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب پہلے کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا ہے بعض کاہمنا ہے کہ انہوں نے یہ کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلقین کے تحت کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زید بن ابی سفیانؓ نے ان سے یہ کام کرایا، اور بعض کہتے ہیں کہ عبدالملک بن مردان کی فرمائش پر یہ کام کیا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ ججاج بن یوسفؓ نے حسن بصریؓ، حیجی بن نعمرؓ اور نصر بن عامرؓ کے ذریعہ انجام دیا ہے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے لہیں شخص نے قرآن کریم پر نقطے ڈالے وہی نقطوں کا موجود بھی ہی، اس سے پہلے نقطوں کا کوئی صد ہمیں تھا، لیکن علامہ قلقشندیؓ نے (جو رسم الخط اور فنِ انشاء کے متعلق ترین عالم تھا) اس کی ترویید کی ہے، اور بتایا ہے کہ نقطوں کی ایجاد اس سے بہت پہلے ہو چکی ہیں، ایک روایت کے مطابق عربی رسم الخط کے موجود قبیلہ بولان کے مرآم بن مرہ، اسلم بن سدرہ اور عاصم بن جدرہ ہیں، مرآم نے حدود کی صورتیں ایجاد کیں، اسلام نے فصل و صل کے طریقے وضع کئے، اور عاصم نے نقطہ بنائے ہوئے اور ایک روایت یہ بھی

لہ البرہان فی علوم القرآن ص ۲۵۰ ج ۱ الاتقان ص ۱، اج ۲ نوع ۴۶ ،

لہ صحیح الاعشی ص ۱۵۵ ج ۳ ،

لہ البرہان ص ۲۵۰ د ۲۵۰ نوع ۱۲ ،

لہ الاتقان ص ۱، اج ۲

وہ تفسیر قرطبی ص ۶۳ ج ۱ تابیخ القرآن للکردی ج ۱،

لہ صحیح الاعشی ص ۱۲ ج ۳ ،

ہے کہ نقطوں کے سب سے پہلے استعمال کا ہر احضرت ابوسفیان بن حربؓ کے دادا ابوسفیان ابن امیثہ کے سرہتے، انہوں نے یہ تجویز کے باشندوں سے سیکھے تھے، اور تجویز کے باشندوں نے اپنے انبار سے یہ ہندو نقطے ایجاد توہبت پہلے ہوچکے تھے، لیکن قرآن کریم کو متعدد مصلحتوں کے تحت اُن سے خالی رکھا گیا تھا، بعد میں جس نے بھی قرآن کریم پر فقط ڈالے وہ نقطوں کا موجود نہیں ہے، بلکہ صرف قرآن کریم میں ان کا استعمال سب سے پہلے اس نے کیا ہے،

حرکات نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر زبر پیش) بھی نہیں تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے، کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے بھی بن یعمرؓ اور نصر بن عامم لیشیؓ سے کرایا تھا اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اس طرح کی نہ تھیں جیسی آجھل معروف ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرفت کے اوپر ایک نقطہ (۔) زیر کے لئے حرن کے نیچے ایک نقطہ (۔۔) پیش کے لئے حرفت کے سامنے ایک نقطہ (۔۔۔) اور تنوں کے لئے دو نقطے (۔۔۔۔) یا۔۔۔ یا۔۔۔۔ مفترر کئے گئے، بعد میں خلیل بن احمدؓ نے ہمزہ اور شدید کی علامتیں وضع کیں، اس کے بعد حجاج بن یوسف نے بھی بن یعمرؓ، نصر بن عاممؓ اور حسن بصری رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرماش کی اس موقع پر

لہ صبح الاعوشی، ص ۱۳۴ ج ۲

لہ صبح الاعوشی ص ۱۵۵ ج ۳ سہ تفسیر القرطبی، ص ۶۳ ج ۱

لہ صبح الاعوشی ص ۱۶۰ ج ۳ و تابیخ القرآن لکردنی، ص ۱۸۰

شہ الاتقان ص ۱، ج ۲ و صبح الاعوشی ص ۱۶۱ ج ۱

حرکات کے انہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر زبر پیش کی موجودہ صورتیں رکھیں۔
معتر کی گئیں تاکہ حرودت کے ذاتی نقطوں سے ان کا انتباہ پیش نہ آتے، واللہ جو
تعالیٰ اعلم،

احزاب یا منزلیں [صحابہؓ اور تابعینؓ] کا معمول تھا کہ وہ ہر سفہتے ایک قرآن کریم
ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انہوں نے روزانہ تلاوت
کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے "حزب" یا "منزل" کہا جاتا ہے، اس طرح قرآن کریم
کو گل شات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا، حضرت اوس بن حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے
صحابہؓ سے پڑھا اپنے قرآن کے کتنے حزب بنلتے ہوئے ہیں؟ انہوں نے جواب
دیا کہ ایک حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا سات سورتوں کا،
چوتھا نو سورتوں کا، پانچواں گیارہ سورتوں کا، پھٹا تیرہ سورتوں کا، اور آخری
حزب مفصل میں قَ سے آخر تک کا۔

اجزاء پال لے [آجھل قرآن کریم تین آجڑا پر منظم ہے جنہیں تیس پالے کہا جاتا
ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے ہیں، بلکہ بھوں کو پڑھائے
کے لئے آسانی کے خیال سے تین مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض
اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہو
کر یہ تین پاروں کی تقسیم کس نئی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ
رضی اللہ عنہ نے مصاحت نقل کرتے وقت انہیں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوا یا
تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانے کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی
دلیل احتقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زرکشیؓ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس
پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی فضوی میں ان کا روایج ہے، بظاہر

لہ ابراہن فی علوم القرآن، ص ۲۵۰ ج ۱،

تلہ تایخ القرآن از مولانا عبد الصمد صارم، ص ۸۱،

تلہ ابراہن، ص ۲۵۰ ج ۱، حزیمہ دیکھنے منابع العرفان، ص ۲۰۲ ج ۱،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقیم عبد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی ہولت کے لئے کی گئی ہے، [اللہ اخmas اور اعشار] قردن اولیٰ کے فترانی نسخوں میں ایک اور علامت کارواج تھا، اور دوہی کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) الفاظ "خمس" یا "خ" اور ہر وൺ آیتوں کے بعد الفاظ "عشر" یا "ع" لکھ دیتے تھے، پہلی قسم کی علمتوں کو "اخmas" اور دوسری قسم کی علمتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا، علاوہ متفقین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علمتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یعنی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علمتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجب حجاج بن يوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا، لیکن یہ دونوں احوال اس نے درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، مصنف ابن ابی شیبہؓ میں روایت ہے:

"عن مسروق عن عبد الله بن عثيمين أنه كتب العشار في المصحف"

"مسروق یہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مصحف میں اعشار کا نام

ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "اعشار" کا تصور صحابہؓ نے زمانے ہی میں پیدا ہو چکا تھا، ایک اور علامت جس کارواج بعد میں ہوا، اور آج تک جاری ہے کہ رکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعبین معنی کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف "ع") بنا دی گئی، احرقو ک جستجو کے باوجود مستند طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتدا کس نے اور کس دوڑ

لہ مذاہل العرقان، ص ۳۰۳ ج ۱ ۲۷ الاتقان، ص ۱۷ ج ۲ نوع ۶۷

لہ البرہان، ص ۲۵ ج ۱

لہ مصنف ابن ابی شیبہؓ ص ۲۹ ج ۲ کتاب الصلوٰۃ، مطبعة العلوم الشرقية وکن

سے ۳۸۴ م

میں کی؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان رکوعات کی تعینین بھی حضرت عثمانؓ ہی کے زمانہ میں ہو چکی تھی، لیکن روایات سے اس دعوے کی کوئی دلیل احتقر کو نہیں ملے سکی، البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعینی جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو "رکوع" اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پڑھ کر رکوع کیا جاتے، چنانچہ فوادی عالمگیر یہ میں ہے :-

ان المشائخ رحمةهم الله جعلوا القرآن على خمسين آية واربعين
ركوعاً على ما ذكر في المصاحف حتى يحصل النعم في ليلة الاسماء
والعشرين

مشائخ نے قرآن کریم کو پانچ سو چالیس رکوعوں پر تقسیم کیا ہے، اور مصافت میں اس کی علامتیں بنادی ہیں، (تاکہ (تراویح میں) قرآن کا ختم ستائیسوی شب میں ہو سکے)

رموز اوقاف تلاوت اور تجوید کی ہمولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارات لکھ دیتے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جملہ وقت کرنا (سنس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو "رموز اوقاف" کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی دان انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقت کر سکے، اور غلط جملہ سنس توڑنے سے معنی کوئی تبدلی پیدا نہ ہو، ان میں اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبداللہ محمد بن طغیور سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے ہیں، ان رموز کی تفصیل یہ ہے :-

له تابیخ القرآن از مولانا عبد الصمد صارم ص ۱۸ ،
له فتاوی عالمگیری، فصل التراویح ص ۹۲ ح ۹۲ مطبوعہ نوکشور،

تل التشریفی القراءات العشر لابن الجوزی ص ۲۲۵ ج ۱،

معہ تاذی عالمگیری میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۰ ہی بیان کی گئی ہے لیکن جیسے نہ قرآن کریم کے موجود فنون میں خود گستاخی کی تعداد ۵۰ ہے اپنی اور بعض اصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ ان کی گئی کہ مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶ ہے ہر سکھا کے رکوع کی علامت مگر میں تلفظ خون میں کچھ اختلاف رہا ہو۔ واللہ اعلم اذ اشریف ۹۳، ۱۲، ۱۱

ط، یہ "وقت مطلق" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے،
 حج، یہ "وقت جائز" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے،
 نما، یہ "وقت مجوز" کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا تو درست ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے،
 ص، یہ "وقت مرخص" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دوسرے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے ہے۔
 هر، یہ "وقت لازم" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آئیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے "وقت واجب" بھی کہتے ہیں لیکن اس سے مراد فقی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا زیادہ بہتر ہے۔
 لا، یہ "لا توقف" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہاں نہ ٹھہرو" لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد ولے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، لگلے لفظ سے ابتداء کرنا محتسن نہیں ہے۔

لہ ان چاروں رموز کی تشریع کے لئے ریکھے المخ الفکریہ شرح المقدمة البحریہ للالاعلیٰ القاری چ ۱۲
 مطبوعہ اہلبخاری غلام رسول، لہ الشّریف، ص ۲۳۱ ج ۱، لہ الشّریف، ۲۳۳

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ جاوندیؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریمؐ کے نسخوں میں موجود ہیں ہشلا؎۔ مع، یہ "معافنہ" کا مخفقت ہی، یہ علامت اُس جگہ بھی جاتی ہے جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسرا تفسیر کے مطابق دوسرا جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسرا جگہ وقف کرنا درست ہمیں، مثلاً ذلیل مثالہم فی التوریۃ، وَ مَثَلُهُمْ فِی
الإِنْجِیلِ: مَكَرَ رَبِّ اخْرَاجَ شَطْحَةَ الْمَاءِ، اس میں اگر التوریۃ پر وقت کر لیا تو الانجیل پر وقت درست ہمیں، اور اگر الانجیل پر وقت کرنا ہے تو التوریۃ پر درست ہمیں، ہاں دونوں جگہ وقف نہ کریں، تو درست ہے، اس کا ایک نام "مقابلہ" بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشاں دی امام ابوالفضل رازیؑ نے فرمائی ہے،

سکتہ، یہ "سکتہ" کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رکنا چاہئے لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملأ کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندر شیرہ ہو، وقف، اس جگہ "سکتہ" سے قدرے زیادہ دیر تک رکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے،

ق، یہ "قیل علیہ الوقف" کا مخفقت ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے، وقف، یہ لفظ "وقف" ہے، جس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ، اور یہ اُس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو کہ یہاں وقف درست ہمیں،

۲۰۱

صلے؛ ”الوصل اولیٰ“ کا مخفف ہے، جس کے معنی یہ ہے کہ ”ملاکر پڑھنا بہتر ہے“ صلے؛ ”قدیوصل“ کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ سہرتے ہیں اور بعض ملاکر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں، یہ روزگاری مشہور ہیں، لیکن احرار کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا واضح دلوجہ کون ہے؟

فترآن کریم کی طباعت

پانچواں مرحلہ

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا ترآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جلتے تھے، اور ہر ہزار میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے جس کا کتابتِ قرآن کے سوا کوئی مشغل نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو مختنیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغفت کا انہما کیا، اس کی ایک بڑی مفضل اور دلچسپ تاریخ ہے، جس کے لئے مستقل تصنیف چاہتے ہیں، اس کی تفصیل کامو قع نہیں،

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہمیگر کے مقام پر الله میں قرآن کریم طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ ابتدک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعارض مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخ طبع کرایے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینیٹ پیرس برگ میں شہزادے میں قرآن کریم کا ایک نسخ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، شہزادے میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پھر پر چھاپا گیا، پھر اس کے مطبوع نسخہ دنیا بھر میں عام ہو گئے ہیں۔

لہ طباعت کی تاریخ کے لئے دیکھئے تاریخ القرآن لکر دی، ص ۸۶ اد علوم القرآن ڈاکٹر صبحی صالح اردو ترجمہ از غلام احمد حریری، ص ۱۳۲

فترات اور آن کی تدوین

سبعہ احرف کی بحث میں گذر جکھا ہے کہ تلاوت کی سہولت کے لئے اللہ تعالیٰ نے فترآن کریم کو متعدد قراءتوں میں نازل فرمایا تھا، قراءتوں کے اس اختلاف سے آیات کے مجموعی معنی میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، لیکن تلاوت اور ادا ایسی کے طریقوں میں نہ رکھنے ہو جاتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لئے آسانی پیدا ہو گئی ہے، اور اس انتہی مسلم نے فترآن کریم کی ان قراءتوں کو بھی ہر ذور میں محفوظ رکھا ہے، اور اس غرض کے لئے بے مثال خدمات انجام دی ہیں، یہاں ان جلیل الفخر خدمات کا خصر تذکرہ بھی مکن نہیں، البتہ چند اشارات ضروری ہیں،

ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ فترآن کریم کی اشاعت کا اصل مارکتابت کے بجائے حافظہ اور نقل در دایت پڑے ہے، ادھر یہ بھی بیان ہو جکھا ہے کہ مصاحف عثمانی کو نقطہ اور حرکات سے اسی لئے خالی رکھا گیا تھا، تاکہ اس میں تمام مسلم قراءتوں سما سکیں، چنانچہ جب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ مصاحف عالم اسلام کے مختلف خطوط میں روایہ کئے تو ان کے ساتھ ایسے فتراء کو بھی بھیجا جو ان کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءت کے مطابق لوگوں کو فترآن کریم کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتوں میں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے اسی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح "علم قراءات" کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لیگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قراءات سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی صنابطہ پوری امتت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ "قراءات" قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں :-

۱۔ مصاحف عثمانی کے رسم المخطوط میں اس کی گنجائش ہو،

۲۔ عربی صرف و نحو کے قواعد کے مطابق ہو،

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور انہر قرآن میں مشہور ترین قرأت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی متفق ہو، اسے قرآن ہونے کی چیزیں سے قبول نہیں کیا جاتا، اس طرح متواتر قرأتوں کی ایک بڑی تعداد نسل اب بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور یہ نسل کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قرأتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قرأت اُس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان قرأتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنی شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عیینہ قاسم ابن سلامؓ، امام ابو حمّام جستانیؓ، قاضی احمد بن حنبلؓ اور امام ابو جعفر طبریؓ نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں، جن میں میں سے زیادہ فترات میں جمع تھیں، پھر علامہ ابو بکر احمد بن موسیٰ بن عباس ابن مجاهدؓ (متوفی ۴۲۷ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قرأت کی قرأت میں جمع کی گئی تھیں، ان کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قرأت کی قرأت میں دوسرے قرار کے مقابل میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگئے کہ صحیح اور متواتر قرأت میں یہی ہیں، باقی قاریوں کی فترات میں صحیح یا متواتر نہیں، حالانکہ واقع یہ ہے کہ علامہ ابن مجاهدؓ نے بعض اتفاقاً ان سات قرأتوں کو جمع کر دیا تھا، ان کا منشار یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا اور دوسری قرأت میں غلط یا ناقابل بقول ہیں، علامہ ابن مجاهدؓ کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعہ احرف" کا مطلب یہ سمجھنے لگئے کہ ان سے ہری سات قرأت میں مراد ہیں جنہیں ابن مجاهدؓ نے جمع کیا ہے، حالانکہ سبعہ احرف" کی صحیح تعریخ وہ ہے جو بھی ایک مستقل عنوان کے تحت گزر چکی ہے،

— بہر حال علامہ ابن مجاهدؓ کے اس عمل سے جو سات قاری میں سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں ।-

۱۔ عبد اللہ بن کثیر الداریؓ (متوفی ۴۲۷ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس

بن مالک، عبداللہ بن زیر، اور ابو ایوب النصاریؓ کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکملہ مکریہ میں زیادہ مشہور ہوتی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بزرگی اور قابل زیادہ مشہور ہیں،

۲۔ نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے سترائیسے تابعین سے استفادہ کیا تھا، جو براہ راست حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوتی، اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالون (متوفی ۲۷۲ھ) اور ابو سعید ورش رم (متوفی ۲۷۸ھ) مشہور ہوتے،

۳۔ عبداللہ الجبیبی جوابن عامرؓ کے نام سے معروف ہیں، (متوفی ۲۷۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعیان بن بشیرؓ اور حضرت واٹم بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قراءت کا فن حضرت منیرہ بن ہشام بخاریؓ سے حاصل کیا، جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور ان کی قراءت کے راویوں میں ہشام اور ذکوان زیادہ مشہور ہیں،

۴۔ ابو عمر زبان بن العلاء بن عمار (متوفی ۲۷۸ھ) آپ نے حضرت مجاہدؓ اور سعید بن جبیرؓ کے داسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور ابی بن کعبؓ سے رشت کی ہے، اور آپ کی قراءت بصرہ میں کافی مشہور ہوتی، آپ کی قراءت کے راویوں میں ابو عمر الددری (متوفی ۲۷۸ھ) اور ابو شعیب سوسی (متوفی ۲۷۸ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۵۔ حمزہ بن حبیب الذیاتؓ مولیٰ اعکرمہ بن زبیع الیتی (متوفی ۲۸۸ھ) آپ سیلمان الحعشؓ کے شاگرد ہیں، وہ حبیب بن وثایبؓ کے اودہ زر بن جبیشؓ کے، اور راحفوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشام (متوفی ۲۸۸ھ) اور خلاؤ بن خالد (متوفی ۲۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں،

۶۔ عامم ابن ابی الجوزہ الاسدی رمتوفی ۱۲۳ھ، آپ حضرت زر بن جیشؑ کے واسطے سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اور ابو عبد الرحمن سلیمانؓ کے واسطے سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قراءت کے راویوں میں شعبہ بن عیاش رمتوفی ۱۷۴ھ، اور حفص بن سلیمانؓ (رمتوفی ۱۷۸ھ) زیادہ مشہور ہیں، آجکل عموماً تلاوت حفصؓ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے،

۷۔ ابوالحسن علی بن حمزہ الکسانی التخویؓ (رمتوفی ۱۷۸ھ) ان کے راویوں میں... ابوالحارث روزیؓ (رمتوفی ۱۷۸ھ) اور ابو عمر الدوریؓ (جو ابو عمر وہ کے بھی راوی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخر الذکر تینوں حضرات کی قراءتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں،

لیکن جیسا کہ پیچے عرض کیا جا چکا ہے ان شاٹ کے علاوہ اور بھی کئی قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب غلط فہم پیدا ہوئی کہ صحیح قراءتیں ان شاٹ ہی میں مختص ہیں تو متعدد علماء نے (مثلاً علامہ مشذابیؓ اور ابو یکبر بن ہرانؓ جنے) شاٹ کے بجائے دوسری قراءتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ "قراءات عشرہ" کی اصطلاح مشہور ہو گئی، ان دوسری قراءتوں میں مندرجہ بالا سات قراءت کے علاوہ ان تین حضرات کی قراءتیں بھی شامل کی گئیں:-

۸۔ یعقوب بن اسحاق خضرمیؓ (رمتوفی ۱۹۵ھ) آپ نے سلام بن سلیمان الطولیؓ سے استفادہ کیا اور انہوں نے عاممؓ اور ابو عمر وہ سے، آپ کی قراءت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی،

۹۔ خلفت بن ہشامؓ (رمتوفی ۱۹۷ھ) آپ نے سلیمان بن عیسیٰ بن حمزہ بن جیب زیارات سے استفادہ کیا تھا، چنانچہ آپ حمزہؓ کی قراءت کے بھی رادی ہیں، آپ کی قراءت کوفہ میں زیادہ رائج تھی،

۳۔ ابو جعفر زید بن القعقاع^ر (متوفی سن ۳۱ھ) آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس^{رض}، حضرت ابو هریرہ^{رض} اور حضرت ابی بن کعب^{رض} سے استفادہ کیا تھا، اور آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں رائج رہی،

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ قاریوں کی قراءت میں جمع کیں، اور مذکورہ دش حضرات پر مندرجہ ذیل قرآن کی قراءت توں کا اضافہ کیا:-

۱۔ حسن بصری^{رض} (متوفی سن ۱۴۷ھ) آپ کیبارتا بعین میں سے ہیں، اور آپ کی قراءت کامر کز بصرہ میں تھا،

۲۔ محمد بن عبد الرحمن ابن حمیض^{رض} (متوفی سن ۱۶۳ھ) آپ حضرت مجاہد^{رض} کے شاگرد اور ابو عمر^{رض} کے استاذ ہیں، اور آپ کامر کز مکہ مکرمہ میں تھا،

۳۔ عیین بن مبارک زیدی^{رض} (متوفی سن ۱۷۸ھ) آپ بصرہ کے باشندے تھے، اور ابو عمار^{رض} اور حمزہ^{رض} سے استفادہ کیا تھا،

۴۔ ابو الفرج محمد بن احمد شبیوزی^{رض} (متوفی سن ۲۰۸ھ) آپ بغداد کے باشندے تھے، اور اپنے استاذ ابن شبیوز^{رض} کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے شبیوزی کہلاتے تھے،

بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شبیوزی^{رض} کے بجائے حضرت سیلان اعشر^{رض} کا نام شمار کیا ہے، ان میں سے پہلی دش قراءت میں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں،

ہمارے زمانے کے مشہور مستشرق ملنگمری والٹ (Montgomery watt) نے اپنے استاذ بیلر Bell کی متابعت میں علامہ ابن مجاہد^{رض} کے عمل کی جو غلط تشریح کی ہے یہاں اس کی نشان دہی بھی مناسب ہے، انھوں نے لکھا ہے

لَهُ مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ بِحَوْلَةٍ مُنْجِدٌ الْمُقْرَبِينَ لَا بَنِ الْجَزَرِيُّ؟ ص ۳۶ ج ۱

کہ ابن مجاہد نے سات قراتیں جمع کر کے ایک طرف قویہ واضح کیا کہ حدیث میں قرآن کریم کے جن "سات حروف" کا تذکرہ ہی اُن سے ہی "سات قراتیں" ہرادیں، دوسری طرف ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ان سات قراتوں کے علاوہ دوسری کوئی قرات قابل اعتماد نہیں چنانچہ دوسرے علماء نے بھی اُن کے اس نظریہ کو قبول کر لیا، اور اسی بناء پر علمائے اہل مفہوم اور ابن شنبیوز "کو اپنے نظریات سے رجوع کرنے پر محبوک کیا، کیونکہ وہ دوسری قراتوں کو بھی قابل اعتماد سمجھتے تھے۔"

واقعہ یہ ہے کہ واثق کے مذکورہ بالابیان میں ایک بات بھی درست نہیں ہم پیچھے بتاچکے ہیں کہ اس زمانے میں مختلف علماء اور قرائے اپنی اپنی ہمولات کے لحاظے کتنی کتنی فتراتیں ایک ایک کتاب میں جمع کر رکھی تھیں، اُن میں سے کسی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ان کے علاوہ دوسری قراتیں ناقابل اعتماد ہیں، خود امام ابن مجاہد نے بھی ان سات قراتوں کو صحیح کرتے وقت کہیں یہ نہیں تھا کہ "سات حروف" کی تشریع ہے، اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ صحیح قراتیں ابھی سات میں مختصر ہیں، دوسرے علا نے بھی اُن کے عمل سے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ وہ دوسری قراتوں کو ناقابل اعتماد قرار دینا چاہتے ہیں، اس کے جایے تمام محقق علماء اس خیال کی ہمیشہ تردید کرتے آتے ہیں، علم قرامت کے مستند ترین عالم علماء ابن الجزریؒ نے جو "محقق" کے لقب سے مشہور ہیں اپنی کتابوں میں اس خیال کی سخت تردید کی ہے، ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"ہم نے اس بحث کو اس لئے طول دیا ہے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض بے علم لوگ صرف ابھی شات قراتوں کو صحیح سمجھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں سات حروف سے مراد صرف یہی شات

قراءتیں ہیں اسی بناء پر بہت سے ائمہ متفقین نے ابن ماجہ پر
یہ تنقید کی ہے کہ انہیں شات قراءتیں جمع کرنے کے بجائے سات سے
کم یا سات سے زائد قراءتیں ذکر کرنی جائیں تھی، یا اپنی مراد واضح کرنی
چاہئے تھی تاکہ بے علم لوگ اس غلط فہمی میں مستلانہ ہوتے ہوئے

حافظ ابن حجر[ؓ] اور علامہ سیوطی[ؓ] نے ہبہ تسلیے ائمہ قراءت کے اوال نقل کئے ہیں،
جن میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ابن ماجہ[ؓ] نے صرف "مصاحیت سیم" کے عد کی رعایت
سے شات قراءتیں "جمع کر دیں، ورنہ ان کا مقصود باقی فتراء توں کو غلط یا ناقابل اعتماد
فتراء دینا ہمیں تھا،"

رہا ابن مقتسم[ؓ] اور ابن شنبورڈ[ؓ] کا قصہ، تو دراصل علماء نے جو ان کی تردید کی،
اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان شات قراءت توں کے علاوہ دوسری فتراء توں کو کیوں
صحیح سمجھتے ہیں؟ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ امت کے تمام علماء اس بات پر متفق رہے ہیں
کہ کسی قراءت کے صحیح ہونے کے لئے تین باتوں کا پایا جانا ضروری ہے، ایکتے یہ کہ
مصحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو، دوسرے کیوں کہ عربی صرف دخوکے قاعدے
کے مطابق ہوا تسلیم کرے یہ کہ دو صحیح سند کے ساتھ منقول اور ائمہ قراءت میں مہمور ہوا یہ
شرائط جس قراءت میں بھی پائی جائیں وہ قابل بقول ہے، خواہ وہ سات قراءت توں میں
شامل ہو یا نہ ہو، اور جہاں ان میں سے کوئی بھی ایک شرط بھی متفق و ہو وہ ناقابل اعتماد
ہے، خواہ وہ ان شات قراءت توں میں شامل ہی کیوں نہ ہو، لیکن ابن مقتسم[ؓ] اور ابن شنبورڈ[ؓ]
لئے اس اجتماعی اصول کی خلاف ورزی کی تھی، ابو بکر محمد بن مقتسم[ؓ] کا ہمنا یہ تھا کہ قراءت

لہ التشریف القرآن العظیم، ص ۳۵ و ۳۶ ج ۱

سلہ فتح الباری، ص ۲۵ تا ۲۷، ج ۹ والاتفاقان ص ۸۲ و ۸۳، ج ۱، نورع ۲۲

سلہ ابن مقتسم[ؓ] کا پورا نام ابو بکر محمد بن الحسن بن یعقوب[ؓ] اور ابن شنبورڈ[ؓ] کا پورا نام محمد بن احمد
بن ایوب ہے،

کے صحیح ہونے کے لئے صرف پہلی دو شرطیں کافی ہیں، لہذا اگر کوئی قرار مصحف عثمانی کے رسم الخط کے مطابق ہو اور عربیت کے لحاظ سے بھی صحیح ہو تو اسے قبول کر لیا جائے گا، خواہ اس کی کوئی سند موجود نہ ہو، اور ابن شنبودہ نے اس کے بر عکس یہ کہا تھا کہ اگر کوئی قرار صحیح ستر سے منقول ہو تو خواہ رسم عثمانی میں اس کی گنجائش نہ ملکتی ہو، اسے پھر بھی قبول کر لیا جائیں گا، اس بناء پر امت کے تمام علماء نے ان دونوں کی تردید کی، اس مقصد کے لئے مبایحہ کی مجلسیں بھی ہوتیں، اور بالآخر ان دونوں نے جمہور کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

— جنہیں بہمنہ بہمنہ بہمنہ —

له التشریف القراءات العشر، ص ۷، اود ۳۵۷ ج ادالۃ تقان ص ۱۹۱ ج ۱ و تاریخ بعد راد،
للخطیب ص ۲۸۰ ج اطبع بیروت و دویفات الاعیان، لابن خلکان، ص ۲۹۰ ج اطبع مصر

حافظاتِ قرآن متعلق سپہیات اور آن کا جواب

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا تھا:-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الِّذِي حَرَقَ وَلَنَا لَهُ حَفَاظَةٌ هُوَ

هُمْ نے ہی قرآن کریم نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرتے ہیں ॥

اس میں یہ پیشگوئی کردی گئی تھی کہ فترآن کریم قیامت تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہے گا، اور دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹانے یا اس میں تحریف و ترمیم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی، گزشتہ صفات میں آپ یہ دیکھو چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پیشگوئی کو عملی طور پر کس طرح سچا کر کے دکھایا، اور ہر دو رسیں اس کی کس طرح حفاظت کی گئی، چنانچہ آج یہ بات پورے دُنیو اور دعوے کے ساتھ بلا خوف ترددید کی جاسکتی ہے کہ فترآن کریم ہمارے پاس اسی شکل میں محفوظ رہے جس شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم دی تھی، اور اس میں آج تک کسی ایک نقطے یا شروشے کا بھی فرق نہیں ہو سکا،

یہ بات صرف مسلمانوں ہی کا عقیدہ نہیں بلکہ منصف مراج غیر مسلموں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور اس سے انکار کی جرأت نہیں کی، لیکن جب بخواہوں پر تعصیت یا عناد کا پردہ پڑ جائے تو ایک شفاف جسمہ بھی گرلانظر آنے لگتا ہے، چنانچہ بعض غیر مسلم مصنفوں نے قرآن کریم کی حفاظت کے معاملہ میں بھی کچھ شبہات اور اعماق اٹھایا ہے، یہاں ہم ان شبہات کی حقیقت اختصار کے ساتھ واضح کرنا چاہتے ہیں، ابتدائی زمانہ کی کچھ آیات محفوظ مشہور مستشرق الیف، بہل (Bahl) نے دعویٰ کیا ہے کہ عبد رسالت کی ابتداء میں نہیں رہیں، پھر لالا اعتراض فرآن کریم کی آیات لکھی نہیں جاتی تھیں بلکہ اُن کی حفاظت کا سارا دار و مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حفظ پر تھا، چنانچہ عین ملکن ہی کہ ابتدائی زمانہ کی قرآنی آیات محفوظ نہ رہی ہیں، اس دعوے کی دلیل میں بہل نے قرآن کریم کی دو آیتیں پیش کی ہیں۔

۱۔ سَتْرِيْ ثَلَاثَ فَلَأَتَّسْنِي إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ.

(رسوئۃ اعلیٰ: ۶)

تم آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ بھولیں گے نہیں، مگر جو کچھ اللہ چاہے ہے

۲۔ مَا نَسْتَخَفُّ مِنْ أَيَّةٍ أَرْتُسْهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا

او مِثْلِهَا، (بقرۃ: ۱۹)

”هم جس آیت کو منسون کریں گے یا بھلا دیں گے ہم اس سے پہتر یا اس جیسی لئے آئیں گے“

لیکن جو شخص بھی قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ادنیٰ واقعیت رکھتا ہو وہ اس اعتراض کی نویت محسوس کر سکتا ہے، اس لئے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم

کی منسوخ آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

پہلی آیت کاشان نزول یہ ہے کہ جب جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم کی کچھ آیات لے کر نازل ہوتے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بھول جانے کے خوف سے بار بار دھراتے رہتے تھے، اور اس میں آپ کو شدید تعجب ہوتا تھا، اس آیت میں آپ کویہ اطمینان دلایا گیا کہ آپ کو یاد کرنے کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لہذا آپ ان آیات کو بھول نہیں سکیں گے، لیکن اس پر یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات تو بعد میں منسوخ ہونے کے سبب حافظت سے محروم ہوئیں، اس کا جواب دینے کے لئے *إِلَّا مَا شاءَ اللَّهُ رَبُّكُوكَبِكَ اشْجَاهُ* (کے الفاظ بڑھادیئے گئے، جن کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کیت کو منسوخ کرے گا تو صرف اُسی وقت وہ آیت آپ کے حافظت سے محروم سکے گی اس کے بغیر نہیں، اسی طرح دوسری آیت میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات مسخ ہونے کی بنا پر آپ کے اور صحابہؓ کے حافظوں سے محروم ہو جائیں گی،

لہذا ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کو جب اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرمادیا تو آن کی کتابت کو مٹانے کا حکم تو دیا ہی گیا، مگر ساتھ ساتھ انھیں لوگوں کے حافظت سے بھی محور رکھا گیا، ورنہ جہاں تک غیر منسوخ آیتوں کا تعلق ہے اُن کے بارے میں تو صراحتہ کہا جا رہا ہے کہ آپ انھیں کبھی نہیں بھول سکیں گے، اس سے یہ بات آخر کیسے نکل آئی کہ جو آیتیں منسوخ نہیں ہوتیں، ان کے فراموش ہو جانے کا بھی کوئی امکان ہے؟ رہا ان آیتوں سے اس بات پر استدلال کہ اسلام کے ابتدائی دور میں قرآن کریم کھا نہیں جاتا تھا، سو یہ ایک قطعی بے بنیاد اور لغو استدلال ہے، ہم پچھے بتاچک

یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے قرآن کریم کی آئینوں کا صاحب ہے کہ یاس لکھا ہوا ہونا مستند روایات سے ثابت ہے، لہنغا پہلی آیت میں صرف "نسیان" (نیچوں جانے) کے ذکر پر اکتفا کا منشاء یہ نہیں ہے کہ اس وقت قرآن کریم مکتوب شکل میں نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں ذکر ہی صرف "نسیان" کا چل رہا ہے، اس نے اس مقام پر لکھی ہوئی آئینوں کو مٹانے کا ذکر کیا جاتا تورہ قطعی بلے موقع اور بے محل بات ہوتی، یہی وجہ ہے کہ دوسری آیت میں چونکہ "نسخ" ہی موجود ہے اس نے اس میں "نسخ" (لکھنے کو مٹانے) اور "انسا" (بھلاکنے) دونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، "نسخ" کے لغوی معنی زائل کرنے اور مٹانے کے آتے ہیں، لہذا یہ لفظ صراحت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود تھا، اور اس کی بعض آئینوں کو مٹسوخ ہونے کی بتا پر مٹایا گیا ہے، حرمت ہو کر یہ آیت جو صراحت قرآن کریم کے مکتوب ہونے پر دلالت کر رہی ہے اُس کو بھل قرآن کے غیر مکتوب ہونے کی تائید میں پیش کر رہا ہے،

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ مستشرق ڈی، ایس، مار گوئیو تھے ایک آیت یاد نہیں ہی تھی؛ دوسراء عرض پر قرآن کریم کی حفاظت کو مشکوں بنانے کی کوشش کی ہے، صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی ہا کو مسجد میں قرآن کریم پڑھتے ہوئے مسناتو آپ نے فرمایا کہ:-

دِحْمَةُ اللَّهِ، لَقَنْ أَذْكَرَ فِي أَيَّةٍ كُنْتُ أَسْيَمْهَا،

"اللَّهُ أَنْ يَرْحَمَ كُرَّهَ، أَنْهُو نَمْجُونَ إِيمَانِي أَيْتَ يَادَلَادِي

جو بھوں سے بھوں گئی تھی۔^۱

اس روایت کو ذکر کرنے سے مارگو تو یہ کام مقصود ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کسی وقت بھوں سکتے ہیں تو (معاذ اللہ) دوسری آیات میں بھی یہ امکان ہے، نیز دہ اس روایت سے غالباً یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کریم نکھا ہوا ہمیں تھا، ورنہ آپ یہ آیت نہ بھولتے، لیکن یہ اعتراض اس قدر بحیرہ اور بے بنیاد ہے کہ ایک محرومی سمجھ کا آدمی بھی اسے درست تسلیم نہیں کر سکتا، کیونکہ مذکورہ بالاواقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بسا اوقات ایک بات انسان کو یاد تو ہوتی ہے، مگر جو نک عرصہ دراز تک اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، نہ اُس کی طرف خیال جاتا ہے، اس لئے وہ ذہن میں مختصر نہیں رہتی، اور جب کوئی شخص اس کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ فوراً حافظت میں تازہ ہو جاتی ہے، یہ حقیقت میں بھوں نہیں ہوتی، بلکہ عارضی طور پر خیال سے نکل جاتا ہوتا ہے، یہی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی، اس لئے ایسے واقعہ کو بنیاد بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسیان کی ... نسبت کرنا انتہاد درج کی بے انصاف ہے، جس کا منتشر تھا تھتب کے سراکچھ نہیں، بلکہ اگر مسٹر مارگو تو یہ تھے بصیرت اور انصاف کی بجائہ سے دیکھتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اس واقعے سے تو یہ بات ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اس عین محرومی طریقے سے فرمائی ہے کہ اس کے کسی حصے کے گم ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، کیونکہ اس واقعے سے اگر کوئی حقیقت ثابت ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت اتنے بے شمار افراد کو یاد کرداری کی تھی کہ اگر کوئی آیت کسی وقت اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر تھصرنہ رکھ تب بھی اس کے ضائقے ہونے کا دُور دُور کوئی امکان نہیں تھا، رہی یہ بات کہ اُس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں

لہ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، ص ۵۳، ج ۲ و صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن

ص ۲۶، ج ۱

موجود نہیں تھا، سویرہ پہلی بات سے زیادہ بے بنیاد اور مفہوم خیز ہے، ہم عرض کرچکے ہیں کہ واقعہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایک آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضی طور پر تھا، جو ایک صحابی کی تلاوت سے فوراً ذہن میں تازہ ہو گئی، اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود نہیں تھا، کیا مستشرق ہو گئے یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات ایک مرتبی لکھی گئی رہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی ذہن سے اچھی ہے، ہو سکتی؟ پھر دنیا جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمیٰ تھے، لکھتے پڑتے ہیں تھے، اس لئے آپ کے قرآن کریم کو یاد رکھنے کا کتابت سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا، لہذا انذکورہ واقعہ سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استدلال دیں شخص کر سکتا ہو جس تے اپنے اور انصاف اور بصیرت کے سارے دروازے بند کر لئے ہوں،

سورۃ نساء میں سورۃ النعام کا حوالہ

تیسرا اعتراض

میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَقَدْ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُم مِّنْ أَيْتَ اللَّهِ مِنْ كُفَّارٍ يَقُولُونَ إِنَّمَا فُلَانٌ تَقْرِئُ مِنْ مَا مَعَهُمْ وَمَحْثُثًا يَخْرُجُوا فِي نَحْنُ يُبَيِّنُونَ (نساء : ۱۲۰)

”اور اللہ تم پر قرآن میں یہ اتار چکلہ ہے کہ جب تم (کسی مجلس میں) اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر اور سترہ اڑا، ہوتا ہو اس تو تم اُن کے ساتھ نہ بیٹھو، تباہ کر وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں“

یہ آیت مدنی ہے اور اس میں سورۃ النعام کی جس مکی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:-

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخْرُجُونَ فِي حَاجَةٍ مِّنْ نَّاسًا فَأَعْرِضْ مَعَهُمْ حَتَّى يَخْرُجُوا فِي مَحِيدٍ يُبَيِّنُونَ (النعام : ۶۸)

”ارجح تم ان وگوں کو دیکھو جو بماری آئیوں میں عیب جوں کرتے ہیں تو ان وگوں سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں“ یہیلی آیت میں دوسری آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن دونوں کے الفاظ مختلف ہیں، مارگو لیوٹھ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن کریم کی آیات لکھی ہوئی نہیں تھیں، ورنہ اگر قرآن لکھا ہوا ہوتا تو یہیلی آیت میں بعضہ وہی الفاظ ذکر کئے جاتے جو دوسری آیت میں مذکور ہیں افاظ کے اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہیلی آیت کے نزدیک وقت دوسری آیت کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے، بلکہ

لیکن مارگو لیوٹھ کا یہ استدلال اس قدر بدتری طور پر غلط ہے کہ اس کا جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر سورہ نساء کے نزول کے وقت سورہ العام کی مذکورہ آیت کے الفاظ (معاذ اللہ) محفوظ نہیں رہے تھے تو پھر بعد میں وہی کیسے قرآن کریم میں لکھے گئے؟ اگر سورہ العام کے اصل الفاظ محفوظ نہ ہوتے تو قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ بعد میں لکھنے والے سورہ العام میں بھی بعضہ وہ الفاظ لکھتے جو سورہ نساء میں مذکور ہیں، ان دونوں آیتوں کا الفظی اختلاف تدریجی ترتیب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دونوں آیتوں کے الفاظ، ہمیشہ سے پوری طرح محفوظ اور غیر متبدل تھے، اور ان میں کسی کے قیاس و مگان کو کوئی دخل نہیں رہا، یعنکہ اگر قرآن کریم کی کتابت قیاس اور اندازے سے ہوئی ہوتی تو ان دونوں آیتوں کے الفاظ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہتے تھا،

واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے مخادرات میں جب کسی سابقہ گفتگو کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، بعض مرتبہ سابقہ گفتگو کے بعض الفاظ دیہرا دیتے جاتے ہیں (جیسے انگریزی میں Direct Narration اور بعض اوقات الفاظ بعضہ وہی نہیں ہوتے صرف سابقہ گفتگو کے بنیادی مفہوم کو روشن کرنا ہے) ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت بہت کم استعمال کہا جاتا ہے،

لہ انسا تکلپ پڑیا اف ریجن اینڈ اسٹھکس، ص ۵۲۲ ج ۱۰

ہوتی ہے، یعنی ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جس سابق گفتگو کا حوالہ دیا جا رہا ہوا س کے پورے پورے الفاظ دہراتے جائیں، اس کے بجائے ادبی محاورات میں زیادہ تر دوسرا صورت اختیار کی جاتی ہے، یعنی اس گفتگو کے معنیوں کو دوسرا الفاظ میں ادا کر دیا جاتا ہے، سورہ نساء میں بھی یہی دوسرا صورت اختیار کی گئی ہے، اور اس کی ایک وجہ یہ گھبی ہے کہ فتر آن کریم کی ہر صورۃ بسا اوقات اپنے جملوں کی ساخت کے اعتبار سے جدا گانہ اسلوب رکھتی ہے، لہذا اگر ایک سورت کے جملوں کے درمیان کسی دوسرا صورت کا جملہ بعینہ جو طریقے تو آیتوں کے تسلسل Sequence میں فرق پڑ جاتا ہے، اور جملوں کی وہ روانی ر Flow برقرار نہیں رہتی جس کی اثر انگیزی سب کے نزدیک مسلم ہے، چنانچہ جس شخص کو بھی ادبی ذوق کا کچھ حصہ ملا ہو وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر سورہ نساء کی مذکورہ آیت میں سورہ انعام کے بعینہ الفاظ نقل کر دیتے جائیں تو عبارت کا ذر اور اترسلسلہ ٹوٹ جائے گا،

اس کے علاوہ سورہ انعام جس کی مذکورہ آیت کے بارے میں مار گولیو ہے کا دعویٰ ہے کہ وہ لکھی ہوئی نہیں تھی، پوری کی پوری ایک مرتبہ نازل ہوئی ہے، اور اس میں یہ آیت بھی موجود ہے :-

وَهُنَّ أَكْثَرُ أَمْرِ رُبُّهُمْ مُبْرَأُونَ مُصَدِّقَاتٍ الَّذِي يَتَّخِذُونَ يَوْمَ يُنْهَا

(راغم : ۹۲)

”اور یہ (قرآن) بھی ایسی ہی کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے، جو بڑی بُرکتِ دالی ہے اور اپنے سے پہلے رنازل شدہ (کتابوں (تورات واجیل وغیرہ) کی تصریح کرنے والی ہے“

اس میں قرآن کے لئے لفظ ”کتاب“ استعمال کیا گیا ہے، اگر سورہ انعام کے نزدیک وقت تک قرآن کریم کو لکھنے کا معمول نہیں تھا تو اسے ”کتاب“ کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تک

غضن جس پہلو سے دیکھئے، مار گولیو تھے کا یہ اعتراض بالکل بے بنیاد، لغوار مغضن تعصیت
عناد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے،
امام بخاری پر مار گولیو تھے کا ایک ہبتان مار گولیو تھے نے قرآن کریم کی حفاظت
پر ایک چوتھا اعتراض ان الفاظ میں کیا ہے:-

چوتھا اعتراض

”بخاری“ کا کہنا ہے کہ ایک جملہ لاؤ آن تصلوٰا مَا يَتَبَيَّنُ وَبَيْتَكُمْ
وَهُنَّ الْقَرَاءَةُ، دَسْرِيْہ کہ تم اُس رشدہ داری کا پاس کرو جو میرے اور تمہارے
دریمان موجود ہے) بذریعہِ حجی نازل ہوا تھا، لیکن شرایح کا کہنا ہے کہ یہ جملہ
قرآن میں نہیں ملتا، اس لئے وہ اس جملے کو سورہ ملک آیت علیٰ یعنی لاؤ
الْمُوَدَّةُ فِي الْقُرْبَى کی تشریع قرار دیتے ہیں۔

لیکن ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ غضن کرتے ہیں کہ ان الفاظ کے ذریعہ مار گولیو تھے جیسے
عالمی شہرت کے مستشرق نے امام بخاری پر ایسا شرعاً مناک ہبتان باندھا ہے جس کی مقصداً
بدویانی یا افسوسناک جھالت کے سو اکوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اس عبارت کا مار گولیو تھے
نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ امام بخاری ایک ایسے جملے کو قرآن کریم کا جزو، مانتے ہیں
جو اس وقت قرآن میں موجود نہیں ہے، حالانکہ ہر شخص صحیح بخاری احاطا کر دیکھ سکتا ہے
کہ امام بخاری نے آیت کے الفاظ بعینہ وہی نقل کئے ہیں جو قرآن کریم میں موجود ہیں،
اور لاؤ آن تصلوٰا مَا يَتَبَيَّنُ وَالْأَجْلَمُ اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے، امام بخاری کی پوری
عبارت یہ ہے:-

باب قوله لاؤ آن المودّةُ فِي الْقُرْبَى حدثنا محمد بن بشار...
عن ابن عباس ماذه سئیل عن قوله لاؤ آن المودّةُ فِي الْقُرْبَى
فقال سعید بن جبیر قریبی أهل حمّن صلی الله عليه وسلم

لہ انس ایکلو پیٹیا آف رلیجن اینڈ ایتحکس، ص ۵۲۳ ج ۱۰

فقال ابن عباس^{رض} عجلتَ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ بِطْنَ مِنْ قَرْيَشٍ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيهِمْ قِرَابَةً فَقَالَ الْأَنَّ تَصْلُوا مَا بَيْنِ يَدَيْنِ وَبَيْنَكُمْ مِنَ الْقِرَابَةِ^{لَهُ}

ملاحظہ فرماتے ہیں، امام بخاری^{رحمۃ اللہ علیہ} نے باب کے عنوان میں آیت کا درج جملہ نقل کیا ہے، جو قرآن کریم میں موجود ہے، پھر اس کی تشریع میں حضرت ابن عباس^{رض} سے آیت إِنَّ الْمُؤْمِنَةَ فِي الْمُهَاجِرَةِ إِلَى تَغْيِيرِ بَحْرٍ مَّا تَحْتَهُ جَنَاحَيْنِ جَسَّسَ كَيْ وَجَابَ مِنْ آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ إِنَّ تَصْلُوا مَا بَيْنِ يَدَيْنِ وَبَيْنَكُمْ مِنَ الْقِرَابَةِ، لیکن مارگولیو تھا صراحتاً پوری ڈھنٹائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ امام بخاری^{رحمۃ اللہ علیہ} اس جملے کو بذریعہ وحی نازل شدہ مانتے ہیں، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تحقیق و انصاف کے یہ دعویدار قرآن کریم کے خلاف تعصب کے کسی دامنی روگ میں مستلا ہیں، اور اسلام کے خلاف بخشن و عناد نے اس خدیں کس بڑی طرح جکڑا ہوا ہے، فی قُلْ هُنَّمَعْرَضٌ فَزَادُهُمْ أَعْرَاضٌ حضرت عائشہ^{رض} سے کچھ آئیں گم ہو گئی تھیں مارگولیو تھے پاچھاں اعتراف یہ کیا ہے کہ مسند احمد^{رحمۃ اللہ علیہ} کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے

پاچھاں اعتراض

کہ حضرت عائشہ^{رض} سے کچھ آئیں گم ہو گئی تھیں یہ

یہاں مارگولیو تھے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے :-

عن عائشۃ زوج النبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ لَهُنَّا انْزَلَتِ ایَةَ الرِّجْمِ وَرِضْعَاتِ الْكَبِيرِ عَثَّلَ فَكَانَتِ فِی وَرْقَةٍ تَحْتَ سَرَایِرِ فِی بَيْتِی فَلَمَّا اشْتَکَیْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لِهِ مُسْعِجُ بخاری^{رحمۃ اللہ علیہ} کتاب التفسیر سورۃ حم عsect، ص ۱۳۷ ج ۲، طبع کراچی، وفتح الباری

ص ۲۵۸ ج ۸ و عدة القاری، ص ۱۹۵ ج ۱۹،

لِهِ انسَیْ کلُوب پیٹر یا آف ریلیجن اینڈ ایمکس، ص ۳۴۵ ج ۱۰،

علیہ وسلم تشاغلنا بامروہ ودخلت دویبة لنا فاکلتها،^{لہ}
 حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کہ رجم کی آئیت اور بڑے آدمی کے دش رضاعت
 کی آیت نازل ہوئی تھیں، یہ آیتیں میرے گھر میں ایک تخت کے نیچے گھنڈ
 پر لکھی ہوئی تھیں، جب آخرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (مرض وفات کی)
 تخلیف شروع ہوئی تو یہ آپ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے، ہمارا
 ایک پال متر جانور تھا وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھا لیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ نے جن آیتوں کا ذکر فرمایا کہ
 یہ باجماع امت وہ آیتیں ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی، خود حضرت عائشہؓ
 بھی ان آیتوں کے منسوخ التلاوة ہونے کی قائل ہیں، لہذا اگر انہوں نے یہ آیات
 کسی کاغذ پر لکھ کر رکھی ہوئی تھیں تو اس کا منتشر اسوسے ایک یادگار کے تحفظ کے
 سچھنہ تھا، ورنہ اگر یہ آیات حضرت عائشہؓ نے کردیک قرآن کریم کا جزو ہو تو
 وہ کم از کم ان کو یاد رکھیں وہ اُن کو ستر آن کریم کے نجوم میں درج کرائیں، لیکن
 انہوں نے ساری عمر ایسی کوشش نہیں کی، اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت
 عائشہؓ نے کردیک یہ آیات محض ایک علی یادگار کی حیثیت رکھتی رکھتی تھیں اور قرآن کریم
 کی دوسری آیات کی طرح اس کو صحف میں درج کرانے کا کوئی اہتمام ان کے پیش نظر
 بھی نہیں تھا، لہذا اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی حرft نہیں آتا،
 ہمدر رسالت میں حفاظت کی تعداد [بعض حضرات کو حفاظت قرآن سے
 متعلق حضرت قاتدؓ کی ایک اور روایت
 چھٹا اعراض] سے مشبہ ہوتا ہے، یہ روایت صحیح

بخاریؓ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:-

سَأَلَتْ أَنْسُ بْنُ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مِنْ جَمِيعِ الْقُرْآنِ عَلَى

عهد المتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، قال اربعۃ کلهم مت
الانصار، ابی بن کعب و معاذ بن جبل و زید بن ثابت و
وابوزینیٰ،

”میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
زملنے میں فترآن کریم کس نے جمع کیا تھا؟ انھوں نے فرمایا چار افراد نے
جن میں سے ہر ایک انصاریں سے تھا، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ
ابن جبلؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابو زید رضی اللہ تعالیٰ عنہمؓ“

اس روایت سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمید مبارک
میں فترآن کریم کے حافظ بس یہی چار حضرات تھے، حالانکہ یہ خیال درست نہیں،
ہم پیچھے ان حضراتِ صحابہؓ کے اسماء، گرامی شمار کرائجے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے زملئے میں ہی فترآن کریم حفظ کر لیا تھا، لہذا حضرت انسؓ کی مذکورہ
بالاروایت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحابہؓ کی پوری جماعت میں ان چار حضراتؓ
کے سوا کوئی اور قرآن کریم کا حافظ نہیں تھا، یلکم مذکورہ بالاحدیث میں ”قرآن کریم
کو صحیح کرنے“ کا لفظ استعمال ہو رہے، اور اس لفظ کا صحیح معنی قرآن کریم کو نکھنا
ہے، اور حضرت انسؓ کا مطلب یہ ہے کہ یہ چار حضرات دہ ہیں جن کے پاس
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمید مبارک ہی میں قرآن کریم کا پورا پورا لکھا ہوا موجود
اس کے علاوہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبریؓ کی ایک روایت کے حوالے
سے حضرت انسؓ کے اس ارشاد کا پورا قصہ یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اوس اور خریج
کے قبیلوں میں باہمی مفاخرت کا سلسہ چلا، قبیلہ اوس کے حضرات نے اپنے قبیلے
کے اُن افراد کے نام شمار کرتے جنہیں ہسلام میں خصوصی مقام حاصل ہو، اس
کے جواب میں قبیلہ خریج کے حضرات رجن میں حضرت انسؓ بھی شامل تھے، یہ فرمایا
کہ ہم میں چار حضرات ایسے ہیں جنھوں نے پورا قرآن کریم جمع کیا تھا، لہذا اس ارشادؓ
کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اوس اور خریج کے قبیلوں میں قرآن کریم کو حسبیع

کرنے والے یہی چار حضرات تھے ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود اور معاویہ تین بعض لوگ مسند احمدؓ کی اُس روایت کو
بہت اچھا لئے ہیں جس میں یہ بیان
ساتواں اعتراض کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود

رضی اللہ عنہ معاویہ تین (سورہ فلق اور سورہ ناس) کو قرآن کریم کا جزو نہیں مانتے تھے،
حالانکہ یہ داعم بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ سبھی پوری امت کی طرح معاویہ تین کو فرقہ آن کریم کا جزو، قرار دیتے تھے، اور جن
روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ان دو سوروں کے قرآن ہونے کے قابل نہ تھے وہ
درست نہیں، میں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن کریم کی
جو متواتر فتاویں منقول ہیں ان میں معاویہ تین شامل ہیں، قرآن عشرہ میں سے
حضرت عاصمؓ کی قراءت حضرت ابو عبدالرحمن شافعیؓ، حضرت زر بن جبیشؓ اور حضرت
اب عمر و الشیبaniؓ سے منقول ہے، اور یہ تینوں حضرات اسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
سے روایت کرتے ہیں، اسی طرح حضرت حمزہؓ کی قراءت علقمؓ، اسودؓ، این وہبؓ
مسروقؓ، عاصم بن ضمیرؓ اور حارثؓ سے منقول ہے، اور یہ تمام حضرات اسے حضرت
عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں، اس کے علاوہ قرآن عشرہ میں سے کسانیؓ
اور خلفؓ کی قرائیں بھی بالآخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ختم ہوتی ہیں، کیونکہ
کسانیؓ "حمزہؓ" کے شاگرد ہیں، اور خلفؓ ان کے شاگرد کے شاگرد ہیں، اور اس بات

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح البهاری ص ۱۳۱ و ۲۲۷ و باب الفرقہ اہل اصحاب البیت صلی اللہ علیہ وسلم

لہ Watt : W. Montgomery ; Bell's Introduction to the Quran PP. 46

لہ النشر فی القراءات العشر، لابن الحجر الرئیسی، ص ۱۵۴ ج ۱،

لہ النشر فی القراءات العشر، لابن الحجر الرئیسی، ص ۱۶۹ ج ۱،

پر امت کا اجماع ہے کہ قرآنؐ؎ عشرہ کی ساری اسانید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قویٰ اور صحیح اسانید ہیں اور نسلہ بجنیل تو اتر سے نقل ہوتی چلی آرہی ہیں، اس لئے اگر کوئی خبر و اخراج متواتر فتراءٰ توں کے خلاف ہو تو وہ یقیناً واجب الرد ہے، اور اسے قول نہیں کیا جا سکتا،

اسی بنابر پر محقق علامہ اور محمد شین کی اکثریت نے ان روایتوں کو ضعیفہ مصنوع یا کم از کم ناقابل تقبیل بتایا ہے، جو حضرت ابن حسروز کی طرف یہ باطل مذہب منسوب کرنی ہیں، ان علماء میں شیخ الاسلام علامہ نوویؒ، علامہ ابن حزمؓ، امام رازیؒ، قاضی ابو یکبر بن عربیؒ، علامہ بحرالعلومؓ اور آخری دور کے مشہور محقق عالم علامہ زاہد کوثریؒ رحمہم اللہ تعالیٰ میں ہیں،

اس پر یہ شہہ ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حجرؓ اور علامہ فور الدین میشیؒ نے تصریح کی ہے کہ ان روایتوں کے تمام راوی ثقہ ہیں تھے، پھر ان روایتوں کو غیر صحیح کیسے کہا جا سکتا ہے؟ لیکن جو حضرات علم حدیث سے واقعیت ہیں ان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ صرف راویوں کا ثقہ ہونا کسی روایت کے صحیح ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں کوئی علت یا شذوذ نہ پایا جائے، تمام محمد شین نے "حدیث صحیح" کی تعریف میں یہ بات بھکھی ہے کہ وہ روایت ہر قسم کی علت اور شذوذ سے خالی ہو، چنانچہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا شذوذ پایا جاتا ہو تو روایوں کے ثقہ ہونے کے باوجود واس کو صحیح قرار نہیں دیا جاتا، حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ اپنی مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

له فیض الباری، ص ۲۶۲ ج ۱،

سلہ دیکھیے علی الترتیب القرآن، ص ۱۸ ج ۲، المحتوى، لابن حزم، ص ۱۳۱ ج ۱، فواعظ الرحموت شرح مسلم التبرت از بحرالعلوم، ص ۱۲ ج ۲، مقالات الکوثری، ص ۱۷، تفصیلی عبارتوں کیلئے ملاحظہ ہوا حق کا صنمون حضرت عبد اللہ بن مسعود رض او معاویہ تین "ماہنامہ البلاع شعبان" سلہ فتح الباری، ص ۳۳۶ ج ۸، وجہ الردوان للہبیشی، ص ۱۲۹ ج ۴،

”پس حدیث معلق وہ حدیث ہے جس میں کوئی علت معلوم ہوتی ہو جو اس حدیث کی صحت کو مجرد حکر تی ہو، باوجود دیکھنے ظاہری نظر میں وہ حدیث صحیح سالم معلوم ہوتی ہو، اور یہ ”علت“ اُس سندر میں بھی واقع ہو جاتی ہے جس کے راوی ثقہ ہوتے ہیں، اور جس میں بظاہر صحت کی تمام شرائط موجود ہوتی ہیں اور اس علت کا ادراک علم حدیث میں بصیرت رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے ہوتا ہے، کبھی راوی کو منفرد دیکھ کر اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ راوی کسی دوسرے راوی کی مخالفت کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ کبھی دوسرے قرآن بھی مل جاتے ہیں۔^۱

اسی طرح حدیث کی ایک قسم ”شاز“ ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہوتے ہیں، لیکن جو نکہ وہ پہنچ سے زیادہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتے ہیں، اس لئے اُن کی حدیث قبول نہیں کی جاتی، لہذا جن روایتوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے، کہ وہ معوذین کو قرآن کریم کا جزو نہیں مانتے تھے علامہ نوویؓ اور ابن حزمؓ وغیرہ نے اُن کو راویوں کے ثقہ ہوتے کے باوجود مندرجہ ذیل تین وجہ سے قابل قبول نہیں سمجھا۔^۲

(۱) یہ روایتیں معلوم ہیں، اور ان کی سب سے بڑی علت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اُن قرأتوں کے خلاف یہں جو ان سے بطریق تواتر منقول ہیں

(۲) مسندِ احمدؓ کی وہ روایت جس میں حضرت ابن مسعودؓ کا یہ صریح قول نقل کیا گیا ہے کہ آئہما ایسٹا من رکناب اللہ (معوذین اللہ کی کتاب کا جزو نہیں ہیں) صرف عبدالرحمن بن یزید شخصی ہے منقول ہے، اور کسی نے صراحةً اُن کا یہ جملہ نقل نہیں کیا، اور متواترات کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ جملہ یقیناً شاذ ہے، اور محض نہیں کے اصول کے مطابق حدیث ”شاز“ مقبول نہیں ہوتی،

^۱ له مقدمة شيخ المهم، ص ۵۲ ج ۱۔ ^۲ دیکھئے جمع الرذائل، الہمیشی، ص ۱۷۹ ج ۱، والفتح الریاضی، ص ۳۵۲ و ۳۵۳ ج ۱،

۳۔ اگر بالفرض ان روایتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی ہر حال یہ اخبار احادیث، اور اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ جو خرداحر متواترات اور قطعیات کے خلاف ہو دہ مقبول نہیں ہوتی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو قواریں تواریک ساخت ثابت ہیں ان کی صحت قطعی ہے، لہذا ان کے مقابلے میں یہ اخبار آحادیقیناً واجب الرد ہیں،

اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں تو ان ثقہ روایوں نے ایسی بے اصل بات کیونکر روایت کر دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کی حقیقت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ موزع تین کو فترآن کریم کا جزو مانتے ہیں، لیکن کسی وجہ سے انھوں نے اپنے مصحف میں ان کو لکھا ہوا، اس واقعہ کو روایت کرتے ہوئے کسی روایی کو وہ سمجھا ہوا، اور اس نے اسے اس طرح روایت کر دیا، گویا وہ انھیں سُکر سے جزو قرآن ہی نہ ملتے تھے، حالانکہ حقیقت صرف اتنی تھی کہ موزع تین کو جزو قرآن مانتے کے باوجود انھوں نے اپنے مصحف میں ان کو نہیں لکھا تھا، اور نہ لکھنے کی وجہ بہت سی ہو سکتی ہیں، مثلاً علامہ زاہد کوثری رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ انھوں نے موزع تین کو اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے بھلوں کا کوئی ڈر نہ تھا، کیونکہ یہ ہر مسلمان کو یاد ہوتی ہے،^۱ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں سورۃ فاتحہ بھی نہیں لکھی تھی، اور امام ابو بکر الانباریؓ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ان سے پرچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: اگر میں سورۃ فاتحہ لکھتا تو اسے ہر سورت کے ساتھ لکھتا،^۲ امام ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہر سورت سے پہلے سورۃ فاتحہ پڑھی جانی ہے، اس لئے میں نے اسے نہ لکھ کر اختصار سے کام لیا، اور مسلمانوں کے حافظہ پر اعتماد کیا،^۳

۱۔ مقالات الکوثری، ص ۱۶، ۲۔ تفسیر القرطبی، ص ۱۴۷ و ۱۵۱، ج ۱،

بہر کیت! اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے لپنے مصحف میں سورہ فاتحہ اور موزعین تحریر نہ فرمائی ہوں تو اس کی بہت معقول توجیہات ہو سکتی ہیں، اور ان سے یہ تجھتنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ ان کو قرآن کریم کا جزو، ہی نہیں مانتے تھے، جیکہ ان سے تواتر کے ساتھ پورا فترآن ثابت ہے، جس میں موزعین بھی شامل ہیں،

خلافت صدیقی میں جمیع قرآن کی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتنہ آن کریم کو جمع کرنے کا جو کاری نامہ روایت پڑستشترین کا آٹھواں عرض انجام دیا گیا، اس کی تفصیل ہم پچھے ذکر کرچکے ہیں، بعض مستشرقین نے اس داقعہ، ہی کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، ان کا ہمنا یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرکاری سطح پر... قرآن کریم کی جمع و ترتیب کی کوشش نہیں ہوئی، بلکہ سرکاری سطح پر اس نوعیت کا بلا کار نامہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انجام دیا، انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہؓ کے جس فتح سے استفادہ کیا تھا وہ حضرت حفصہؓ کا ذاتی نسخہ تھا، کوئی سرکاری طور پر تیار کیا ہوا نسخہ نہیں تھا، اپنے اس دعوے کے شہادت میں انہوں نے صحیح بخاریؓ کی اُس روایت پر مستحدداً اعتراضات کئے ہیں جو حضرت زید بن شابثؓ سے مردی ہے، اور جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمیع قرآن کا واقعہ بیان کیا ہے، ان تمام اعتراضات کا خلاصہ پر وفیسر منظگری واطن نے بیان کیا ہے، یہاں ان تمام اعتراضات کو بیان کر کے جواب دینا اس لئے غیر ضروری ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات ایسے ہیں جن کا جواب ایک محولی دائمیت کا انسان خود بھجو سکتا ہے، البته ان میں سے چند اہم اعتراضات کا جواب یہاں پیش خرمت ہے،

لہ پر روایت پچھے صفحہ پر گزر جکی ہے،

Watt : Bell's Introduction to the Quran 40, 42

Edinburgh 1970

مثلاً ایک اعڑا ضریح ہے کہ صحیح بخاریؓ کی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جمیع قرآن کا محترک یہ تھا کہ یہ آمہ کی جنگ میں حفاظ و قرار کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تھی، حالانکہ تاریخی طور پر یہ محترک صحیح ہنسیں معلوم ہوتا، کیونکہ جنگ پر کے شہدا کی فہرست میں لیے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، جو قرآن کے حافظ ہوئے کیونکہ شہدار زیادہ تر نسلم تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعڑا ضریح بے بنیاد اور بغیر لے سبے پہلے فریڈرک شالے R. Fredrich Schwally نے کہا

اس کے بعد کے مستشرقین بھی آنکھیں بند کر کے اس کی تقسیم کرتے چلے گئے، اور کسی نے یہ زحمت گوارا نہیں کی، کہ یہ آمہ کے شہدا کی فہرست دیکھ کر اس بات کی تحقیق کرتا، کہ یہ اعڑا ضریح کس حد تک صحیح ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ آمہ کی جنگ میں مدینہ طیبہ کے رہنے والے ہماجرین و انصار کی تعداد تین سو ساٹھ اور مدینہ طیبہ کے علاوہ دوسرے مقامات کے رہنے والے ہماجرین کی تعداد تین سو سی تھی، ظاہر ہے کہ ان چھ سو ساٹھ افراد کے پر کوئی نام تو تاریخ میں محفوظ نہیں رہے، البته ان میں سے اٹھاؤ ہماجرین و انصار کے نام حافظ ابن کثیرؓ نے نقل فرمائے ہیں۔^{۱۷}

ان اٹھاؤں افراط میں سے ایک حضرت سالم ہوئی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ، جو حافظ اور قاری ہونے کے اعتبار سے صحابہؓ میں ممتاز ترین مقام کے حامل تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار حضرات سے بطور خاص قرآن کریم سکھنے کا حکم دیا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی تھے، آپؐ کی بحث سے پہلے محدث قیارہ میں امام یہی تھے، اور حضرت عمر بن بھی ان کے پیچے نازد پڑتے تھے، سفر میں بھی اکثر صحابہؓ کی امامت یہی فرماتے، کیونکہ انھیں اقراءؓ (قرآن کریم کا سبے بڑا عالم) سمجھا جاتا تھا،^{۱۸}

^{۱۷} لہ ایضاً، ص ۱۹۲، لہ تاریخ الطبری، ص ۵۱۶، ج ۲ لہ البدایۃ والہنایۃ ص ۳۶۰، ج ۲ لہ دیکھی الاستیعاب، لابن عبد البر، علی ہامش الاصاید ص ۶۸ و ۶۹، ج ۲،

دوسرا بزرگ حضرت ابو حذیفہؓ میں جو حضرت سالمؓ کے مولیٰ تھے، اور تاریخ اسلام میں جو ایسیوں مسلمان ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت کے علاوہ حضرت سالمؓ نے خصوصی تعلق کی بناء پر علم فتوح آن کریم کے معاملہ میں ان کے مقام بلند کا اندازہ لکھا یا جاسکتا ہے،

تیسرا بزرگ حضرت زید بن الخطابؓ میں، جو حضرت عمرؓ کے بڑے صحابی ہیں اور بالکل ابتداء میں اسلام نے آئے تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہو تو اکابرؓ بھی جھونکا چلتا ہے وہ مجھے زید بن الخطابؓ کی یاد دلاتا ہے،^۱
جو تھے بزرگ حضرت ثابت بن قیس بن شماں رضی اللہ عنہ میں، جن کے مابین میں صحیح گزارچکا ہے کہ وہ کاتبینِ دحی میں سے تھے،^۲ قرآن کریم سے ان کا خصوصی تعلق بالکل ظاہر اور واضح ہے،

ایک اور بزرگ حضرت عباد بن بشیرؓ میں، جو بدری صحابی ہیں، اور حضرت عاشورہ کا ارشاد ہے کہ انصاری صحابہ میں تین حضرات ایسے تھے جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے تمام دوسرے صحابہ پر فائز تھے، ان تین حضرات میں سے ایک حضرت عباد بن بشیرؓ بھی تھے^۳

نیز حضرت طفیل بن عمر دودسی رضی اللہ عنہ بھی یکامہ کی جنگ میں شہید ہوئی جو مشہور صحابی ہیں، اور قرآن کریم کی تعلیم میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ جیسے اقراب الصحابہؓ کے شاگرد ہیں،^۴ حضرت زید بن ثابتؓ کے بھائی حضرت یزید بن ثابتؓ،^۵ حضرت برابن عازبؓ کے چچا حضرت قیس بن الحارثؓ،^۶ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ الاصابہ،^۷ الحافظ ابن حجر، ص ۲۳۴ ج ۲،

سلہ البراءۃ والہنایۃ، لابن کثیر، ص ۳۳۶ ج ۶ مطبع السعادۃ مصر،

سلہ زاد المعاد، لابن القیم، ص ۳۰ ج ۱ معینیہ مصر،

سلہ الاصابہ، ص ۲۵۵ ج ۲، والاستیعاب علی ہامش الصواب، ص ۲۲۶ ج ۲،

۵۵ الاصابہ ص ۲۱ ج ۲،

کے بھائی عائذ بن ماعنؑ ہی حضرت زبیرؓ کے بھائی سائب بن عوامؑ اور حضرت عثمان بن منظونؑ کے صاحبزادے حضرت سائب بن عثمانؑ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں، پھر نہ کہہ بالا حضرات کے علاوہ اٹھارہ ہمایہ حسین تھے، اور انصار میں سے تقریباً بیشتر حضرات لیے تھے جو غزوہ بدربار سے پہلے مسلمان ہوتے، اور ان کے علاوہ تقریباً دس ایسے تھے جو غزوہ آخر میں شریک تھے، اور یہ تفصیل صرف ان شہداء کی ہے، جن کے نام آیا ہے میں محفوظ رہ سکی ہیں، باقی سینکڑوں نامعلوم افراد میں سے کتنے حافظ قاری ہوں گے؟ اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، لیکن فریدریک شلیلر Schwally (Jaraj) میں اور منظہمی راث میں کہا گیا ہے اس فہرست میں نہ صرف یہ کہ کرنے قاری نظر نہیں آتا بلکہ وہ ان سب کو نو مسلم " Recently Converts)

قرار دے کر دنیا پر اپنی تحقیق کا رعب جانا چاہتے ہیں، غور فرمائیے کہ جس جنگ میں ہمایہ حسین و انصار کی اتنی بڑی جماعت شہید ہو گئی ہواں کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں سب نو مسلم شہید ہوئے تھے لہذا صحیح بخاریؓ کی جمیع قرآن والی روایت غلط ہے علم دین تحقیق پر کتنا بڑا اظلم ہے، اور انصاف و دیانت کے ساتھ کتنا بڑا فریب ہے؟ پھر بات یہ نہیں ہے کہ جنگ یا تمہارے میں تمام حفاظت صحیح شہید ہو گئے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ جنگ یا حملہ تو صرف ایک لڑائی تھی، یہ زمانہ وہ تھا جبکہ اس طرح کی جنگوں کا ایک طبقہ میں سلسلہ شروع ہو رہا تھا، اور علماء صحابہؓ میں سے کتنے جانباز ایسے تھے جو یا مدد سے کہیں زیادہ خوب ریز مرکوں میں اپنی جان فتویان کرنے کے لئے بے چین تھے، اس ماحدوں میں اگر حضرت عمر بن کوئی دل میں فتویٰ کر کیم جمع کرنے کا داعی ہے پیدا ہو گیا تو اس میں کوئی ایسی غیر معقول بات ہے جس کی بناء پر صحیح بخاریؓ کی ایسی قوی روایت کو غلط فتوار دیدیا جائے؟

منظہمی راث نے اس روایت پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ اگر حضرت ابو بکرؓ

لہ اس فہرست کے لئے دیکھئے اکامل، لابن اثیر الحجریؓ، ص ۱۳۰، ابتدایہ و الہمایہ ص ۳۰۰

نے سرکاری سطح پر کوئی نسخہ تیار کیا ہوتا تو اسے ایک "جگت" کی حیثیت حاصل ہوتی احوالہ کی اس زمانے کی روایتوں میں اس بات کا کوئی نشان نہیں ملتا، لہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس سرکاری نسخے کے حوالے دیتے جاتے ہوں — لیکن اس اعتراض کی بغیر بھی محتاج بیان نہیں کیونکہ اس نسخے کو "جگت" فرار دینے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ جب حضرت عثمان بن علیؓ نے عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں قرآن کریم کے نسخے نقل کر کر سمجھیے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے حضرت حفصہؓ سے دہی نسخہ طلب فرمایا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تیار فرمایا تھا، واطہ نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ اگر یہ کوئی سرکاری نسخہ تھا تو حضرت عمرؓ کے بعد یہ نسخہ خلیفہ وقت کے بجائے حضرت حفصہؓ کے پاس کیوں رہا؟ اس کا جواب بھی بہل واضح ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت کوئی خلیفہ معین نہیں تھا، اس لئے حضرت عمرؓ کے دوسرے سامان کے ساتھ یہ نسخہ بھی حضرت حفصہؓ کے پاس منتقل ہو گیا، کون ایسا صاحبِ عقل انسان ہو سکتا ہے جو محض اتنی سی بات کی وجہ سے ایسی مستند روایت ہی کو دریا برد کر دے!

خلافتِ صدیقیٰ تک پورا فتران | پچھے بتایا جا چکا ہے کہ جب بھی آنحضرت ﷺ کیا ہے کیا ہے کیا تھا؛ تو آپؐ کا تبین وحی کو بلاؤ کر اُس کو لکھوادیت تھے، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک پورا قرآن لکھا تو جا چکا تھا، لیکن وہ کتابی شکل میں مرتب نہیں تھا، بلکہ مختلف آیتیں مختلف چیزوں پر لکھی ہوئی موجود تھیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان مختلف اشیاء کو جمع کر کے آیات قرآنی کو یکجا صحیفوں کی شکل میں لکھوایا،

اس کے برخلاف مستشرقین میں سے نوکلڑی کی اور آرٹھوجیفرے دیغونے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پورا فتران لکھا ہے کیا بلکہ اس کے صرف کچھ حصے لکھ گئے تھے، انہوں نے صحیح بخاریؓ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ بیہادر کے بعد حضرت عمرؓ نے جمیع قرآن کا مشورہ

دیا اور اس کی وجہیہ بتائی کہ اگر حفاظ صاحبہ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کریم کے بہت نے حصوں کے مذاع ہو جائے کا اندازیت ہے، آرٹھر جیفرے لکھتا ہے:-
”اس سے واضح ہے کہ اندازیت کی وجہ اُن حفاظات کا قتل ہو جانا تھا جوں نے فترآنِ کریم یاد کر کھاتا تھا، اگر قرآن کریم پورا کا پورا عہد رسالت میں بھا جا چکا تھا تو اس اندازیت کے کوئی معنی نہ تھے۔“

لیکن اول تو یہ بات اہتمامی ہیرت انگریز اور افسوسناک ہے کہ بعض دوسرے مستشرقین کی طرح آرٹھر جیفرے نے بھی صحیح بخاریؓ کی اس روایت کو درست ماننے سے انکار کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی سلط پر کوئی نسخہ تیار فرمایا تھا، اب اس دو عملی کو انصاف اور دیانت کے کونے خانے میں فیٹ کیا جائے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی اس روایت میں وہ ساری باتیں توجیفے صاحب کی نگاہ میں جھوٹی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی کے زمانے میں سرکاری سلط پر قرآن کریم کی حفاظات کا اہتمام کیا گیا تھا، لیکن اسی روایت کا وہ حصہ اُن کی نظر میں بالکل صحیح ہے جس میں حضرت عمر رضی کا وہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ ”اگر صحابہؓ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو خطرہ ہے کہ کہیں فترآن کا بڑا حصہ مذاع نہ ہو جائے“، ایک طرف تو وہ یہ پوری روایت نقل کر کے اسے من گھرت (fictions) بتائیں اور دوسری طرف اسی روایت سے قرآن کریم کے غیر مکتوب ہونے پر استلال بھی فرماتے ہیں، اُس کے باوجود ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ”مستشرقین کا انصاف، نیک نیتی، اور غیر جاپ داری بالکل واضح ہے، ان کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سوچا حقیقت کی نقاب کشانی کے کچھ اور نہیں جاہتے“

بہر کیف! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ کے عہد خلافت میں قرآن کریم کو جمع

کرنے کا جو طریقہ کا رخ تیار کیا گیا تھا، اور جسے ہم پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کرچکے ہیں، آگرائے ذہن میں رکھا جاتے تو حضرت عمر بن کے اس جملے سے جیفرے کا یہ استدلال خود بخود باطل ہو جاتا ہے، ہم عرصن کرچکے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی کے زمانے میں جمیع قرآن کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس میں یادداشت اور کتابت دونوں ذرائع سے بیک وقت کام لیا جاتا تھا، اسی لئے کوئی آیت اُس وقت تک نہیں لکھی جاتی تھی جب تک تمام موجود ذرائع سے اس کا جائز و قرآن ہونا ثابت نہ ہو جاتے، یہ محتاط طریقہ کا راسی وقت ممکن ہوا جب آیات قرآنی کے مکتوب شکل میں محفوظ ہوئے کے علاوہ حفاظت کی بھی ایک بڑی داد موجود تھی، اس کے برخلاف اگر حفاظت صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت اس وقت موجود نہ ہوتی تو جمیع قرآن کا یہ کارنامہ اس بخشن احتیاط کے ساتھ انجام نہیں پاسکتا تھا، جس کا وہ مستحق تھا،

اس کے علاوہ قرآن کریم کے ثبوت کے لئے تو اتر کی ضرورت تھی، اور حضرت وہ چار نسخے اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے تھے، اس لئے جمیع قرآن کے وقت حفاظت قرآن کی ایک بڑی جماعت ناگزیر تھی، لہذا حضرت عمر بن کے اندر یشیے کی وجہ یہی تھی کہ اگر حفاظت قرآن شہید ہو تے گئے اور جمیع قرآن کا کام موخر ہوتا رہا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کریم کا تو اتر منقطع ہو جائے اور لکھے ہوئے مواد کی تصدیق صحابہؓ کے متواتر حافظوں سے نہ کی جاسکے، لہذا حضرت عمر بن کے اس اندر یشیے سے یہ استدلال بالکل باطل ہے کہ اُس وقت تک پورا قرآن کہیں بھی لکھا ہوا موجود نہیں تھا،

مختلف قراتین کس طرح وجود قرآن کریم کی مختلف قراءتوں کی حقیقت ہم پچھے تفصیل کے ساتھ ذکر کرچکے ہیں، میکن میں آئیں؛ دسوائی شبہ

معاشرے میں ایک دوسرا اگرہا کن نظر یہ پیش کیا ہے، نولریکی، گولٹازیہ اور آرٹھرجیزی دیگرہ نے لکھا ہے کہ قراءتوں کا اختلاف درحقیقت سماعی نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ نے جو نسخہ تیار کرائے تھے ان پر نقطے اور حرکات نہیں تھے،

اس لئے اسے مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا، چنانچہ جس شخص نے جس طرح چاہا
اپنے اجہتار سے پڑھ لیا، اور وہ اس کی قرارت بن گئی ہے
مستشرقین کے اس دعوے کا علاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو مختلف قرائیں معروف
ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، بلکہ مصاحف عثمانی کو پڑھنے میں
لوگوں کا جواختلاف ہوا اس کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں، حالانکہ یہ دعویٰ صراحت بے بنیاء
اور بالکل غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانی کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہوتا
قراء، توں کے وجود میں آنے کا سبب نہیں بنتا، بلکہ ان مصاحف عثمانی کو نقطوں اور
حرکات سے جان پوچھ کر اسی لئے خالی رکھا گیا تھا کہ قرآن کریم کی جتنی فتراتیں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں وہ سب اس رسم الخط میں سما سکیں،
ہم پچھے وضن کرچکھ ہیں کہ ہر درمیں قرآن کریم کی کسی قراءت کو قبول کرنے
کے لئے تین شرائط کو لازمی سمجھا گیا ہے، ایک یہ کہ مصاحف عثمانی میں کے رسم الخط
میں اس کی گنجائش ہو، دوسری یہ کہ وہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو، اور تیسرا
بکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، لہذا کوئی قراءت
امس وقت تک صحیح تسلیم نہیں کی گئی، جب تک صحیح سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں مل گیا، اگر قراءت کے وجود میں آنے کا سبب محض عثمانی
رسم الخط ہوتا توہر اس قراءت کو درست مان لیا جاتا جو رسم الخط میں سما جاتی، اور اسے قبول
کرنے کے لئے یہ تیسرا شرط عامدہ نہ کی جاتی، چنانچہ جو شخص بھی قرآن کریم کی مختلف قراءتوں
پر غور کرے گا اُسے کھلی آنکھوں نظر آجائے گا کہ عثمانی رسم الخط میں ایک لفظ کو مختلف
طریقوں سے پڑھنے کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ وہ طریقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے ثابت نہیں تھے اس لئے اُنھیں خہتیار نہیں کیا گیا، یہ بات دو مثالوں سے واضح ہو گی:-

لَهُ دِيْكَهُيَّ "ذَاهِبُ الْقِيْسَرِ الْأَسْلَامِيِّ، گُولڈِ زِيْر، تَرْجِيمَة عَرَبِيٍّ وَأَكْرَاطِ عَالَمِ بِحِلْمِ نَجَار، ص: ۸، مَكْتَبَةُ الْخَاجِيِّ فَاهِزَ"
۱۴۷۶ھ اور مقدمہ کتاب مصاحف، آرٹھ جیفرے، ص، المطبع الرحمانیہ، مصر ۱۹۵۵ھ

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:- "وَلَا يُقْبِلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْتَغْنِي مِنْهَا عَذَلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ" یہاں ایک قرات میں لآتیقبل ریائے ساتھ ہے، اور ایک قرات میں لآتیقبل رتا کے ساتھ ہے، لیکن اسی قسم کی ایک آیت سورہ بقرہ میں ایک دوسری جگہ ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے وَلَا سَعْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ، یہاں لآتیسفعھا صرف تارکے ساتھ آیا ہے، لآتیسفعھا ریارکے ساتھ کوئی قرات نہیں ہے، حالانکہ رہم عنانی میں لآتیسفعھا کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ عثمان مصاحب میں یہ جملہ اس طرح لکھا ہوا تھا، "لآسفعھا" اور عربی زبان کے قواعد میں بھی یہ اور تار، دونوں کی گنجائش موجود تھی، لیکن چونکہ یہ قرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تھی، اس لئے اس کو کسی نے بھی خستیار نہیں کیا، اسی طرح سورہ یلس میں ارشاد ہے:- "إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَهْوَى لَهُ كُنْ فَيَكُونُ" یہاں ایک قرات میں فیکون رون پر پیش کے ساتھ آیا ہے، اور دوسری قرات میں فیکون رون پر زبر کے ساتھ، لیکن اسی طرح کی ایک آیت سورہ آی عمران میں ہے، "إِذَا أَخْضَنَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ" یہاں صرف ایک، ہی قرات ہے (یعنی رون پر پیش) دوسری قرات رسم الخط کی گنجائش کے باوجود کسی نے خستیار نہیں کی۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں قرات کے مجموعوں میں موجود ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ قرات تین رسم الخط سے وجود میں نہیں آتیں، بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھیں، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے مصاحب کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا تھا،

یہی وجہ ہے کہ پوری اہمیت میں صرف ایک صاحب ریعنی ابویکر بن مقشم، ایسے

لہید تو مثیلیں علامہ طاہر کردی[ؒ] کی تاریخ القرآن، ص ۱۲۸ اور ۱۴۹ سے ماخذ ہیں،
لہ ان کا پورا نام محمد بن الحسن بن یعقوب بن نعیم ہے، ولادت ۲۶۵ھ اور وفات ۳۵۳ھ

مزرے پیش گھنوں نے یہ مسلک خستیار کیا تھا کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق
قراءتیں ایجاد کی جا سکتی ہیں، اور ان کا سند کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت
ہونا ضروری نہیں، لیکن جس وقت انہوں نے اپنا یہ مگراہن نظریہ پیش کیا، تو پوچھے عالم
اسلام نے اُن پر شدید نیکر کی، خلیفہ وقت نے انہیں فستراہ اور رہقاہ کی ایک مجلس میں
طلب کر کے اُن سے توہہ کرنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ انہوں نے توہہ کی، اور اپنے نظریہ سے
رجوع کا سخیری اعلان لکھ کر دیا۔^۱

اس واقع سے صاف واضح ہے کہ عثمانی مصاحف سے اپنے اجتہاد کے مطابق قراءتیں
مستنبط کرنے کو امتیت مسلمہ میں ہمیشہ ایک مگراہی سمجھنا گیا ہے، اور اس بات پر ہر فدوار
میں مسلمانوں کا اجماع رہا ہے کہ قرآن کریم کی صرف دہی قراءت معتبر ہے جو آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اگر ترا، توں کا وجود بعض عثمانی رسم الخط
کے پڑبندی میں اجتہادی اختلافات کی وجہ سے ہوا ہوتا تو ابن مقسم پر اتنی شدید نیکر کیوں
کی جاتی؟ لہذا مستشرقین کا یہ دعویٰ بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے کہ قراءتیں عثمانی
مصاحف میں نقطوں اور حرکات کی غیر موجودگی سے پیدا ہوئی ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے
کہ یہ قراءتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقے پر ثابت ہیں، اور اُن کو محفوظ
کرنے کے لئے ہی حضرت عثمانؓ نے اپنے مصاحت کو نقطوں اور حرکات سے غالی رکھا تھا
تاکہ یہ تمام قراءتیں اُن کے رسم الخط میں سما سکیں،

قرآن کریم کی شاذ قراءتیں اور انکی حقیقت [بعض مستشرقین نے قرآن کریم کی شاذ
قراءتیں کو بنیاد بنا کر غلط مفروضات
کا ایک قلعہ تعمیر کر لیا ہے، اور رائی کا
گیارہواں شبہ]

لہ تفصیلات کے لئے دیکھئے تایمیخ بغداد، المخطیب، ص ۲۰۴-۲۰۵ ج ۲ طبع بیروت، خطیب بغداد^۲
نے اُن کا یہ تطبیف بھی نقل کیا ہو، کہ ان کی دفاتر کے بعد ابو احمد الفرضی^۳ نے انہیں خواب میں ویجاہ کوہ قبلہ
کی طرف پشت کر کے ساز پر مظہور ہو ہیں، فرضی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی یہ تعبیری کہ انہوں نے قرأت
قرآن میں انہر کی مخالفت کی ہے،

پہاڑ اور سوئی کا بھالا بنانے کی کوشش کی ہے، خاص طور سے گولڈزیر اور آرٹچر جیسے نے ان قراۃ توں کی بہت سی مثالیں پیش کر کے اُن سے من مانے نتائج نکالے ہیں لہ، یہاں اُن تمام مثالوں کو پیش کر کے اُن کی حقیقت واضح کرنا تو ممکن ہی، اس لئے کہ اس کام کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہوگی، اس کے علاوہ ہماری رائے میں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، لیکن ہم یہاں شاذ قراءات توں کے بارے میں جذب اصولی باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں، امید ہے کہ ان اصولی حقائق کو بدینظر رکھنے کے بعد مستشرقین کے اُن تمام باطل نظریات کی تردید اچھی طرح سمجھ میں آئے گی جو انہوں نے شاذ قراءاتوں کی بنیاد پر قائم کئے ہیں،

جیسا کہ ہم پچھے عرض کرچکے ہیں پوری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کی صرف وہ قراءتیں معتر ہیں جن میں تین شرائط پابند ہائیں:-

(۱) وہ قراءت ختمی مصاحت کے رسم الخط میں سما سکتی ہو،

(۲) عربی قواعد کے مطابق ہو،

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کا پڑھنا متواتر طریقے سے ثابت ہو، یا کما زکم علماء قراءات میں مشہور و معروف ہو،

جس قراءت میں ان تین شرائط میں سے کوئی ایک مفقود ہو، وہ شاذ قراءت کہلاتی ہے، اور پوری امت میں سے کسی نے اسے معتر نہیں مانا، ان شاذ قراءاتوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں مندرجہ ذیل باتوں میں سے کوئی ایک بات پابندی جاتی ہے:-

لہ دیکھنے مذاہب التفسیر الاسلامی : گولڈزیر، ترجمہ عویض اکٹر عبد الحکیم التجار، اور:-
Materials for the History of the text
Arthur Jeffery ;
of the Quran, Leiden 1937 P. 6

لہ گولڈزیر کے نظریات پر ڈاکٹر عبد الحکیم التجار نے بھی مذاہب التفسیر الاسلامی کے حاشیہ پر مختصر مگر اچھا تبصرہ کیا ہے،

۱۔ بعض اوقات وہ قراءت بالکل موضوع ہوتی ہے، جیسے کہ ابوالفضل محمد بن حیز
خر اعی کی قراتیں، جنکو انہوں نے امام ابوحنیفہؓ کی طرف منتسب کیا ہے، امام
دارقطنیؓ اور تمام علماء نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ یہ تمام قراتیں موضوع بیس ہیں،
۲۔ بعض اوقات آن کی سند ضعیف ہوتی ہے، جیسے ابن تیمیع اور ابوالسائل کی
قراتیںؓ، یا بہت سی وہ قراتیں جو ابن ابی داؤدؓ نے کتاب المصافت میں ثابت
صحابہؓ و تابعینؓ سے منسوب کی ہیں،

۳۔ بعض اوقات ستر صحیح ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ قرآن کریم کی قراءت نہیں
ہوتی، بلکہ کوئی صحابی یا تابعی عام گفتگو میں قرآن کریم کے کسی لفظ کی تشریح کے
لئے اس کے ساتھ دو ایک لفظ بڑھادیتے تھے، قرآن کریم چونکہ پورا کا پورا
متواتر تھا، اور ہر دوسریں اس کے ہزاروں حفاظات موجود تھے، اس لئے ان الفاظ
کے اضافہ سے قرآن کریم کے متن میں اضافے کا کوئی اندازہ نہیں تھا، لہذا اس
قسم کی تشریحات میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا، مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ
سے مردی ہے کہ انہوں نے وَلَمْ أَخْمُّ أَذْأَخْتُ مِنْ أَمْمٍ پڑھا، اس میں مِنْ اُمَّةٍ
کا لفظ تفسیری اضافہ تھا، اسی طرح حضرت عثمانؓ سے مردی ہے کہ انہوں نے
ایک آیت اس طرح پڑھی وَلَمْ تَكُنْ مِنْكُمْ أَمْمَةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْحَسِيرِ وَ
يَا مُرْوَنَ يَا لِمَعْرُوفٍ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيَسْتَعِيْنُونَ اللَّهُ عَلَى مَا
آصَابَهُمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَؓ اس میں وَيَسْتَعِيْنُونَ اللَّهُ عَلَى مَا
آصَابَهُمْ، بلاشبہ تفسیری اضافہ ہے، کیونکہ اگر یہ حبلہ حضرت عثمانؓ کی قراءت

لہ التشریف القراءات العشر، لابن الجزریؓ، ص ۱۶ ج والاتفاقان، ص ۸، ۹، ۱۰ ج،
لہ التشریص، ص ۱۶ ج ۱، لہ التشریف لابن الجزریؓ، ص ۳۲ و ۳۴ ج ۱، والاتفاقان، ص ۹، ۱۰ ج ۱
فروع ۲۲ تاءؓ و شرح الموطأ، للزرقاوی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۲۵۵ ج ۱،
لہ کنز العمال لعلی المتقی رحمۃ اللہ علیہ، ج ۱، بحوالہ عبد بن حمید و ابن حبیرؓ وغیرہ،

میں واقعہ قرآن کا جزو، ہوتا تو ان کے مرتب کردہ مصحف میں صور موجود ہوتا، حالانکہ ان کے مرتب فرمائے ہوئے سات مصافت میں سے کسی میں یہ جملہ منقول نہیں، شاذ قراءت وہ میں اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں،

۴۔ بعض مرتب ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن کریم کی بعض قرات میں آخر میں منسوخ ہو گئیں، لیکن کسی صحابی کو ان کے منسوخ ہونے کا عالم نہ ہو سکا، اس لئے وہ قدیم قراءت کے مطابق پڑھتے رہتے، لیکن جو نکر دوسرے تمام صحابہؓ نے جانتے تھے تھے کہ یہ قراءت منسوخ ہو چکی ہے اس لئے وہ نہ اسے پڑھتے تھے، اور نہ قرآن کریم کی صحیح قراءت وہ میں شمار کرتے تھے،

۵۔ بعض شاذ قراءتوں کو دیکھ کر ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی وقت کسی تابع^۱ وغیرہ سے قرآن کریم کی تلاوت میں کوئی بھول چکوک ہو گئی، جیسا کہ اکثر برطے برطے حافظوں سے ہو جاتی ہے، اس وقت کبھی سننے والے نے سنکرے سے روتا کر دیا ہے،

قرآن کریم کی جتنی شاذ قرات میں منقول ہیں وہ زیادہ تراہنی پارچے صورتوں میں دائر ہیں، ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں ان قراءتوں کو معین قرار دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ امت نے کسی بھی ذریمی انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، اور اسی لئے یہ قرات میں متواتر توکیا ہوتیں مشہور بھی نہ ہو سکیں، لہذا ان کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے جو یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم کے متن میں کچھ اختلافات پائے جاتے تھے یہ ایسا بلے بنیاد اور لغو خیال ہے جو علم و تحقیق کے اعتبار سے قابل غور بھی نہیں ہے، وانہلہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم^۲ ۳

^۱ مشکل الآثار، للطحاوی^۲، ص ۱۹۶ تا ۲۰۲ ج ۲

^۲ النشر، لابن الجزری^۳، ص ۱۶ ج ۱، والمبانی في نظم المعانی: مقدمة في علوم القرآن، ص ۷۰، مكتبة الحجاجي، مصر، ۱۹۵۲ء

باب سقتم

حقانیتِ قرآن

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی حیرت انگیز کائنات کی ہے کہ ہستہ وھری اور عناد کی بات تو اور ہے، لیکن جو شخص بھی غیر جانبداری اور اخلاقی کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ بیساختہ پھر اُٹھے گا کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قرآن کریم بیک وقت عقل اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کی صداقت و حقانیت دل میں اُترتی چل جاتی ہے، لہذا قرآن کی حقانیت پر دلائل پیش کرنے کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے سورج تک رoshن ہونے پر دلائل قائم کرنا، لیکن فیل میں ہم مختصر آندر وہ باتیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے سے ایک غیر مسلم کے لئے بھی قرآن کریم کی حقانیت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سب سے پہلے اُس بات کو ذہن میں تازہ کی صدورت "کے عنوان کے تحت پیچھے لکھی ہے، اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "وھی" انسان کی ایک فطری صدورت ہے، جس کے بغیر انسان کے لئے دنیا میں ایک اچھی زندگی گزارنا ممکن نہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں اُن سے تو وہی

وہ مسات کے مخصوص پر بات کرنا ہی فضول ہے، اُن سے پہلے وجود یا رسم تعالیٰ کے
 مسئلہ پر گفتگو کی مزدورت ہے، یعنی جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا کہ ”وَحْيٌ“ اللہ تعالیٰ لی رحمت اور قدرت کا ایسا ناگزیر تقابل ہے جس پر ایمان لاتے بغیر ایمان باللہ کی تکمیل نہیں ہو سکتی، جس ذات نے انسان کو پیدا کیا اور اُس کے لئے یہ کائنات بنائی اس سے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کہ وہ انسان کو شر و فساد کے تقابلوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اُس کی رہنمائی کے لئے کوئی ہدایت نامہ نہ بھیج،

ہدایت کے اسی سلسلے کا نام ”وَحْيٌ“ اور ”رسالت“ ہے، اور یہ سلسلہ آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے م Shr دع، نہیں ہوا، بلکہ آپ پر اُس کی تکمیل ہوئی ہے، آپ سے پہلے ہزاروں انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کا سیغام ہدایت لے کر دنیا میں تشریف لاجھ کئے اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے یہ بشارت دی تھی کہ آخری دُور میں ایک ایسے نبیؐ تشریف الائیں گے جن پر نبوت کے مقدوس سلسلے کی تکمیل ہو جائے گی، بعض انبیاء علیہم السلام نے آپ کی متعدد علمائیں بھی پہلے سے بیان کروی تھیں، بلکہ بعض نے تو صراحت آپ کا نام نای بھی بتارا تھا، بعض انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں اگرچہ آج بہت کچھ تحریف و ترمیم ہو چکی ہے، لیکن آج بھی اُن میں آپ کی تشریف اور میں اُنی ہست کی بشارتیں اور رہیت اُنی علمائیں محفوظ ہیں،

کتبِ مقرر میں آپ کی بشارتیں امثلہ ابتدی کتاب ہشتہ، میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہے:-

”اوْ خَدَاوِنْدَنْجَ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں اُن کے لئے اُنی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک بھی برپا کر دیں گا، اور اپنا کلام اس کے مذہب میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا دی ہو اُن سے کہے گا، اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کے گا، نہ مُنے تو میں ان کا حساب اُس سے لوں گا، لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے

کے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، یا اور مبعودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ بھی قتل کیا جاتے، اور اگر تو اپنے دل میں کہے کجھ بات خداوند نے نہیں کی ہے اسے ہم کیز کرنے سمجھائیں؟ تو سمجھان یہ ہے کہ جب وہ بھی خداوند کے نام سے کچھ کہے، اور اس کے کہے کے مطابق تکھہ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا ہے۔

(استثناء: ۱۸، ۲۲ تا ۲۴)

اس عبارت میں بھی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے یہ صراحةً کی گئی ہے کہ جس نبی کی بشارت دی گئی ہے، وہ ان میں سے نہیں بلکہ ان کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں میتوث ہوگا، اور حضرت شعبان علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجودہ باطل میں منقول ہے کہ:-

"دیکھو! میرا خادم جبکو میں سنھاتا ہوں، میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے، میں نے اپنی روح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا، وہ نذچلاتے گا اور نہ شور کرے گا، اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنتائی دیجی، وہ مسئلے ہوتے سرکنڈے کو نہ توڑے گا، اور تمہامی بستی کو نہ سمجھاتے گا، وہ راستی سے عدالت کریگا، اور ماندہ نہ ہوگا، اور بہت نہ ہارے گا، جبکہ مک عدالت کو زین پر قائم نہ کرے ہجیزی دا اس کی شریعت کا استظار کریں گے....."

میں ہی تیرا ہاتھ پکڑ دیں گا، اور تیری حفاظت کروں گا، اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا، کہ تو انہوں کی آنکھیں کھولے اور ایسروں کو قید سے نکالے، اور ان کو جوانہ ہیرے میں بیٹھیں گے قید خانے سے چھڑائے، یہوداہ میں ہی ہوں، یہی میرا نام ہے، میں اپنا جلال کسی دسکر کے لئے اور اپنی حمد کھو دی، ہوئی مورتوں کے لئے روانہ رکھوں گا،..... اسے سمندر پر گزرنے والو! اور اس میں بستے والو! اسے جزیرہ! اور ان کے باشندو! خداوند کے لئے نیا گیت گاؤ، زمین پر سرتاسر اسی کی ستائش

کرو، بیان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آبادگاؤں اپنی آوازیں بلند کریں،
تلعہ کے بنے والے گیت گائیں، پھاڑوں کی بچپوں پر سے لٹکاریں، وہ خراوند
کا جلال تلاہ کریں، اور حبس زیروں میں اس کی شناختی کریں، خداوند بیادگی
مانند نکلے گا، دجنگی مردکی مانتر اپنی غیرت دکھاتے گا،..... جو کھودی ہری
مورتوں پر بخود سہ کرتے اور ڈھلنے ہوتے بُتوں سے کہتے ہیں تم ہمارے عبور
ہو وہ بچپے ہیں گے، اور بہت شرمذہ ہوں گے ॥ (یسعیاد: ۲۲، ۱)

اس عبارت میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جس نبی کی بشارت دی جا رہی ہے وہ حضرت
امنیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا، (کیونکہ قیدار اہمی کے صاحبزادے کا نام ہے)
اور سلح (مدینہ طیبہ کے مشہور پیار) کے بنے والے اس کی آمد پر خوشیان منایں گے،
اس کا خاص مقابلہ بُت پرستوں سے ہوگا، اور وہ اپنے حلقوں اثر میں بُت پرستی کا خاتمه
کر دے گا، اُسے متعدد اقوام سے جنگیں بھی پیش آئیں گی، اور بالآخر وہ غالب آکر
اُن اقوام میں عدالت نافذ کرے گا،

لہ اس بشارت کا ایک ایک لفظ صرف اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے،
اس کی پوری تفصیل تواحرنے بیابل سے قرآن "مک" ص ۲۸۳ ج کے مفصل حداشی میں بیان کی ہے
یہاں مختصرًا اتنا بھج لیجئے کہ قیدار خود بیابل کی تصریح کے مطابق حضرت امنیل علیہ السلام کے
صاحبزادے کا نام تھا، (۱۔ تواریخ: ۳) اور ان کی اولاد عرب کے بیان میں آباد ہی، جیسا کہ
بیابل ہی کی کتاب یسعیاد (۲۱: ۳۰) میں اضافہ ہے، لہذا اس عبارت میں قیدار کا نام میکر
صاف طور سے رکھا گیا ہے کہ جس نبی کی بشارت دی جا رہی ہو وہ امنیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا،
اور عرب میں بیوث ہوگا، اس کے علاوہ اس عبارت میں "سلح" کے بنے والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ
گیت گائیں، سلح مدینہ طیبہ کا مشہور پیار ہے، اور اسی کے ایک حصہ میں "ثیات الوداع" دعائے
ہیں، جن پر کھڑے ہو کر بدینے کی بچپوں نے "طلعَ النَّبِيِّ وَعَلَيْهِ" کے گیت گاتے ہوتے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا تھا،

موجودہ بابل کے عہد نامہ ترمیم میں اس قسم کی اور بھی بہت سی بشارتیں ابک موجودیں، اور انہی کی وجہ سے حضرت عیینی علیہ السلام کی تشریف آوری کے وقت اُنک لوگوں میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور عظیم الشان نبی دنیا میں تشریف لانے والے ہیں، چنانچہ انجیل یوحنائیں مذکور ہے کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام تشریف لائے تو لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ وہی نبی ہیں جن کی بشارت پچھلے انبیاء علیہم السلام دیتے آ رہے ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اس کا انتکار کیا، انجیل یوحنائی کی عبارت یہ ہے :-

”اور یوحنائی کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یہ دشمن سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور اس نے انکار نہ کیا، بلکہ یہ اصرار کیا کہ میں ترمیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایسا لیا ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، الخ“

(دیکھیے انجیل یوحنائی ۱۹:۱۶ تا ۲۶)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور نبی میں کے منتظر تھے، اور وہ نبی اُن کے درمیان اس قدر مشہور و معروف تھے کہ اُن کا نام لینے کی بھی صورت نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ ”دنبی“ کہنا کافی ہوتا تھا،

پھر جب حضرت عیینی علیہ السلام تشریف لائے تو انہوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح اسم گرامی لوگوں کو بتا کر آپ کی تشریف آوری کی بشارت دی، انجیل یوحنائی میں مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد منقول ہے کہ :-

”میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تھا رے لئے فائدہ مند ہو، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ (فار قلیط) تھا رے یا سزا آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے

لاد انجیل کی یونانی نسخوں میں یہ لفظ ”پیر کلیطوس“ تھا، جو ”محترم“ کا ترجیح ہے، یہاں ہم نے صرف نوشی کر لئے چند بشارتیں ذکر کی ہیں، اس موضوع پر مبسوط مباحثت کے لئے دیکھئے ”بابل سے قرآن تک“ جلدی تو میں

محاجاہے پاس میسجدوں گا اور وہ آگر دنیا کو گناہ اور رہستیا زمی اور عدالت
کے بارے میں قصور دار پھرائے گا ॥ (ریوحتا ۱۶:۲)

ان بشارتوں کو ذہن میں رکھ کر اُس زمانے کا تصور کیجئے جس میں آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم تشریف لاتے، یہ وہ زمانہ تھا جب سینکڑوں سال سے یہ دنیا کسی بنی کے وجود
سے محروم تھی، گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات مث رہی تھیں، تحریف و ترمیم کرنے
والوں نے بچھلی شریعتوں کو برتری طرح منح کر دیا تھا، مشرک کی وبا، عالمگیر ہوشی تھی،
ظلہم و بربرتیت کا دور دور تھا، اور گزشتہ آسمانی کتابوں کا... علم رکھنے والے
بنی آخر الزمان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، ان حالات میں آپؐ مکرہ مکرہ
میں پیدا ہوتے ہیں، اور چالینس سال اُنک اس چھوٹی سی بستی میں اس طرح رہتے
یہی کہ اس کا بچہ بچہ آپؐ کی سچائی، آپؐ کی دیانتداری، آپؐ کے عدل والی صاف اور
آپؐ کے جن ہنلائق کا معرفت ہے، مکرہ مکرہ آجکل کے شہروں کی طرح کوئی بڑا شہر نہیں
تھا، بلکہ ایک ایسی بستی تھی جس میں ہر شخص کی زندگی دوسروں کے سامنے ایک کھملی
کتاب کی مانند ہوتی ہے، اس بستی میں آپؐ چالینس سال بس رکرتے ہیں، مکرہ کے باشندے
آپؐ کے بھین اور آپؐ کی جوانی کا اچھی طرح مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس پوچھے عصر میں
کسی شخص کو آپؐ کے ذاتی کردار پر کوئی انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی، کوئی تنفس
ایسا نہیں پایا جاتا جو کبھی ساری عر آپؐ کی کہی ادنیٰ غلط بیانی کی مثال پیش کر سکے
اس کی بجا سے پوری بستی میں آپؐ "صادق" اور "ایمن" کے لقب سے مشہور ہوتے ہیں
ایسا بھی نہیں ہے کہ آپؐ نے یہ چالینس سال زندگی لوگوں سے الگ تمہلگہ کر گزاری
ہے، بلکہ آپؐ اُن کے تمام امور زندگی میں قوم کے ایک باشدور اور مدبر فرد کی طرح
دخلیں رہتے ہیں، آپؐ اُن کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، اجرت پر کام کرتے ہیں، اُن
کے باہمی جھگڑے نپڑاتے ہیں، اُن کے ساتھ سفر کرتے ہیں، ازدواجی زندگی گزارتے
ہیں، غرض زندگی کے جتنے مراحل کا اُس دوسریں تصور کیا جا سکتا ہے اُن سب سے
حیرتے ہیں اور پوری قوم ان تمام مراحل میں آپؐ کے بلند کردار کا اعتزاز کرتی ہے،

پھر چالیس سال کی اس طویل مدت میں آپ کسی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کرتے، اہل کتاب کے علم سے آپ کا کوئی میل جوں نہیں رہتا، کسی سے لکھنا پڑتا نہیں سمجھتے، عام اہل عرب کے برخلاف کبھی کوئی شعر نہیں کہتے، نہ مشاعروں سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے، کبھی کسی کا ہن جادو گر یا بخومی کی صحبت میں نہیں بیٹھتے، اس کے بعد اچانک آپ کی زبان مبارک ایک ایسا کلام جاری ہوتا ہے جس کے آگے عرب کے بڑے بڑے ادباء و شرفا، محدثین میکن پر مجبور ہو جاتے ہیں، ایسے ایسے علوم و معارف بیان فرماتے ہیں، جس کے سامنے دنیا بھر کے حکماء کی گرد نیں حشمت ہو جاتی ہیں، ایسی ایسی بیشگی خبریں مناتے ہیں جو کبھی کسی کا ہن یا بخومی کے تصور میں بھی نہیں آئیں، اور پھر یہ خبریں سونی صدر درست ثابت ہوتی ہیں، آپ کے درست مبارک پر بہت سے ایسے معجزات ظاہر ہوتے ہیں جن کے آگے بڑے بڑے جادو گر عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں، اور پھر تینیں سال کی مختصر مدت میں آپ پورے جزیرہ عرب میں ایسا محیر العقول انقلاب برپا کر دیتے ہیں کہ صحرائے عرب کے جو وحشی علم و معرفت اور تہذیب و تمدن سے باکل کورے تھے وہ پوری دنیا میں علم و حکمت اور تہذیب و شاستری کے چڑاغ روشن کرتے ہیں، جو لوگ کل تک ایک دمرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بجاتے ہیں، جہاں بہرط قتل دغارت گری کی آگ بھر ٹک رہی تھی وہاں امن و آشی کے گلاب کھل اٹھتے ہیں، جہاں ظلم دبر بریت کا دار و دورہ تھا، وہاں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے، اور بالآخر عرب کے یہی صحراء نشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلیل و خزار تھے، ایران اور روم کی عظیم سلطنتوں کے وارث بن جلتے ہیں، اور ساری دنیا اُن کے عدل و انصاف، اُن کی رحم دلی، اور ان کی مژاافت نفس کے گن گانے پر مجبور ہو جاتی ہے،

ان حقائق پر جو شخص بھی ٹھنڈے دل و دماغ اور علیص وغیر جانب داری سے خور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچ بخیر نہیں رہ سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کے سچے رسول تھے، آپ ”وہی بنی“ سچے جن کی بشارت صدیوں پہلے سے دی جا رہی تھی اور جن کا انسانیت کو انتظار رکھتا، لہذا آپ کا یہ ارشاد کہ ”قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے“ سونی صدر بحق اور بلا خوف تردید درست ہے،

اعجازِ قرآن

قرآنِ کریم کی حقانیت کی ایک اور واضح دلیل اس کا اعجاز ہے، یعنی ایک ایسا کلام ہے جس کی نظر پڑی کرنا انسان قدرت سے باہر ہے، اسی وجہ سے اس کو سر درستین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے، یہاں ہم مختصرًا قرآنِ کریم کی اُن وجوہ اعجاز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن پر خور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، اور کسی بشری ذہن کا اس میں کوئی دخل نہیں،

آگے بڑھنے سے پہلے بنیادی طور پر دو باتیں ساختے رکھنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ فصاحت و بлагعت اور کلام کی سحر انگیزی ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہے، اور پوری حقیقت و ماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، آپ تلاش و جستجو اور استقراء کے ذریعہ فصاحت و بлагعت کے اصول و قواعد مفتر فرمائتے ہیں، لیکن درحقیقت ان اصول و قواعد کی حیثیت فیصلہ کن نہیں ہوتی، کسی کلام کے حسن و حق کا آخری فیصلہ ذوق اور وجدان ہی کرتا ہے، جس طرح ایک حسین چہرے کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی، جس طرح ایک خوش رنگ بچوں کی رعنایتوں کو الفاظ میں محدود نہیں کیا جاسکتا، جس طرح ہمکتی ہوئی ٹھک کی پوری کیفیت بیان کرنا ممکن نہیں، جس طرح ایک خوش ذائقہ بچل کی لذت و حلاوت الفاظ میں نہیں سما سکتی، اسی طرح کسی کلام کی فصاحت و بлагعت کو تمام دکمال بیان کر دینا بھی ممکن نہیں، لیکن جب کوئی صاحب ذوق انسان سے منسے گا، تو اس کے محاسن و اوصاف کا خود خوب پتہ چل جائے گا،

دوسرے یہ کہ فصاحت و ملاحت کے معاملے میں ذوق بھی صرف اہل زبان کا معتبر ہے، کوئی شخص کسی غریب زبان میں خواہ کتنی جہارت حاصل کر لے، لیکن ذوقِ سیم کے معاملے میں وہ اہل زبان کا کبھی ہمسر نہیں ہو سکتا،

اب زرازماہ جاہلیت کے اہل عرب کا تصور کیجئے، خطابت اور شاعری اُن کے معاشرے کی روح روان تھی، عربی شعروار دل کا فطری ذوق اُن کے بچے بچی میں سایا ہوا تھا، فصاحت و ملاحت اُن کی رگوں میں خوبیں حیات بن کر دوڑتی تھی، ان کی مجلسوں کی رونق، اُن کے میلوں کی رنجیگی، اُن کے خروجیں کام سرمایہ اور ان کی نشرواشاعت کا ذریعہ سب کچھ شعروار تھا، اور اسخیں اس پر اتنا غور تھا کہ وہ لپنے سواتھ اتمام قوموں کو "جمع" یعنی گونجاہ کرتے تھے،

ایسے ماحول میں ایک اُمیٰ (جانبِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک کلام پیش کیا، اور اعلان فرمایا کہ یہ ایڈ کا کلام ہے، کیونکہ:-

تَئِينَ الْجَمَعَتِ الْأُنُوشُ وَالْجِنُّ عَلَى آنَ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا

الْقُرْآنَ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَكُوْكَانَ بَعْضُهُمْ لِيَعْضُنَ ظَاهِرِيًّا، (السراء: ۱۸)

"اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس قرآن جیسا کلام، پیش کرنا چاہیں تو

اس جیسا پیش نہیں کر سکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کی کتنی مذکوری کریں

یہ اعلان کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ دعویٰ اُس ذات کی طرف سے تھا جس نے کبھی

وقت کے مشہور ادبیار اور شعراء سے کوئی علم حاصل نہ کیا تھا، کبھی مشاعرے کی محفلوں میں

کوئی ایک شعر بھی نہیں پڑھا تھا، اور کبھی کامیابیوں کی صحبت بھی نہ اٹھائی تھی، خود

شعر کہنا تو درکنار، آپ کو دوسرے شعراء کے اشعار تک یاد نہیں تھے، پھر یہ وہ ذات تھی جسے میدران فصاحت کے یہ سورہ ایک نئے دین کا بانی کہا کرتے تھے، اگر یہ اعلان

سچا ثابت ہو جائے تو ان کے آبائی دین کی ساری عمارت مُنہ کے بیل گر پڑتی، اور اُن کی

صدیوں پُرانی رسوم دروایات کا سارا اپنکندہ بیوند زمین ہو جاتا تھا، اس لئے یہ اعلان

، تبقیت اُن کی ادبی صلاحیتوں کو ایک زبردست چیلنج تھا، یہ اُن کے دین و مذہب پر

ایک کاری دار تھا، یہ اُن کی قومی ہمیت کے نام مبارزت کا ایک پیغام تھا، یہ اُن کی غیرت کو ایک لکھا رکھتی، جس کا جواب دیئے بغیر کسی غیتو ر عرب کے لئے چین سے بیٹھنا ممکن نہیں تھا، لیکن ہوا کیا؟ — اس اعلان کے بعد اُن آتش بیان خطیبوں اور شعلے نما شاعروں کی محفل میں ستائیا جھاگیا، کوئی شخص اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے آگئے نہ بڑھا، کچھ عرصہ کے بعد قرآن کریم نے یہ اعلان فرمایا کہ:-

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ قَدْ أَتَرْتَ لَنَا عَلَى عَبْدٍ تَأْفَانُوا إِنْ شَرَبَ مِنْ
مِثْلِهِ وَادْعُوا شَهَدَنَ آءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
صَدِيقِينَ هَفَانِ لَمْ يَقْعُدُوا وَلَمْ يَفْعَلُوا فَاتَّقُوا الْمَارِا الَّتِي
رَفَعُوا هَذَا النَّاسُ وَالْجِنَّا إِذْ أَعْنَتْ لِلْكُفَّارِ يَنْ هَ (البَقْوَة: ٢٣)

اور اگر تم کو اس کتاب کے باقی میں ذرا بھی شک و شبہ ہو جو ہم نے لپٹے بندے پر نمازیل کی ہے تو اس جیسی ایک (بی) سورت بنا لاؤ، اگر سچے ہو، اور اسکے سوا تمھارے جتنے حیاتی ہیں اُن سب کو بلاؤ، پھر بھی اگر تم ایسا نہ کر سکے، اور یعنی ہے کہ ہر گز نہ کر سکو گے، تو پھر اس آگ سے ڈر دیجس کا ایندھن انسان اور بچہ ہوں گے، وہ کافر دن کے لئے تیار کی گئی ہے ॥

اس پر بھی بدستور سکوت طاری رہا، اور کوئی شخص اس کلام کے مقابلے میں چند جملے بھی پناکر نہ لاسکا، سوچنے کی بات ہے کہ جس قوم کی کیفیت بقول علامہ جمیر جانی یہ ہر کو اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ دنیا کے آخری مرے پر کوئی شخص اپنی فصاحت و بлагعت پر غریب معمول گھنڈ رکھتا ہے، تو وہ اس پر تقدیر کرنے اور اپنے اشعار میں اس پر چوٹیں کرنے سے بازنہ رہ سکتی تھی، اس بات کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے ان مکرر سکرر اعلانات کے بعد بھی مجبکی بیٹھی رہے، اور اُسے ذم مارنے کی

له الرسائل الشافية، لعبد القاهر الجرجاني، المطبوعة في ثلاثة رسائل في إعجاز القرآن، ص ١٠٩، دار المعارف مصر،

جرأت نہ ہو، اس بات کی کوئی سادیں اس کے سوا نہیں ہو سکی کہ فصاحت بلا غت کے سو سارے آن کریم کا مقابلہ کرنے سے عاجز رکھے تھے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زک پہنچانیکے لئے ظلم و ستم کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا، آپ کو ستایا، مجنون کہا، جادوگ کہا، شاعر اور کہا، ہن کہا، لیکن ان سے اتنا نہیں ہو سکا کہ قرآن کے مقابلے میں چند جلے میش کرتے، پھر صرف یہی نہیں کہ یہ شعلہ بیان خطیب اور آتش نما شاعر قرآن کریم کا مقابلہ نہیں کر سکے، بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کلام کی حرمت انگریز تاثیر کا گھل کر اعتراف کیا، امام حاکم[ؒ] اور سہیق[ؒ] نے قرآن کریم کے بالے میں ولید بن مغیرہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

وَاللَّهُ أَنْ لِقَوْلِهِ الَّذِي يَقُولُ حَلَاوَةٌ وَّاَنْ عَلَيْهِ
لِطَلَاوَةٌ... وَأَنَّهُ لِيَعْلَوْ وَمَا يَعْلَى،

خدا کی قسم! جو یہ کلام بولتے ہیں اس میں بلا کی شیرینی اور رونق ہے
یہ کلام غالب ہی رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔^۱

یہ ولید بن مغیرہ ابو جہل کا بھتیجا تھا، ابو جہل کو جب یہ پتہ چلا کہ میرا بھتیجا اس کلام سے متاثر ہو رہا ہے تو وہ اسے تنبیہ کرنے کے لئے اس کے پاس آیا، اس پر ولید نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! تم میں کوئی شخص شعر کے حسن و فتح کو مجھ سے زیادہ جانتے والا نہیں، خدا کی قسم! محمد جو کہتے ہیں شر کو اس کے ساتھ کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے،^۲
اسی ولید بن مغیرہ کا اقام حضرت ابن عباس[ؓ] نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب موسم حج آیا تو اس نے قریش کو جمع کر کے کہا کہ موسم حج میں عرب کے مختلف قبائل یہاں آئیں گے، اس نے محمد کے بالے میں کوئی ایسی بات طے کرو کر پھر باہم کوئی اختلاف نہ ہو، قریش نے کہا کہ ہم لوگوں سے یہ کہیں گے کہ حج کا ہن ہیں،

۱- الخصائص الکبریٰ، للستیوطی[ؒ]، ص ۱۱۳ ج ۱ والاتفاق، ص ۱۱ ج ۲،
۲- اخرجه الحاکم[ؒ] والسبیق[ؒ] عن ابن عباس[ؓ] راجع الخصائص الکبریٰ / ۱/ ۱۳

وَلَيْدَنَے کہا، خدا کی قسم: ان کا کلام کا ہنزو جیسا نہیں ہی، فتریش نے کہا کہ پھر ہم اکھیں مجذون کہیں گے، وَلَيْدَ بولا کہ ان میں جزوں کا شائزہ تک نہیں، فریش کہنے لگے کہ پھر ہم کہیں گے کہ وہ شاعر ہیں، وَلَيْدَ نے کہا کہ شعر کی تمام اصناف سے میں وافق ہوں، یہ کلام شعر ہرگز نہیں ہے، فریش نے کہا کہ تپھر ہم اکھیں جادوگر کہدیں؟ وَلَيْدَ نے پہلے اس کا بھی الکا کیا، مگر عاجز اگر اسی پر فیصلہ ہوا، کہ جادوگر کہا جاتے، کیونکہ یہ ایسا جادو ہے جو باپ بیٹے اور بھائی بھائی میں تفریق کر دیتا ہے۔

اسی طرح عتبہ بن ربیعہ فریش کے سر برآورده لوگوں میں سے تھا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصالحت کی گفتگو کرنے آیا، آپ نے سورہ الحجہ کی ابتدی آیات اس کے سامنے تلاوت فرمائیں، وہ ہمہ تن گوش ستارہا، یہاں تک کہ آپ نے آیت سجدہ پر سجدہ کیا، تو وہ بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر سیدھا گھر جلا گیا، لوگ اس کے پاس گفتگو کا نتیجہ معلوم کرنے آئے، تو اس نے کہا "خدا کی قسم: محمد نے مجھ کو ایسا کلام سنایا کہ میرے کانوں نے تمام عمر ایسا کلام نہیں سننا، میری سمجھ میں نہ آس کا کہ میں کیا جواب دوں؟"

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے بڑے بڑے فیض و بلیغ أدیباً و شعراً نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کا معارضہ نہیں کر سکے، بلکہ فتر آن کریم کی اثر انگیزی کا قولی یا اعلیٰ طور سے اعتراض کرنے پر مجبور ہوتے،

لبعن غیر مسلم مصنفین یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کسی نے قرآن کریم کے مقابلے پر کوئی کلام میں کیا ہو، لیکن یہ تک اس کا کلام نہ پہنچ سکا ہو، عَلَامَه

لَهُ اخْرَجَ الْبِيْهِقِيُّ وَابْنَ اسْحَقَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا (الْخَصَائِصُ الْكَبِيرُى، ص ۱۱۳ ج ۱)

لَهُ اخْرَجَ الْبِيْهِقِيُّ وَابْنَ اسْحَقَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا كَعْبَ (الْخَصَائِصُ الْكَبِيرُى، ص ۱۱۵ ج ۱) و

ابُولِيلِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مَرْجِعُ الغَرَائِبِ (ص ۲۶۷ ج ۲)

ابو سیلان خطابی (متوفی ۱۷۸۴ھ) نے جو بڑے پایہ کے محدث ہونے کے علاوہ لفت اور ادب کے بھی امام ہیں، اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوتے ہیں کہ بڑی اچھی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں کہ :-

”یہ خیال بالکل غلط ہے، اس نے کہ ابتداء سے عام اور خاص لوگوں کی یہ عادت چل آئی ہے کہ وہ اہم واقعات کو ضرور نقل کر کے آئندہ نسلوں کے لئے بین کر جاتے ہیں، بالخصوص وہ واقعات جن کی طرف لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہوں یہ معاملہ (قرآن کریم کا جیلخ) تو اس وقت چار دنگ عالم میں شہرت پاچکا تھا، اگر اس کا کوئی مقابلہ کیا گیا ہوتا تو اس کا ہم تک تپہچنا ممکن ہی نہ تھا، اگر بات ممکن ہو سکتی ہے تو پھر بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں کوئی اور نبی یا بے شمار انبیاء مبعوث ہوتے ہوں، اُن پر کتابیں اُتری ہوں، اور ان میں شریعت محمدی کے علاوہ کوئی اور شریعت بیان کی گئی ہو، اور یہ واقعات ہم تک نہ پہنچ ہوں، — اگر بات ناقابلِ تصور ہے تو قرآنِ کریم کے معارضہ کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔“

البتہ چند مسخردیں نے قرآنِ کریم کے مقابلے میں کچھ مضائقہ خیز جملے بنائے تھے وہ یہیں کے صفات میں آج تک محفوظ ہیں، اور اب ل عرب ہمیشہ اُن کی سہنسی اڑاتے آؤ ہیں مثلاً کسی نے ”سورۃ القارعہ“ اور ”سورۃ الفیل“ کے انداز پر یہ جملے کہتے تھے، کہ ”آتَفِیْلُ مَا الْفِیْلُ وَمَا أَذْرَلَكَ مَا الْفِیْلُ، لَهُ مَشْفَقٌ طَوْمَلٌ وَذَنَبٌ أَقْشَلٌ“، وَمَا ذَلَّكَ مَنْ خَلَقَ رَبُّنَا لِلْفَلَلِلِ“۔ یا کسی نے قرآن کے مقابلے پر یہ جملے بنائے تھے:- ”أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ فَعَلَ بِالْجَنْبَلِ، أَخْرَجَ مِنْهَا نَسْمَةً تَسْعَ، بَيْنَ شَرَاسِيفَ وَحَشَّيْ“۔ یا میلہ کذاب نے ان جملوں کو قرآن کے مقابلے میں اپنی دھی فتار دیا تھا کہ یا صدقہ نقی کہ تنقیں

لاماء تک درین دلائل وارد تنفیریں "پھر زول قرآن کے کافی عرصے کے بعد عربی کے مشہور ادیب اور انسا پرداز عبد الدین المتفق مترجم کلیلہ و منڈلہ متوافق سلسلہ مامنے قرآن کے کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن اسی دروان کسی بچے کو یہ آیت پڑھتے ساکہ و قیلیا اگر صُ ابْلَغَنِي مَاءَ لِي وَيَا سَمَاءَ لِي أَقْلَعَنِي " تو پکارا مٹھا کے میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا محابرہ ناممکن ہے، اور یہ ہرگز انسان کلام نہیں پڑھے۔

قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات

اب ہم مختصر آن اہم خصوصیات کو میان کرنا چاہتے ہیں جن کی بناء پر قرآن کریم کا کلام مُجھز ہے، ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا احاطہ تو بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم انسان کی محمد و دو بصیرت کے مطابق ان خصوصیات کو چار عذانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے :-
 (۱) الفاظ کا اعجاز (۲) ترکیب کا اعجاز (۳) اسلوب کا اعجاز (۴) اور نظر کا اعجاز،
الفاظ کا اعجاز کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ای بلند مرتبے کو پہنچا ہو اب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح ہے۔ تعالیٰ نہیں ہوا، یونکہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر محبوہ رہ جاتا ہے، لیکن پورے قرآن کریم میں الحمد سے لے کر و آننس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہی، بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹال ہے کہ اسے پہل کر اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں ہے، عربی زبان ایک انتہائی رسیح زبان ہے جو اپنے ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے دنیا کی دولت مندرجہ زبانوں میں سے ایک ہے، چنانچہ اُس میں ایک مفہوم کے لئے معمولی

لہ بیان اعجاز القرآن، للخطابی (ج ۲)، المطبوع فی "ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن، ص ۵ و ۶،
 لہ اعجاز القرآن، للباقلا (ج ۲)، ص ۵ ج ۱ حاش الشقان،

محولی فرق سے بہت سے الفاظ پائے جلتے ہیں، قرآن کریم الفاظ کے اس دینی ذخیرے میں سے اپنے مقصود کی ادائیگی کے لئے وہی لفظ منتخب فرماتا ہے جو عبارت کے سیاق، معنی کی ادائیگی اور اسلوب کے بھاؤ کے نحاظ سے موزون ترین ہو، یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو سکتی ہے۔

(۱) زمانہ جاہلیت میں "موت" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے، مثلاً موت، ہلاک، فتا، حقہ، فحوش، حمام، متوں، سام، قاضیہ، بیخ، بیط، فود، مقدار، جیاز، قیم، حلاق، طلاطل، طلاطلہ، عول، ذام، کفت، جدراع، مجرّۃ خالج، لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے بیس منظر میں ابی عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکنا تھا کہ متکہ ذریعہ انسان کے تمام اجزاء اور ہیئت کے لئے فنا ہو جاتے ہیں، اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں، جو تکہ وہ لوگ محاذ و آخرت اور حساب و کتاب کے قائل نہیں تھے، اس لئے انہوں نے موت کے لئے جتنے نام جھوپڑ کئے اُن سب میں اس نظریہ کی جھلک موجود ہے، اگر قرآن کریم ابی عرب کی اپنی قدیم تعبیرات پر اکتفا کرتا تو موت کے باقی میں اُن کے باطل نظریے سے کسی درجہ میں موافقت کا شہید ہو سکتا تھا، چنانچہ جس جگہ موت کی حقیقت بیان کرنی تھی، وہاں موت کے مفہوم کے لئے قرآن نے مذکورہ چوبیں الفاظ کو جھوپڑ کر ایک نیا لفظ اختیار کیا اور عربی زبان کو ایک ایسا خوب صورت، مختصر، جامع اور فضیح لفظ عطا کیا، جس سے موت کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی، اور وہ لفظ ہے "توفیٰ" جس کے لغوی معنی یہ ہے "کسی چیز کو پورا پورا صول کر لینا" اس لفظ نے یہ بھی واضح کر رہا کہ موت ابدی فنا کا نام نہیں، بلکہ اشد تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ اچاہے وہ جسم کے منتشر اجزاء کو بجا کر کے اُن میں دوبارہ روح کو لوٹا سکتا ہے، "موت" کے لئے یہ لفظ قرآن کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا تھا، چنانچہ ابن سیدہ نے "المخصوص" میں "موت" کے درسرے الفاظ کے لئے تو ابی عزیز

لہ ابن سیدہؒ اندسیؒ نے یہ تمام نام شمار کرائے ہیں، اور ابی عرب کے اشعار سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں، (المخصوص، لا بن سیدہ، ص ۱۱۵ (ج ۶))

کے اشعار سے مثالیں پیش کی ہیں، لیکن "توفی" کے لئے قرآن کریم کے سوا کوئی استشهاد پیش نہیں کیا ہے۔

(۲) ہر زبان کے بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصح اور پسندیدہ ہیں سمجھے جاتے، لیکن پونکہ آن کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے کوئی اور متبادل لفظ نہیں ہوتا، اس لئے اپل زبان انھیں استعمال کرنے پر جبور ہوتے ہیں، لیکن قرآن کریم ایسے موقع پر اسی خوب صورت تبعیر اختیار کرتا ہے کہ ذوق سیم و جگہ کراٹھتا ہے، مثلاً عربی میں تعمیر مکان کے لئے پچھی ہوئی اینٹوں کے لئے جتنے الفاظ متعلق ہیں وہ سب ثقیل، مبتدل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، مثلاً اجر، قرمد، اور ملبوث، اب قرآن کریم میں بیان کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک اور بجا محل تعمیر کرنے کے لئے اینٹیں پکاؤ، اس واقعہ کو ذکر کرنے کے لئے اینٹ کا لفظ استعمال کرنا ناگزیر کہ تھا، لیکن قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایسے معجزاً انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ مفہوم بھی نہایت حُسن کے ساتھ ادا ہو گیا، اور ثقیل الفاظ کے استعمال کی قیاحت بھی پیدا نہیں ہوتی، چنانچہ ارشاد فرمایا:-

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَائِكَةُ مَا أَعْلَمُ بِتُّكُمْ وَمَنْ إِلَهٌ غَيْرِيُ
فَأَوْقِنْ لِي يَا هَامَانٌ مَعَنِّي الطَّيْبِينَ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا، (القصص: ۳۸)

اور فرعون نے کہا کہ سردار ان قوم مجھے اپنے سوا تھار اکوئی معتبر معلوم نہیں، پس اے ہامان: گیلی مٹی پر آگ روشن کر کے میرے لئے ایک محل تعمیر کرو ॥

(۳) عربی میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو مفرد ہونے کی حالت میں تو سبک اور فصح ہیں، لیکن ان کی جمع ثقیل سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً زمین کے معنی میں لفظ "آرض" ایک سبک لفظ

لہ یعنیہ التبیان لمشکلات القرآن، المیثن البنتوری حفظہ اللہ، ص ۵۶، مجلس علمی دہیل
۱۹۷۴ء لہ یعنیہ بحوالہ المثل اساتذہ ابن الاشیر، ص ۱۱،

ہے، اس کی دو جمیں عربی میں مستعمل ہیں، آرٹھون اور آرٹھنی، یہ دونوں ثقیل سمجھی جاتی ہیں، اور ان کی وجہ سے کلام کی سلاست میں فرق واقع ہو جاتا ہے، لیکن چہار جمیں کا مفہوم ادا کرنا ناصر دری ہوتا ہے، وہاں ادبیے عرب انہی کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، اس کے برخلاف قرآن کریم نے بیشتر مقامات پر سماڑت کو بصیرت جمع اور اس کے ساتھ آرٹض کو معندرہ استعمال کیا ہے، اور کہیں آرٹض کو بصیرت جمع استعمال نہیں فرمایا البتہ ایک جگہ سات زمینوں کا ذکر کرنا تھا، جس کے لئے جمع کا صیغہ لانا ناصر دری تھا، لیکن قرآن نے اس صیغہ جمع سے احتراز کر کے ایسی خوب صورت تعبیر اختیار کی کہ مفہوم بھی ٹھیک ٹھیک ادا ہو گیا، اور نہ صرف یہ کہ کلام میں کوئی ثقل پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کے حُسن میں چند درجند اضافہ ہو گیا، ارشاد ہے:-

آَنَّهُ اللَّهُمَّ خَلَقْتَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَكْرَمِ صِنْ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: ۱۲)

”الشروع ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے، اور زمین میں سے بھی اتنی، ہی“
دریکھتے: نیہاں سنتا“ رآسمان کی جمع تولاٹی گئی، لیکن قرآن نے آرٹض کی جمع لانے کے بجائے اس کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وَمِنَ الْأَكْرَمِ صِنْ مِثْلَهُنَّ کی تعبیر اختیار فرمائی جو کے اسرار و نکات پر جس قدر غور کیجئے مجذب انس بلاغت کا دریا موجز نظر آتا ہے، (۲۴) قرآن کریم کے بعض الفاظ پر بعض ملحدوں نے ثقل ہونے کا اعتراض کیا ہے، مثلًا لفظ ”ضیزی“ لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بعض الفاظ اپنی ذات میں ثقل ہوتے ہیں لیکن ادیب انہیں ایسے سلیقے سے استعمال کرتا ہے کہ اس بگاس سے بہت لفظ نہیں لایا جا سکتا، اردو میں اس کی مثال یہ ہے کہ ”دخول دھپا“ ایک مبتدل لفظ سمجھا جاتا ہے، جسے فصیح و بلیغ عبارتوں میں عموماً استعمال نہیں کیا جاتا، لیکن غالب کا یہ شعر دریکھتے ہے

دخول دھپا اس سراپا ناز کا سثیوہ نہیں

ہم ہیں کر بلیخے تھے غالب پیش دستی ایک دن

نیہاں یہ لفظ ایسے سلیقے کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ کو دیا جائے

تو حُن بیان پر پانی پھر جائے گا، عربی میں اس کی مثال یہ ہے کہ گردن کی ایک رُگ کا نام "اخد ع" ہے، عربی کے دُو شاعروں نے اس لفظ کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے، لیکن دونوں میں حُن وسلامت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، ابو تمام کہتا ہے

ياد هر قوم عن أحد عيك فعتد

اصججت هذ الاسم عن خرقك

یہاں یہ لفظ بڑا ثقیل اور بوجھل معلوم ہو رہا ہے، لیکن اس کے بعد حساس کے ایک شاعر عبد اللہ بن الصمر کا یہ شعر پڑھتے ہے

تلقت نوالى حتى وجَدْتُ ثُنى

وَجِدتُّ من الاصفاء لِيَتَأَقَّرَّ أَخْدَعَا

اس میں وہی ثقیل لفظ اتنی روایی اور خوبصورتی سے آیا ہے کہ زویں سیم پر کوئی گرانی نہیں ہوتی، بلکہ شعر میں مجموعی طور پر جو سوز و گلاز پایا جا رہا ہے یہ ثقیل لفظ اس میں بھی پوری طرح فٹ ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں لفظ ضَيْنَى "بھی ایسے حُن کے ساتھ یا ہے کہ اس کی جگہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا، آَكُمُ الَّذِي مَلَكَ إِذَا قِسْمَةً ضَيْنَى

اگر انفرادی طور سے دیکھا جائے تو قسمۃ جَاءَتْ يَا قِسْمَةً ظَالِمَةً کے الفناض ضَيْنَى کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوتے ہیں، لیکن جن سیاق میں لفظ ضَيْنَى قرآن میں آیا ہے وہاں اگر صحابۃ "یا" ظالمۃ" کے الفاظ رکھ دیتے جائیں تو کلام کی ساری روایی ختم ہو جائے گی،

لہ یہ چاروں مثالیں بنیادی طور پر مولانا محمد نویس صاحب بتوئی صاحب ظلیم کی کتاب "مِيقَةُ الْبَيَان" سے ماخذ ہیں، جو حضرت علامہ اوزیر شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مشکلات القرآن" کے مقدمہ کے طور پر شائع ہوتی ہے، موصوف نے یہ مثالیں حضرت شاہ حبیب اور علامہ ابن اثیر رحمہ کی "المثل المسائر فی ادب الکاتب انشاعر" کے حوالے سے پیش کیں ہیں،

ترکیب کا اعجاز [الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا عجز آتا ہے]

اس معاملے میں بھی قرآن کریم کا اعجاز اور حکم کمال پر ہے، قرآن کریم کے جملوں کے درویسٹ میں وہ شوکت، سلاست اور شیرینی ہے کہ اس کی نظر پیش نہیں کی جاسکتی، یہاں میں صرف ایک مثال پر استدعا کرتا ہوں:-

فَإِنْظَارُهُ كَسَّكَ لِيَ عَوْنَىٰ مِنْ كَيْ مَقْرُبَهُ مُهْسُورٌ تَحْمَلُهُ
رَقْتُلُ اجْتَمَاعِي زَنْدَگِيٰ (ہے) اور الْقَتْلُ أَنْقُلُ الْقَتْلُ رَقْتُلُ مَتْلُ كَيْ رُوكَتْعَمُ ہُوتَیٰ (ہے)
أَوْ رَأْكُتْرُوا الْقَتْلُ لِيَقِيلُ الْمَكْتُلُ (قتل زیادہ کرو تو کہ قتل کم ہو جائے) - ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زدِ عام تھے، اور فیض بھی جلتے تھے، قرآن کریم نے بھی اسی مفہوم کو ادا فرمایا لیکن کس شان سے؟ ارشاد ہے:-

وَكَسْكُونُ فِي الْقِصَاصِ حَمِيلَةٌ

”اور تمہارے لئے تھاصیں میں زندگی ہے“

اس جملے کے اختصار، جامیعت، سلاست اشکست، اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھتے بلاغت کا سمجھ، شاہکار معلوم ہوتا ہے، اور پہلے کے تمام جملے اس کے لئے سجدہ ریز و کھلائی دیتے ہیں،

اسلوب کا اعجاز [قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے زیادہ روشن مظاہرہ اس کے اسلوب میں ہوتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کا مشاہدہ ہر کوں کر سکتا ہے، اس کے اسلوب کی اہم محرکات خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:-]

(۱) قرآن کریم ایک الیسی بشر پر مشتمل ہے جس میں شعر کے قواعد و ضوابط ملحوظ نہ ہونے کے نامہ جو ڈائیک ایسالزید اور شیرین آہنگ پایا جاتا ہے، جو شعر نے کہیں زیادہ خلافت اور لطافت کا حامل ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا جمالیاتی ذوق نظم اور شعر میں ایک الیسی لذت اور خلافت محسوس کرتا ہے جو نثر میں محسوس نہیں ہوئی، اگر آپ اس

لذت اور سلاوات کے سبب پر تغور قراییں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کا بارہ درحقیقت لفظیں کی اس ترتیب میں مفہوم ہے جو ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے، عربی، فارسی والے لوگوں کی قدیم شاعری میں اس آہنگ کی لذت شعر کے خاص اوزان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، جب ایک بھی صوتی وزن کے الفاظ بار بار کافیوں میں پڑتے ہیں تو اس سے زوقِ سلیم کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے، اور پھر جب وزن کے ساتھ قافیہ بھی مل جاتا ہے تو اسی کی لذت دوچند ہو جاتی ہے، ارجیب اس کے ساتھ ردیف کی یکسانیت بھی شامل ہو جاتی ہے تو لذت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، اور اگر مصرعوں کے نیچ پیچ میں عروضی اوزان کے ساتھ صرف اوزان اور قوافی کی یکسانیت بھی شامل ہو جائے (جیسا کہ مرصح اشعار میں ہوتا ہے) تو یہ لذت اور طریقہ جاتی ہے،

لیکن اوزان اور قوافی کے اصول ہر خطا اور ہر زبان میں یکسان نہیں ہوتے، ہر زبان کے لوگ اپنے اپنے ذوق اور مزاج کے لحاظ سے اس کے لئے مختلف قواعد معتبر رکھتے ہیں، مثلاً ایں عرب نے اپنی شاعری کو وزن اور قافیہ کے اُن ساختوں کی مدد و درکاہ ہے، جو خلیل بن حمود وغیرہ نے وضع کئے ہیں، فارسی شاعری میں اوزان کا دائرہ کچھ اور وسیع کیا گیا، اور نئی نئی بھروسے خستیار کی گئیں، لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی میں زیادہ کردی شرائط عامد کر دی گئیں، چنانچہ عربی شاعری میں قبور اور کبر کو ہم قافیہ سمجھا جاتا ہے، اور اگر ایک شعر میں قبور اور دمرے میں کبیر آرہا ہو تو اُسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، جبکہ فارسی میں یہ ممکن نہیں، اسی طرح عربی میں اگر ایک بھی کل کا اُرھا حصہ پہلے مصرع میں اور آرہا در دشکن میں ہو تو اُسے عیوب نہیں سمجھتے جبکہ فارسی میں یہ زبردست عیوب ہی، بلکہ ایسا شعر شعر ہی نہیں سمجھا جاتا، نیز عربی شاعری میں زحافت اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ بسا ارقات اصل بھر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، جبکہ فارسی میں ایسا نہیں ہوتا، اسی طرح عربی شاعری میں ردیف کا کوئی تصویر نہیں جبکہ فارسی میں ردیف کے بغیر غزل پہلکی سمجھی جاتی ہے، مزید یہ کہ اصل عربی شاعری میں فارسی کی طرح مشتوی، مستراد، محنت، مسلس، رباعی اور قطعہ بنڈ نظموں جیسی

اصناف کا وجود نہیں تھا، جبکہ فارسی ان اصناف سے مالا مال رہی ہے، اور پھر اسی کے اثر سے اندر کس وغیرہ میں موت شفات اور از جمال وغیرہ کی اصناف راجح ہوتیں، عربی اور فارسی میں ان اختلافات کے باوجود اوزان میں بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے، لیکن قدریم ہندی شاعری کو دیکھتے تو اس میں معروف عروضی اذرا کے بجائے صرف حروف کی تعداد کا لحاظ ہوتا ہے، اور اگر دو خلف طفون کے حروف کی تعداد ایک ہو تو انھیں ہم وزن سمجھا جاتا ہے، خواہ ان کی حرکات و سکنات میں بڑا نظر ہو، بلکہ بعض اوقات ہندی رو ہونئیع قدر عرضی اوزان و قوافی قافیہ یا ردیف کے قواعد، بلکہ تعداد حروف تک میں بڑا فرق ہوتا ہے، اس کے باوجود انھیں بڑے لطف کے ساتھ پڑھنا اور گایا جاتا ہے، اور ان کی تاثیر ناقابل انکار ہوتی ہے، اور اس معاملے میں انگریزی شاعری کا مراجح شاید سبھی سے زیادہ آزاد واقع ہوئے، کہ اُس میں عرضی اوزان تو کجا مصروعوں کے طول و عرض میں بھی بسا اوقات زین؟ آسمان کا فرق ہوتا ہے، اکثر قافیہ کی بھی کوئی خاص رعایت نہیں ہوتی، بلکہ صرف تلفظ کے ٹکٹکوں (Syllables) سے ایک خاص آہنگ (rhythm) پیدا کیا جاتا ہے، اور وہی آہنگ اہل زبان کے لئے ایک خاص لذت و کیف کا سبب ہون جاتا ہے،

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کی لذت و حلاوت میں افراد و قوافی کے لگے بندھ قواعد کوئی عامگیر حیثیت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ یہ قواعد مختلف زبانوں اور خطوں میں بدلتے رہتے ہیں، لیکن ایک چیز ہر جوان سب زبانوں اور تمام قوموں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ ہے "ایک متوازن صوتی آہنگ" یعنی الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا کہ اُن کے تلفظ سے اور انھیں منکر انسان کا جمالیاتی ذوق حظ محسوس کرے، لیکن انسان چونکہ اس قدر مشترک کو اوزان و قوافی کے معروف سائچوں سے الگ کرنے پر قادر نہیں، اس لئے جب وہ شاعری کا لطف پیرا کرنا چاہتا ہے تو اسے لازماً اپنے ماحول کے

بناتے ہوتے قواعد صوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے، یہ صرف قرآن کریم کا اعجاز ہو کہ اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں مقرر کئے ہوئے شعری قواعد میں سے کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی، بلکہ صرف "متوازن صوتی آہنگ" کی اس تدریشتگر کو اختیار کر لیا گی جو ان سارے قواعد کا اصل مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نظر ہونے کے باوجود اپنے شعر سے زیادہ لطافت اور حلاوت کا حامل ہے، اور صرف اہل عرب، ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے لوگ اُسے شنکر غیر معمولی لذت اور تاثیر محسوس کرتے ہیں،

یہیں سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بعض گفار عرب نے قرآن کریم کو کس بنابری خعرفت را دیا تھا؟ ظاہر ہے کہ شعر کی معرفت تعریف کسی بھی طرح قرآن کریم پر صادق نہیں آتی، اور گفار عرب اپنی ہزار گرا ہیوں کے باوجود اتنی جس ضرور رکھتے تھے کہ نثر اور نظم میں ہمیزگر سکیں، وہ اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ شعر کے لئے وزن اور قافیہ کی پابندی ضروری ہے، جو قرآن کریم میں مفقود ہے، اس کے باوجود انہوں نے قرآن کریم کو شعر اس بنابری قرار دیا کہ اس کے اسلوب اور آہنگ میں انہوں نے شعر سے زیادہ حلاوت اور تاثیر محسوس کی تھی، اور وہ بھجو رہے تھے کہ وزن اور قافیہ کی پابندی کے بغیر اس کلام میں شعری ذوق اور وجہان کے لئے وہ جمالیاتی لذت بدرجہ اتم موجو ہے، جو اوزان وقوافی کی جگڑ بندیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی،

قرآن کریم نے "متوازن صوتی آہنگ" کی یہ تاثیر پیدا کرنے کے لئے کونے نئے اصول کی رعایت رکھی ہے، اس بات کو بیان کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، کیونکہ مرد جبکہ الفاظ و مصطلحات اُس کیفیت کو ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتے جو قرآنی اسلوب میں روای دوال نظر آتی ہے، ہال جس شخص کو ادبی ذوق اور جمالیاتی جس کا کچھ حصہ ملا ہو وہ ہمارے مذکورہ بالابیان کی صداقت کو تلا دت قرآن کے دوران خود بخود محسوس کر سکتا ہے،

لہ یہ پوری بحث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محرث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الفوز الکبری" سے تشریحی اضافوں کے ساتھ ماخوذ ہے اس کی مزید تفصیل کیلئے اس کے پائیں فصل ۱۷ کامطالعہ کیا جائے،

(۲) علایم بلاغت نے اسلوب کی تین قسمیں دستار دی ہیں، خطابی، ادبی، علمی، ان تینوں قسموں کے دائرے الگ الگ ہیں، ہر ایک کی خصوصیات جو اور مواقع مختلف ہیں، اور ایک بھی عبارت میں ان تینوں اسالیب کو جمع کر دینا ممکن نہیں ہے، آپ جب تقریر کرتے ہیں تو آپ کا انداز اور ہوتا ہے، اور جب کوئی ادبی شرائحتے ہیں تو اس کا اسلوب بالکل جدا ہوتا ہے، اور جب کوئی علمی مقالہ لکھتے ہیں تو اس کا اسلوب کچھ اور خستیار کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان تینوں اسالیب کو ساتھ لے کر جلتا ہے، اس میں خطاب، کا زدزادب کی شکنگنی اور علم کی ممتاز ساختہ ساتھ چلتی ہے، اور کسی چیز میں کرنی کمی نہیں آنے پاتی،

(۳) قرآن کریم کے مخاطب الہ طردیہا تی بھی ہیں، پڑھنے لکھنے لوگ بھی اور اعلیٰ درجے کے علماء اور ماہرین فتوح بھی، لیکن اس کا ایک اسلوب بیک وقت ان تینوں طبقوں کو حداڑ کرتا ہے، ایک طرف آن پڑھاً آدمی کو اس میں سادہ حقائق ملتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ قرآن میرے ہی لئے اُترتا ہے، لیکن دوسری طرف علماء اور محققین جب اُسے گھری نظر سے پڑھتے ہیں تو انھیں دستار آن کریم میں علمی نکات نظر آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستاب علم و فن کی ایسی باریکیوں پر مشتمل ہے کہ معمولی واقفین کا آدمی انھیں سمجھے ہی نہیں سکتا۔

ایک عام آدمی کے ذہن کے پیش نظر قرآن کریم کا طریقہ استدلال بہت سادہ اور زیادہ تر مشاہدہ کی دلیلوں پر مبنی ہے، توحید، رسالت، آخرت، آفرینش، حیات، اور بُودباری جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس نے بالکل سامنے کی دلیلوں سے ثابت کیا ہے، اور مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کر کے وہ حقائق بیان فرمائے ہیں، جو آسانی کے ساتھ ایک ادنیٰ ذہنی معیار کے آدمی کی سمجھ میں آسکیں، لیکن انہی سادہ حقائق کی تہہ میں اُتر کر دیکھتے تو اس میں خالص عقلی اور منطقی دلائل بھی ملیں گے، جو فلسفیانہ موٹاگا فیوں کے ملیں کو بھی شفابخش ہستے ہیں، باقتوں باقتوں میں اس نے فلسفہ اور مائننس کے وہ دقیق مسائل بھی حل کر دیئے ہیں جن کی تحقیق کے لئے بڑے بڑے

فلسفی آخر تک پہنچ دتاب کھلتے رہے،

(۴) اگر ایک ہی بات کو بار بار دوسری بار آجاتے تو کہو والا ادب و انشاء میں خواہ تنا بلند پایہ مقام رکھتا ہو ایک مرحلے پر پہنچ کر سنتے والے اُکتا جاتے ہیں، کلام کا زور ٹوٹ جاتا ہے، اور اس کی تاثیر کم ہو جاتی ہے، لیکن قرآن کریم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہی بات بعض اوقات بسیروں مرتبہ کہی گئی ہے، ایک ہی دفعہ بار بار مذکور ہوا ہی، لیکن ہر مرتبہ نیا کیف، نئی لذت اور نئی تاثیر محسوس ہوتی ہے،

(۵) کلام کی شوکت اور اس کی نزدیکی و شیرینی و متن查ہ صفتیں یہی دلنوں کے لئے الگ اسلوب اختیار کرتا پڑتا ہے، ان دونوں صفتوں کو ایک عبارت میں جمع کر دینا انسانی قدرت سے باہر ہے، لیکن یہ صرف قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ اس میں یہ دونوں اوصاف بدر جمکمال یہجا پائے جاتے ہیں،

(۶) قرآن کریم نے بعض اُمن مصنایم میں بلا غلت کو ادیج کمال سک پہنچا کر دکھا ہے جن میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کر سکتا، مثلاً قانون و راثت کو لیجئے، یہ ایک ایسا خفک اور سنگلاخ موضوع، اور کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب و شاعر عمل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کر سکتے، لیکن اس کے بعد سورہ نسار میں یہ حکیم کرم اللہ مفتی آؤ لادی گھر الخ دالے روکوں کی تلاوت کیجئے، آپ بیساختہ پکارا ٹھیکن گے کہ یہ کوئی غیر معمولی کلام ہے، اس پورے روکوں میں قانون و راثت بیان کیا گیا ہے، لیکن اس حسن و جمال کے ساتھ کہ ایک ایک جملے پر ذوقِ سیلیم دجد کرتا ہے،

(۷) ہرشاعر اور ادیب کی فصاحت و بلا غلت کا ایک مخصوص میدان ہوتا ہے، جس سے ہست کر اس کا کلام پھیکا پڑ جاتا ہے، عربی میں امرؤ القیس نیسب و غزل کا امام ہے، تابغہ، خوف و ہمیت کے بیان میں، اعتشی، حسین طلب اور وصفت میں، اور زیر رغبت و امید میں بے نظر ہے، یہی حال ہرزبان کا ہے، لیکن قرآن کریم میں اس قدر مختلف الانواع مصنایم بیان کئے گئے ہیں کہ اُن کا احاطہ دشوار ہے،

لیکن ترغیب ہو یا ترہیب، وعد ہو یا دعیر، دعظہ نصیحت ہو یا امثال و قصص، عقائد کا بیان ہو یا احکام کا، ہر جگہ اس کا بیان بلا غلت کے اعلیٰ ترین معیار کو پہنچا ہوا ہے، (۸) اختصار اور ایجاد فترآن کریمؐ کے اسلوب کا امتیازی و صفت ہے، اور اس و صفت میں اس کا اعجاز نہایت نمایاں ہے، قرآن کریمؐ چونکہ قیامت تک کے ہر زمانے کی رہنمائی کے لئے آیا ہے، اس لئے اس نے مختصر جملوں میں وہ وسیع مضامیں سمیٹ دیتے ہیں کہ ہر دو اور ہر زمانے میں اس سے ہدایات حاصل کی جاسکتی ہیں، چودہ موسال گز جانے پر بھی اس کے مضامیں پڑنے نہیں ہوتے، اس عرصے میں انسانی زندگی نے کتنے پلٹے کھاتے، کیسے کیسے عظیم انقلابات روتا ہوتے، لیکن فترآن کریمؐ سدا بہارا ہا اور رہے گا، وہ تاریخ کی کتاب نہیں، مگر تاریخ کا مستند ترین مأخذ ہے، وہ سیاست و قانون کی کتاب نہیں، لیکن اس نے چند مختصر جملوں میں سیاست اور جہاں بانی کے وہ اصول بیان فرمادیتے ہیں، جو ہر ہتی دنیا کی انسانیت کی رہنمائی کریں گے، وہ فلسفہ اور سائنس کی کتاب نہیں، لیکن اس نے فلسفہ اور سائنس کے بہت سے عقدے کھوؤں دیتے ہیں، وہ معاشیات اور عمرانیات کی کتاب نہیں، لیکن دونوں موضوعات پر اس لے اختصار کے ساتھ ایسی جامع ہدایات دی ری ہیں کہ دنیا کے علوم و فنون سینکڑوں ٹھوکریں کھلنے کے بعد آج ان کے قریب پیچ رہے ہیں،

نظم کا اعجاز [فترآن کریمؐ کا ایک راقیق اعجاز اس کی آیات کے باہمی ربط و تعلق، تلاوت فرمائیں تو بظاہر یہ محسوس ہو گا کہ اس کی ہر آیت جدا مضمون کی حامل ہے، اور ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے، اسی وجہ سے نظم فترآن کے بارے میں مفسرین کے دو گروہ ہو گئے ہیں، بعض حضرات کا خیال یہ ہو کہ فترآن کریمؐ چونکہ تینیس سال میں تھوڑا اکھوڑا کر کے نازل ہوا ہے، اس لئے اس میں کوئی ربط و ترتیب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، اس کی ہر آیت ایک مستقل مضمون کی حامل ہے، اس کے برخلاف دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ فترآن کریمؐ ایک مکمل کتاب ہے، وہ شروع سے آخر

تک باہم مربوط ہی، اور اسی نقطہ نظر سے اس کا مطابعہ ضروری ہے، اس دوسرے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ کسی کتاب کا بے ربط ہونا اس کے نقش کی دلیل ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا کلام لازماً اس نقش سے بڑی ہے، مگر پہلا گروہ اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ جس طرح قدرتی مناظر میں کوئی ربط اور ترتیب نہیں ہوتی بلکہ ان کا حسن ہی اس بے ترتیبی میں ہوتا ہے کہ کہیں بُل کھاتا ہوا دریا ہے، کہیں ناہموار پہاڑ ہے، کہیں اچھی نیچی دادیاں ہیں، اسی طرح قرآن کریم کا حسن بھی اس کی اس مستقل حیثیت میں ہے، غزل کے ہر شعر کا موصوع جُدرا ہوتا ہے اور اس کو کوئی عیوب نہیں سمجھتا، بس ربانی تشبیہ اسی طرح قرآن کریم میں بھی یہے ترتیبی کوئی عیوب نہیں،

لیکن حقیقت یہ ہو کہ قدرت آن کریم کی آیات کے درمیان ہمایت لطیف ربط پایا جاتا ہے، اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ورنہ اگر کوئی ترتیب ملاحظہ ہوتی تو ترتیب تردد اور ترتیب کتابت میں فرق رکھنے کی چیز اس ضرورت نہ تھی، جس ترتیب سے قرآن کریم نازل ہوا تھا، اُسی ترتیب سے لکھ لیا جاتا، یہ جو کتابت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک الگ ترتیب قائم فرمائی وہ اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآنی آیات میں ربط موجود ہے، البتہ یہ ربط قدرتے دقيق ہوتا ہے، اور اس تک پہنچنے کے لئے بڑے خود و فکر کی ضرورت ہے،

اس ربط کو اتنا دقیق اور غامض رکھنے کی حکمت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے (والله) کہ ہر آیت کی ایک مستقل حیثیت باقی رہے، اور اس کے الفاظ کا عموم ختم نہ ہونے پاے تاکہ العبرۃ بعوم اللفظ پر عمل کرنا آسان ہو، اس کے علاوہ اُس زمانے میں اہل غز کے خطبات و قصائد کا اسلوب عموماً یہی ہوتا تھا کہ ان کے مضمایں مرتب اور مربوط ہو کے جائے مستقل حیثیت رکھتے تھے، لہذا یہ طریقہ اُس دور کے ادبی ذوق کے عین مطابق تھا، چنانچہ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے، قرآن کریم کی ہر آیت مستقل معلوم ہوگی، لیکن جب آپ ذرا غور کی نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ یہ پورا کلام مسلسل اور مربوط ہے،

اس طرح قرآن کریم نے پسند نظم میں جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ اس کا دقیق ترین اعجاز ہے، اور اس کی تقلید بشری طاقت سے بالکل باہر ہے، بہت سے علماء نے قرآن کریم کے نظم کی توضیح کے لئے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں کے ضمن میں اسے بیان کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے، اس معاملے میں امام فخر الدین ازیٰ کی تفسیر کبیر شاید سب سے زیادہ قابل تعریف کا درج ہے، انھیں اللہ نے نظر قرآن کی تشریح کا خاص سلیقہ اور خاص ترقیت عطا فرمائی ہے، ان کے بعد قاضی ابوالسعود رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نظر قرآن کی خصوصیات کو بیان فرمانے کا خاص اہتمام فرمایا ہے، بعد کے بیشتر مفسرین اس معاملے میں اہنی دو حضرات کے خوش چیزیں لکھیں، نظر قرآن کی ایک ہلکی سی جملہ اس مثال میں دیکھی جا سکتی ہے، سورہ رج مریں ایک جگہ ارشاد ہے:-

نَبِيٌّ عَبْدًا يَأْتِيَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ وَأَنَّ عَذَابَهُ

هُوَ الْعَدَابُ الْأَلِيمُ (ابجر: ۵۰ و ۲۹)

”میرے بندوں کو بخوبی دکھ میں غفور اور رحیم ہوں، اور میرا عذاب

(بھی) بڑا دردناک ہے“

اس کے فوراً بعد ارشاد ہے:-

وَتَبَتَّهُمْ عَنْ صَيْفِ إِبْرَاهِيمَ (ابجر: ۱۵)

اد را انھیں ابراہیمؑ کے جہاؤں کی خبر دے دو“

اور اس کے بعد فرشتوں کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آتے کام مشہور و قائم بیان کیا گیا ہے، بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا، لیکن ذرا غور کر دیکھئے تو وہ حقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پہلے جملے کی تائید ہے، اس لئے کہ جو فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آتے تھے، انھوں نے دو کام کئے، ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحق علیہ السلام جیسے صالح بھیٹے کی خوش بخوبی دی، دوسرا ہبھی فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستی پر

جاکر عذاب نازل کیا، پہلا کام ”آنَا أَنْفُوْرُ الرَّحِيْمُ“ کامظاہرہ تھا اور دوسرا کام ”عَذَابٌ هُوَ الْعَذَابُ أَبْلَى الْأَدْلِيْمُ“ کا، اس طرح یہ دونوں جملے باہم نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں لیکن الگ الگ دیکھنے تو ان کی مستقل حیثیت بھی ہے،

قرآن کریم کی پیشگی خبریں

یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب وہ کسی کو اپنا پیغمبر بنائے جاتا ہے، اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے تو لوگوں پر اس کا کلام اللہ ہوتا ثابت کرنے کے لئے اس میں آئندہ پیش کرنے والے واقعات کی کچھ پیشگی خبریں دی جاتی ہیں، اگرچہ پیشینگوں تیان جو میں کی طرف سے بھی کی جاتی ہیں، لیکن اوقل تو وہ یقینی نہیں ہوتیں، چنانچہ بڑے سے بڑا خوبی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی ہر پیشینگوں درست نکلی ہے، اور کبھی کوئی غلطی نہیں ہوتی، دوسرے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹے دعویٰ نہ کر سکتے کوئی پیشینگوں کرتا ہے تو اسے پورا نہیں ہونے دیا جاتا، قرآن کریم نے کلام اللہ ہونے کے ساتھ یہ میں یوں پیشگی خبریں دی ہیں، اور وہ سب کی سب بلا استثناء صحیح ثابت ہوتیں، جس کا انکار اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکا، یہاں ان تمام پیشگی خروں کو بالتفصیل بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن چند اہم خبریں مثال کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں :-

رومیوں کی فتح | جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد یک مسکونی میں شریفہ فرمی تھے اور مشرکین مکہ کی طرف سے آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی تھیں، مطہیک اُسی وقت دیتا کی دُو عظیم طاقتوں روم اور ایران کے درمیان شدید جنگ برپا تھی، اس جنگ میں ایرانی فوجیں مسلسل رومیوں پر غالب آئی جا رہی تھیں، لہ یہاں ہم نے اعجاز قرآن کی صرف چند اہم دجوہ بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے، مرید تفصیلات کے لئے دیکھئے ”باتیل سے قرآن تک“ از حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی را نوی مرتبہ احقرص، ۳۵، نیز علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی ج کار سالہ اعجائز قرآن۔

رومیوں کے پاؤں ہر جگہ سے اکٹھ رہے تھے، اور ایرانی شکر شام کے بڑے بڑے شہروں کو ساخت و تاریخ کرتا ہوا طوفانی رفتار سے بڑھ رہا تھا، اور دمی حکومت پے درپے ناکامیوں، متوالی شکست اور جان و مال کے بے پناہ نقصان کے باعث اس قدر ندھمال ہو چکی تھی، کہ اس کا کسی مقام پر قدیم جمانا، ہی مشکل تھا، یہ جائیدادہ پیٹ کر کوئی حل کر سکے، صبورت حال کفارِ عرب کے لئے باعثِ هستہ تھی، یکونکہ وہ ایران کو آتش پرست ہونے کی بنابرائے مشایہ اور روم کو ابیں کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مشاہد سمجھتے تھے اور ایرانیوں کا غلبہ ان کے نزدیک اپنی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا شکون تھا، ان حالات میں سورہ روم کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں،

الْمَهْلَةُ غُلَبَتِ الرَّوْمُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ حَتَّى وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلْبِهِمْ
سَيَغْلِبُونَ كُلُّ فِي بِضْعِ سِينِينَ إِنَّهُ الْأَكْمَرُ مِنْ قَبْلِهِ وَمِنْ بَعْدِهِ
وَيَوْمَ يَعْذِنُ يَقْصَدُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرٍ إِنَّهُ يَعْصِمُ مَنْ يَشَاءُ مِنَ
هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ وَعَنِ اللَّهِ لَا يَعْلَمُ أَنَّهُ وَعَلَهُ وَلَكُنَّ
أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الروم : ۴-۱)

الف، لام، ميم، روم (ولے) قریب ترین زمین (یعنی اردن) میں مغلوب ہو گئے، اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں میں غالب آجائیں گے، اشہدی کے ہاتھ میں ہے کام پہلے بھی اور بعد بھی، اور اس روز مسلمان الشکر مدد کی وجہ سے خوش ہوں گے، اشہدی کی چاہت ہے مدد کرتا ہے، اور وہ زبرد اور جہر بان ہے، یہ اللہ کا وعدہ ہے، اور اللہ پنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۷۸

جو لوگ روم اور ایران کے جنگی حالات سے باخبر تھے ان کیلوں یہ پیشینگوئی قطعی طور پر ناقابل یقین تھی، چنانچہ قریش کے ایک متاز سردار ابی بن خلف نے حضرت ابو جہر رضی اللہ عنہ سے شرط لکائی کہ اگر تین سال کے دوران رومی غالب آئے تو میں تمہیں دس اونٹوں گا، اور اگر غالب نہ آئے تو تم مجھے دس اونٹ دو گے، اُس وقت اس طرح کی

شرط جائز تھی، اس لئے حضرت ابو بکرؓ نے اُسے منظور فرمایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع کی، آپؐ نے فرمایا کہ قرآن نے "بعض سنین" (چند سالوں میں) فرمایا ہے، اور عربی میں لفظ "بعض" رچنڈ کا اطلاق تین سے لے کر تو سال تک ہوتا ہے اس لہذا تم ابی بن خلف سے اونٹوں کی تعداد بڑھا کر شرط کی مدت تو سال تک مفترکر لو، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ابی بن خلف سے تو سال کی مدت مقرر کر کے توازنٹوں کی شرط لگالی، آگرچہ اس پیشینگوئی کے وقت اسکے دو کر ہونیکوئی کوئی آنمارہ تھی، بلکہ اسکے بعد بھی ایرانی افواج آگئے ہی بڑھتی چلی گئیں یہاں تک کہ رومیوں کے دارالحکومت قسطنطینیہ کی دیواروں تک جا پہنچیں، مشہور موڑخ ایڈ و ڈگبین اس پیشینگوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اُسوقت جبکہ پیشینگوئی کیگئی، کوئی بھی پیشگی خراحتی بعد از قیاس نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہر قل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمه کا اعلان کر ہو تھے ॥

رسقوط زدال سلطنت روشن، ج ۵ ص ۴۳ و ۴۲
لیکن اپنی پہلی شکست کے ٹھیک شات سال بعد قیصر روم بالکل خلاف توقع قسطنطینیہ سے باہر بکھلا اور اسکی فوجوں نے ایرانیوں پر پے در پے حملہ کر کے ہمیں متعدد مقامات پر شکست فاش دئی اور اس کے بعد رومی شکر پر جگہ غالباً ہی آتا چلا گیا،

اوہ راس عوصر میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھرت کر کے مدینہ طیبہ جا چکی تھی اور کفارِ مکہ کے ساتھ ان کی جنگی شروع ہو گئی تھیں، اور جس وقت بدتر کے میدان میں تین آسموں نہتھے مسلمان ایک بڑا مسلح سورا ماریں کامنہ پھیر رہے تھے ٹھیک اُسی وقت یہ خبر ملی کہ رومیوں نے اہل ایران کو شکست دی دی ہے، اُس وقت یہ واضح ہوا کہ قرآن کریم نے رومیوں کی فتح کی خبر دینے کے ساتھ جو فرمایا تھا کہ *يَوْمَئِنْ يَقْرَأُهُ الْمُؤْمِنُونَ* پیغمبرِ اللہ رہی راس روز مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے، اس سے مسلمانوں کی دھری خوشی کی طرف اشارہ تھا، ایک رومیوں کی فتح کی اور دوسری بدتر کے میدان میں خود اپنی فتح کی، فتح مکہ کی خبر جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ قیام کے بعد مدینہ طیبہ کے راستے پر حجۃ کے قریب پہنچے تو رہاں سے مگہ مُکرمہ جانیوالی

سترک نظر آئی، اور طبعی طور سے آپ کو وطن کی یاد آئی، اور اُسے مستقلًا چھوڑ دینے کے خیال سے
افسوں ہوا، اس موقع پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ۔

إِنَّ الْجِنَّىٰ فَرَحُوا عَلَيْكُمُ الْفُرْقَانَ لَرَأَوْا لَهُ إِلَىٰ مَعَادٍ ،

بلاشبود جس ذات نے قرآن رکے احکام، آپ پر فرض کئے ہیں وہ آپ کو

دوبارہ لوٹاتے گا؟

اُس وقت آپ جس بے سرو سماںی کے عالم میں مکمل مکہرد سے نکلے تھے اُس کے پیش نظر ظاہری اعتبار سے اس پیشینگوئی کے پورا ہولے کی کوئی ترقع نہ تھی، لیکن چند ہی سال بعد آپ اسی شہر مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے اور یہ پیشینگوئی پوری ہو کر بھی یہودیوں کی تمنا سے **موت** تھے کہ آخرت کی نلاح دکامیابی صرف یہودیوں کا کرتا ہے، اور یہم ضرور جنت میں جائیں گے، اس کے جواب میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:-

قُلْ إِنَّ كَانَتْ لِكُمُ الْدَّارُ الْأَخْرَىٰ فَعَمَّنْ أَنْذَلَهُ خَالِصَةً هُنَّ

دُونُنِ النَّاسِ فَتَمَنُوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ هَوَنُ

يَتَمَنُوا مَا بَدَأَ إِيمَانَكُمْ مَتَّ أَيْمَانِكُمْ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْمٌ بِالظَّالِمِينَ هَ

آپ فرمادیجئے کہ رائے یہودیوں! اگر اللہ کے پاس صرف تھا کے لئے خاص

طور پر دارالا خرت ہی، دوسروں کے لئے نہیں تو تم موت کی تمنا کر د، اگر تم سچے

ہو، اور یہ لوگ اپنے کرتوت کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کر سیں گے، اور اللہ تعالیٰ

ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

یہ چیلنج اور یہ پیشینگوئی مدیریہ طیبہ کے اس ماحول میں کی جا رہی ہے جہاں یہودیوں کی بستیاں کی بستیاں آباد ہیں، اور مسلمانوں کو دن رات ان سے بحث و مناظرہ کا اتفاق پیش آتا رہتا ہے، اگر یہ چیلنج بذریعہ دھی نہ دیا گیا ہوتا تو جو یہودی آپ کی تکذیب

کا کوئی موقع فرگزداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ بڑی آسانی سے علی الاعلان موت کی
تمناکر کے دکھائی تھے، اور اس طرح جو مناظرے شب و روز جاری تھے ان کا فیصلہ ایک
ہی لمجھ میں ہو سکتا تھا، لیکن اس آیت کے تزویل کے بعد یہودیوں کو سائب سونگھہ گیا،
اور کوئی ایک منتفس بھی اس جیلخ کو قبول کرنے کے لئے آگئے نہیں بڑھا،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و درسات کے باعث میں غیر مسلموں کا نظر یہ
خواہ کچھ ہو، لیکن اس بات سے اپ کے کسی دمُن نے بھی انکار نہیں کیا اک آپ پر عقل د
حکمت تدبر اور فہم و فراست کے اعتبار سے بلند ترین مقام کے حامل تھے، اب یہ بات
ایک محظی سمجھو کر انسان سے بھی متوUCH ہیں کہ وہ پڑے یقین د اعتماد کے بغیر ایک ایسا
چیلنج یا الیسی پیشیگری کر گزرے جسے اس کے مخالفین ایک لمجھ میں توڑ سکتے ہوں، رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عاقل، حکیم اور مدبر کی طرف سے یہ جیلخ دھی اہمی کی رہنمائی
کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا،

قرآن کریم کی حفاظت [اقرآن کریم سے پہلے جو آسانی کتابیں مختلف انبیاء علیہم السلام
پر نازل ہوئیں ان کی حفاظت کا کوئی وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف
سے نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہ سکیں، مسلمانوں کا تو خیر
عقیدہ ہے ہی کہ آج جن کتابوں کو تورات، زبور یا انجیل کے نام دیتے جلتے ہیں وہ ہرگز
بعینہ وہ کتابیں نہیں ہیں جو آسان سے اُتری ہیں، بلکہ ان میں بہت کچھ تحریف و ترمیم
ہو چکی ہے، لیکن خود اہل کتاب بھی اس حقیقت کے اعتراض پر مجبور ہیں، اور کوئی کہتے
کہ یہودی یا یوسفی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں میں ہر ہر لفظ اہمی ہے اور
ان میں کہیں کوئی غلطی یا تبديلی نہیں ہوئی، اس کے برخلاف قرآن کریم نے اپنے باعثے
میں یہ پیشگی خبر دیدی تھی کہ:-

لہ اس کے مفصل اور ناقابل انکار دلائل کے لئے ملاحظہ ہو ”باتبل سے فترآن تک“
مصنفہ مولانا حرجت اللہ صاحب کیروی، در ترتیب احر،

إِنَّا نَحْنُ نَرَأُنَا الَّذِي كَرَّرْنَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعَفِّظُونَ۔

تمہرے ہی اس فرقہ کو اتنا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ॥

چنانچہ یہ دعا ہر حرف صحیح ثابت ہوا، اور چودہ سو سال کے اس طویل عرصے میں قرآن کریم کا کوئی نقطہ یا کوئی شو شہ تک نہ ضائع ہو سکا، اور نہ اس میں تحریف و ترمیم کی کوئی کوشش کامیاب ہو سکی، اسلام ہمیشہ مخالفوں کے نرغہ میں رہا ہے، اور اس کے دشمنوں نے اسے مغلوب کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا، نہیں رکھی، لیکن کوئی دشمن قرآن کریم کو اس دور میں بھی مٹانے اضائے کرنے یا بدلتے میں کامیاب نہیں ہو سکا جبکہ قرآن کریم کے نسخے ہنایت محدود تھے، اور نشوشا ناشاعت کے وسائل نایاب، تورات کو دیکھتے کہ کس طرح باہل کا بادشاہ بخت نصر اٹھتا ہے، اور بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تو اسے حضرت عزیز علیہ السلام کے کسی شخص کو تورات یاد نہیں تھی، اس نے تمام نسخے ضائع ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنے حافظے سے اُسے دوبارہ لکھوا یا، پھر روم کا بادشاہ اینیتوکس ایپی فائیس () اٹھتا ہے، اور نزود بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تورات کا ایک ایک نسخہ پھاڑ کر جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ کوئی نسخہ باقی نہیں رہتا۔

اسی طرح اجنبی کو دیکھئے کہ کس طرح طیطوس رومی، شاہ نیردن، دو ڈیشین اور ڈیو ڈیشین کے حملوں میں اس کے اصل نسخہ نا بود ہو جاتے ہیں، لیکن قرآن کریم کا حال یہ ہے کہ اس کا سینکڑوں حملہ آوروں سے سابقہ پڑتا ہے، بہت سے مواقع پر مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہے، اُن کے کتب خانے جلاتے جلتے ہیں، قدیم کتابوں کے

لہ دیکھئے انسائیکلو پیڈیا بریانی کا، ص ۱۰۰ ج ۳ مطبوعہ ۱۹۵۷ء مقالہ: بائبل، بحث ہمہ قدیم، فرست مسلسل، بحوالہ السید ریس دوم ۱۹۱۳ء، ۲۸۱ تا ۱۹۱۳ء، لہ دیکھئے بائبل، ناکس در گز میکلن، لندن ۱۹۶۳ء، مکا بیوں کی پہلی کتاب ۱: ۵۹،

بڑے بڑے ذخیرے دریا میں بہادتے ہے جاتے ہیں، قرآن کریم کا سیلاب عظیم پرے عالم اسلام پر ٹھیک ہے اور فتنہ آن کریم کی تحریت کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، لیکن یہ کتاب مبین اللہ کے وعدے کے مطابق کرسی ادنیٰ تغیر کے بغیر صرف محفوظ رہتی ہے بلکہ مشرق و مغرب میں اس کی نشر داشاعت کر فتار ہوتی ہی بیچلی جاتی ہے، آج بھی اگر بالغز نہ لاخواستہ، قرآن کریم کے تمام محتویات نسخہ ناپید ہو جائیں تو لاکھوں فرزندوں توحید کے سینے اس کے پچھے امامت دار ہیں، اور اگر کوئی شخص فتنہ آن کریم کا ایک لفڑا بھی تبدیل کرنا چاہے تو مسلمانوں کے کم سن پچھے بھی اسے پھر طے سکتے ہیں،

پھر فتنہ آن کریم کے سرف الفاظ ہی نہیں، بلکہ معانی کی حفاظت کا جو انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے وہ بجا نے خود ایک مستقبل تایخ ہے، مثلاً مردِ را یام سے ہر زبان کے انفاذ میں معانی کے اعتبار سے فرق راقع ہوتا رہتا ہے، چنانچہ عبرانی، مسیحیانی، اور علداری زبانیں جن میں کچھی آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں، رفتہ رفتہ دنیا م پسید ہو گئیں، یا ان میں ایسا عظیم تغیر واقع ہو گیا کہ وہ بالکل نئی زبانیں بن گئیں، لیکن فتنہ آن کی زبان کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا ہے کہ وہ ہزار ہزار تغیرات اور انقلابات کے باوجود پوری طرح محفوظ ہیں، اور اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ قرآن کریم کا فلاں لفظ اس دور میں کس معنی میں استعمال ہوتا تھا تو وہ نہایت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے،

عربی زبان کو کس غیر معمولی طریقے پر محفوظ رکھا گیا ہے؟ اس کا ایک معمولی سائز اور اس واقعیت سے ہرگز کہیں کے شہر زرائب کے اوپر عکاد نامی در پہاڑ تھے، ان پہاڑوں کے رہنے والوں نے یہ عہد کیا: ہذا تھا کہ وہ اپنی بستی کے باہر کسی بھی شخص سے نہ شادی بیا کا تع伦 قائم کریں گے، نہ دوستی کا، اور نہ خود کہیں باہر جائیں گے، یہاں تک کہ باہر کا کوئی آدمی ان کے یہاں تین دن سے زیادہ قیام بھی نہیں کر سکتا تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر باہر کے لوگوں سے ہمارا میل بزل بڑا تو ہماری عربی زبان بگمرا جائے گی، یہ لوگ اپنے ان اصولوں پر سختی سے عمل پیرا رہے، اور مذکورین نے لکھا ہے

گیر وہ واحد گرد ہے جس کی عربی زبان پھیٹھے زمانہ جاہلیت کی زبان ہے، اور اس میں پر مُو
فرق نہیں آیا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم نے جو دعہ فرمایا تھا کہ اسکی کتاب ہمیشہ محفوظ رہے گی،
اور خود اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرے گا، اس کی صداقت روز بروز روشن ہوتی چلی
جاتی ہے، اور یہ پیشگی خرسونی سد درست ثابت ہوتی ہے،
یہاں قرآن کریم کی تمام پیشگی خرون کا استیعاب کرنا ہیں، بلکہ صرف چند مثالیں
پیش کرنا مقصود تھا، اور ان چند مثالوں ہی سے یہ ہات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے
کہ قرآن کریم نے جو پیشگی نہیں دی تھیں وہ ایسے مجرماں طریقہ پر پوری ہوتی ہیں
جس میں کسی انسانی کوشش کا کوئی دخل نہیں،

قرآن کریم کے انکشافات

پیشگی خرون کے علاوہ قرآن کریم نے بہت سے ایسے علمی اور تاریخی حقائق کی نشاندہی
فرمائی ہے جو اس زمانے میں بنصرت یہ کذا معلوم تھے، بلکہ اس دقت آن کا تصوّر بھی
نہیں کیا جا سکتا تھا، قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کو جمع کر کے اگر ان کی مفصل تفسیر
بیان کی جائے تو بلاشبہ ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، یہاں آن سب آیات کا
استیعاب تو ممکن نہیں، البته چند مختصر مثالیں درج ذیل ہیں:-

(۱) قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جس وقت فرعون دریا میں غرق ہونے لگا، تو
اس نے جان بچانے کے لئے زبانی طور پر ایمان لانے کا اقرار کیا، جس کے جواب میں باریع
نے فرمایا:-

الآن وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝
قَاتِلُومُ نُتَعَذِّيَّكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِيَمَنْ خَلْفَكَ أَيَّةً، ریونس: ۹۱، ۹۲، ۹۳: ۱۲۳

لہ مجھم السبدان لیا قوت الحموی، ص ۱۲۳ اج ۱۲، جلد ۱۲، دار صادر بریڈت لسٹ ۱۳۴

مادہ "عکران" و تاج العروس، للزبیدی، مادہ "علۃ"۔

”اب را بان لاتا ہے؟) حالانکہ پہلے نافرمانی کرتا رہا اور فساد مچانے والوں سے تھا، پس آج ہم تیرے بدین کو سمجھاتے دیں مگر، ناکر تو اپنے بعد رواں کے لئے عربت بن جلتے“

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اُس وقت اور اس کے بعد بھی صدیوں تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ فرعون کی لاش اب تک صحیح سلامت موجود ہے، لیعن اب سے کچھ عرصہ پہلے یہ لاش دریافت ہوئی، اور آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے،
 ۲) قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَنَكُمْ
 تَذَكَّرُ مِنْ وُنَّهُ

”اور ہم نے ایک جز کے رو جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم
 نسیحت حاصل کرو،

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اُس وقت عالم تصور یہ تھا کہ نژاد رمادہ کے جوڑے صرف انسانوں یا جانوروں میں ہوتے ہیں، یا پھر جنڈ نباتات میں، لیکن سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ نظر آئی حقیقت واضح ہوئی جا رہی ہے کہ نژاد رمادہ ہر جیزوں میں موجود ہیں، یہ اور بات ہو کہ کہیں ان جوڑوں کا نام نژاد رمادہ رکھ لیا جائے، کہیں مشتبہ تر Positive (او منفی) (او منفی) Negative (او کہیں الیکٹرون اور پوزیٹرون اور کہیں نیٹرون اور پوزیٹرون، بلکہ ایک آیت میں قرآن کریم نے صراحتی یہ بھی واضح فرمادیا کہ بہت چیزوں میں جوڑوں کا پایا جانا ابھی لوگوں کو معلوم نہیں،

مُسْبَحَانَ اللَّهِيْ خَلَقَ الْأَنْوَارَ وَاجْكَلَهَا هِمَّا شَاءَتْ
 الْأَنْوَارُ وَمِنْ أَنْقَيْهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ

”پاک، ہر وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا، نباتات زمیں کے قبیل سے بھی اور ان آدمیوں سے اور ان چیزوں میں مگر بھی جیسیں یہ لوگ نہیں جانتے“

حَقَائِقُ قُرْآنٍ وَمَغْرِبَ كَعَبَ مُصْتَفِينَ

ایک زمانہ تھا جب مغربی مصنفین عیسائیت کے شدید تعصب میں مبتلا ہو کر کھلم کھلایہ کہا کرتے تھے کہ قرآنِ کریم (معاذ اللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانی بوجی تصنیف ہے، اور رمعاذ اللہ، آپ کا درخواست نبوت خود ساختہ تھا، لیکن اب خود مغرب کے غیر مسلم مصنفین کا کہنا یہ ہے کہ پچھلے اہل مغرب کا یہ لفڑی محسن ایک معاشرانہ خوبی تھا جس کی پشت پر کرنی دلیل نہیں تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اس کی تکذیب کرتی ہے، چند حاضر کے معروف مستشرق پر فیض منگلی و آٹھ لکھتے ہیں :-

”قرون و سلطی کے یورپ میں یہ تصور عام کیا کیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ایک (معاذ اللہ) جھوٹے سفیر تھے، جو غلط طور پر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھی آتی ہے، لیکن قرون و سلطی کے یہ تصورات جو در جنگی پر دیگنڈے کی حیثیت رکھتے تھے، اب آہستہ آہستہ یورپ اور عیسائی دنیا کے ذہنوں سے اگر بھے ہیں یہ۔“

پروفیسر داٹنے بالکل درست کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تکذیب کسی علی دلیل پر مبنی نہیں تھی، بلکہ یہ اس پر دیگنڈے کا ایک بجز تھا، جسے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے ضروری بھا جا رہا تھا، انھوں نے خاصی تفصیل کے ساتھ ان قدیم اہل یورپ کی تردید کی ہے جو آنحضرت سے اللہ علیہ وسلم پر (معاذ اللہ) جھوٹے دعوے یا جنون یا کسی بیماری کا الزام عائد کرتے تھے، اور بتایا ہے کہ چند حاضر کے مغربی اسکال روشن دلائل کی وجہ سے ان الزامات کو تسلیم نہیں کرتے، آخر میں دہ لکھتے ہیں :-

”ہنزا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں قرون و سلطی کے اس تصور کو تو

لبخاچ از بخش قرآن دیده بیتا پاہتے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک ایسا انسٹا
سی محضنا چاہئے جو پورے خلوس اور تیک نیتی سے وہ بیعتات مٹاتے تھے جن کے
پائیے میں ان کا عقیدہ تھا کہ اُنکے پاس خدا کی طرف سے آتے ہیں ۱۰

اس اعراض کے بعد انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ صفات الفاظ میں سرکار در عالم
صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت رسالت کا اقرار کر دیا جانا، لیکن صدیوں سے ذہنوں میں جیسے ہوئے
تصورات آسانی سے نہیں ہوتے، چنانچہ منظہمی راث اور ان کی طرح کے عہدی خاص کے وکرے
معتنفین ایک طرف تویر اعتراف کرتے ہیں کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پنے دعواتے
نبوت میں مخلص تھے، دوسرا طرف پنے مذہب و علی الاعلان چھوڑ رہا اسلام کو اختیار
کر لینا آن کے لئے مشکل ہے، لہذا انہوں نے ایک بیچ کی راہ تلاش کرنے کے لئے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے دعواتے نبوت کی ایک عجیب غریب توجیہ پیش کی ہے،
اُن کا ہمسایہ کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی دھی درحقیقت کوئی
خارجی چیز نہیں، بلکہ (معاذ اللہ) یہ ایک اندر دنی کیفیت تھی جو آپ کے طویل غور و تکر
اور مشاہرات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی، اور جسے آپ نے پوری دیانتاری اللہ تعالیٰ
کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھا، آپ اپنی عمر کے ابتدائی دوسری سے اپنی قوم کے مذہب
اور ان کے طوڑ طریقوں سے بیزار تھے، اسی لئے آپ اُن کے طرز عبادت کی تقليید کرنے
کے بجائے تہنمائی میں خورد فکر فرماتے تھے، آپ کا رال اپنی قوم کی گمراہیوں پر کڑھتا تھا
اور آپ اُن کو اس گمراہی سے نکالنے کے طریقے سوچتے تھے، اسی مقصد کے لئے آپ نے
غائر حرام کی تہنمائیوں میں کئی کئی دن گزارنے شروع کئے، دہن پر طویل خورد فکر کے
نتیجے میں عقیدہ توحید آپ کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا، اور ساتھی یہ داعیہ بھی کہ اس
قوم کو سوت پرستی کی گمراہی سے بکال کر توحید کی طرف دعوت دینی چاہئے، غائر حرام کی
اُن تہنمائیوں میں جہاں کوئی بات کرنے والا نہیں تھا، یہ تصور آپ کے دل و دماغ پر

اس ذر محیط ہو گیا کہ آپ کو اپنے دل کی یہ آواز ایک خارجی آواز محسوس ہونے لگی، اور اسے آپ نے اللہ تعالیٰ کی یا کسی فرشتے کی آواز سمجھ کر پورے خلوص دریافت سے بیوت کا دعویٰ کر دیا،

یہ ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے بیوت کی وہ توجیہ جسے آجھل "رانشورِ مغرب" میں قبول عام حاصل ہے، مستشرقین میں سے ایک دونہیں، بلکہ بیسیوں "میقین" اس کے قائل ہیں، یہاں تک کہ بعض مسلمان کھلانے والے افراد بھی اس سے متأثر نظر آتے ہیں، لیکن ذرا غور فرمائیے کہ اس توجیہ کے پیچے اس کے سوا اُو کیا ذہنیت کا رقبہ ہے کہ ان "رانشوروں" نے یہ بات پہلے ہی طے کر لی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوت کی تصدیق اُن کے لئے ممکن نہیں، خواہ اُس پر کتنے روشن دلائل قائم ہو جائیں، اور خواہ اس بیوت کی تردید کے لئے کتنی دراز کار، ناقابلِ فهم اور ناقابلِ یقین تاریخ کراختیار کرنا پڑے، واقعیت ہر کو کہ پروفیسرِ آٹ اور عصر حاضر کے دوسرے مستشرقین آپ پر نازل ہونے والی دھی کی جو توجیہ کرتے ہیں اس کا کوئی علی ادرا عقلی جواب دیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، تاہم مندرجہ ذیل حقائق پر غور فرمائیے۔ ۱)

(۱) کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اجن کے پارے میں خود اُن کا اعتراف یہ ہے کہ ہبھری ذہنی اور عملی صلاحیتوں سے مالا مال تینیس سال تک مسلسل اپنی ایک اندر دنی کیفیت کو کسی فرشتے کی آواز سمجھتے رہیں اور آخر وقت تک یہ پتہ نہ لگا سکیں کہ اس غیر معمولی گینیت کی حقیقت کیا ہے، دھی کا نزول آپ پر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ تینیس سال تک سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں مرتبہ ہوتا رہا ہے، کیا اس پورے عرصہ میں رمعاذا اللہ آپ اسی مغالطے میں مبتلا رہے؟

(۲) پھر اگر آپ پر یہ نامہ "اندر دنی کیفیت" اپنی قوم کو دیکھ کر طاری ہوتی تھی، تو قادرے کا تقاضا یہ تھا کہ اس کیفیت کے سب سے پہلے تحریکے میں انکی مگر ایسوں

کی تردید اور عقیدہ توحید کا بیان ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی دھی میں نہ کفر و شرک کی تردید ہے، نہ عقیدہ توحید کا ذکر ہے، اور نہ آپ کی بنیادی تعلیمات میں سے کسی تعلیم کا بیان ہے، اس کے بجائے اُس کے الفاظیہ ہیں:-

إِقْرَأْ إِيمَانَهُ تِبَّاعَ الَّذِي خَلَقَهُ خَلْقُ الْإِنْسَانَ وَنَّ
عَلَقَهُ إِقْرَأْ وَرَبَّكَ الْأَكْثَرُ مِنَ الْمُنْدَى عَلَمَ بِالْقُلُمِ
عَلَمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العنان : ۳۱)

”بڑھ صوپنے پر دردگار کا نام لے کر جس نے تمہیں پیدا کیا، انسان کو دم بستہ سے پیدا کیا، پڑھو اور محاراب پر دردگار کریم ترین ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکایا، انسان کو اُن باتوں کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا“

۱۔ پھر یہ خوبی بات ہو کر یہ کیفیت ”ایک مرتبہ پیش آنے کے بعد فوراً شہنشہ یا پڑھنے“ ہے، اور تین سال تک آپ کو کوئی آواز سنانا نہیں رہتی، اس عرصے میں آپ دھی کے انقطاع سے پر ایشان بھی رہتے ہیں، لیکن تین سال تک مکمل سکرت طاری رہتا ہے، اس کے بعد پھر دھی نازل ہوتی ہے تو اس میں بھی شرک کی واضح تردید نہیں کی جاتی اور نہ اصل عرب کی علی مگرا ہیوں کا کوئی ذکر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کیفیت آپ پر اپنی قوم کی مگرا ہیوں پر سوچ بچا اور تصویر توحید کے غلبہ سے پیدا ہوئی تھی، تو دھی کے بالکل ابتدائی راتعات میں یہ تصویرات کہاں گئے تھے؟ اور تین سال تک ان تصویرات کے غلبے نے کوئی آواز کیوں نہیں سنائی؟

۲۔ اگر یہ کوئی ”اندر دنی کیفیت“ تھی تو پری طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے تھا، لیکن قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر آپ کے ذاتی خیالات کے خلاف ہداستیں دی گئیں، بلکہ بعض مقامات پر آپ کی ذاتی رائے کی تردید اور اس پر ایک لطیف عتاب بھی موجود ہے، مثلاً لیسَ لَكُمْ مِنَ الْأَمْرِ
شَيْءٌ أَوْ بَيْوْبَتْ عَلَيْهِمْ أَوْ لِعْنَةَ هَمْمٌ (آل عمران: ۱۲۸) اور مکان لیسی آن یا کوئی

لَهُ أَسْمٌ إِنْ تَحْتَ الْأَرْضَ^۱ فِي الْأَرْضِ^۲ وَلَا يَعْلَمُ^۳ مَنْ لَمْ يَذْكُرْ^۴ لَهُمْ حَتّیٌ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَعَلَمَ الَّذِينَ^۵ بَيْنَ (التوتة: ۶۷) اور عَفَانِ اللّٰهِ عَنْ لِقَاءِ مَآذِنَتْ (۶) کلمہ مکمل ہے جس کا معنی ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص میں اپنے نام کا ذمہ دار نہ ہو تو اس کی صورت کا شدید غلبہ انسان کو ایک خارجی آواز کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہو کہ یہ "خارجی آواز" جو پیشینگوئی کرنے والے سمجھتے ہیں نکلے، جو حکم دیتے وہ انجام کا درست ثابت ہو، جو الفاظ بول دے وہ ایسے پتھر کی لکیر بن جائیں کہ دنیا بھر کے ادیب و خطیب اس کے مقابلے سے عاجز ہو کر بیٹھ جائیں، یہاں تک کہ اسی کلام کی بنیاد پر پولے جزیرہ عرب میں ایسا انقلاب عظیم برپا ہو جائے جس کی نظر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے،

(۷) اگر تسلیم کر دیا جاتے کہ تصویرات کے غلے سے محسوس ہونے والی آواز کوئی حقیقت رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اسی شخص کے علم و تصویر کا ایک عکس ہو سکتی ہو جسے وہ سنائی دے رہی ہے، اور جو بات پہلے سے اس کے علم و تصویر میں نہ ہو وہ اس آواز سے معلوم نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن کریم کی تلاوت کر کے دیکھئے اس میں کتنی بے شمار باتیں ایسی ہیں جو دھی سے پہلے آپ کو معلوم نہیں تھیں، وحی کے اس کلام نے پہلی بار آپ کو ان کا علم عطا کیا، مثلاً آئیت ذیل پر غور فرمائیے:-

مَا كَنْتَ تَنْرِي مَا الْكَثِيفُ وَلَا الْأَيْمَانُ وَلَا الْيَمَنُ

جَعْلَنَّهُ تُورَّاً هَفْدَنِي دِه مَنْ نَشَاءُ مِنْ نَشَاءُ مِنْ عِيَادَ كَارِشُورِيٰ^۱

"آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے؟ اور نہ ایمان سے واقع

تھے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو روشنی بنا لایا جس کے ذریعے ہم اپنے

بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں بنا دیتے ہیں" ۲

(۸) بالخصوص بچپنی امتوں کے اکثر اتفاقات وہ ہیں جن کے بالے میں خود قرآن کریم نے بھی تصریح کی ہے، اور تاریخی اعتبار سے بھی یہ امنا قابل انکار ہے کہ آپ نے زندگی سے قبل اُن سے واقع نہیں تھے، قرآن کریم نے پہلی بار آپ کو ان کا علم عطا کیا، مثلاً سورہ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کا داقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کریم کا

ارشاد ہے :-

تَلَاقٌ مِّنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ لَوْجِيَّهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْمَلُهَا
آتَتْ وَلَا تَقُولُكَ مِنْ كُنْبِلْ هَذَا (ہود: ۳۹)

”یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم آپ کی طرف بذریعہ وحی نازل کرتے ہیں، ان خبروں کو نہ آپ اس سے پہلے جانتے۔ تھے اور نہ آپ کی قوم“

اور سورہ یوسف کے آخر میں ارشاد ہے :-

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ لَوْجِيَّهَا إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ
كُنْتَ يَهْيَهُ إِذْ أَجْتَمَعُوا أَمْرُهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ۝

(یوسف: ۱۰۲)

”یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم بذریعہ وحی آپ پر نازل کرتے ہیں، اور جس وقت یہ لوگ اپنے معاشرے میں متفق ہو رہے تھے، اور تمہیں

کر رہے تھے، اُس وقت آپ ان کے پاس نہیں تھے“

منظگری و اداث اور اُن کے دوسرے ہم نوایا بات تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور :-

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دیانت و اخلاق پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا ۴۷“

لہذا قرآن کریم کی کسی آیت میں ان کے نزدیک بھی غلط بیانِ مکہن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ ”وحی“ کوئی خارجی ذریعہ علم نہیں تھا تو اس کے ذریعے آپ کو کچھ پہلے انبیاء، علیہم السلام کے دہ و اقدامات کیسے معلوم ہو گئے جو پہلے معلوم نہیں تھے؟ (۸) اد پر ہم نے صرف دہ باتیں پیش کی ہیں جو ایک عام آدمی بھی معمولی غور فکر سے سمجھ سکتا ہے اور جو قرآن کریم کی سرسری تلاوت سے بھی واضح ہو جاتی ہیں،

اور اگر حدیث کی ان روایات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں نزولِ دحی کی کیفیات اور اس کے ابتدائی واقعات بیان کئے گئے ہیں تو مندرجہ آواٹ وغیرہ کی یہ نہیں ای تلویث خود بخود پارہ جاتی ہیں، ان میں سے کچھ روایات چیزیں ”ما بیخ نزول قرآن“ کے تحت بیان ہو چکی ہیں،

آنحضرت کی اللہ علیہ وسلم اور اصل کتاب؛

بعض مغربی مصنفین نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپ پر نازل ہونے والی ”دحی“ درحقیقت آپ ہی کی ایک ”اندر دنی کیفیت“ تھی، جو تصورات کے غلبے سے پیدا ہوئی تھی، یہ جتنا کی کوشش کی ہے کہ آپ نزولِ دحی کے آغاز سے پہلے بچھلی امتوں کے واقعات سے واقعہ تھے، اور وہی واقعات اُس ”خاص کیفیت“ کے وقت آپ کی تربیان پر آگئے،

ان کاہنا یہ ہے کہ آپ نے بچھلی امتوں کے یہ واقعات (معاذ اللہ) عرب کے یہود و نصاریٰ سے سنتے تھے، اس سلسلے میں خاص طور پر صحرا اور سطور اراہب کے نام لئے جاتے ہیں، جن سے سفرِ شام کے وقت آپ کی ملاقات کا حصہ سیرت و تاریخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے، بعض مغربی مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ راہب آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، جو توحید کا قائل تھا، اسی راہبوں سے آپ نے (معاذ اللہ) توحید کا تصور اخذ کیا، انہی سے بچھل کتابوں کا علم حاصل کیا، اور انہی سے بچھلی امتوں کے واقعات پہنچے،

یہیں اگر اتصافِ دنیا سے بالکل اُٹھ لی ہیں گئی تو ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ سفرِ شام کے دوران اس محض رسی ملاقات

لہ مثلاً ریکھتے ہے، ایم، راڈ ول د Rodwell کا انگریزی ترجمہ قرآن، مقرر، ص ۸ مطبوعہ لندن ۱۹۵۹ء،

میں ان راہبوں نے اپنے سینے کی تمام معلومات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اندھیل دی ہوئی، اور آپ نے اُن سب کو راتوں رات جذب کر کے ایک انقلاب نہیں دین کی بنیاد ڈال دی ہوگی، اذل تو یہ دعویٰ ہی ہے سے بلاد میں بلکہ بے بنیاد ہے کہ بحیرا اور نسٹور آریوسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، کسی ہنیف سے خیف روایت میں بھی اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی، اور مل بھی کیسے سکتی ہے جبکہ آریوسی فرقے کو توجہ کمی سے عیسوی ہی میں بدعتی اور ملحد (Heretic) قرار دے دیا گیا تھا، اور اس کے آرلوسی کا نام لینا بھی قابل تعزیر جرم قرار پا گیا تھا، اتحاناسیوس (Athanasius) اور اس کے ہم نوازوں نے اُس فرقے کا باعث مارنے میں کوئی کسر اٹھانیں رکھی، اسکیں فرقے میں اتنی سخت کہاں تھی کہ وہ ساتوں صدی عیسوی تک سانس لے سکتا ہے اور اگر کوئی بچا کچا فرد باقی ہوتا بھی تو اس کو یہ جرأت کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ بصری جیسے شہر میں ایک خانقاہ کا سربراہ بن بلیٹھتا؟

دوسرے جن ردایتوں میں یہ مذکور ہے کہ سفر شام کے دوران آپ کی ملاقات ان راہبوں سے ہوئی تھی، انہی ردایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ انتہائی محضراً سرسری اور ضمیمنی ملاقات تھی، جس میں کسی تعلیم و تعلم کی گنجائش ممکن ہی نہیں، یہرت ہے اُن لوگوں کی عقول پر جو ایسی مضمون کے خیز باتوں پر ایمان لاسکتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزدیل وحی کو تسلیم کرتا اُن کے لئے مشکل ہے، یہاں ہم بحیرا راہب سے آپ کی ملاقات کی مفصل ترین روایت نقل کرتے ہیں جس سے حقیقت حال واضح ہو سکے گی:

جامعہ ترمذی میں حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مردی ہے کہ ایک ترجمہ ابو طالب قریش کے کچھ مشائخ کے ساتھ شام کے لئے روانہ ہوئے، شام میں جس جگہ جا کر اُترے دہاں ایک اہبہ تھا، اس سے پہلے بھی اس راہب کے پاس سے گزر ہوتا تھا لیکن وہ کبھی ملقت نہیں ہوتا تھا، اس مرتبہ جب یہ تجارتی قافلہ وہاں جا کر اُترتا تو راہب خلافِ معمول اپنی خانقاہ سے نکل کر آیا، اور مجتہسانہ نظروں سے ایک ایک

دیکھنے لگا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا:
هُنَّا إِسْمِيلُ الْعَالَمِينَ، هُنَّا أَرْسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ،
يَعْلَمُهُ اللَّهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ،

یہی ہے تمام چانوں کا سردار، یہی ہے پروردگارِ عالم کا رسول،
حَكَمَ اللَّهُ سَامَ كَاتِنَاتِكَ لِتَرْحِمَتِكَ صَبِيجَ گَاهِ

سردار ان قریش نے اس را ہبے کیا کہ آپ کو یہ معلوم ہوا؛ زاہب نے کہا جس وقت
آپ سب، گھانی سے نکلے تو کوئی شجر و جھر ایسا نہیں تھا جس نے اس کو سجدہ نہ کیا ہو،
اور شجر و جھرنی، یہی کے لئے سجدہ کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ میں آپ کو مُہرِ ثبوت سے بھی
بچانتا ہوں جو سب کے مشابہ آپ کے شانے کے نیچے واقع ہے،

راہب یہ کہہ کر واپس ہو گیا، اور پورے قافلے کے لئے کھانا تیار کرایا، جب کہنے
کے لئے سب حاضر ہوئے تو آپ موجود نہ تھے، راہب نے دریافت کیا کہ آپ کہاں ہیں؟
معلوم ہوا کہ اونٹِ چراتے گئے ہوتے ہیں، آدمی بھیج کر آپ کو بلایا، جن وقت آپ تشریف
لاتے تو ایک ابر آپ پر سایہ کئے ہوئے تھا، جب آپ اپنی قوم کے قریب پہنچ تو دیکھا کہ
لوگ آپ سے پہلے درخت کے ساتے میں جگہ لے چکے ہیں، اب کوئی جگہ سایہ کی باقی نہیں
رہی، آپ ایک جانب کو بیٹھ گئے، بیٹھتے ہی درخت کا سایہ آپ تک جھک گیا، راہب نے
کہا کہ درخت کے ساتے کو دیکھو، وہ کس طرح آپ کی طرف جھکا ہوا ہے، اور پھر کڑے
ہو کر قریش کے لوگوں سے کہا کہ آپ ان کو ردم کی طرف نہ لے جائیں، رُومی اگران کو
دیکھ لیں گے تو آپ کی صفات اور علامات سے آپ کو بیچان کر قتل کروالیں گے، اتنا یکلم
میں راہب کی نگاہ اٹھی تو دیکھا کہ ردم کے شات آدمی کری تلاش میں اسی طرف آ رہی ہیں
راہب نے پوچھا، تم کس لئے نکلے ہو؟ رومیوں نے کہا کہ ہم اُس نبی کی تلاش میں نکلے ہیں
(جس کی تورتیت و انجیل میں بشارت مذکور ہے) جو اس مہینے میں سفر کے لئے نکلنے والا ہے،
ہم نے اپنے آدمی ہر طرف بھیج یہاں..... راہب نے کہا اچھا یہ تو بتاؤ کہ جس شے کا اللہ
نے ارادہ فرمایا ہو، کیا اس کو کوئی طلاسکتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، اس کے بعد

رمیوں نے بحیرا را ہبے سے ہمدر کیا کہ وہ اس نبی کے درپنے نہیں ہوں گے، اور دینیں راہب کے پاس شہر گئے، راہب نے پھر قریش سے قسم دے کر پوچھا کہ تم میں سے آنکاروں کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ابو طالب ہیں، اس کے بعد راہب سلسل ابو طالب کو قسمیں دیتا رہا، کہ تم ان کو ضرر روا پس بھیج دو، یہاں تک کہ ابو طالب نے آپ کو واپس بھیج دیا، بعض علماء کو اس روایت کی صحیت میں بھی کلام ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہو تو بھی اس میں خود دین لگا کر بھی اس بات کی کوئی تجھاشن نہیں نظر آئی کہ آپ نے بحیرا را ہبے کچھ واقعات یہیکھے ہوں گے، یہ ایک اہم ترین مختصر ملاقات تھی، جو چند گھنٹوں سے زیادہ آگے نہیں بڑھی، اور یہ ملاقات بھی اُس وقت ہوئی جبکہ آپ کی عمر گھنٹا بارہ تیرہ سال تھی تھے، کیا یہ بات کوئی صحیح ہعقل انسان با در کر سکتا ہے کہ اس کم سنی میں چند گھنٹوں کی اس مختصر ملاقات نے پھیل امتتوں کا ایسا ہمارا علم آپ کو عطا کر دیا ہو کہ آپ اپنے کتاب کو چیخ کر کے اُن کی کتابوں میں تحریک کی وضاحت فرمائیں، اور اُن کی غلطیاں واضح کریں؟

اور نسکور را ہبے ملاقات کا قصہ تو بحیرا کے قصہ سے بھی زیادہ مختصر ہے،

له جامع ترمذی ابوب المناقب باب ماجار فی بدء نبوة النبي صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۲۲۵، ۲ ج، طبع قرآن محل کراجی، ۳۷۰ چنانچہ حافظ ذہبی نے اسے ناقابل اعتماد قرار دیتے ہوئے لکھا اظہر موضع افغانستانی محدث رحمیت اللہ عزیز کتاب التاریخ، دلائل النبوة، ص ۹۱۵ ج ۲ مطبوعہ دکن ۱۳۴۳ھ۔
لیکن حافظ ابن حجر وغیرہ نے اسے درست قرار دیا ہو، چنانچہ فرماتے ہیں ”رجا لاغ ثقافت“ (بیو الام زرقانی)
شرح المواہب ص ۱۹۶ ج ۱ طبع ازہری مصر ۱۳۲۵ھ۔ ۳۷۰ اس سفر کے باقیے میں تین دنیں
لطی ہیں، ایک میں آپ کی عمر گھنی نوسال بیان کی گئی ہے، اور علامہ جلیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے،
(السیرۃ الحلبیۃ- ص ۱۱۱ ج اصطفان البانی ۱۳۲۲ھ) اور حافظ ابن عبد البر نے تیرہ سال کی روایت
کو اختیار کیا ہے، لیکن علامہ زرقانی حضرتی میں کہ اکثر علماء کارجو حان اس طرف ہی کہ اس وقت
آپ کی عمر گھنی بارہ سال تھی (زرقاوی ر: شرح المواہب ص ۱۹۳ ج ۱) -

اور اگر کوئی شخص اُس کی نیاز پر یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے معلومات حاصل کی تھیں تو سو اسے تعصیب اور اسلام دشمنی کے اس کی کوئی توجیہ ممکن ہی نہیں،

پھر سچنے کی بات ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اہل کتاب سے یہ واقعات سن رکھے تھے، تو وہ کفار مکہ جو آپ کی تردید کے لئے ہر رانی کا پھاڑ بنانے کے لئے تیار تھے، اس موقع پر کیوں خاموش رہے؟ انھوں نے یہ دعویٰ کیوں نہیں کیا کہ آپ کو یہ باتیں فلاں فلاں اہل کتاب نے سمجھائی ہیں، انتہا یہ ہے کہ آپ کبھی کبھی مکہ مکرمہ کے ایک لوہار کے پاس کھڑے ہو جایا کرتے تھے، مخفی اتنی سی بات سے کفار مکہ نے یہ شہرت دیدی کہ یہ لوہار آپ کا معلم ہے، جس کی تردید قرآن کریم نے اس طرح فرمائی کہ:-

وَقَنْ تَعْلَمَ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يَعْلَمُهُ بَشَرٌ
إِنَّمَا الَّذِي يُلْحَدُ عَنِ الْكِتَابِ أَعْجَزَيْشَ وَهَذَا إِنَّمَا
عَرَفَ فِي مُهْبِتِينَ ه (الخل : ۱۰۳)

لیکن ان میں سے کسی نے کبھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ آپ نے یہ علم سمجھا، نسطوراً یا ورق بن لوقل سے حاصل کیا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ یہ ایسے بے تکما اعتراض تھا جسے آپ کے کھڑ مخالفت ہم عصر وہی نے بھی زبان سے نکالا پسند نہیں کیا،

فَتَرَأَ كَرِيمٌ پَرَّ حِنْدٍ اعْرَاضَاتُ

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کے بیان کے ہوئے بعض واقعات پر اعتراض کئے ہیں، اور ان سے یہ جتنا کی کوشش کی ہے کہ (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعات اہل کتاب کے کسی عالم سے زبانی سے تھے جنھیں بیان کرنے میں مغاظہ ہو گیا، مثلًا:-

حضرت مريمؑ کے والد کا نام مثلاً انسائیکلو پیڈ یا برٹانیکا میں ایک اعتراض یہ کیا گیا

ہے کہ: "مریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام بھی تھا، اور حضرت علیٰ علیہ السلام کی والدہ کا بھی، اور اول اللہ کر عمران کی بیٹی تھیں، مسٹر آن میں (معاذ اللہ) مغالطہ کی بناء پر موئی حستہ الرذکر کو بھی بنتِ عمران" متراد دیا، مقام افسوس ہے کہ یہ بے سر و بیا اعتراض بر طانیکا جیسی عالمی شہرت کی کتاب میں درج کرتے ہوتے بھی کرنی جھوک محسوس نہیں کی گئی، اگر بر طانیکا "کام مقابلہ نگار" کسی یقینی دلیل سے یہ بھی ثابت کر دیتا کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام "عمران" نہیں تھا، تب تو یہ اعتراض کسی درجے میں قابلِ لحاظ ہو سکتا تھا، لیکن حالت یہ ہے کہ اگر خود اپنی سے پلٹ کر یہ پوچھ لیا جائے کہ پھر حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران کے سوا اور کیا تھا؟ تو اس کے جواب میں ان کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہوگا، انتہا یہ ہے کہ باشبل میں بھی اُن کے والد کا کوئی نام مذکور نہیں، اور خود بر طانیکا کے مقالہ "مریم" میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ:-

"حضرت مریمؑ کے والدین کے بارے میں پہلی صدی عیسوی کی کسی تاریخی دستاویز میں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے"

ایک طرف یہ لاعلی اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام (معاذ اللہ) مغالطہ پر مبنی ہے، کیا بر طانیکا "کام مقابلہ نگار" سمجھتے ہیں کہ اگر ایک ہر تبہ کسی شخص کا نام "عمران" رکھا جا چکا ہو، تو اب دنیا میں کوئی شخص اس کا ہم نام پیدا نہیں ہو سکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ تو قرآن کریم کی حقانیت کی واضح دلیل ہے کہ وہ اُن تاریخی حقائق کی علی الاعلان نقاب کشانی کر رہا ہے جو سات سو سال سے نامعلوم تھے، اور اس خود اعتمادی اور دھڑکے کے ساتھ کر رہا ہے کہ چودہ سو سال سے اس کے بدترین دشمن بھی اسے غلط قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکے۔

لئے انسانیکو پیٹیا بر طانیکا، ص ۲۸۳ ج ۱۳ مطبوعہ ۱۹۵۹ء "مقالہ" قرآن
سلف بر طانیکا، ص ۹۹۹ ج ۱۲ مقالہ "مریم"

پھر یہ بات صرف حضرت مریمؑ کے والد کے نام ہی تک محدود نہیں، بلکہ حضرت مریمؑ کی سیدائیش، اُن کی تربیت، اُن کے بچپن اور اُن کی ابتدائی زندگی کے تمام حالات کے بالے میں تمام "مستند" عیسائی مذاہذ بالکل خاموش تھے، یہاں تک کہ چاروں معترانا جیل میں بھی ان حالات کا تذکرہ موجود نہیں ہے، یہ قرآن کریم ہی تھا جو پہلی بار ان واقعات کو منظرِ عام پر لایا، شروع شروع میں عیسائی دنیا ان "انکشافتات" پر بھی اعتماد اضطراری تریتی رہی، مگر اب خود عیسائیت کی ایسی قدرم کتاب میں دریافت ہو رہی ہیں، جن میں تعریفیاً قرآن کریم کے بیان کردہ یہی واقعہ بیان کئے گئے ہیں، حیرت ہے کہ قرآن کریم کے ان واضح مجزرات کو دیکھ کر بھی ان "زانشوروں" کو قرآن کریم پر یہ اعتماد ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کا نام کسی عیسائی ماذہ میں نہیں ملتا؟

فرعون کا وزیر ہامان برطانیہ کا کے مقالہ "قرآن" میں ایک اعتماد یہ بھی کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ایک وزیر کا نام ہامان ذکر کیا ہے، حالانکہ اس نام سے فرعون کے کسی وزیر کا نام باستبل کے عہد نامہ قدرم میں نہیں ملتا، مقالہ بناگارنے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراصل ہامان شاہ اس تویرس کا وزیر تھا، جس کا ذکر باستبل میں موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ یہ واقعات زبانی سکھتے تھے، اس نے آپ سنن (معاذ اللہ) مغایط سے یہ نام فرعون کے وزیر کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی انتہائی بے سرو پا بات ہے، اور اسی طفلانہ مفرض پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک نام کے دو انسان نہیں پاسے جا سکتے، پھر واقعہ یہ ہے کہ اس تویرس کے جس نام ہمداد وزیر کا ذکر "برطانیہ کا" کے مقالہ بناگارنے کیا ہے اس کا

لہ ملاحظہ ہو ڈکشنری آفت دی باستبل از ہینگز، ص ۲۸۸ ج ۳،
لہ برطانیہ کا، ص ۲۸۳ ج ۳ مقالہ "قرآن"۔

Apocryphal book

قد حص صرف بابل کی ایک مشتبہ کتاب رہی۔ آسٹر میں مذکور ہے، اس کتاب کو پر ڈھنٹ فرقہ معترضین مانتا، چنانچہ مرد جہ پر ڈھنٹ انجیلوں میں یہ کتاب موجود نہیں ہے، البتہ کیتھولک فرقہ اسے مستند مانتا ہے، اس مشکوک کتاب میں جس ہامان یا آمان کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ شاہ استریس کا وزیر نہیں بلکہ صدرِ دربار تھا، اور اس کا جو قصہ اس کتاب میں مذکور ہے اسے ہامان کے فتر آنی والقہ سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہے، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ فرعون نے ہامان کو یہ حکم دیا تھا کہ اس کے لئے ایک اونچا محل تعمیر کراتے، تاکہ اس پر چڑھ کر وہ موسمی کے خدا کو جھانک سکے، نیز قرآن کریم ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہامان آخر وقت تک فرعون کا منہج چڑھا دیزیرا، اور بالآخر اسی کے ساتھ غرق ہوا، اس کے بر عکس کتاب آسٹر میں ہامان (یا آمان) کی طرف اس نوعیت کا کوئی قصہ منزوں نہیں کیا گیا، کتاب آسٹر کا ہامان بخت نصر کے واقعہ کے بعد کا ہے، اور اس کا قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک اتفاقی والقہ کی بنار پر صرف محصر عرصہ کے لئے بادشاہ استریس کا لفڑ حاصل کرتا ہے، لیکن اسی دوران وہ یہودیوں کے قتل عام کا حکم جاری کروادیتا ہو جس بادشاہ کی یہودی ملکہ آسٹر اس کی دشمن ہو جاتی ہے، اور اسجام کا بادشاہ کے سُولی پر لٹکا کر اس کی جکہ ایک یہودی مرد کے کونا مزد کر دیتا ہے، جس شخص نے آسٹر کی کتاب کا سرسری مطابع بھی کیا ہو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ آسٹر کے اس قصہ کو ہامان کے فرآنی والقہ سے دور دراز کا بھی تعلق نہیں، اگر والقہ ہامان کے تذکرے میں آسٹر والے ہامان سے اشتباہ لگا ہو تو دونوں قصتوں میں کہیں تو کوئی اتفاق ہونا چاہئے تھا، لیکن والقہ یہ ہے کہ دونوں میں مطابقت کی کوئی ادنیٰ

لہ کتاب آسٹر کے بعض نسخوں میں اس کا نام ہامان اور بعض میں آمان یا آیمان (Aman) مذکور ہے۔ تاہم دیکھنے آسٹر ۱:۳، ۳:۲۵ ملاحظہ ہو آسٹر ۳:۸ اور ۷:۶ و ۱۰:۸ اور ۸:۲ (ناکسی شرک مطبوعہ میکملن لندن ۱۹۶۳ء)

جملک بھی نہیں پائی جاتی، ہامان کا بحرواقعہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ آسترا یا باسل کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے، اور آسترا میں جو قصہ منقول ہے وہ مذکور قرآن کریم میں بلکہ لاکھوں احادیث کے ذخیرے میں بھی کبھی نہیں ملتا، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ کبھی آپ کے علم میں آیا تھا،

بچر عجیب بات یہ ہے کہ دو ہنام شخصوں کو دیکھ کر اشتباہ لگنے کا یہ فلسفہ عبدالحناز کے عیسائی اور یہودی مستشرقین کو ہمیشہ صرف قرآنی اور اسلام ہی کے معاملات میں یاد آتا ہے، باسل میں جو سینکڑوں ہم نام انسانوں کا ذکر ہے ان کے باسے میں انھیں کبھی اس قسم کے خیالات نہیں ستاتے؟

مَصَائِلُهُ قُرْآنٌ

قرآن کریم کے مصایل میں پرجب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ تمام مصایل چار بڑے عنوانات پر منقسم ہیں، اور قرآن کریم کی ہر آیت ان میں سے کسی ایک عنوان کے تحت ضرور آتی ہے:-

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) قصص (۴) امثال،

عَقَدَاتٌ (ایجادی پہلو)

قرآن کریم میں بنیادی طور پر تین عقائد کو ثابت کیا گیا ہے، توحید، رسالت اور آخرت،

توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان کائنات کے ذریعے ذریعے کو صرف ایک ذات کی

لہ یہ مضمون احرف نے اس کتاب کی تالیف سے گیارہ سال پہلے ۱۳۸۳ھ میں لکھا تھا، اور اس وقت ماہ ستمبر "بینات" دیگرہ میں شائع بھی ہوا تھا، اب اُسے معقولی حزف و اضفاف کے بعد اس کتاب کا جزو بنا رہا ہوں، م، ا، ت، ع

مخلوق سمجھے، اسی کو پڑھے، اُسی کو چاہئے، اُسی سے ڈرے، اُسی سے ملائے، اور دل میں یہ یقین رکھ کر اس بیکار ان کائنات کا ہر ذرہ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اور کوئی دوسرا اس کی توفیق کے بغیر اسے ادھر سے ادھر بلا بھی نہیں سکتا،

رسالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے تمام پیش رو غیر وہ کو خدا کا سچار رسول سمجھے، جس بات کو وہ حق ہے میں اسے حق سمجھے، اور جو بات اُن کے نزدیک باطل ہو اُسے باطل ٹھہراتے،

آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ایک ایسی زندگی پر ایمان رکھے، جو ابدی ہوگی، اور اس میں ہر شخص کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے اپنی دنیوی زندگی میں کئے ہیں، اگر اس نے اچھے کام کئے ہوں گے تو وہ جنت کی سرمدی نعمتوں کا حق دار ہو گا، اور اگر اس نے بُرے کام کر کے اپنی دنیوی عمر کو ضائع کیا ہے تو وہ درخواست کے دامنی غذاب کا تھنچ ہو گا،

ان تین بنیادی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم نے انواع و اقسام کے دلائل ذکر فرمائے ہیں، عقلی طور پر دلائل کی چار قسمیں ہیں، کسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے یا تو انسان کسی ایسی احکامی شیئی کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے مخالفت کے تردید بھی واجب التسلیم ہو، یہ دلیل نقلی ہوتی ہے، یا پھر وہ منطقی انداز سے اپنے دعوے پر دلیل لاتا ہے کہ یہ منطقی دلیل ہے، یادہ اپنے مخالفت کو ایسی چیزیں دکھاتا ہے جس سے ہر انسان اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے جہاں مدعی پہنچا ہے، یہ مشاہداتی دلیل ہوتی ہے، یا پھر وہ اپنے نقطہ نظر کو درست ٹھہرانے کے لئے دنیا کے سابقہ واقعات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو مااضی میں میرے نظریے کے مطابق عمل کیا گیا تھا تو دنیا نے فلاح پائی تھی، اور فلاں قوم نے اس نظریے کے خلاف عمل کیا تھا تو وہ تباہ ہو گئی تھی، ایسی دلیل کو تجھریاتی یا استقرانی دلیل کہا جاتا ہے،

فترآن کریم میں ان میں سے ہر ایک قسم کی دلیل موجود ہے، اُن کی مثالیں ملاحتظہ فرمائیے :-

نَقْلٌ دَلَالٌ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَإِنَّهُ تَعْلَمُ زُبُرَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء)

اور بلاشبہ اس کی خبر پھیلاؤ گوں کی کتابوں میں بھی ہے۔

اس آیت میں باری تعالیٰ نے کافر دل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رست کا انکار کرتے ہو، حالانکہ جو کتنا میں بھائی نزدیک معتبر ہیں یعنی تورۃ الرأیں، خود ان میں (تحفیظ) ہو جانے کے باوجودہ آج تک آپ کی رسالت کا ذکر موجود ہے۔

یہ اُن پیشینگٹونریوں اور خوشخبروں کی طرف اشارہ ہے جو سابقہ آسمان کتابوں میں آپ سے متعلق دی گئی تھیں، مثلاً تورۃ کے سفر استشارہ میں ہے:-

”خدراوند سینا سے آیا اور شاعر سے اُن پر طلوع ہوا، فارآن ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گزرا

دس ہزار قدیسوں کے ساتھ آیا اور اس کے دامنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت

اُن کے لئے تھی“ (استشارہ ب ۳۲، درس ۲)

ظاہر ہے کہ فارآن اور شیر کے پہاڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ (حضرت) ولی کے بعد آنے والے سعیروں میں سے کوئی اور سعیر جلوہ گز نہیں ہوا، اور دس ہزار قدیسوں سے صحابہؓ کی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ فتح مکہؓ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی اسی طرح انجیل میں ہے کہ حضرت علیؓ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:-

تجب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لئے کہ وہ اپنی طریقے سے نہ گالیکیں جو کچھ شے نگاہی کے گا اور تمہیں آئندہ کی خبری دے گا۔ (یوحنا ۱۵: ۱۲)

لہ مدینہ منورہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے، اور فارآن کے عظیم کام شہر پہاڑ ہے، جس کے ایک حصہ پر غارِ حرام ہے، اور اب وہ جبل انور کے نام سے معروف ہے،

۳۰۵ء کے ایڈیشن میں ہائیلے کے "ارباب حل دعقد" نے "دس ہزار" کے لفظ کو "لاکھوں" سے تبدیل کر دیا ہے،

منطقی دلائل | منطقی دلائل کی بھی بہت سی قسمیں ہیں، اور تقریباً ہر قسم قرآن کریم میں موجود ہے، منطقی دلائل کی سیکھی پہلی اور سب سے کثیر لاستعمال قسم وہ ہے جسے اصطلاح میں "قیاس اقتراضی" کہا جاتا ہے، اس قیاس میں عام طور پر ایک کلیہ بیان کیا جاتا ہے، اور اپنے دعوے کو اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، سورہ طاری میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں سے مقابلہ ہوا اور ان کی رستیاں اور لاثمیاں سانپ بن کر چلنے لگیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ خوف محسوس ہوا اس وقت اللہ تعالیٰ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، آپ ہی ستر بلند رہیں گے، یہ لوگ فلاخ نہیں پاسکتے، اس نے کہ:-

إِنَّمَا صَنَعُوا أَكْيَنْ سَاجِرٌ وَلَا يُفْلِهُ أَسْتَأْجِرٌ حَيْثُ شُ

آٹی رطہ: ۶۹

تجو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ ایک جادوگر کی ترکیب ہے، اور جادوگر خواہ کہیں چلا جائے اُسے فلاخ حامل نہیں ہو سکتی ॥

یہ قیاس اقتراضی کی وہ مثال ہی، جن میں صغیری اور بکری دو فنی موجود ہیں، اور الیسی مثالیں تو بیشمار ہیں جن میں کوئی مقدار مخذوف ہے، مثلاً، کفار کہا کرتے تھے کہ جب انسان کی ہڈیاں خاک بن کر ختم ہو جائیں گی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بروز حشر انھیں از سر نوزندہ کر دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عین حکمن ہے، کیونکہ:-

بَلِّيْ قَادِرِيْتَ أَنْ تُسْوِيَ بَنَاتَهِ (قیامہ: ۷۱)

"کیوں نہیں، ہم اس بات پر قادر ہیں کہ انسان کی انھیلوں کے پوروں کو برابر کر دیں ॥"

یہ صغیری ہے اور بکری مخذوف ہے، کہ بخودات پوروں کو برابر کرنے پر قدرت رکھتی ہو وہ یقیناً ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہو گی، کیونکہ پوروں کا برابر کرنا ہڈیوں کو زندہ کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے) کیونکہ انھیلوں کے پوروں پر جو خطوط قدرت نے رکھے ہیں وہ اللہ جعل شانہ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا ایک عجیب غریب نمونہ ہو کہ کروڑوں

بلکہ اربوں اور پہلوں انسان جو اس دنیا میں آئے ان میں سے کسی کے یہ خطوط دوسروں سے نہیں ملتے، اس آدھا بیخ کی جگہ میں قدرت نے کیا مجزہ رکھا ہے کہ ہر انسان کے خطوط دوسرے سے الگ ہیں، کبھی ایک کے نشانات دوسروں سے نہیں ملتے، اسی لئے قدم زمانے سے نشان انگشت کو دستخط کے قائم مقام اس کی خصوصیت کا مظہر رکھا گیا ہے، اور آج بھی تمام حکومتوں، عدالتوں میں نشان انگشت کو دستخط کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے، اس کے امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے باقاعدہ حکمر قائم ہے، اس لئے جو ہستی پوروں جیسی نازک اور دقیق چیزوں کے اعداد پر قادر ہے وہ ہٹریوں کو زندہ کرنے پر بھی یقیناً قادر ہے، لہذا یوم آخرت کو جھٹلانے لئے دلیل بات ہے،

قياس استثنائی | منطق دلائل میں سے دوسری اہم قسم "قياس استثنائی" ہے، یہ دلیل عام طور پر کسی چیز کی نفی کرنے کے لئے لائی جاتی ہے اور اس کے دو حصے ہوتے ہیں، پہلے جزو یعنی صغری میں جو چیز کی نفی کرنا مقصود ہوتا ہے اسے کسی دوسری چیز پر موقوف کر دیا جاتا ہے، اور دوسرے جزو یعنی بڑی میں اُس چیز کی نفی کر دی جاتی ہے جس پر پہلی چیز کو موقوف کیا گیا تھا، مثلاً مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ کاس وقت دن نہیں ہے، تو میں کہوں گا کہ "اگر دن موجود ہوتا تو سوچ موجود ہوتا لیکن سوچ موجود نہیں ہے، لہذا معلوم ہوا کہ دن بھی نہیں ہے" — اس قسم کی دلیلیں بھی قرآن کریم میں بہت ہیں، مثلاً شرک کی نفی اور توحید کا اثبات کرتے کرتے ہوتے ارشاد ہے:-

تَوْكَانَ فِي هَمَّا إِلَيْهِ إِلَّا اللَّهُ تَفَسَّدُ تَا، (النور: ۲۴)

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور معبد ہوتے تو یہ

دوفون چیزیں فاش ہو جاتیں"

یہ صغری ہے اور بکری محدود ہے، کہ "لیکن زمین و آسمان فاسد نہیں ہوتے" لہذا معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبد بھی نہیں ہے،
لہ اس لئے کہ ایک خدا ایک کام کو چاہتا اور سرانچاہتا، لہ اسی ہوتی اور فساد پھیل جاتا،

السُّبْرُ وَ التَّقْسِيمُ منطقی دلائل میں سے ایک اہم دلیل "السُّبْرُ وَ التَّقْسِيمُ" بھی ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مخالفت سے یہ کہا جاتے کہ تمہارے دعوے کے ثابت ہونے کے لئے اتنے احتمالات میں سے کوئی ایک احتمال پایا جانا ضروری ہے، اور کیونکہ بہاں ان میں سے ایک بھی نہیں پایا جاتا رہا ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ تمہارا دعویٰ غلط ہے، مثلاً آپسے مخالفت کا دعویٰ ہے کہ زید پاکستان کی اسمبلی کا ممبر ہے، آپ اس سے جواب میں کہیں کہ پاکستان اسمبلی کا ممبر کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ یا تو وہ نیشنل اسمبلی کا یا محض بی پاکستان اسمبلی کا یا مشرقی پاکستان اسمبلی کا، اور چونکہ وہ ان میں سے کسی کا بھی ممبر نہیں ہے لہذا اسے پاکستان اسمبلی کا ممبر نہیں کہا جاسکتا، یہ تو "السُّبْرُ وَ التَّقْسِيمُ"۔

قرآن کریم میں اس کی بڑی واضح مثال موجود ہے،
کفار حلال جانوروں میں سے بعض اوقات نرجانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لیا کرتے تھے، اور بعض مرتبہ مادوں کو، اللہ تعالیٰ نے اُن کا رد کرتے ہوتے فرمایا کہ تمہارے اس حرام قرار دینے کی علت کیا ہے؟ عقل اصرت چار صورتیں ممکن ہیں جن کے سوا کوئی پاکخیزی بات نہیں ہو سکتی، یا تو انھیں اُن کے مذکور ہونے کی بنا پر قرار دیتے ہو، یا موئش ہوئے کی بنا پر ایسا اس لئے کہ وہ حرم جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اس میں کوئی الی بات ہے جو سببِ حرمت بن سکتی ہے، یا پھر عقل کی رو سے کوئی سببِ حرمت بیکھر میں نہیں آتا، بلکہ حرم اسے اس لئے حرام سمجھتے ہو کہ خدلنے اسے حرام قرار دیا یا ہے، اور یہ چاروں ہیں ناممکن ہیں، تر ہونے کو سببِ حرمت اس لئے نہیں ٹھہرا یا جا سکتا کہ تم صرف نرجانوں کو حرام فرائیں دیتے، بلکہ بعض اوقات مادہ جانور بھی حرام کر لیتے ہو، دوسرا بیان یعنی مادہ ہونے کو بھی اسی لئے سببِ حرمت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ تم نزاور مادہ دوپر قسم کے جانوروں کو حرام کرتے ہو، تیسرا بھی صورت یعنی اس حرم کا سببِ حرمت ہونا اس لئے ممکن نہیں کہ پھر تو بیک وقت نزاور مادہ دوپر حرام ہونے چاہیں، حالانکہ تم ایک وقت میں یا ان کو حرام سمجھتے ہو یا مادہ کو، بیک وقت دوپر کو حرام نہیں کرتے

چو تمھی صورت یعنی محض اللہ کی اطاعت کی بنا پر حرام سمجھنا بھی مکن نہیں، اس لئے کہ اللہ نے ایسا کوئی حکم نازل نہیں فرمایا،

وَمِنَ الْأَيَّلِ إِلَيْهِ أَثْنَيْنِ وَمِنَ النُّبُرِ إِثْنَيْنِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ تَحْرِينَ حَرَمَ آمِ
الْأَمْلَقَيْنِ أَمَّا أَشْتَدَتْ عَلَيْهِ آرَاحَمُ الْأَنْتَيْنِ أَمْ كَنْتُمْ شَهَدَاءَ
إِذَا وَصَارُكُمْ أَنَّهُ يَهُدُّا، (الفاتحہ)

”او راللہ نے پیدا کئے) اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو، آپ پرچھے کہ رونوں حرام کے یہ میں یادوں والے؟ یا ہر دو جس پر دو نوں مارہ کے حرم مشتمل میں یا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس بات کا حکم دیا تھا؟“

یہاں باری تعالیٰ نے بڑے لشیں انداز میں ”بُرُّ تَقْيِيم“ کے ذریعے اُن کے مرحومات کا رد فرمایا۔

تَقْيِيم

منظقو استلال کا چوتھا ہم طریقہ ”تسلیم“ ہوتا ہے، یعنی مخالف کی کسی بات یا ارجاع کو تسلیم کر کے یہ کہنا کہ اس تسلیم کرنے کے بعد ہم مقصود حاصل نہیں ہوتا، کفار کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس کسی انسان کی بجائے کسی فرشتے کو سعیر بنا کر کیوں نہیں سمجھا گیا؟ اس کا جواب باری تعالیٰ نے کئی طریقوں سے دیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:-

وَلَوْ بَعَلْنَاهُ مَلَكَ الْجَعْلَنَةَ رَجُلًا، (الفاتحہ)

”او راگر ہم انھیں فرشتہ بناتے تو کمی اُسے مرد ہی کی نشکل میں

مبouth کرتے“

یعنی اول تو کسی سینہ کے لئے فرشتہ ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ انسان کو اس مقصد کے لئے بھیجا جائے، لیکن اگر بغرضِ محال تھماری بات تسلیم کر کے فرشتہ بھیج بھی دیا جائے تو بھی تھمارا مقصود اس سے حاصل نہ ہوتا، اس لئے کہ ہم فرشتے کو اس کی اصل شکل و صورت میں تو بھیج نہیں سکتے، کیونکہ تم میں اس کی اصلی شکل دیکھنے کی تاب ہی نہیں ہے، لامحال اُسے مرد کی صورت میں بھیجا جاتا، اس وقت بھر تم اس پر ایمان نہ لاتے،

انتقال [منظقو انداز کے مناظر میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدعی نے ایک رسلی پیش کی، مخالف نے کچھ فحی کی بنا پر اس پر کوئی اعتراض کر دیا،

۳۰

مدحی لیسے موقع پر اس کا جواب دینے کے بجائے دوسری دلیل پیش کر دیتا ہے، جس کا مقصد یہ ہے میں ہوتا کہ میری پہلی دلیل غلط تھی، بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اعتراض حاقدت پر مبنی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تم وہ دلیل سمجھنے نہیں سکتے، میں دوسری دلیل دیتا ہوں اسے ”انتقال“ کہا جاتا ہے،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعہ میں اس کی واضح مثال ہے، آپ کا جب مزدود سے مناظرہ ہوا، آپ نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید پر ایک دلیل پیش کی کہ :-

رَبِّيَ الْأَنْزَىٰ يُحِبِّي وَيُمِيَّزُ

میرا پر دردگار فہر ہر جوز نہ کرتا ہے اور مارتا ہے

اس پر مزدود نے ایک بے گناہ کو پکڑ کر قتل کر دادیا، اور ایک ایسے شخص کو آزاد کر دیا ہے پھانسی کا حکم ہو چکا تھا، اور کہا کہ :-

آتَا أَخْيَرَ حَوْمَيْتَ

میں بھی زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں

حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ الحق زندہ کرنے اور مارنے کا مطلب ہی نہیں سمجھتا اس لئے فرما ایک اور لا جواب کر دینے والی دلیل پیش کی کہ :-

إِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِكُلِّ شَيْءٍ مِّنَ الْمُشْيَّقِ فَأَمْتِنَّهَا مِنْ أَنْتَعْرِفُ بِهِ

”اللہ تعالیٰ تو سورج مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر لے“

یہ ”انتقال“ تھا، جس پر مزدود کی ساری چرب زبانی ختم ہو گئی،

فَبِهِمْتَ الَّذِينَ نَكَفَرُ، (بِقَسْكَ)

”چنانچہ اللہ کا انکار کرنے والا مبہوت رہ گیا“

مُشَاهِدَاتِ دَلَائِلِ [دلائل کی تیسرا قسم وہ ہے جو ”مشابہ“ سے تعلق رکھتی ہے] قرآن کریم نے اس قسم کے دلائل زیادہ استعمال فرماتے ہیں، یہونکہ منطقی اور فلسفیہ موشگ فیاں انسان کو خاموش تو کر دیتی ہیں، مگر بسا اوقات اس سے بات

دل میں ہمیں اُرتقی، اور ان سے شہماں کے مریض کا علاج نہیں ہو سکتا، اور قرآن حکیم کا مقصد رسمی کو خاموش کرنا نہیں حق باتوں کو دلوں میں اُثار نہیں، دوسرا یہ منطق دل لیں ایک خاص طبقہ کے لئے تغیریتی ہیں، ہر آن پڑھ اور جاہل کے لئے وہ کارگر نہیں ہو سکتیں، اور ”مشابہہ“ وہ منہجِ بُرتی چیز ہے جس کی وجہ سے ایک الہڑ دیہاتی بھی بے اختیار پکارا ٹھتا ہے کہ :-

أَبْعَرْتُهُ تَدْلِيلًا عَلَى الْبَعْيِيرِ وَالْأَشْرِ عَلَى الْمَيِّسِ فَتَمَاءَ
ذَائِتَ أَبْرَاةَ وَأَرْضَ ذَائِتَ فَجَابَ كَيْفَ لَا تَدْلِيلٌ عَلَى
الْأَطْيَقِ التَّعْجِيزِ

جب راستے میں پُری ہوئی میتگی اونٹ کا پتہ دیتی ہے، اور نشانِ قدم مسافروں کا، تو یہ بُر جوں والا آسمان اور یہ غاروں والی زمینِ لطیف و خیر خالق کا پتہ کیسے نہیں دے گی؟

اس نے اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر مشاہداتی دلیلیں ہر مرتبہ نئی شان اور نئی ادائے پیش فرمائی ہیں، ایک مثال سنتے، توحید کے دلائل دیتے ہوئے ارشاد ہے :-

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ تَكْمِيلَتَ السَّمَاءَ
مَاءً فَأَثْبَسَنَا يَهُ سَدَائِنَ حَدَّ الْقُوَنَ ذَائِتَ بَهْجَةٍ، مَاهَانَ الْكُمَانُ
تَنْبِيَتُوا شَجَرَهَا، عَرَالَهُ مَعَ الْلَّهِ، يَلْ هُمْ قَوْمٌ لَعُونَ وَ
أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ مَقْرَابًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَهْلَرًا وَجَعَلَ لَهَا
رَقَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا، عَرَالَهُ مَعَ اللَّهِ، يَلْ
أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ وَأَمَّنْ يَعْجِبُ الْمُضْطَرُ أَذَادَ عَاهَ وَ
يَكْثِيفُ الشَّوَّاءَ، وَيَجْعَلُكُمْ خُفَاءَ الْكُرْصَنَ عَرَالَهُ مَعَ الْلَّهِ،
قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ وَأَمَّنْ يَعْنِي يَكْمُرُ فِي ظُلْمِتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
وَمَنْ يُرِسِّلُ الرِّيَاحَ بُشَّا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ، عَرَالَهُ مَعَ
الْلَّهِ، تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشَرِّكُونَ وَ (رِمَلٌ ۖ ۶۳)

بلکہ وہ ذات بہتر، جس نے آسمانوں اور زمیزوں کو پیدا کیا، اور تمہارے لئے آئنے سے پانی اُتارا، پھر تم نے اس سے بار و نتن باغ مگاٹے، تمہارے بس کی بات ہمیں تھی کہ تم ان کے درخت اُنکا سکھتے، کیا راب بھی تم یہ کہتے ہو کر، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبور ہے؟ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو رحمتی بات سے اعراض کرتے ہیں، بلکہ وہ ذات بہتر ہے جس نے زمین کو رہنے کی جگہ بنایا، اور اُس کے درمیان ہر سی بنائیں اور ان کے لئے جانے والے چھاٹ بنائیں، اور دو سمندر دل کے درمیان ایک حائل بنائیا کیا راب بھی تم یہ کہتے ہو کر، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبور ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر صحیح بات ہمیں جانتے، بلکہ وہ ذات بہتر ہے جو مضطراً انسان کی دعا قبول فرماتی ہے، اور بُرانی کو دور کرتی ہے، اور تم کو زمین کا خلیفہ بناتی ہے، اپناراب بھی تم یہ کہتے ہو کر، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبور ہے؟ بلکہ وہ ذات بہتر ہے جو ہمیں خشکی اور سمندر کی تاریخیوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، اور جو اپنی رحمت سے خوش کر دینے والی ہو ائم یحییٰ ہیں، کیا (اب بھی تم یہ کہتے ہو کر)، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبور ہے؟ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے، جنہیں یہ لوگ اس کے ساتھ مرشیک ہٹھلاتے ہیں ॥

یعنی جزویات اتنے اہم کام سراجِ اجام دیتی ہے اور اس کے سوا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا، تو لا حالاً اسی کو عبارت کے لئے مخصوص کرنا چاہتے، اور دسرے کو اس کا شریک بنانا بذریعین حماقت ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جزویات تہذب اتنے عظیم کام انجام دیتی ہے اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے کسی ساتھی کی مدد و رت کیوں ہو؟

ایک اور جگہ یوم آخرت کا اثبات کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْدَهُ كَيْفَ بَنَيْتَهَا وَكَيْنَاهَا

ملکہ کفار اور عرب جانتے تھے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے، زین و آسمان اسی نے پیدا کئے ہیں، مگر وہ ذہنیوں با ادشاہوں پر قیاس کر کے سمجھتے تھے کہ اس نے ان کے انتظام کیلئے معاذ اللہ پر یہ دنگاڑ رکھتے ہوئے ہیں، م، ت،

وَمَا تَهَا مِنْ فُرُوجٍ وَالْأَكْمَانَ مَذْنَاهَا وَالْقَيْسَارِيَّةِ وَإِيَّى وَأَنْبَتَنَا
فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بِهِيجٍ تَبِعَصَهُ قَدْ كُرْبَى لِكُلِّ عَبْدٍ مُنْتَهٍ وَنَزَّلَنَا مِنْ
الْمَسَامَاءِ مَاءً مِنْهَا دَكَّا فَأَنْبَتَنَا يَهُجَّتْهُ وَحَبَّ الْعَصِيَّنْ وَالشَّخْلَ
بِالْمَقَاتِلِ الْمَاطِلَهُ لَعْنِيُّدُ رَدَّ قَالِ اللَّعِيلَهُ وَأَحْيَيْنَا يَهُبَّلَهُ مِنْتَهَا كَذَلِكَ
الْخُرُوجُ (ت ۱۱۵)

”کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں رکھا، ہم نے اسے کیسے بنایا ہے، اور اسے
زمینت بخشی ہے، اور اس میں کوئی بھی تو شگاد نہیں، اور ہم نے زمین کو چھیلایا ہے،
اور اس میں نسلنے والے پہاڑ بیانے یہیں، اور اس میں ہر ایک بار واقع جوڑا اگایا ہے، تاکہ
ہر جو رع کرنے والا بندہ اُن سے بصیرت اور نصیحت حاصل کرے، اور ہم نے آسمان سے
برکت والا بانی آثارا، پھر اس کے ذریعہ بندوں کو رزق دینے کے لئے باغات اور
کھیتوں کے بیچ اُگاتے، اور اس کے ذریعے مردہ (خطاطرہ) شہر کو زندہ کیا جائیں، اسی
طرح حشر ہو گا“

قرآن کریم میں انسانی جسم و نفس، کائناتی حقائق، فلکیات، نباتات اور ارضیات سے
متعلق جواباتیں بیان ہوئی ہیں دہ زیادہ ترا اسی قسم کے دلائل کے ضمن میں آئی ہیں، اور جیسا
جہاں آفاق دکائنات پر غور کرنے کی تاکید کی گئی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان اُس
کائنات کے اسرار و عجائب پر غور کر کے اس کے بنانے والے کی قدرت کا علم کا استحضار پیدا
کرے، اور بالآخر اُسی کے آگے بجود ریز ہو جائے، اس ضمن میں فترآن کریم نے بہت سائنسی
حقائق کی نقاب کشائی بھی فرمادی ہے، لیکن اس قسم کی تمام ہاتوں کو قرآن کے پولے سیاق
و Context میں دیکھنا چاہئے، اُسے ایک مستقل سائنس کی کتاب سمجھنے سے بہت سی
غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں،

تجربات دلائل | قرآن کریم نے اقوام سابقہ کے تجربات کی طرف توجہ دلاتی ہے، چنانچہ
دہ جگہ جگہ ارشاد فرماتا ہے :-

أَوْلَمْ تَيَسِّرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مُرْتَ

قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً فَإِنَّا لَا نَرَضُ وَهَا أَكْثَرُ
مِنْتَأْعَمْرُ وَهَا حَاجَةُهُمْ رَسَاهُمْ بِالْبَيْتَاتِ فَمَا كَانَ اللَّهُ
يُيَظْلِمُهُمْ وَلَا كُنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ه (روم: ۹)

مسیحیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجم کیا رہا جو ان
سے پہلے گزرے ہیں، وہ اُن سے وقت کے اعتبار سے زیادہ تھے، اور انھوں نے زمین
کو ان کے بسائے سے زیادہ لبسا یا، اور بولیا جوتا تھا، اور ان کے پاس ہمارے سیغیر
نشانیاں لے کر آتے تھے، تو اللہ تو ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ پر
ظلماً کرتے تھے ॥

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَكُمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرْتُ مَعِيشَتَهَا أَفْلَكْ مَسَارُهُمْ لَمْ تُشَكِّنْ
مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثُينَ ه (قصص: ۵۸)

”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں سکبر اختریا کیا، پھر دیکھ لیو“
وہ اُن کی بستیاں ہیں جو اُن کے بعد آباد نہ ہو سکیں، مگر ہبہت کم اور ہم ان کے دارہیں“

ان تحریبات کو ذکر کر کے قرآن حکیم یہ بتلاتا چاہتا ہے کہ جس جس قوم نے اپنی زندگی کو غلط
بنیادوں پر کھڑا کیا ہے، اور جس نے ہماری ہدایات کی روشنی سے مٹھے موڑا، ہم نے
ہمیشہ اُسے تباہی کے اُن گھرے غاروں میں ڈھکیل دیا ہے جہاں سے وہ پھر کہی نہیں
نیکل سکے،

عَمَّا مَرَ (سلی بپلو)

مندرجہ بالا عقائد کو ثابت کرنے کے علاوہ قرآن کریم نے انسانوں کے عقائد و
اعمال کی بہت سی مگاہیوں کو رد کیا ہے، اور اُس مگراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کے
مختلف شہابات کا تشفی بخش جواب دیا ہے، اس مضمون کی آخرتوں کو اصول تفسیر کی
اصطلاح میں ”آیاتِ محا صمه“ کہتے ہیں،

اس قسم کی آیتوں میں چار قسم کے گمراہ انسانوں کا روا کیا گیا ہے :-

(۱) بُتْ پَر سَتْ مُشْرِكِينَ (۲) فَصَرَانِ (۳) يَهُودِي (۴) مُنَافِقِينَ،

بُتْ پَر سَتْ مُشْرِكِينَ | بُتْ پَر سَتْ مُشْرِكِينَ کی گمراہیاں پانچ اقسام کی تھیں :-

کو شریک بھراستے تھے، اور ان کا عقیدہ بہ تھا کہ اگر جو اللہ تعالیٰ ہی تمام چیز دل کا خدا ہے، مگر جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنی حکومت کے مختلف انتظامات مختلف آدمیوں کو سونپ دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حیثیت بھی (معاذ اللہ) ایکیاں بادشاہ کی سی ہے جو کائنات پر کنٹرول کرتا ہے، مگر رزق وغیرہ جس زدی شجے اس نے بتوں کے سپرد کر رکھے ہیں، اور اب ان میں اس کا کوئی دخل نہیں، لہذا ان شعبوں سے متعلق سوال بھی بتوں ہی سے کرنا چاہئے، اور ان کی عبادت کر کے انھیں خوش رکھنا چاہئے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حصنوں ہماری سفارش کرتے رہیں، قرآن کریم نے ان کا یہ عقیدہ اس طرح بیان فرمایا ہے :-

وَمَا تَعْبُدُ هُنْمَ إِلَّا لِيُقْرَبُ إِلَيْنَا إِنَّ اللَّهَ زُلْفَی (زم: ۳)

”ہم ان کی صرف اس لئے عبادت کرتے ہیں کہ یہ ہمین اللہ تعالیٰ سے قریبی

کر دیں ॥

بُتْ پَر سَتِی کی یہ گمراہی ان لوگوں میں سب سے پہلے عمر دین لمحی نامی ایک شخص نے پھیلائی تھی اور اس میں شبانہ روز ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ تین سو سالہ بتوں کی پرستش کرتے تھے،

فترآن کریم نے ان کی اس گمراہی کا مختلف طریقوں سے رد فرمایا ہے، کہیں ان دلیل کا مطالبه کیا کہ آخر کس نے تمہارے کان میں آکر تم سے یہ باتیں کہہ دی ہیں کہ جو پر لے سوچ سمجھے عمل کئے جاتے ہو، اور انھیں چھوڑنے کا نام نہیں لیتے، کہیں یہ ثابت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کا ارادہ ہی طریقے سے بڑی چیز کو عدم کے پردوں سے نکال کر وجود کے اسٹیچ پر لاکھڑا کر دیتا ہے، پھر اسے اپنی سلطنت

کے استظام میں درسرخوں کی مددگاری کیا حاجت ہے؟ (سورة نحل کی جو آیت اور پریش کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے، ہمیں انھیں اس بات کی طرف توجہ دلانی کجرا پھر کل تک لوگوں کی سطحوروں میں پڑا تھا وہ آج ہستھولے کی ضرب کھا کر خدا کیسے ین گیا، صرف ”لات“ یا ”ہبل“ نام رکھ لینے سے اس میں رزق دینے اور صیتیں دور کرنے کی صلاحیت کھان سے آگئی؟

إِنْ هُنَّ إِلَّا آَسْمَاءٌ عَتَمَّيْتُ مُوْهَا أَنْتَمْ وَ إِنَّمَا يُؤْكِدُ كُمْ مَا

أَمْرَّلَ اللَّهُ بِهَا صَنْ سُلْطَنٍ، (النیم: ۲۲)

”بُس یہ چند نام میں جو تم لوگوں نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھئے

یہ، انہوں نے تو ان میں کوئی قوت و قدرت نہیں آتا رہی۔“

(۱۲) بُت پرستوں کی درسری مگر اسی ”تشبیه“ تھی، یعنی وہ خدا تعالیٰ کو لپٹنے اور پر تیکا کر کے مجسم اور (معاذ اللہ) یہودی پچھوں والا سمجھتے تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، فتر آن کریم نے آن کی اس مگرایی کا ردِ ذوق طرح فرمایا، ایک تھکلیۃ اللہ سے اولاد کی نفی کر کے:-

لَمْ يَلِدْنَ وَ لَمْ يُوْكِدْنَ ه (اخلاص: ۳)

”ذ اُس نے کسی کو جنم ہونے کی وجہاں یا

و درسرے خاص طور سے لڑکیوں کی نفی کر کے، کہ ذرا اپنی عقلمندی تو ملاحظہ کرو کہ تم بیٹیوں کا وجود را پنے لئے تو باعثت ننگ دعا سمجھتے ہو، اور پھر جس ذات کو پوری کائنات کا پروردگار مانتے ہو اس کے لئے بیٹیوں کے وجود کے قابل ہو:-

اللَّهُ الْبَسَاتُ وَ لَكُمُ الْبَتَرُونَ إِنَّا لَكُمْ كَيْفَ تَعْكُمُونَ ه

”کیا اس کیلئے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لئے بیٹے؟ تمھیں کیا ہو گیا؟

کیسے کیسے فیصلے کر لیتے ہو؟“ (الطور: ۳۹ / القلم: ۳۶)

(۱۳) آن کی تیسری مگرایی ”تحلیف“ تھی، یعنی وہ اپنے آپ کو دین ایر ایم علیہ السلام کا پیر دسمجھتے تھے کہ ہم ٹھیک آن کے طریقے پر ہیں، مگر بہت سے جزوی

احکام دوائیں بھی انہوں نے اپنی طرف سے گھٹ لئے تھے، ننگے ہو کر طواف کرنا، نماز کی بجائے سیسیاں اور تالیاں بجانا، ہمیندوں کو آگے پچھے کر لینا، کرجنگ کرتے کرتے کوئی "شہر حرام" آ جاتا تو وہ کہتے کہ اب کے یہ جمیں دوچینے تک چلے گا، باری تعالیٰ نے جا بجا آن کی لغویتوں کو ظاہر کیا ہے، اور مسلمانوں کو ایسی داہیات باتوں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے؛

لِيَبْتَغِي أَدَمَ مُخْذُولًا وَإِزْيَادَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۲۷)

مکے ایمان والوا ہر بھر کے پاس اپنا ماں مژو رہتا اکرو ॥

وَمَا كَانَ صَلَوةً تَعْمَلُ بِعِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَافَأً أَوْ تَحْمِدَيَةً

"اد رہبیت اللہ کے پاس آن کی نماز سیسیاں اور تالیاں بجانے کے

سو اکچھے نہ تھی ॥" (الانفال: ۳۵)

إِنَّمَا الظَّيْنُ عَزِيزٌ بِرِيَادَةٍ فِي الْكَعْفِ (التوبہ: ۲۴)

بلاشبہ ہمیندوں کو آگے پچھے کرنا کفر میں اور زیادتی ہے ॥

(۲۲) آن کی جو تھی مگر ابھی یہ تھی کہ وہ اخضارت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول خدا یلم نہیں کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہمارا جیسا چلنے پھرنے اور کھلتے پینے والا انسان سفیر یکے ہو سکتا ہے؛ فتنہ آن کریم نے جا بجا آن کی اس مگر ابھی کا رد فرمایا، اور سمجھایا کہ بشریت بنتوت کے منافی نہیں، اور ہمیشہ سے انبیاء رسانانوں ہی میں سے آتے ہیں:-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا ذُرِّيْسِيَ إِلَيْهِمْ،

"اور ہم نے آپ سے پہلے بھی مرد ہی سمجھے ہیں جن کی طرف ہم وہی

نازل کر دیتے تھے ॥" (یوسف: ۱۰۹)

(۲۳) آن کی پاچھوئیں مگر ابھی "انکار آخرت" تھی کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن سمجھتے تھے، قرآن کریم نے اس کا مختلف دلنشیں اسالیب سے رد فرمایا:-

أَوْلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي حَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَ

لَمْ يَعِيْ بِخَلْقِهِنَّ يَقَادِرُ عَلَى أَنْ يُحْجِيَ الْمَوْتَى (الاحقاف: ۳۳)

”کیا وہ ذات جس نے تمام آسمانوں اور زمین کو پیدا کرایا اور ان کے پیدا فرمائے سے بالکل تکھلی بھی نہیں، وہ اس بات پر قادر ہیں کہ اس جیسی اور حبیزیں پیدا فرمادے یہ“

پہنچ دی اُن آن کریم نے پہنچ دیں کافر دمکھی فرمایا ہے، یہ لوگ اپنی گمراہیوں میں حد سے بڑھتے ہوئے تھے، بت پرست مشرکین میں جو مگر اہمیات تھیں وہ (صوت) انوار آخرت کے) سب ان میں بدرجہ اکمل موجود تھیں، کبھی کوئی لوگ اپنے آپکو ”تورات“ کا پیغمبر رکھتے تھے۔ مگر درحقیقت یہ اُس کے پیروز نہ تھے، تورات تو خود ہی اُن کے رحم و کرم پر تھی، یہ اس میں جس طرح اُن کا دل چاہتا تھا تضاد کرتے تھے، تورات میں ان کا لفڑ تین قسم کا تھا،

(۱) تحریف لفظی؛ یعنی یہ لوگ تورات کی آیتوں کا غلط ترجمہ کر کے نوگریں کے سامنے پیش کرتے تھے،

(۲) سخیریت معنوی؛ یعنی تورات کی آیتوں کا اپنی طرف سے گھٹ کر مطلب بیان کرتے اور اسی پر دسر دل کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے، اس کی ایک مشاہ ملاحظہ فرمائیے؟

ہر نبی کی امت میں یہ بات معرووف و مشہور رہی ہے کہ کافر اور فاسق ایک جیز نہیں، بلکہ دونوں اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی جلا ہیں اور دونوں کا انجام بھی مختلف ہے، کافر دہ جو دین فطرت کے بنیادی حقائق مثلاً توحید، آخرت اور رسالت پر ابھان نہ رکھتا ہو، ایسا شخص ہمیشہ کے لئے عذاب جنم کا تھنخ ہوتا ہے، اور فاسق وہ ہے جو ان بنیادی جیزوں پر ابھان رکھنے کے باوجود عمل اور کردار کے اعتبار سے اپنے آپ کو دین نظرت لے مطابق نہ بناسکا ہو، اور ان جیزوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہو جو دین فطرت نے شدت کے ساتھ منوع ترارزی ہیں، ایسا شخص دائمی عذاب کا تھنخ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی سزا بھللتے کے بعد جنت میں جلا جائے گا، — تورات میں اسی حقیقت کو جیان کیا گیا تھا کہ جو شخص حضرت موسیٰ پر ابھان لے آیا ہے

وہ جنت کا ستحی نزد رہی، اور اگر درزخ میں جائے تو بھی تو نار سنی طور پر، اس کا طلب پہی تھا کہ جو شخص دین نظرت کے بیانی تصورات سے متفق ہوتے ہوئے اپنے زمانے کے رسول پر ایمان لے آئے گا وہ اس مرتبے کا ستحی ہو گا۔ یہودیوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ ہماری بخات کے لئے بھی بس حضرت موسیٰ پر ایمان لانا کافی ہے اور اگر یہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاسے تو کوئی حرج نہیں،

وَقَالُوا أَكَنْ تَعْلَمَ النَّارَ إِلَّا أَيْتَمَا تَعْلَمُ وَدَأَتِ طَرَالِ عَرْلَنْ (۳۷)

اُدراخنوں نے کہا کہ یہیں آگ نہیں جھوک سمجھی گئی خوبی پر دن

قرآن کریم نے اس پر واضح اذار میں رد کرتے ہوئے فرمایا:-

بَلِّي مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَآحَاطَتْ بِهِ تَحْيِيَّةٌ فَأُولَئِكَ

آمْحَاجُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ه (البقرة: ۸۱)

”یکوں نہیں جس شخص نے کوئی بُر کام کیا اور اس کی وجہ اُس پر جگہ

تو ایسے لوگ آگ کے ستحی ہیں، وہ اس میں بھیشہ رہیں گے“

(۲) یہودیوں کی تیسری گمراہی یہ تھی کہ وہ تورات کی بہت سی آیتوں کو چھپاتے تھے، تاکہ دنیا لاوں میں ان کا بلند مرتبہ برقرار رہے، انھیں خطرہ تھا کہ اگر اس قسم کے احکام لوگوں کو معلوم ہو گئے اور انھوں نے یہ دیکھا کہ ہمارے علماء ان پر عمل نہیں کرتے تو وہ آن سے بداعتِقاد ہو جائیں گے، اور عزت و شرف کا جو مقام انھیں حاصل ہے، وہ جاتا رہے گا،

چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت والی آیتیں وہ آیتیں جنہیں نہیں کو سننگسار کرنے کا حکم تھا چھپا رکھی تھیں اور آپس میں یہ تاکید کرتے رہتے تھے کہ دیکھو یہ باتیں کسی مسلمان کو نہ بتا دینا، قرآن کریم نے ان کی اس چھالت کا جگہ جگہ پر وہ چاک کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں کہ:-

أَتَحِنُّ ثُوَّاهُمْ بِمَا فَتَحْمَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيَحْجَاجُوْ كُمْ بِهِ عِنْدَ

رَبِّنَكُمْ، (بقرۃ: ۶۴)

”کیا تم مسلم انوں کو وہ باتیں بولا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نکشف کر دی ہیں، تبھی ہو گا کہ وہ تم کو مغلوب کر دیں گے تمہارے پر درگار کے پاس“

لصاڑی | یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا متبوع کہتے تھے، اُن کی بیٹے پہلی گڑا ہی اُن کا ”عقیدہ تسلیث“ تھا، یعنی یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) تین احسان (اقانیم) ہیں، جو بعض اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ محدود ہیں، اور بعض اعتبار سے مختلف، پہلا جز، ”بَاب“ ہے، دوسرا جز ”بیٹا“ اور تیسرا جز ”روح القدس“ ہے، اور بیٹے کا جائز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رواۃ دھار کر دنیا میں آیا تھا،

اللہ تعالیٰ نے جہالت کے اس مضمون خیز نظری کو علم کی روشنی سے رد فرمایا، اور جا بجا یہ جتنا دیکھی تو ایسی بے سروپا بات ہے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے پناہ منجھتے ہیں،

وَإِذْ كَانَ اللَّهُ يُعِيسَى إِنْ مَرِيَّا أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ أَتَعْذِنُ وَنِي وَأَنْتَ
إِلَهَنِيْ مِنْ دُوْنِنِ اللَّهِ قَالَ سُبْلُحَنَكَ مَا يَكُونُ لِيْ إِنْ أَقُولَ
مَا لَيْسَ لِيْ يَعْلَمُ إِنْ كُنْتَ قُلْتَهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمَ مَا فِي الْفَسْقِيْ
وَلَا أَغْشِمُ مَا فِي الْفَسْقِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَامُ الْغَيْوَيْ... إِنْ تَعْدِيْهُمْ
فَإِنَّهُمْ عَبَادُكَ لَئِنْ تَغْفِيْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (اللهۃ: ۱۷)

”اور جب کہ اللہ نے کہا تھا کہ اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے بجا بے معبود بناؤ؟ انہوں نے کہا کہ پر درگارا، آپ پاک ہیں میرے لئے یہ شایاں نہیں کہ وہ باتیں کہوں جن کا مجھے حق نہیں پہنچتا، اگر میں نے ان سے کہا ہوتا تو آپ ضرور جانتے، آپ وہ تمام باتیں جانتے ہیں جو میرے دل میں ہیں، اور میں وہ باتیں نہیں جانتا جو آپ کے دل میں ہیں بلاشبہ آپ چھپے ہو سے بھی دردیں کے جانتے والے ہیں... اگر آپ انھیں

عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں ہی، اور اگر آپ ان کو بخشن دیں تو وہی کوئی تجھب کی بات نہیں کیوںکہ آپ بڑے بختے ولے اور مہربان ہیں یہ بست پرست مشرکین کی طرح یہ بھی انکار رساالت، تشبیہ اور تحریف کے مرتکب تھے، جن پر بار بار تشبیہ فرمائی ہے،

منافقین | یہ آن شریز بد طینت، بزدل اور کم حوصلہ انسازیں کا گردہ تھا، جن کا عقائد کا اعلان کر سکیں، اس نے زبان سے توحید رساالت، اور یوم آخر کا اقرار کرتے تھے، اور در پرداہ مسلمانوں کے خلاف سازش کے جال تیار کرتے رہتے تھے، ان میں سے بعض تو وہ تھے جو صرف سازش اور دغباڑی کے ارادہ سے کلے تو یہ بڑھتے تھے، مگر ان کا دل کفر و شرک کی تمام شقاوتوں سے پُر تھا، اور بعض وہ تھے جو اپنے بڑے بڑوں کو اسلام لاتا دیکھ کر خود بھی زبان سے اسلام لانے کا افترار کرتے تھے، گویا آن کے نزدیک اصل مسئلہ اپنے بڑوں کی اتباع تھا، اگر وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر ہتھے اور اگر وہ مسلمان ہیں تو یہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگتے تھے، چونکہ ان منافقوں کے کوئی مستقل عقائد نہیں تھے، بلکہ یہ زبان سے اپنے آپ کو اسلامی عقائد ہی کے پیرو کتھے تھے، اس نے ظاہر ہے کہ آن کے عقائد پر رد کرنے کا تونکوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ قرآن کریم نے آن کی بد طینتی اور سازشی حوصلت کو جگہ جگہ بے نقاب کیا ہے، اور آن کی خباشوں کے پول کھولے ہیں، اس کے نمونے دیکھنے ہوں تو سورہ توبہ اور سورہ انفال پڑھ جائیے، ان دونوں سورتوں میں باری تعالیٰ نے آن کی گندگیوں کو ایک ایک کر کے بیان فرمایا ہے،

احکام

قرآن کریم کا دوسرا مضمون "احکام" ہے، اس میں جن احکام کا ذکر کیا گیا ہے،

انھیں ہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے تین قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:-
 را، وہ احکام و قوانین جو غالص اللہ کے حقوق سے متعلق ہیں جنھیں مختصر الفاظ میں
 خالص "عبارات" کہا جا سکتا ہے، اس میں بھارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، تربیتی اور رجع
 کے احکام داخل ہیں، لور قرآن کریم نے ان چیزوں سے متعلق بنیادی ہدایات عطا
 فرمائی ہیں،

(۲) وہ احکام و قوانین جو غالص بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں جنھیں عموماً "معاملہ"
 سے تعبیر کر سکتے ہیں، مثلاً تجارت، قضا، شہادت، امانت، اگر دی رکھنے، ذمیح جافور دوں کو
 سکانی، مختلف مشدیات کے ستمان، وصیت اور میراث وغیرہ ان کے احکام خود قرآن کریم
 میں موجود ہیں،

(۳) وہ احکام و قوانین جو بعض حیثیت سے عبارت ہیں اور بعض حیثیات کے معاملہ
 اس نوع میں سے نکاح و طلاق، حدود و تعزیرات (Criminal Laws) دیا،
 تناص (Torts)، جیار، ایمان، قسمیں اور شرکت کے احکام قرآن کریم نے
 ذکر نہ مانے ہیں،

فتر آن کریم جو نکہ دنیا کو ایک ایسا پاکیزہ نظام حیات دیتا چاہتا ہے جس پر بزرگ
 میں عمل کر کے انسان امن و سکون پا سکیں، اس لئے اس نے اپنے احکام نافذ کرنے دقت
 "تیریجی انداز" اختیار کیا، یعنی کوئی غیر مترقب حکم بکایک نہیں دیدیا، بلکہ پہلے اپنے
 اس حکم کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا، اور بعد میں اُسے نافذ فرمایا، اس کی ایک مثال شراب
 کی حرمت ہے، اہل عرب شراب کے ایسے متولے تھے کہ ان کی زبان میں اس کے ڈھائی سو
 نام ہیں، ان سے اس خوبی عادت کو چھڑانا قرآن کریم ہی کا مجرم ہے، جب شردع
 میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کی حللت و حرمت کے بارے میں شریعت
 کا حکم پوچھا گیا، تو قرآن نے فوراً یہ نہیں فرمادیا کہ اسے چھوڑو بلکہ ارشاد ہوا:-

قُلْ فِيمَا أَشْهُدُكَبِيُّ وَمَنَافِعُ الدُّنْيَا إِنَّمَّا هُمَّا

أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا، (البقرة: ۲۱۹)

آپ کہدیجے کہ ان دشرا ب اور جو لے میں بڑا فقسان ہے اور لوگوں کے لئے پچھے فائدے بھی ہیں، اور ان کا فقسان اُن کے نفع سے زیادہ بڑا ہے، سلیم الفطرت انسان اسی سے سمجھ گئے کہ اس چیز کو چھوڑ دینا، اسی بہتر ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد حکم نازل ہوا،

لَا تَقْرَبُ الصَّلْوَةَ وَأَسْتَعِنُكُمْ سَكَارَىٰ، (النساء: ۳۲)

ئیسے کی حالت میں نماز کے قرب مت جاؤ ॥

اب عام طور پر دہنوں میں شراب کی ناپسندیدگی بیٹھ چکی تھی، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد واضح حکم نازل ہو گیا کہ،

إِذَا أَخْمَرَ وَالْمَيْسِرَ وَالْأَنْسَابَ وَالْأَنْذَالَمُرْجِسَ

فَمَنْ حَمَلَ الشَّيْطَنَ فَاجْتَبَيْتُهُمْ، (المائدہ: ۹۰)

" بلاشبہ شراب، بجوا بست اور لالڑی کے تیر، گندگی کی چیزیں اور شیطان کا عمل ہیں، لہذا تم ان سے پر بیز کرو ॥"

شانِ تزویل | قرآن کریم میں جس قدر احکام مذکور ہیں وہ دو طریقے سے نازل ہوتے، (۱) مسلمانوں یا کافروں میں کوئی غلط راجح تھا اس کو بدلتے کی اللہ تعالیٰ نے خود ہی صدورت محسوس فرمائی، اور اس کے لئے آیت نازل ہو گئی

اس طرح بعض اوقات ایک ہی آیت نے کئی کئی غلط رسوم کو ختم کر دیا، مثلاً حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اہل عرب کا ایک معمول یہ تھا کہ اپنے زیر سر برستی یعنی عورتوں کے مال دو لوت اور حسن و جمال کی وجہ سے اُن سے شادی کر لیا کرتے تھے، پھر آن کونان و نفقہ اور ہر اس معیار کا نہیں دیتے تھے جس معیار کا وہ دوسری عورتوں سے بخاچ کرنے پڑتے، حضرت ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ اہل عرب دنی دنی عورتوں سے بیکی قت شادی کر لیتے تھے اور حب اُن کے مصارف ادا کرنے پر قادر نہ ہوتے تو اپنے زیر سر برستی یعنی عورتوں کے مال میں خرد بُرد کرتے تھے،

حضرت عکرمؓ فرماتے ہیں کہ اہل عرب دس دس بیویاں رکھتے تھے، مگر ان کے

درمیان عدل و انصاف کا معاملہ نہیں کرتے تھے،
اہل عرب کے یہ تمام طریقے عمل غلط تھے، اور اسلامی معاشرہ میں انھیں بدلتے
کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک جامع آیت نازل فرمادی جس نے ان تمام
خراپوں کا قلع تھع کر دیا،

**وَإِنْ خَفْتُمْ أَلَا يُقْسِطُوا فِي الْأَيْمَانِ فَإِنْ كُفُوا مَا طَابَ لَهُمْ
مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَمُكَلَّثَةً وَرُبَّاعَةً، فَإِنْ خَفْتُمْ أَلَا تَعْدِلُوا
فَوَاجِدَةً، (نساء: ۳۰)**

اور اگر تمہیں یہ اندریشہ ہو کہ بیویوں کے بارے میں انسات ہمیں کرسکو گے تو
دوسری عورتوں میں سے جو تمہارے لئے حلال ہیں ان سے نکاح کرو، دوسروں سے
تین تین سے، چار چار سے، پھر اگر تمہیں انذشت، ہو کہ انساف شکر سکو گے، تو ایک
ہی سے نکاح کرو ۴

جو لوگ اپنی زیر پر درش تیم عورتوں سے شادی کر کے انھیں پورے حقوق نہیں
دیتے تھے، اس آیت نے انھیں یہ حکم دیا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ تم اپنی تیم عورتوں سے
شادی کرو، اور مرنے تمہارے لئے دوسری عورتوں میں سے چار تک نکاح کرنا جائز قرار
دیا ہے، ان سے نکاح کرو، جو لوگ دس دس عورتوں سے نکاح کر ڈالنے تھے اور ان کے
مصارف سے نکال ہو جانے پر تیموں کے مال میں ٹھُرد بُرد کرتے تھے، انھیں شادی
کی ایک معقول حد بتلادی کہ چار سے آگے نہ بڑھو، تاکہ مصارف لتنے زیادہ ہی نہ ہوں
کہ تیموں کے مال میں گرد بڑی تک نوبت پہنچے، اور جو لوگ دس دس بیویوں سے نکاح کر کے
آن کے درمیان بے انصافی کے مجرم تھے، انھیں بھی یہ فرمادیا گیا کہ چار سے زیادہ شادیاں
نہ کر دتا کہ عدل و انصاف پر قائم رہنا آسان ہو، اور اگر ان میں بھی بے انصافی کا خوت
مہے تو بس ایک بیوی پر اکتفا مکرو،

اس طرح اس ایک آیت نے بیک وقت کی خراپوں کا انسدا کر دیا،
۴) احکام کے نازل ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوتا تھا کہ کسی خاص واقعہ کے

پیش نظر صحابہؓ نے کوئی مسئلہ پوچھا تو اس پر آیت نازل ہو گئی، اس کی مثالیں اُسبابِ نزول“
کے عنوان کے تحت پیچے گذرا چکی ہیں،

قصص

قرآن کریم کا تیسرا دراہم مضمون ”قصص اور واقعات“ ہیں، قرآن کریم میں جو واقعات
بیان ہونے یہں انھیں دو قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ واقعات جو ماضی
سے متعلق ہیں اور دوسرے وہ جو مستقبل سے متعلق ہیں،

ماضی کے واقعات علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے ہیں، اور ان کے
علاوہ بعض نیک یا نافرمان افراد اوقام کے واقعات بھی مختلف جھگھوں پر ذکر کریں،
قرآن کریم میں سُلْطَانِ انبیاء علیہم السلام کے واقعات ذکر فرمائے گئے ہیں
جن کے اسماء گرامی تاریخی ترتیب سے حسب ذیل ہیں :-

حضرت آدمؐ، حضرت نوحؐ، حضرت ادریسؐ، حضرت ہودؐ، حضرت صالحؐ،
حضرت ابراہیمؐ، حضرت اسماعیلؐ، حضرت احْمَدؐ، حضرت لوطؐ، حضرت یعقوبؐ،
حضرت یوسفؐ، حضرت شعیوبؐ، حضرت موسیؐ، حضرت ہارونؐ، حضرت یوشعؐ،
حضرت حمزہؐ، حضرت یونسؐ، حضرت الیاسؐ، حضرت الیشعؐ، حضرت شموئیلؐ،
حضرت داؤدؐ، حضرت سُلیمانؐ، حضرت ذوالکفلؐ، حضرت عُزیْرؐ، حضرت زکریاؑ،
حضرت یحییؑ اور حضرت علیؑ علیہم السلام،

ان حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ مندرجہ ذیل افراد اوقام کا ذکر
قرآن کریم میں موجود رہے:-

اصحابِ الجنة، اصحابِ القریۃ، حضرت لقمانؐ، اصحابِ التبت، اصحابِ البر،
حضرت ذوالقینینؐ، اصحابِ الکھف والرّیقیم، قوم شبا، اصحابِ الاخدرو، اصحابِ افیل؛
ان قصوٰں کو بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصد تاریخ مختاری نہیں ہے، بلکہ

وہ ان قصوں کریا دلکش طرف تو تذکرہ موعظت کا سامان ہتھیا فرماتا ہے، اور مسلمانوں کو انہیا کرام کی دعوت و عویسیت سے بچنے یعنی پر محروم کرتا ہے از دسری طرف یہ واضح کردیتا چاہتا ہے کہ سابقہ قوموں اور امّتوں کے یہ بصیرت افراد سچے واقعات اس ذاتِ گرامی کی زبان پر جاری ہو رہے ہیں جو بالکل اُنمیٰ ہے، اور اس نے آج تک کسی کے پاس رہ کر اس قسم کا کوئی علم حمل نہیں کیا اس نے یقیناً اسے المدعیان کی طرف سے باخبر کیا جاتا ہے، اور جو کلام وہ تلاوت فرماتے ہیں وہ کوئی انسانی کلام نہیں خدا کا کلام ہے،

پھر ان قصوں کے درمیان علم و حکمت کے بے شمار خذلانے پوشیدہ ہیں اور ان کی ہدایت انسان کو زندگی کے ان گفتگوں مسائل پر صحیح اور بہترین رہنمائی عطا کرتی ہے،

و اقuaط میں تکرار کیوں؟ | قرآن میں جو راتuat بیان ہوئے ہیں، ان سے متعلق عماں طور پر فروہن میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے، کہ قرآن کریم میں ایک ہی قسم کو بعض اوقات کئی کسی بارہ بڑا گیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ کا داحظہ قرآن کریم میں بہتر مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، ایسا کیوں ہے؟ اگر ایک قصر ایک ہی جگہ سیان کر دیا جائے اور بقیہ مقامات پر احکام بیان ہو جاتے تو امت کے لئے شاید زیادہ آسانی کا موجب ہوتا اور بہت سے اختلاف ختم ہو جلتے،

۱۔ سببہ کا جواب یہ ہے کہ دراصل قصوں کو بار بار ذکر کرنے میں کئی لمحتیں ہیں،

(۱) قرآن کریم دفعہ ایک مرتبہ نازل نہیں ہوا، بلکہ تدریجیاً آڑابے، اور اس امت کیلئے

آڑابے جسے لپٹنے ابتدائی دو ریں قدم پر نت نئی آزمائشوں اور بے شمار تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، بلکہ اگر دوں کہا جائے تو کچھ بے جانہ ہو گا کہ اس امت کی پوری زندگی ہی اپنی ترقی کے ذریعیں چہارو قتال، حرب و ضرب، سرفوشی و جانبازی اور حننوں میں گزری ہے، ایسی صورت میں اگر انہیں بار بار قسیل ندی جاتی تو وہ دل شکستہ ہو یعنی، چنانچہ قرآن کریم نے ہر اس موقع پر بچھلے انیصار کے واقعات سنائے جہاں مسلمانوں کو دشواریاں پیش آئیں، اور بار بار انہیں یہ بتلایا کہ ان آزمائشوں میں تم تھنا نہیں ہو، بلکہ دعویٰ حق کا ہر قافلہ ان کھٹکیں دادیوں سے گذر رہے اور انجام کا رسیشہ کامیابی و کامرانی نے اس کے

قدم پُوچھے ہیں،

بھی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایک بھی کا داقہ بھی قرآن حکیم میں یک جا نہیں ہوتا بلکہ اس کے متفرق حصے مختلف مقامات پر مذکور ہیں، جس موقع پر جس پیغمبر کے جس داقے کی ضرورت ہوئی اس موقع پر اسی کو نازل فرمایا گیا،

(۲) دوسری بحث یہ ہے کہ قصوں کے اس تکرار سے یہ بات واضح انداز میں معلوم ہوتی ہے کہ نظر آن حکیم جزویات احکام بیان کرنے کے لئے نازل نہیں ہوا، وہ احکام کے صرف اصول بیان فرماتا ہے، اور اس کا بنیادی مقصود عقائد کی اصلاح، تنبیہ اور خوش کردار پر اجھار نہیں، رہنمائی جزویات، سورہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و قشیرخ پر چھوڑ دیتے ہیں، اور انھیں وہ وحی غیر متولے ذریعے دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے، نظر آن کریم کا یہ طرزِ عمل صحیح، حدیث "پر ایک بڑی واضح دلیل ہے، کیونکہ اگر فقر قانون میں صرف قرآن جنت ہوتا اور احادیث جنت نہ ہوتیں، تو قرآن کریم میں بار بار قصہ بیان کرنے کے بجائے احکام بیان فرمائے جاتے، اور قصوں کو وحی غیر متلوک ذریعہ بیان فرمادیا جاتا، ظاہر ہے کہ قصہ بیان کرنے سے جو مقصود رکھ کر گزیا اس طرح بھی بد رحمہ اتم پڑا ہو جاتا، مگر یا رسم تعالیٰ نے اسکے عکس ترتیب رکھ کر گزیا اس بات پر تنبیہ فرمادی ہے کہ قرآن عقائد و اخلاق کی تربیت کے لئے آیا ہے، اور صرف اصول احکام بیان فرماتا ہے، اور جزویات کے بارے میں اس کا ارشاد یہ ہے:-

فَلَا وَرَبِّ يُؤْمِنُونَ عَمَّا يُحَكِّمُونَ فَيُنَمَّا شَعَرَ بَيْنَ هُنْمُ
ثُمَّ لَا يَجِدُونَ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا إِذَا فَضَيْتَ رَبِّيَّسَلَّمُوا
تَسْلِيمًا (النساء : ۶۵)

"بس، نہیں، آپ کے پروگار کی قسم: وہ ایمان نہیں لاسکتے تا قتیلہ وہ آپ کو اپنے مختلف نیہ معاملات میں فیصلہ بنالیں، اور جھاؤ گئے کہ فیصلہ سے دل میں پانچ کوئی تنگی محسوس نہ کریں (بلکہ) اسے خوب ابھی طرح تسلیم کر لیں یہ

(۳) قصوں کے مکرر ہونے میں ایک تیسری بحث یہ بھی ہے کہ اس سے اعجاز قرآن کا

منظارہ ہوتا ہے، انسان کی نفیات کا تقاضا ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار سنتے رہنے سے اکتا جاتی ہے، اور چند مرتبہ کے بعد ایک لچھے خاصہ ولقے میں بھی اُسے کوئی حظیا لطف محسوس نہیں ہوتا، مگر فترآن کریم اگرچہ ایک ہی ولقے کو بار بار ذکر فرماتا ہے، مگر اس میں ہر بار نئی لذت اور ہر مرتبہ نیا کیف محسوس ہوتا ہے، یہ بات انسان کو بیختم اس نتیجے تک پہنچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ یہ کلام یقیناً کبی شیری داغ کا جنم دیا ہوا نہیں ہے، مُستقبل کے وَاقعَاتُ [قرآن کریم نے پیشگوئی کے طور پر مستقبل کے واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں، اس قسم کے واقعات میں

قیامت کی نشانیاں، قیامت لے احرال، حشرنشرا کا منظر، دوزخ کی ہولناکیاں اور جنت کی دل فشنیاں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ قیامت سے پہلے زیوں سے ایک بولتے ہوئے جائز رکا نمودار ہونا، یا جرج دما جرج کا خروج، صور اسرافیل، سوال و جواب اور چہنیوں کے باہمی مکالمے فترآن کریم میں متعدد جگہوں پر موجود ہیں،

امثال

قرآن کریم میں جو امثال مذکور ہر نیں ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک ترہ امثال جو کسی بات کو سمجھنے کے لئے تمثیل کے طور پر سبیش کی گئی ہیں، مثلًا:

مَكَلَ الَّذِينَ يُنِيقُوْنَ آمُوا الْهَمَّةَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَكَلَ حَبَّةَ آنْجَتَتْ سَبْعَ سَنَاءِلَ فِي مُكْلِ سُبْتَلَةِ مَا عَنَّهُ حَبَّةَ، (البعرة: ۲۶۱)
جو لوگ اپنے ماں کو اسٹکی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی حالت اُسی یح کی سی ہے

جس نے شاہت خوشے اُگانے ہوں اور برخوشے میں سو سو دلے ہوں:

بتلانا یہ قصور ہے کہ امّلہ کی راہ میں خرچ کرنے ہوئے ماں کا بدلہ آخرت میں سات سو گنا بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ ملتے گا، انسانی عقل اس کو ذرا بعید سمجھ سکتی ہی اس نے ارش تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا دیا، کہ جس طرح زمین میں ڈالا ڈا ایک بیچ درخت پر سات سو نئے یج لے کر نمودار ہوتا ہے، اسی طرح دنیا میں خرچ

سیاہو امال آخرت میں سات سو گناہ بڑھ کر انسانی کو ملے گا،
اس قسم کی تہذیبات بات کو پوری طرح واضح کرنے اور نور بنانے کے لئے رائنا
گئی میں، امثال کی دوسری قسم رہے جسے اردو میں "کھادت" کہتے ہیں، اس قسم کی
اخال قرآن کریم میں دو طرح مذکور ہوئی ہیں، بعض توہہ یہں جو نزول قرآن کے
بعد ہی کھادت ہیں، گویا ان کا موجہ ہی قرآن ہے، مثلاً:-

هَنْ يَرَأُ إِلَّا إِلْحَافَ إِلَّا إِلْحَافَ حَسَانٌ رَّحْمَنٌ (۴۰:)

اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ۲۲

اوہ :-

وَأَنْ تَعْفُوَ عَنِ الْفَرِيْبِ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (البقرة: ۲۲۸)

اور معاد کر د تو یہ تقوی کے زیادہ قریب ۲۲

کھادتوں کی دوسری قسم رہے جس میں صراحت کوئی کھادت تو نہ کوئی نہیں، مگر
آبیت، کے مفہوم سے نکلتی ہے، گویا وہ یا تو عارمی سرپرالا امثال کا سرچشمہ ہیں، یا آن کی نظر
دلالت کرتی ہے، ایسی امثال کو "امثال کامنہ" کہا جا سکتا ہے، اس کی قرآن کریم میں
بلے شمار مثالیں ہیں، مثلاً ایک عربی کھادت مشہور ہے کہ:-

لَيْسَ الْخَبَرُ كَمَا لَأَعْيَانَ

فَنَبِدَهُ كَمَا بُودَ مَا نَسِدَ دِيْرَهُ

یہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں موجود ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ "آپ مجھے دکھلائیے کہ آپ ترددے کو زندہ کس طرح
کرتے ہیں؟" اس پر باری تعالیٰ نے پوچھا: "کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟" تب
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:-

بَلَى رَبِّنِيْنَ لَيْسَ مِنْ فَتَّاهِيْ

"یکروں نہیں؛ رہیں ایمان رکھتا ہوں) مگر

رُمْشَبَرْ دَرْخَوَسْتَ اس اُرْکَہِ کَہْرَبَہِ مِرْدَلِ مَطْعَنْ بُوْجَهَ

اسی ملرح مثل مشہور ہے:-

لَأُبْلِدَنِّ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ حَمِيرٍ مُّرَتَّبِينَ

”مسلمان کو ایک سوراخ سے دو مرتبہ

ہنپس ڈساجا سکتا“

یہ سورہ یوسف کی آیت میں موجود ہے، جب حضرت یوسف، علیہ السلام کے
ماں شریک بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوں میں ڈالنے کے بعد
حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ بنی آیمن کو بھی بھیج جائی
تو انہوں نے فرمایا:-

هَلْ أَمْكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمْكَمْتُكُمْ

عَلَى أَخِيهِ (یوسف: ۶۲)

کیا میں تمہیں اس کے بارے میں ایسا ہی امانتدار
بھجوں جیسا کہ اس کے بھائی کے بالے میں سمجھا تھا ؟

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَسْدُو

علم تفسیر

تعارف

اصول

تاریخ

باب اول

علم تفسیر و راس کے مأخذ

تعارف:

لفظ "تفسیر" دراصل "فسر" سے بھلاہے، جس کے معنی ہیں "کھولنا" اور اس علم میں چونکہ قرآن کریم کے مفہوم کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے، اس نے اُسے "علم تفسیر" کہنے میں چنانچہ قدم زمانے میں تفسیر کا اطلاق قرآن کریم کی تشریح ہی پر ہوتا تھا، اور عہد رسالت سے قرب اور علوم کے اختصار کی بنار پر اس علم میں زیادہ شاخیں نہیں تھیں، لیکن جب اس نے ایک مرد ان علم کی صورت اختیار کی اور مختلف پہلوؤں سے اُس کی خدمت کی گئی تو یہ ایک انتہائی وسیع اور پہلو دار علم بن گیا، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں تفصیلات کا اضافہ ہوتا چلا گیا، اب "علم تفسیر" جن تفصیلات کو شامل ہے اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

لہ چنانچہ علامہ زکریٰ نے علم تفسیر کی مختصر تعریف یہ کی ہے: "علم یعرف به فہم ستاب اللہ المنزل علی نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم و بیان معانیہ واستخراج احکامہ و حکمہ" یعنی "علم جس سے قرآن کریم کا فہم ٹھیل ہوا اور اس کے معانی کی دھناعت اور اس کے احکام اور حکمتوں کا استنباط کیا جاسکے" (ابرار، ص ۱۲۷ ج ۱)

عِلْمٌ يُبَحَّثُ فِيهِ عَنْ كَيْفِيَّةِ التَّعْلِيقِ بِالْفَاظِ الْقُرْآنِ وَمَمْلُوكٌ لِّهَا
وَأَخْكَامُهَا الْأَفْرَادِيَّةُ وَالْتَّرْكِيَّةُ وَمَعَانِيهَا الَّتِي تُعْمَلُ عَلَيْهَا
حَالَةُ التَّرْكِيبِ وَشَهَادَتُ الْمُلْكِ لَهُ

"علم تفسير و ملم ہے جس میں الفاظ قرآن کی ادایگی کے طریقے، اُن کے مفہوم، اُن کے افرادی اور ترکیبی احکام اور اُن معانی سے بحث کی جاتی ہے جو اُن الفاظ سے ترکیبی حالت میں مراد نئے جلتے ہیں، نیز اُن معانی کا تحلیل، تاسیع و نسخ، شائی تزویل اور مہم قصتوں کی توضیح کی شکل میں بیان کیا جاتی ہے" ॥

اس تعریف کی روشنی میں علم تفسیر مندرجہ ذیل احیاء پر مشتمل ہے:-

۱۔ **الفاظ اتر آن کی ادائیگی کے طریقے**:- یعنی الفاظ اتر آن کو کس طریقے سے پڑھا جاسکتا ہے؟ اسی کی توضیح کے لئے قدیم عربی مفسرین اپنی تفسیروں میں ہر آیت کے ساتھ اس کی فسرا تین بھی تفصیل سے واضح کرتے تھے، اور اس مقصد کے لئے ایک مستقل علم "قراءات" کے نام سے بھی موجود ہے، جس کا مختصر تعارف پچھلے صفحات میں آچکا ہے،

۲۔ **"الفاظ اتر آن کے مفہوم"** یعنی اُن کے لغوی معنی، اس کام کے لئے علم لغت سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے، اور اسی بناء پر تفسیر کی کتابوں میں علم لغت کے حوالے اور عربی ادب کے شواہد بکثرت ملتے ہیں،

۳۔ **"الفاظ کے انفرادی احکام"** یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ اس کا ماذہ کیا ہے؟ یہ موجودہ صورت میں کس طرح آیا ہے؟ اس کا دزن کیا ہے؟ اور اس دزن کے معانی و خواص کیا ہیں؟ ان باتوں کے لئے "علم صرف" کی ضرورت پڑتی ہے،

۴۔ **"الفاظ کے ترکیبی احکام"** یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ دردست الفاظ کے ساتھ مل کر کیا معنی دے رہا ہے؟ اس کی نحوی ترکیب (Grammatical Analysis) کیا ہے؟ اس پر موجودہ حرکات کیوں آئی ہیں؟ اور

Analysis

لئے درج المحتوى، للأتوصى، ص ۲۷۱

کن معانی پر دلالت کر رہی ہیں؟ اس کام کے لئے علمِ نحو اور علمِ معانی سے مددی جاتی ہے،
۵۔ ”ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنی“ یعنی پروردی آئیت اپنے سیاق و سماں
میں کیا معنی دے رہی ہے؟ اس مقصد کے لئے آیت کے مضمایں کے لحاظ سے مختلف علوم
سے مددی جاتی ہے، مذکورہ علوم کے علاوہ بعض اوقات علم ادب اور علم بلاغت سے کام
لیا جاتا ہے، بعض اوقات علم حدیث سے اور بعض اوقات علم اصول فقہ سے،

۶۔ ”معانی کے سچلے“ یعنی آیات قرآن کا پس منظراً درج بات قرآن کریم میں محل ہے
اس کی تفصیل، اس غرض کے لئے زیادہ تر علم حدیث سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس کے
علاوہ بھی یہ میران اتنا وسیع ہے کہ اس میں دنیا کے ہر علم و فن کی معلومات کھپکھتی ہیں
کیونکہ بسا اوقات قرآن کریم ایک مختصر ساجملہ ارشاد فرماتا ہے مگر اس میں حقائق و
اسرار کی ایک غیر منتباہی کا انتہا پوشیدہ ہوتی ہے، مثلًا قرآن کریم کا ارشاد ہے:-
قَرْيْنَ آنْفِسِكُمْ أَفْلَأَ تُبْصِرُنَ ۝ (ذاريات)

”او تم اپنی جانوں میں غور کرو، کیا تم نہیں دیکھتے؟“ Physiology

(غور فرمائیئے کہ اس مختصر سے جعلی کی تشریح تفصیل میں پورا علم الابدان ر)

او پورا علم نفسیات (Psychology) سما جاتا ہے، اس کے باوجود یہ
ہمیں تہجا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی تخلیقی حکمت بالغ کے جن اسرار کی طریق
اشارة فرمایا ہے وہ سب پورے ہو گئے، میں چنانچہ تفسیر کے اس ذیلی جز میں عقل و تدبیر
تجربات و مشاہدات کے ذریعے اہتمامی متعدد مضمایں شامل ہو جاتے ہیں،

تفسیر اور تاویل؛

قدیم زمانے میں ”تفسیر“ کے لئے ایک اور لفظ ”تاویل“ بھی بحثت استعمال ہوتا
اور خود قرآن کریم نے بھی اپنی تفسیر کے لئے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے، ”وَمَا يَعْلَمُ
تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ“ اس لئے بعد کے علماء میں یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا یہ دونوں لفظات بالکل
ہم معنی ہیں، یا ان میں کچھ فرق ہے؟
امام ابو عبید وغیرہ نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظات بالکل مارادن ہیں اور دوسرے

حضرات نے ان دونوں میں فرق بیان کرنے کی کوشش کی، لیکن دونوں میں فرق بنانے کے لئے اتنی مختلف آراء، ظاہر کی گئی ہیں کہ ان سب کو نقل کرنا بھی مشکل ہے، مثلاً جندا تو والی یہ ہیں:-

- ۱۔ "تفصیر" ایک ایک لفظ کی انفرادی تشریع کا نام ہے، اور "تاویل" جملے کی جمیعی تشریع کا،
- ۲۔ "تفصیر" الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں اور "تاویل" اصل مراد کی توضیح کو،
- ۳۔ "تفصیر" اس آیت کی ہوتی ہے جس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال ہے، اور "تاویل" کا مطلب یہ ہے کہ آیت کی جو مختلف تشریعات ممکن ہیں اُن میں سے کسی ایک کو دلیل کے ساتھ اختیار کر لیا جائے،
- ۴۔ "تفصیر" یقین کے ساتھ تشریع کرنے کو کہا جاتا ہے، اور "تاویل" تردید کے ساتھ تشریع کرنے کو،
- ۵۔ "تفصیر" الفاظ کا مفہوم بیان کر دینے کا نام ہے، اور "تاویل" اس مفہوم سے بخلاف وائے سبق اور نتائج کی توضیح کا، وغیرہ وغیرہ،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابو عبیدہ، ہی کی راستے درست معلوم ہوتی ہے، کہ ان دونوں لفظوں میں استعمال کے لحاظ سے کوئی حقیقی فرق نہیں، جن حضرات نے فرق بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اُن کے شدید اختلاف آراء پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی معین اور اتفاقی اصطلاح نہیں بن سکی، اگر ان میں حقیقت فرق ہوتا تو ایسے شدید اختلاف کے کوئی معنی نہیں تھے واقعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل علم نے "تفصیر" اور "تاویل" کو الگ الگ اصطلاحات قرار دینے کی کوشش کی ہوگی، لیکن اس میں ایسا اختلاف رونما ہوا کہ کوئی بھی اصطلاح عالمگیر قبولیت حاصل نہ کر سکی، یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک کے مفسرین ان الفاظ کے ساتھ عموماً ہم معنی الفاظ کا سامناعملہ کرتے آتے ہیں، اور ایک کو دوسرے کی جگہ بلا تکلف استعمال کیا جاتا رہا ہے، لہذا اس بحث میں وقت کھپانے کی ضرورت نہیں ہے،

لہ الاتقان، للسیوطی، ص ۲۷۴، ۲۷۵، فرع عکی

تفسیر کے مأخذ

”علم تفسیر“ کے اس مختصر تعارف کے بعد سب سے ضروری بحث یہ ہو کہ ”تفسیر قرآن“ کے مأخذ کیا ہیں؟ یعنی وہ کیا ذراائع ہیں جن سے ہم کسی آیت کی تفسیر معلوم کر سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں قدیم تفصیل کی ضرورت ہے جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہے، سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ آیات قرآنی دو قسم کی ہیں، بعض آیات تو اتنی صاف، واضح اور آسان ہیں کہ جو زبان جانے والا انھیں پڑھے گا، ان کا مطلب فوراً سمجھیں آجائے گا، اسی نئے الیٰ آیتوں کی تفسیر میں کسی اختلاف رائے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، الیٰ آیات کی تفسیر کا مأخذ تو صرف ”لغت عرب“ ہے، عین زبان پر ماہر ان نظر اور عقل سليم کے سوا ان کا مطلب سمجھنے کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن دوسری قسم ان آیات کی ہے جن میں کوئی اجماع، ابہام، یا تشریحی دشواری پائی جاتی ہے، یا ان کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ان کے پولے پیں منتظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یا ان سے دقيق قانونی مسائل یا گہرے اسرار و معارف مستنبط ہوتے ہیں، الیٰ آیات کی تشریح کے لئے بعض زبان کافی نہیں بلکہ اسرار کے لئے بہت سی معلوماتی کی ضرورت ہے، آگے اسی قسم کی آیات کی تفسیر کے مأخذ بیان کئے جا رہے ہیں:-

اس لحاظت سے ”تفسیر قرآن“ کے کلچر آخذ ہیں: خود قرآن کریم، احادیث بنویم، صحابہ کرامؓ کے اقوال، تابعین کے اقوال، لغت عرب اور عقل سليم، ذیل میں ان تمام آخذ کی تھوڑی سی تفصیل اور علم تفسیر میں ان کے مقام کے بارے میں جذب مباحث پیش خدمت ہیں:-

لَهُ وَالْجَاهِنَّ عَلَى الْتَّفْسِيرِ مِنْهُ مَا يَوْقُتُ عَلَى النَّفْلِ ... وَمِنْ مَا لَا يَوْقُتُ أَخْرَاجُ الْبَرَاهِنَ لِلزَّكْشِيِّ^۱
ص ۱، اج ۲ فرع ۱۴، فصل، بعد کلام الصوفیۃ فی القرآن، والاتفاق، ص ۱۸۳ اج ۲ نوع ۶۷
آخر کلام علی التفسیر بالرأی)

پہلًا مَا حَزَ، خُودْ قرآنَ كَرِيمَ

تفسیر قرآن کا پہلًا مَا حَزَ خود دستِر آن کریم ہے، یعنی اُس کی آیات بعض اوقات ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتی ہیں، ایک جگہ کوئی بات بہم انداز میں کہی جاتی ہے، اور دوسری جگہ اس اہم کو رفع کر دیا جاتا ہے، مثلاً سورہ فاتحہ میں ارشاد ہے:-

إِنَّ تَابَ الصَّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ هِيَ أَطْ أَكْذِيرَ

أَنْعَمَتْ عَلَيْهِمْ، (الفاتحہ)

”ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کیجئے، ان لوگوں کے راستے کی جن پر

آپ نے انعام فرمایا“

یہاں یہ بات واضح ہنہیں کی گئی کہ جن لوگوں پر انعام فرمایا گیا ہے، ان سے کون لوگ
ہوا ہیں؟ لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے:-

فَأَوْلَى لِعَذَاقَمَعَ الظِّينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ

وَالْمُصْدِيقِينَ وَالشَّهَدَاءِ وَالصَّلِّيْحِينَ ه (نساء: ۶۹)

”یہ دو لوگ ہیں جن پر انہوں نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدّیقین،

شہداء اور نیک لوگ“

اسی طرح ایک آیت میں ارشاد ہے:-

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ زَرِّتِهِ تَكْلِمَتِ فَتَابَ عَلَيْهِ (التقو: ۱۷)

”پس آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ تو اس نے ان کی توہی

قبول کر لی“

لیکن یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کلمات کیا تھے؟ دوسری جگہ ان کلمات کی وضاحت
فرمادی گئی، ارشاد ہے:-

فَاللَّارَبَنَاظَلَمَنَا أَنْفَسَنَا فَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ وَمَرْحَمَنَا

لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَسِيرِ يُنَّ ه (اعراف: ۲۳)

”انہوں نے رآدم و حوئے، کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جا تو پر ظلم کیا ہے، اور اگر آپ نے ہماری مخفت نہ کی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

نیز ایک مقام پر ارشاد ہے:-

يَا يَعْلَمُ الَّذِينَ آمَنُوا اللَّهُ أَكْبَرُ وَمَنْ أَعْمَلَ الصَّالِحَاتِ فَإِنَّمَا (التوبہ: ۱۱۹)

”لے ایمان والوں اشے ڈرو، اور پچھے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔“

یہاں یہ نہیں بتا یا کیا کہ ”پچھے لوگوں“ سے کون مراد ہیں؟ لیکن ایک دوسری آیت میں اس کی تشریع فرمادی گئی ہے، ارشاد ہے:-

لَيْلَنَ النَّبِيَّ أَنَّ مُؤْمِنَوْا وَمُجْرِمَوْهُ كُمْرُ قَبْلَ الْمُشْرِقِ وَالْمُغْرِبِ بِدِ
وَلِكِنَ النَّبِيَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْأَخِرِ وَالْمَلَكَةَ
وَالْيَكْبِرِ وَالنَّتَنَيْنِ وَلِلَّمَاءَ عَلَى حُجَّتِهِ ذَرِيَّ الْفُصُّ بِلِ
وَالْيَسْمِيِّ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ التَّيْمِيِّ وَالشَّاعِلِيِّنَ وَفِي الْرِّقَاءِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَلِلَّرَّكُوَّةِ وَالْمَعْوَنَ بِعَهْدِ هِيمَادِيَا
عَاهَدَ وَأَجَّ وَالصَّدِيرَيْنِ فِي الْبَاسَاءِ وَالضَّاءِ وَجَعَنَ الْبَاءِ
أَوْ لِتَعْكِيَّكَ الَّذِينَ حَسَدَوْهُ وَأَوْ لِتَعْكِيَّكَ هُمُ الْمُتَعَوْنَ ۝

(القرۃ: ۱۴۴)

مکھ ساری نیکی اسی میں نہیں کرم اپنا منہ مشرق کو کرو، یا مغرب کو، لیکن (صلی) نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اندر تعالیٰ پر لین بن رکھے، اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور رآسمان، کتابوں پر اور سیرپروں پر اور مال دیتا ہو اشد کی محنت میں رشتہ داروں کو اور ربیعوں کو اور محبتا جوں کو اور سافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور (قدیریوں) یا غلاموں کی، گردن چھڑلنے میں، اور رخماں کی پابندی کرتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کریا ہو اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کر لیں اور صبر کرنیوالے ہوں تسلسلتی میں اور تیاری میں اور جنگ کے وقت، یہ لوگ ہیں جو پچھے ہوں، اور یہی لوگ تحریق ہوتے ہیں۔

اس آیت نے یہ بات واضح فرمادی کہ ”صادقین“ سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں، یہ صرف تین مثالیں تھیں، قرآن کریم میں اس قسم کی بہت سی آیات موجود ہیں،

۱۔ ”تفسیر القرآن بالقرآن“ کی دوسری نسخہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی بات اس کی ایک قرأت میں نہیں ہوتی ہے اور دوسری قرأت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے، مثلاً ایک قرأت میں وضو کا طریقہ بیان فرمائے ہوئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَاغْسِلُوا وَصْحُونَهُمْ وَأَيْمَدْ يَكْعُبُ الْمَرَاثِقَ وَ
امْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (الملائمة: ۴۰)

عربی گرامر کی رو سے اس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:-

”تم لپنے چڑوں کو اور ہاتھوں کو کہیں توں تک دھولو، اور پانے سروں کا

مسح کرو، اور پاؤں دھولو“

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:-

”لپنے سروں کا اور پاؤں کا مسح کرو“

لیکن دوسری قرأت میں ”وَأَرْجُلَكُمْ“ کے بجائے ”وَأَرْجُلَكُمْ“ آیا ہے، اس قرأت میں اس کے سوا کوئی ترجمہ نہیں ہو سکتا کہ ”لپنے پاؤں دھولو“ لہذا اس قرأت نے یہ واضح کر دیا کہ پہلی قرأت میں بھی پاؤں دھونے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور اس میں مسح کرنے کا بھروسہ ہو سکتا ہے وہ مراد نہیں ہے،

اس طرح متواتر قراتوں کی روشنی میں فترآن کریم کی جو تفسیر کی جائے وہ یعنی اور قطعی ہوتی ہے، مشہور قراتوں سے اگرچہ علم الیقین تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن تفسیریں اُن کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن شاذ قراتوں کے بارے میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، بعض حضرات اسخین تفسیریں کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور بعض حضرات انھیں ”خرفاحد“ کے درجے میں قبول کرتے ہیں، اس مسئلے کی پوری تفصیل اصول فقرہ کی کتابوں میں مذکور ہے،

۴۔ ”تفصیر الفتنۃ ب القرآن“ کی تیسرا صورت یہ ہے کہ جس آیت کی تفسیر طلب ہے خداوسی کے سیاق و سباق ر Context (پر غور کیا جائے، اس طرح بسا اوقات آیت کے کسی حل طلب مسئلے کی تشریح واضح ہو جاتی ہے، مثلاً سورۃ آحزا میں آنہات المُرْبِّین سے خطاب کرتے ہوتے ارشاد ہے:-

وَقَرَنَ فِي بُيُوتِكُنْ وَلَا تَبَرَّجْ جَنْ تَبَرَّجْ الْجَاهِلِيَّةِ

الْأَفْلَى، (الاحزاب: ۳۳)

”او تم اپنے گھروں میں دستار سے رہو، اور قدیم زمانہ جاہلیت کے

دستور کے مطابق بے پرده مت پھردو۔“

بعض اصول شرعیت سے ناواقف لوگوں نے یہ دیکھ کر یہاں خطاب ازدواج مہتر کو ہو رہا ہے، یہ دعویٰ کر دیا کہ پردے کا یہ حکم صرف ازدواج مہترات ہی کے ساتھ مخصوص ہے عام عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لیکن قرآن کریم کا سیاق و سباق اس دعوے کی تردید کر رہا ہے، اسی آیت کے آگے اور پچھے ازدواج مہترات سے خطاب کرتے ہوئے اور بھی کتنی احکام مذکور ہیں، اور وہ یہ کہ: یونٹ میں نز اکت سے کام نہلو، نیک بات کہو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، ان احکام میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے بالے میں کوئی معقول آدمی یہ کہ سکے کہ یہ صرف ازدواج مہترات کے ساتھ مخصوص ہے، اور دسری عورتوں کے لئے اس پر عمل ضروری نہیں، لہذا ان بہت سے احکام کے بیچ میں سے صرف ایک جملے کے بالے میں یہ کہنا کہ یہ عام عورتوں کے لئے نہیں ہے، دسری آیات قرآنی اور احادیث ہبھوئی وغیرہ کے علاوہ قرآن کریم کے سیاق و سباق کے بھی بالکل خلاف ہی حقیقت یہ ہے کہ یہ سالے احکام تمام مسلمان عورتوں کے لئے ہیں، اور یہاں خاص طور سے ازدواج مہترات کو خطاب صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ ان پر احکام شرعیت کی ذمہ داری زیادہ ہے، اخھیں ان احکام کا زیادہ اہتمام کرتا چاہتے، اسی طرح دسری جگہ ارشاد ہے:-

قَدَّاً أَسْلَمُوهُنَّ مَتَّاعًا فَسُلُّوْهُنَّ مِنْ وَرَائِهِ حِجَّةً لِلْأَزْبَابِ :۵۲
 اور راجح مسلمانوا، جب تم ان راز وراج مہرات) سے کوئی سامان
 مانگو تو ان سے پردے کے پچھے سے طلب کر دی

اس آیت کے بارے میں بھی بعض ناواقف لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف ازدواج مہرات کے ساتھ مخصوص ہے، حالانکہ اسی آیت کا اگلا جملہ وضاحت کر رہا ہے کہ اس حکم کا اطلاق تمام عورتوں پر ہوتا ہے، ارشاد ہے:-

ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقْلُوْدِيْكُمْ وَ قُلُوْدِيْكُمْ هِنْ ط (الاذباب: ۵۳)

”یہ طریقہ تھا اے دول کے لئے بھی اور ان کے دول

کے لئے بھی زیادہ پاکیزگی کا سبب ہے“

اب ظاہر ہے کہ دول کی پاکیزگی صرف ازدواج مہرات ہی کے لئے مطلوب نہیں، بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لئے مطلوب ہے، اس لئے آیت کے حکم کو کچھ خاص عورتوں میں منحصر کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

اسی طرح سورۃ الاذباب ہی میں ارشاد ہے:-

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْنِيْهِ بَعْثَكُمُ الْمُرْجُسَ آهُنَّ

الْبَيْتَ وَ نُطْهِرُ كُمْ نَطْهِرَ آهَ (الاذباب: ۳۲)

”اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے گندگی کو دور کر دے

اور تم کو خوب اچھی طرح پاک کر دے“

بعض لوگوں نے اس آیت کے بلکے میں یہ کہہ دیا کہ ”اہل بیت“ سے مراد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد وغیرہ ہیں، ازدواج مہرات اس میں داخل نہیں، لیکن فترائیں کریم کا سیاق و سباق اس نظریہ کی واضح تردید کرتا ہے، کیونکہ اس آیت کے آگے اور سچے تمام تر خطاب ازدواج مہرات کو ہو رہا ہے، اس لئے یہ کیسے لہ پر دے کے حکم کے عام ہونے پر اور بھی بہت سے واضح دلائل ہیں، یہاں بطور مثال صرف سیاق و سباق کو پیش کیا گیا ہے،

مکن ہے کہ وہ "اہل بیت" کے مفہوم میں داخل نہ ہوں! خاص طور سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:-

أَذْكُرُونَ مَا يُشَوِّقُكُنَّ، (الإِذْبَاب: ۳۲)

اور راءے ازدواجِ نبیؐ تھا حالکے گھروں میں جو تلاوت ہوتا ہے

ہے اُسے یاد کرو!

اس میں لفظ "سیوت" نے واضح کر دیا کہ پچھلی آیت میں "آہل الْبَيْت" کے مفہوم میں ازدواج مہلرات تو سب سے پہلے داخل ہیں، انھیں اس آیت سے الگ نہیں کیا جاستا! یہ صرف چند مثالیں تھیں، ورنہ قرآن کریم پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر کے بہت سے حل طلب مسائل سیاق و سبان کو دیکھ کر حل ہو جاتے ہیں، البتہ کبھی سیاق و سبان سے آیت کی تفسیر اتنی واضح ہو جاتی ہے کہ اسے کوئی بھی عقولیت پسند آدمی رکھنے کر سکتا، ایسی تفسیر قطعی اور لقینی ہوتی ہے، اور بعض مرتبہ سیاق د سیاق کی مرد سے جو تفسیر کی جاتی ہے وہ اتنی واضح نہیں ہوتی، چنانچہ اسے قبول کرنے یا رد کرنے میں مجہد علماء کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں،

یہ "تفسیر القرآن بالقرآن" کا اجمالی تعارف تھا، بعض حضرات نے ایسی پڑھی تفسیر بھی لکھی ہیں جن میں ہر آیت کی تفسیر کسی دوسری آیت سے کرنے کا الزام کیا گیا، اسی اس قسم کی ایک تفسیر علامہ ابن حوزیؓ نے لکھی ہے، اور علامہ سیوطیؓ نے الاتفاق میں اس کا ذکر کیا ہے،

اسی نوعیت کی ایک گرانقدر کتاب مدینہ طیبہ کے ایک عالم شیخ محمد امین بن محمد بن فشنقیطی (رحمۃ اللہ علیہ) نے چند سال پہلے تایفعت کی ہے، جو "أصنوار البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے تفسیر القرآن بالقرآن کی مختلف صورتیں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہیں،

لہ الاتفاق، ص ۱۵، ۱۶، ۱۷ فوری ۱۹۷۷ء،

لہ اصنوار البیان، ص ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۴۱۰، ۴۴۱۱، ۴۴۱۲، ۴۴۱۳، ۴۴۱۴، ۴۴۱۵، ۴۴۱۶، ۴۴۱۷، ۴۴۱۸، ۴۴۱۹، ۴۴۲۰، ۴۴۲۱، ۴۴۲۲، ۴۴۲۳، ۴۴۲۴، ۴۴۲۵، ۴۴۲۶، ۴۴۲۷، ۴۴۲۸، ۴۴۲۹، ۴۴۳۰، ۴۴۳۱، ۴۴۳۲، ۴۴۳۳، ۴۴۳۴، ۴۴۳۵، ۴۴۳۶، ۴۴۳۷، ۴۴۳۸، ۴۴۳۹، ۴۴۳۱۰، ۴۴۳۱۱، ۴۴۳۱۲، ۴۴۳۱۳، ۴۴۳۱۴، ۴۴۳۱۵، ۴۴۳۱۶، ۴۴۳۱۷، ۴۴۳۱۸، ۴۴۳۱۹، ۴۴۳۲۰، ۴۴۳۲۱، ۴۴۳۲۲، ۴۴۳۲۳، ۴۴۳۲۴، ۴۴۳۲۵، ۴۴۳۲۶، ۴۴۳۲۷، ۴۴۳۲۸، ۴۴۳۲۹، ۴۴۳۳۰، ۴۴۳۳۱، ۴۴۳۳۲، ۴۴۳۳۳، ۴۴۳۳۴، ۴۴۳۳۵، ۴۴۳۳۶، ۴۴۳۳۷، ۴۴۳۳۸، ۴۴۳۳۹، ۴۴۳۳۱۰، ۴۴۳۳۱۱، ۴۴۳۳۱۲، ۴۴۳۳۱۳، ۴۴۳۳۱۴، ۴۴۳۳۱۵، ۴۴۳۳۱۶، ۴۴۳۳۱۷، ۴۴۳۳۱۸، ۴۴۳۳۱۹، ۴۴۳۳۲۰، ۴۴۳۳۲۱، ۴۴۳۳۲۲، ۴۴۳۳۲۳، ۴۴۳۳۲۴، ۴۴۳۳۲۵، ۴۴۳۳۲۶، ۴۴۳۳۲۷، ۴۴۳۳۲۸، ۴۴۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۱۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۴، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۵، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۶، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۷، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۸، ۴۴۳۳۳۳۳۳۲۹، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۰، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۱، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۲، ۴۴۳۳۳۳۳۳۳۳، ۴۴۳۳۳۳۳۳۴، ۴۴۳۳۳

دوسرا مأخذ، احادیث نبوی

تفسیر قرآن کا دوسرا مأخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہ واضح فرمایا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں بیوٹ فرمائے کا مقصد ہی تھا کہ آپ اپنے قول و فعل سے آیات قرآنی کی تفسیر فرمائیں چنانچہ سورہ حلق میں ارشاد ہے:-

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ

إِلَيْهِمْ، (الخل: ۳۴)

اور ہم نے قرآن آپ پر اسی نئے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے

وہ بائیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہیں ॥

اس میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ آپ کا مقصد بعثت یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی توضیح فرمائیں، نیزار شار ہے ۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ

يَتَلَوَّ عَلَيْهِمُ اِيمَانُهُمْ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْحِكْمَةَ

وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ لَفْنِ ضَلَالٍ مُّشْيِنٍ ۝ (آل عمران: ۱۶۳)

”blasib اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا، جبکہ ان کے درمیان انہی میں

ایک سیغیر بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرئے، اور انہیں پاک نہ

صاف بنائے، اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت کی تعلیم دئے، اگرچہ وہ اس سے

پہلے کھلی ہوئی گراہی میں تھے ॥

نیز سورہ نسا میں ارشاد ہے:-

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتُخْكِمَ بَيْنَ النَّاسِ

بِمَا أَرَأَكَ اللَّهُ مِنْ، (نساء: ۱۰۵)

”blasib ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب آتا رہی، تاکہ آپ، لوگوں کو

درمیان اُن رہبیات کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہیں۔

اور سورہ خلآ میں ارشاد ہے:-

**وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ أَنْكِتَبَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الْمُّدَّى
الْخَلَفُوا فِيهِ هُدًى وَرَحْمَةً لَّقَوْمٍ لَّا يَعْمَلُونَ ۝**

اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں انتاری مگر اس لئے کہ آپ تو گوں کو وہ تھیں
کھول کھول کر بتا دیں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور بتا کر یہ کتاب
ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت کا سبب ہو۔

اُن آیات میں خود قرآن کریم نے یہ واضح فرمادیا ہے کہ سرورِ کائنات حضرت محمد
صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بیوٹ فرمانے کا مقصود ہی یہ تھا کہ آپ دنیا کو
قرآن کریم کی ہدایات اور اس کے اسرار و معارف سے آگاہ کریں، اور اس کے مطابق
زندگی گزارنے کے طریقے سکھلائیں، اس لئے خود قرآن کریم ہی سے یہ بات ثابت
ہو جاتی ہے کہ آپ کی تعلیمات تفسیر قرآن کا اہم ترین مأخذ ہیں،

یوں بھی اس بات کے لئے بلی چڑی منطق کی ضرورت نہیں کہ کسی آسمانی کتاب
کی صحیح تشریع اس سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے جس پر وہ کتاب نازل ہوئی، اس دنیا میں
اس سے بڑا الحق کرنی ہیں، ہو سکتا، جو یہ کہ کہ قرآن کریم نازل تو آخر حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم پر ہوا تھا، لیکن اس کی تفسیر میں زیادہ جانتا ہوں،

بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر میں آخر
صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت تو مسلم ہے، مگر جو کہ وہ ارشادات ہم تک
قابلِ اعتماد ذراائع سے نہیں پہنچے، اس لئے ہم ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے،

لیکن اس مغالطے کا مطلب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو آخر حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو قرآن کریم کا معلم بن کر بھیجا اور بار بار یہ واضح فرمایا کہ آپ کو کتاب اللہ کی تشریع
و توضیح کے لئے بھیجا جا رہا ہے، اس لئے قیامت تک تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ
آپ کی تعلیمات کی پیروی کریں، اور دسری آپ کی تعلیمات و تشریحات کو قیامت

مکہ باقی رکھنے کا کوئی محفوظ انتظام نہیں فرمایا، کیا یہ بات کوئی ایسا شخص کہہ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالخاور قدرت کاملہ پر ایمان رکھتا ہو؟ اور جس نے قرآن کریم میں ۷۸ آیت پڑھی ہو کر۔

لَا يَحِلُّ لِلَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسَعَهَا،

اللَّهُ تَعَالَى كُلِّ کواس کی دسعت سے باہر کام

کا مختلف نہیں کرتا ہے

بعض لوگ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے لئے تو معالم قرآن تھے، لیکن ہمارے زمانے میں (معاذ اللہ) آپ کی تعلیمات کی ضرورت نہیں رہی، لیکن اس بے شکی بات کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ صحابہ کرام میں جن کی مادری زبان عربی سمجھی جو اس کے ایک ایک لفظ کا التعری اور حجود رائی غور میں جانے تھے، جو نزول قرآن کے پورے ماحول سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ اس سے عمل اگزیر ہے تھے، اور جو ایک ایک آیت کے پورے پس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، انھیں تو کسی پیغمبر کی تعلیم کے بغیر قرآن سمجھو میں نہیں آ سکتا تھا اور ان کے مقابلہ میں اس زمانے کے لوگ جن کی نہ مادری زبان عربی ہے، نہ تزلیل قرآن کا ماحول نہیں ہے اور نہ اس کے پس منظر سے آگاہ ہیں اُن کو قرآن کریم کی تفسیر جانے کے لئے کسی پیغمبر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں؟ اگر ذہن میں عقل و خرد اور دل میں عدل و الصاف کی ادنیٰ رمنتی باقی ہو تو اس بے سرو بیا بات کو کون باور کر سکتا ہے؟

یہ ایک بڑا مفصل موضوع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں وہ کتنے قابل اعتماد ہیں؟ اس موضوع کی تحقیق کے لئے علم حدیث اور اور اسلامی الرساجال کے پورے کتب خلیٰ موجود ہیں، اور اپنی نفسانی خواہشات کے لئے زبردستی شرعی جواز ڈھونڈنے کی بات تو الگ ہی، لیکن اگرچہ درل ان علوم کا مطالعہ کیا جاتے تو انسان اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو یوں ہی رہنمائیک و اجنب الاتباع قرار نہیں دیا بلکہ اگلی

حفاظت کا انتظام فرمایا ہے کہ اس کی تفصیلات دیکھ کر عقلِ انسانی درگ رہ جاتی ہے، حدیث کے درسرے شاخِ درشاخ علم کو چھپوڑ کر سرف ایک اسلامِ الرجال کے علم ہی کو دریکھ لیجئے تو وہ اس امت کا ایسا قابلِ خوازِ محیر العقول کارنامہ ہے جن کی نظیر دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہ ہمارے زمانے تک جس کسی شخص نے کوئی حدیث کہیں بیان کی ہے، اس علم کی کتابوں میں اس کا پورا کچھی چھاؤضاحت کے ساتھ موجود ہے، کہ وہ کہاں پیدا ہوا؟ کس کس سے احادیث کا علم حاصل کیا؟ اکنہن رابرین سے اس کی ملاقات ہوتی؟ اس کا عام کردار کیا تھا؟ قوتِ حافظہ کس درج کی تھی؟ روایت بیان کرتے ہوتے احتیاط کو کس حد تک مدنظر رکھتا تھا؟ اُس کے ہمصر اور بعد کے علماء نے اس کے بارے میں کیا رائے ظاہر کی ہے؟ آج بھی حدیث کی کسی کتاب میں جس حدیث کے جس رادی کا نام چاہتے تھا کمال لیجئے، اسلامِ الرجال کی کتابوں میں اس کے متعلق مذکورہ بالا سوالات کا جواب مل جاتے گا،

یہاں حدیث کی حفاظت کے موضوع پر کوئی مفصل بحث پیش نظر نہیں، اس کے لئے تدریسنِ حدیث پر بھی ہوتی بہت سی میسوٹ کتابیں موجود ہیں، لیکن یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے انکارِ داعرض ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس پر قرآن کریم، عقلِ عام اور داقعاتِ تاریخ کسی بھی اعتبار سے غور کیجئے تیجہ ہمیشہ ہی نہ ٹھکھا گا، کہ اس کی بنیاد یعنی قویت کا کوئی چھینٹا بھی نہیں پڑا،

البته یہ درست ہے کہ احادیث کے موجودہ ذخیرے میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات ملتی ہیں، لہذا جو روایت جہاں مل جائے اُسے پڑھ کر کوئی فیصلہ کر لینا درست نہیں، بلکہ اصولِ حدیث کے مطابق اُسے اچھی طرح جا پہنچنے کی ضرورت ہے، کہ وہ ان اصولوں پر پوری اُترتی ہے یا نہیں، تھا صور سے تفسیر کی کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں اُن کی چھان پھٹک اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ بیشتر مفسروں نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں صرف صحیح کر دی ہیں، محدثانہ طریقے پر اُن کی تحقیق و تفتیش کی بحث کو نہیں

چھیرا، لہذا ان روایات سے صحیک صحیک استفادہ دہی شخص کر سکتا ہے جو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر ماہر از نگاہ رکھتا ہو، اور جسے صحیح و سیم روایات کو پڑھنے کے اصول حاصل ہوں۔

تیسرا مأخذ، اقوال صحابہ

جن حضرات نے قرآن کریم کی تعلیم برائے راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی وہ صحابہ کرام ہیں، ان میں سے بعض حضرات نے اپنی پوری زندگیان اسی کام کے لئے وقت کی ہوتی تھیں کہ فتوح کریم، اُس کی تفسیر، اور متعلقات کو برائے راست آپ کے اقوال و افعال سے حاصل کریں، یہ حضرات اہل زبان بھی تھے، اور نزول قرآن کے ماحول سے پوری طرح باخبر بھی، لیکن انھوں نے اپنی زیاد دانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے قرآن کریم کو سبقاً سبقاً آپ سے پڑھا، اما ابو عبد الرحمن شعیع مشہور تابعی عالمیں وہ فرماتے ہیں :-

حَقَّ الَّذِينَ كَانُوا إِلَيْنَا مُؤْمِنِينَ كَمَعْمَانَ بْنَ عَفَّانَ وَ
عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ وَغَيْرِهِمْ أَكْفَمُ كَانُوا إِذَا تَعْلَمُوا مِنَ
الشَّيْءِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ أَيَّاْتٍ تَمَّ يَعْجَازُونَ فَهَا حَقُّ
يَعْلَمُوا إِمَّا فِيهِمْ هَامَتِ الْعِلْمُ وَإِمَّا لَهُ

رجھابہ کرام ہیں سے) جو حضرات قرآن کریم کی تعلیم دیکرتے تھے، مثلاً حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ، انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپ سے دش آئتیں سیکھتے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے، جب تک کہ ان آئتیں کی تمام علی و عمل بالتوں کا علم حاصل نہ کر لیں ॥

اسی لئے مسند احمد ہیں حضرات انس فرماتے ہیں :-

كَانَ الرَّجُلُ إِذَا أَقَرَّ أَثْبَقَهُ وَالْعَمَانَ جَدَّ فِي وَأَعْيَدَهُ

جب کرنی شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں وہستہ
قابل احترام ہو جاتا تھا ॥

اور متوطناً امام مالک میں روایت ہے کہ :-

آقَمَ إِبْنَ عُمَرَ عَلَى حِفْظِ الْبَقْرَةِ شَمَائِ سِينِيْنَ ۝

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اسٹھ سال تک صرف سورہ بقرہ یاد کرتے رہے ॥

ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمرؓ ایسے ضعیف الحافظ نہیں تھے کہ سورہ بقرہ کے محض الفاظ
یاد کرنے میں اُن کے آٹھ سال خرچ ہو جائیں، یقیناً یہ مرت اسی لئے صرف ہوئی کہ وہ
الفاظ فتر آئی کو یاد کرنے کے ساتھ اس کی تفسیر اور جملہ متعلقات کا علم حاصل کر رہے ہیں۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں :-

**وَالَّذِي أَنْزَلَ اللَّهُ عَزِيزُهُ مَا نَزَّلَتْ أَيْمَنَ مِنْ كِتَابِ أَنْشَأَهُ إِلَّا قَاتَأَهَا
أَعْلَمُ فِيمَنْ نَزَّلَتْ وَأَيْمَنْ نَزَّلَتْ، وَتُوَّلَّ عَلَمَنْ أَحَدًا أَعْلَمَ
كِتَابُ اللَّهِ مِنْتَهِيَّ تَسَالْمَةُ الْمُطَهَّرِيَاكَ تَكِيَّتُهُ يَلِهِ**

”اُس ذات کی قسم: جس کے سوا کوئی معبور نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسا نہیں
ہے جس کے باسے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے باسے میں اور کہاں ناہیں
ہوئی؟ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ چلے جو کتاب اللہ کے باسے میں مجھے سے زیادہ
جاننا ہو اور سواریاں اُس کے پاس بیچا سکتی ہوں تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا“
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بعد تفسیر قرآن کا تسلیم اہم ماحنڈ
اُن صحابہ کرام کے اقوال ہیں جنہوں نے اس محنت و جانفشنی سے قرآن کریم کی تفسیر کی
تمیٰ، یہاں بھی چند امور کو پیش نظر کھانا ضروری ہے:-
۱۔ صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال میں سبھی صحیح و سقیم طریق کی روایتیں ملتی ہیں،

لہ الاتقان، ص ۱۴۶ ج ۲، نوع ۷۵

لہ تفسیر ابن کثیر، ص ۳ ج ۱

لہذا ان اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اصول حدیث کے مطابق ان کی
جاپن پڑتاں ضروری ہے،

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اُس وقت جست ہوں گے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آئیت کی کوئی صریح تفسیر مستند طریقے سے ثابت نہ ہو، اگر آپ کی بیان فرمودہ کوئی تفسیر صحیح احادیث میں منقول ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی حیثیت محفوظ اتاری ہوگی، اور اگر کوئی قول آپ کی بیان فرمودہ تفسیر کے معارض ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔
۳۔ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تفسیر مستند روایات میں منقول ہو تو
اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہوئی تفسیروں میں کوئی اختلاف نہ ہو دہاں اہنی کے اقوال
کو خستیار کیا جائے گا،

۴۔ جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ تفسیروں میں کوئی اختلاف ہو دہاں اول تو یہ دیکھا جائے گا کہ ان مختلف اقوال میں کوئی ہم آہنگی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم آہنگی ہو سکتی ہے تو اسی پر عمل کیا جائے گا، اور اگر اختلاف ناقابل تطبیق ہو تو ایک مجتہد جن قول کو دلات کے لحاظ سے زیادہ مضبوط پایا رہے اُسے اختیار کر سکتا ہے، لہ

چوتھامآخڑ، تابعین کے اقوال

تابعین سے مراد وہ حضرات ہیں جنہوں نے صحابہ کرام سے علم حاصل کیا، اس سلسلے میں علا رکا اختلاف ہر کہ تفسیر میں تابعین کے اقوال جست ہیں یا نہیں؟ حافظ ابن کثیرؓ نے اس سلسلے میں بہترین حاکم کیا ہے، اُن کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ تابعی اگر کوئی تفسیر کسی صحابی سے نقل کر رہا ہو تو اس کا حکم دری ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر کا ہے، اور اگر خود اپنا قول بیان کرے تو یہ دیکھا جائے گا کہ دوسرے کسی تابعی کا قول اس کے خلاف ہے

لہ یہ اصول، البریان، ص ۲۱۷ اور الاتقان، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷ اور ۲۱۷ سے تلحیفہ تذییح کر کے
اخذ کئے گئے ہیں،

یا نہیں؟ اگر کوئی قول اس کے خلاف موجود ہر تو اس وقت تابعی کا قول جب تا جب نہیں ہو گا بلکہ اس آیت کی تفسیر کے لئے قرآن کریم، لغت عرب، احادیث نبویہ، آثار صحابہؓ اور درستگار شرعی دلائل پر غور کر کے کوئی توصلہ کیا جائے گا، اور اگر تابعین کے درمیان کوئی خلافات نہ ہر تو اس صورت میں بلاشبہ ان کی تفسیر صحبت اور داجلہ تابع ہو گی۔

پانچواں مأخذ، لغت عرب

پنجی پتا یا جاچکا ہے کہ قرآن کریم کی جس آیت کا مفہوم بدیکی طور پر واضح ہوا اور جس کے مفہوم میں کوئی الْجَهْن، الْحَشْيَة، الْبَهَام واجمال نہ ہو، اور نہ اُسے سمجھنے کے لئے کسی تاریخی پس منظر کو جانتے کی ضرورت ہو، وہاں تو عربی لغت ہی تفسیر کا دلحد مأخذ ہو، لیکن جہاں کوئی ابہام واجمال پایا جا رہا ہو، یا جو آیت کسی واقعاتی پس منظر سے دافتہ ہو یا اس سے فقی احکام مستحبت کے جا رہے ہوں، وہاں محض لغت کی بنیاد پر کوئی توصلہ نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں تفسیر کی اصل بیان تو خود قرآن کریم، سنت نبویہ اور آثارِ صحابہؓ و تابعینؓ پر ہو گی، لیکن ان مأخذ کے بعد لغت عرب کو بھی مشتمل رکھا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک وسیع زبان ہے، اور اس میں ایک ایک لفظ کوئی کمی معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور ایک ایک جملے کے متعدد معنی ہو سکتے ہیں، لہذا صرف لغت کی بنیاد پر ان میں سے کوئی مفہوم معین کرنا مغالطوں کا سبب بجنگا ہو، اسی بناء پر بعض حضرات نے "سلطان لغت" کو مستقل مأخذ بنانے سے ہی انکار کیا ہے، بلکہ امام محمدؐ کی طرف یہ قول منسوب ہو کہ وہ لغت کے ذریعے قرآن کریم کی تفسیر کو مکروہ قرار دیتے تھے، لیکن علامہ زکریٰ فرماتے ہیں کہ ان کا مقصد تفسیر میں لغت کو بالکل نظر انداز کرنا ہے، بلکہ مقصدریہ تھا کہ کسی آیت کے ظاہر اور متبادر معنی کو چھوڑ کر ایسے معانی بیان کرنا منوع ہے، جو قلیل الاستعمال اور دور از کار بغیر

تحقیقات پر مبنی ہوں ظاہر ہے کہ قرآن کریم عرب کے عام محاورات کے مطابق نازل ہوا ہے، لہذ جس جگہ فتر آن و سنت یا آثار صحابہؓ میں کسی لفظ کی تفسیر موجود نہ ہو، وہاں آیت کی وہ تفسیر کی جائے گی جو اہل عرب کے عمومی محاورات میں متداول طور پر سمجھی جاتی ہو۔ ایسے موقع پر اشعار عرب سے استدلال کر کے کوئی ایسے قلیل الاستعمال معنی بیان کرنا بالکل غلط ہے جو لغت کی کتابوں میں تو لکھ ہوئے ہیں، لیکن عام بول چال میں استعمال نہیں ہوتے، ۱۰۰ اس کو ایک واضح مثال سے سمجھنے، فتر آن کریم میں ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم نے پانی کی فرمائش کی تو اشد تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ:-

وَاصْرِبْ بِتِعْصَمَكَ الْحَجَرَ ،

أَوْ رَأْبِنِ لَاكُنْيَ كُو پَتْهَرَ پِرْ مَارَوْ ، ،

یہ جملہ کسی زبان جانے والے کے سامنے بولا جاتے گا وہ صراحت اس کا ہے مطلب سمجھنے کا کہ لاکنی کو پتھر پر مارنے کا حکم دیا جا رہا ہے، چنانچہ اس جملے کی یہی تفسیر صحیح اور معین ہے، لیکن سر سید احمد خان صاحب نے لغت کے دوراً زکار حوالوں کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ لاکنی کے پہارے اس چٹان پر چلو۔ اس میں ارضیب کے معنی (مارو) کے بجائے "چلو" اور الحجر کے معنی (پتھر) کے بجائے "چٹان" بیان کرنا ایک ایسی بردستی ہے جس کی تائید میں اگر لغت کی کتابوں کا کوئی ایک آدھا حوالہ میں بھی جائے تو عام محاورات عرب اس کی بالکلیہ تردید کرتے ہیں ۱۰۰

لہابریان، ص ۱۶۰ ج ۲، نورع ۱۷۱، امہات مأخذ لقنسنر،

لہ تفسیر القرآن، از سر سید احمد خان صاحب، ص ۹۱ ج ۱، مطبوعہ لاہور،

تمہاری یہاں ہم نے سر سید صاحب کے بیان کئے ہوتے اس معنی کو بطور مثال پیش کیا ہے، ورنہ درحقیقت ایک بیان کی ہوتی اس شرائع کی کسی لغت سے بھی تائید نہیں ہوتی، اور لغت کے اعتبار سے بھی اس میں چند حصے نظر لیاں ہیں، مثلاً "ضرب" جب چلنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے ساتھ "فی" صدر ہوتا ہے جیسے قیاداً اضطر بِتُّمْ فِي الْأَسْرِينْ" اور یہاں "فی" نہیں ہے،

اہم احمدؓ نے لغت کے ذریعے اسی قسم کی تفسیریں بیان کرنے کو جمنو ع قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ لغت سے اس طرح کا کام لینے کو کوئی بھی عقل و انصاف رکھنے والا شخص بہت نہیں کہا سکتا،

چھٹا مأخذ، عقل سلیم

عقل سلیم کی مزدوری یوں تو دنیا کے ہر کام کے لئے ہے، اور ظاہر ہے کہ پچھلے چار مأخذ سے استفادہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں، ہی، لیکن یہاں اس کو ایک مستقل مأخذ کے طور پر ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ آن کریم کے اسرار و معارف ایک ناپیداگذار سمندر کی حیثیت رکھتے ہیں، مذکورہ بالا پانچ مأخذ کے ذریعے اس کے مضمون کو بقدر ضرورت تو بھاجا جا چکا ہے، لیکن جہاں تک اس کے اسرار و حکم اور حقائق و معارف کا تعلق ہے اُن کے بارے میں کسی بھی دور میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اپنے اُن کی انتہاء ہو گئی ہے، اور اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے، اس کے بجائے داقعہ یہ ہے کہ فتنہ آن کریم کے ان حقائق و اسرار پر غور و فکر کا دروازہ قیامت تک کھلایا ہے اور جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم و عقل اور خیانت اور انابت کی دولت سے نوازا ہو وہ تدبیر کے ذریعہ نئے نئے حقائق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، چنانچہ ہر دوسرے مفسرین اپنی اپنی فہم کے مطابق اس باب میں اضافہ کرتے آئے ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کی دعا، آخوند صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے لئے فرمائی تھی:-

اللَّهُمَّ عِلْمَتَ الشَّافِعَيْلَ وَفَيْقَهَتُ فِي السَّيِّئِينَ ه

يَا أَدَلَّ اسْ كَوْنِيْسِيْرِيْ كَاعِلْمُ اُور دِيْنِيْ مِنْ بَعْدِ عَطَا فَنِيرِ ما ۔ ۔ ۔

لیکن اس سلسلے میں یہ بات یا اور کہنے کی ہے کہ اس طرح عقل و فہم سے مستنبط کئے ہوئے وہی حقائق و اسرار معتبر ہیں جو دوسرے شرعاً اصول اور مذکورہ بالا پانچ مأخذ سے متصادم ہوں، اور اگر اصول شرعاً یہ کو قوڑ کر کئی نکتہ بیان کیا جائی تو اس کی بین میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے،

۴۸۹

تفسیر کے ناقابل اعتبار مأخذ

تفسیرِ ترآن کے معتبر اور مستند مأخذ معلوم کرنے کے بعد ان ناقابل اعتبار مأخذ کی نشان دہی بھی ضروری ہے جنہیں بعض لوگ تفسیر کی بنیاد قرار دے کر غلط فہمیوں، بلکہ بعض اوقات گمراہیوں کا فکار ہو جاتے ہیں :-

۱۔ اسرائیلی روایات

”اسرایلیات“ یا ”اسرایلی روایات“ اُن روایات کو کہتے ہیں جو یہودیوں، یا عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے بعض براہ راست باہمی یا تالیم و درسے لی گئی ہیں، بعض مشتمل اور ان کی سترخواج سے، اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہل کتاب میں سینہ بسیدہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں، اور عرب کے یہود و نصاری میں معروف و شہرو تھیں تفسیر کی مردم جماعت کتابوں میں ایسی روایات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے، ان روایات کا حکم پیان کرتے ہوئے مشہور محقق صاحب تفسیر حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ایسی روایات کی تین قسمیں ہیں، اور ہر قسم کا حکم عالیٰ ہے؛

۱۔ پہلی قسم وہ اسرائیلیات یں جن کی تصدیق دوسرے خارجی دلائل سے ہو چکی ہے

مثلاً فرعون کا غرق ہر جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ، آپ کا کوہ طور پر جانا وغیرہ، ایسی روایات اس لئے قابل اعتبار ہیں کہ قرآن کریم یا صحیح احادیث نے ان کی تصدیق کر دی ہے،

(۲) دوسری قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کا جھوٹا ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، مثلاً یہ کہانی کہ حضرت سیلمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذ اللہ بنت پرستی) میں مبتنلا ہو گئے تھے، یہ روایت اس لئے قطعاً باطل ہے کہ قرآن کریم نے صراحتاً اس کی تردید فرمائی ہے، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بالے میں یہ محدث کہانی کہ آپ (معاذ اللہ) اپنے سپہ سالار اور یا کی بیوی پر فریفہ ہو گئے تھے یہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ صحی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹی ہیں، مثلاً تورات کے احکام وغیرہ، ایسی اسرائیلیات کے بالے میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے:-

لَا تَصِّرْ قُوَّهَا وَلَا تُكَذِّبْ بُوْهَا،

”نَّمَّا أُنَّ کِ تَصْدِيقَ كِردا وَرَبَّ تَكْذِيبَ“

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے، لیکن نہ ان پر کسی دینی مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، اور نہ ان کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکتی ہے، اور اس قسم کی روایات بیان کرنیکا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے، حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خود... قرآن کریم نے سورہ کہف میں یہ تعلیم دی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے ؟ ارشاد ہے:-

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةُ رَأْلِعُهُمْ كَبُّهُمْ، وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ

لہ بابل، کتاب سلاطین اول ۱۱:۲۰ تا ۱۳:۲، لہ اینا ۳:۲ - سموئیل ۱۳:۱۷،

لہ تفسیر ابن کثیر، مقدمہ ص ۲۴۷ و اصول التفسیر لابن تیمیہ ص ۳۳،

سَادِ سُهْمٍ كُلْبَهُمْ رَجَمًا يَا لِعِيْبٍ، وَلَقَوْ لُؤْتَ سَبْعَهُ وَثَانِهِمْ
كُلْبَهُمْ، قُلْ رَبِّيْ آفَأَمْ بِعِدَّهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَدْلِيلٌ هُ
فَلَآتْمَارِيْهُمْ إِلَّا مِرَأَ ظَاهِرٌ أَوْ لَا سَنْفُوتِ فِيْهُمْ مِنْهُمْ أَحَدٌ هُ
رَا صَاحِبِ الْكَعْتَكَ تَعْدَادَكَ بَايْهَ مِنْ بَعْضِ اهْلِ كِتَابٍ كَمْ بَعْضِهِ كَمْ دَيْنِ بَيْنِ اهْلِ
چوْتَهُمْ كَاكَتَابَهُ، اور بَعْضِهِمْ بَعْضِهِ کے پاچِیں، چھَٹَانَ کَاکَتَابَهُ، یہ لوگ
اہلِ بَچَوْنَ ہَاںکَ ہے بَيْنِ، اور بَعْضِهِمْ بَعْضِهِ کے دَه سَاتِ بَيْنِ اور آٹھوَانَ اُنْ کَا
کَتَابَهُ، آپَ کَہْدِیْجَیْهَ کَمِيرَابَ اُنْ کَ تَعْدَادَ خَوبِ جَانَتَابَهُ، اُنْ کَوْبَہْتَکَمْ لَوْگَ
جَانَتَبَهُ، سَوَّا پَهْ اُنْ کَ بَايَهَ مِنْ بَعْضِ سَرِسَرِی بَجَشَلَ زِيَادَه بَحْثَ نَرْکَیْجَیْهَ، اور
آپَ اُنْ کَ بَارَے مِنْ اُنْ لَوْگَوْنَ مِنْ سَکَسِیْ بَهْ بَجَلْوَچَیْجَیْهَ ॥

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کعبت کی تعداد کے بارے میں اہل کتاب کی مختلف اسرائیل روایات بیان فرمائی ہیں، اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتوں کی طرف اشارہ فرمادیا ہے:-

۱۔ اسرائیل روایات اور ان کا اختلاف بیان کرنا جائز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا،

۲۔ ان میں سے جو روایتیں غلط ثابت ہو چکی ہوں اُن کے غلط ہونے پر تنبیہ بھی کر دینی چاہئے، جیسا کہ پہلے دو اتوال کو اللہ تعالیٰ نے رَجَمًا يَا لِعِيْبٍ کہہ کر رد فرمایا۔

۳۔ جس روایت کی غلطی پر کوئی دلیل نہ ہو، اُس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا چاہئے، جیسا کہ اللہ نے تیسرا روایت پر سکوت اختیار فرمایا،

۴۔ ان روایات کے صدق و کذب کے بارے میں یہ ایمان رکھنا چاہئے کہ حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے،

۵۔ ان روایات کے بارے میں زیادہ بحث و مباحثہ سے پر ہیز کرنا چاہئے،

۶۔ ایسی روایات کی زیادہ تحقیق و تفتیش میں پڑنا بھی درست نہیں، یکون کہ ان سے

دنیا و آخرت کا کوئی قابل ذکر فائدہ متعلق نہیں،

پھر بعض روایات میں تو صراحت ہوتی ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے، اور بعض روایات میں ایسی صراحت نہیں ہوتی، لیکن دو سُکرَدِ لائل کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے، کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہے، تفسیر کتابوں میں جو روایات کعب الاحبار اور وہب بن منبه سے مردی میں دہ زیادہ تر اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے ان درنوں کا مختصر حوال معلوم کر لینا بھی ضروری ہے،

كعب الاحبار کون تھے | كعب الاحبار کا پورا نام كعب بن ماتع حمیری ہے، اور دہ کعب الاحبار یا كعب الجر کے لقب سے مشہور ہیں، یہ یعنی کے باشد ہے تھے، اور انھیں علمائے یہود میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، انھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں مشرق باسلام نہ ہو سکے، سالہ ۱۴ میں حضرت عمرؓ کے ہدید خلافت کے دوران یہ مدینہ طیبہ آئے اور مسلمان ہو گئے، طبقات ابن سعدؓ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے اُن سے پوچھا کہ "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیوں اسلام نہیں لائے؟" اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے باپ نے مجھے تورات کا ایک نسخہ لکھ کر دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس پر عمل کرتے رہو، اور تورات کے علاوہ جتنی کتابیں تھیں انھیں بسدر کر کے اس پر مہریں لگادی تھیں، تاکہ میں آن کا مطالعہ نہ کر دو، اور ساتھ ہی مجھ سے پہنچ رشتہ ابوبت کا واسطہ فری کریے ہمدرد لیا تھا کہ میں یہ مہریں نہ توڑوں، لیکن جب دین اسلام دنیا میں غالب ہونے لگا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے باپ نے مجھ سے کوئی علم چھپلنے کی کوشش نہ کی ہو، چنانچہ میں نے ان کتابوں کی چوری کر دی، اور آن کا مطالعہ کیا، تو اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کا تذکرہ مجھے ملا، اس لئے میں اب مسلمان ہو کر آیا ہوں ॥

له قال الکوثری د فی سنہ دہ الیحر خاد بن سلۃ وہ مختلط و فیه ایضاً علی بن زید بن جدعان ضعفه غیر واحد لمقالات الکوثری ص ۳۲۰) و لکچ تذم المخالفات فی الاصایر (۲۹۸، ۱۳)

کعب الاحباد کو عام طور سے ثقہ قرار دیا گیا ہے، لیکن علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے بعض روایات کی بناء پر اُن کے بارے میں کچھ شکوک و شبہات کا بھی الہمار کیا ہے، مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجدِ اقصیٰ تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ "مسجد کو صخرہ بیت المقدس کے آگے تعمیر کیا جائے یا پچھے؟" اس پر کعب الاحباد نے مشورہ دیا کہ "مسجد صخرہ کے پچھے بنائی جائے" یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا، "یہودی عور کے بیٹے! تم پر یہودیت کا ابھی تک اثر ہے، میں تو مسجد کو صخرہ کے آگے کے بناؤں کا تاکہ نماز میں صخرہ کا استقبال نہ کیا جائے" علامہ زاہد کوثریؒ نکھنے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد کعب الاحباد کے ذہن میں حضرت عمرؓ کے بارے میں کچھ رجھش رہی، یہاں تک کہ ان کا میں جوں ایسے لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا گیا جو حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کی سازش میں ملوث تھے اور اس سے پہلے وہ اہل کتاب کی بعض کتابوں کے خواص سے حضرت عمرؓ کو تنبیہ کرچے تھے کہ آپ کو کسی وقت قتل کیا جائے گا، ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد علامہ کوثریؒ نکھنے ہیں :-

"ان پھرے ہر یہ واقعات کو ملانے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت سعید رضا، حضرت ابوذرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عون بن مالکؓ اور حضرت معادیؓ کعب الاحباد پر ابھروس نہیں کرتے تھے" ۱

علامہ کوثریؒ نے کعب الاحباد پر جن شکوک و شبہات کا الہمار کیا ہے، اور مختلف صحابہؓ کے اقوال سے جو تنازع تکالیے ہیں ان سے اختلافات کی گنجائش ہے، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ ان کی بیشتر روایات امر ائمیں روایات ہیں، لہذا جب تک ان کی تصدیق خارجی دلائل سے نہ ہو جائے، اُس وقت تک ان پر ابھروس نہیں کیا جاسکتا،

لئے مقالاتِ الکوثری ص ۳۲۳ و ۳۲۴، مقال: "کعب الاحباد و الاسمائیلیات"

لئے مصر کے محقق عالم داکٹر رمی نعیان اور ان شکوک و شبہات کی مفصل اور مدلل تردید کی ہے،
روظا حظہ ہو ان کی کتاب "الاسمائیلیات و اثرها فی التفسیر" ص ۲، ۱۷۱ ص ۸۲ امطبوعہ الرضیاء بہر دت ۱۹۶۴ء

وَهِبْ بْنُ مُنْبِيٍّ | دو سکریزگ جن سے بکثرت اسرائیلی روایات منقول ہیں وہب بن منبیہ (متوفی ۷۱۰ھ) ہیں، یہ بھی یمن کے علاقے منعا کے پاشدے تھے، اور فارسی الاصل تھے، روایات کے مطابق یہ حضرت عثمانؓ کے ہمبد خلافت میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد منبیہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمبد مبارک میں مسلمان ہو چکے تھے، وہب بن منبیہؓ عاید وزاہد تابعی تھے، اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ سے روایتیں لی ہیں، ان کے پاس علماء اہل کتاب کی روایات کتابوں کا بڑا وسیع علم تھا، یہاں تک کہ وہ اس معاشرے میں پہنچنے آپ کو حضرت عبد اللہ بن سلامؓ اور کعب الاحرار کے علوم کا جامع سمجھتے تھے، امام ابن سعدؓ نے لکھا ہے کہ انہوں نے ان روایات پر مشتمل ایک کتاب "احادیث الانبیاء" کے نام سے تالیف کی تھی، اور مسعودیؓ نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب "المبرأ" کے نام سے لکھی تھی، اور حاجی خلیفہؓ نے "کشف الظنون" میں شاید اسی کتاب کو "کتاب الاسراء تبلیفات" کے نام سے ذکر کیا ہے، نیز یا قوت الحمویؓ اور قاضی ابن خلکانؓ نے ان کی ایک اور کتاب کا تذکرہ کیا ہے، جس کا نام "ذکر الملوك المفتوحة من حیر داخبارهم وغير ذلك" تھا، قاضی ابن خلکانؓ نے یہ کتاب خود لکھی ہے،

جہاں تک وہب بن منبیہؓ کے صدق اور امانت کا تعلق ہے اس کے بارے میں محدثین اور ائمہ جرج و تعديل نے کوئی کلام نہیں کیا، حافظ فیضی گزملتے ہیں:-
”وَ ثَقَةُ اُولَئِكَ هُنَّ مُجَمِّعُ الْأَدْبَارِ لِلْحَمْوَى“ ص ۲۲۲ ج ۶، و رفیات الاعیان لابن خلکانؓ ص ۱۸۰ ج ۴

لئے نذر کۃ الحفاظ، ص ۱۰۱ ج ۱
لئے طبعات ابن سعد، ص ۹۴ ج ۱، ۱۲۰ ج ۵
لئے مروج الذریحی ج ۱، ص ۱۲۰ ج ۵
لئے بحث فی نشأة علم اتاریخ عند العرب للدکتور عبد العزیز الدمردا
ص ۱۱۳، ۱۱۴ ج ۶، مجمع الادباء للحموی ص ۲۲۲ ج ۶، و رفیات الاعیان لابن خلکانؓ ص ۱۸۰ ج ۴

اور امام نسائیؓ نے انھیں "ثقة" قرار دیا ہے، امام عجلؓ فرماتے ہیں: "دہبؓ ثقة تابعی تھے" صرف امام عمر و بن علیؓ الفلاسؓ نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں دہبؓ کے صدق و امانت میں کوئی شبہ تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ دہبؓ ابتداء میں قدرتیہ فرقہ کے عقائد کی طرف مائل تھے، لیکن امام حسینؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے بعد میں اپنے اس عقیدے سے رجوع کر لیا تھا، اور ابو سنانؓ نے خود دہبؓ بن منبیؓ سے نقل کیا ہے کہ میں پہلے قدری عقائد کا قاتل تھا لیکن بعد میں میں نے اُن سے رجوع کر لیا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ احمد جرج و تعلیم میں سے کسی نے بھی اُن کی سچائی اور امانت و دیانت پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اسی بنا پر امام سجاریؓ، اور امام سلمؓ دونوں نے اپنی اپنی صحیح میں اُن کی روایات ذکر کی ہیں، لہذا جو روایات وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگر ان کی سند اصول حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہو تو ان کو بلاشبہ قبول کیا جائے گا، البتہ زمانہ ماضی کے جو قصہ اور زمانہ آئندہ کی جو خبریں انھوں نے بغیر کسی حوالے کے بیان کی ہیں وہ زیادہ تر اسرائیلی روایات میں جن کے باوجود میں ہمں حکم یہ ہے کہ ہم نہ اُن کی تصدیق کریں اور نہ مکذبیں، عذر حاضر کے بعض مصنفین مثلاً سید رشید رضا مرحوم وغیرہ نے اُن کی عجیب و غریب اسرائیلی روایات کی بنار پر انھیں ضعیف قرار دیدیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کا محض بیان کرنا کوئی جسم نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان روایات پر کسی اسلامی عقیدے یا اسلامی حکم کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی ہے

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ [کعب الاحبارؓ] اور دہبؓ بن منبیؓ [تو تابعین میں سے

مردی ہیں، صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ اسرائیلیات شاید حضرت عبد اللہ بن عمرؓ

لئے ہمذب البہذب، س ۱۶۸ ج ۱۱]

لئے سید رشید رضا مرحوم وغیرہ کے اس نظرتیے کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہوڑا کٹر مرزا نعاعم کی محققانہ کتاب "الاسرائیلیات و اثرہا فی المفہیر" ص ۱۸۸ ،

سے مروی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سریانی زبان باقاعدہ سمجھی تھی^۱، اس زمانے میں یہود و نصاریٰ کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں تھیں، اور غزوہ یہود کے موقع پر حضرت عبد اللہ بن عفرؓ کو اس قسم کی کتابیں اتنی بھاری تعداد میں ہاتھ آگئی تھیں کہ وہ دو اونٹوں پر لا دی جاتی تھیں^۲، حضرت عبد اللہ بن عفرؓ نے بہت سی احادیث خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت کی ہیں، لیکن اُن کا اسرائیلیات سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اگر وہ صحیح سند سے ثابت ہوں تو درست کے صحابہؓ کی روایات بھی روایتیں ہیں اُن کی طرح ان کی روایات بھی روایتیں ہیں جو روایات انھوں نے صراحةً اہل کتاب سے نقل کی ہیں وہ اسرائیلی روایات ہیں جنکی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، اسی طرح جو روایات خود ان کے لپنے مقولے کے طور پر منقول ہیں اُن کے باعثے میں بھی اکثر گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ اسرائیلیات ہیں، اور ان کو اسلامی عقائد کی بنیاد نہیں پنا یا جا سکتا، مصر کے ایک منکر حدیث مصنف ابو ریۃ نے اپنی کتاب "اضوار علی السنۃ المحمدیۃ" میں حضرت عبد اللہ بن عفرؓ پر یہ بے بنیاد الزام عائد کیا اور کہ وہ کبھی کبھی اسرائیلی روایات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کر دیتے تھے، لیکن یہ الزام نہ صرف سو فی صد غلط اور مگرہ کن ہے بلکہ اس نے خود ابو ریۃ صاحب کے علم دریانات کی قلعی بھی کھول دی ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی دلیل میں حافظ ابن حجرؓ کی فتح الباری سے یہ عبارت نقل کی ہے کہ :-

أَنَّ عَبْرَ اللَّهِ بْنَ عَمْرُو وَكَانَ قَدْ أَصَابَ زَانِلَتِينَ مِنْ كُتُبِ

أَهْلِ الْكِتَابِ وَكَانَ يَرْدِيْهَا لِلنَّاسِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَتَجَهَّبَ الْأَخْذُ عَنْهُ كَيْدِرْ وَمِنْ أَيْمَنَةِ الْتَّأْبِعِينَ وَكَانَ

يُقَالُ لَهُ: لَا تُحَمِّلْ شَانِعِنَ الزَّانِلَتِينَ،

حضرت عبد اللہ بن عفرؓ کو اہل کتاب کی کتابوں میں سے دو اونٹوں کا بوجھ ملا تھا

وہ ان کتابوں کی باتیں لوگوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منتشر

کر کے روایت کرتے تھے، اس لئے بہت سے ائمۃ تابعین نے ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا، چنانچہ لوگ ان سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں ان دو انبٹوں کے بوجھیں سے پکھ نہ سنائیے ॥

اس عبارت میں خط کشیدہ جملہ حافظ ابن حجرؑ کی "فتح الباری" میں نہیں ہے، ابوريٰ صاحبؒ نے یہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا کر حافظ ابن حجرؑ کی طرف منسوب کر دیا ہے، اسے آپ منکریں ہد اور مغرب زدہ مولفین کی علی امامت و دیانت کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔

۲۔ صوفیاء کرام کی تفسیر میں

صوفیاء کرامؓ سے قرآن کریم کی آیات کے تحت کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جو لظاہر تفسیر معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ آیت کے ظاہری اور ما ثور معنی کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

قَاتِلُوا الَّذِينَ يَغْوِيَنَّكُمْ مِّنَ النَّاسِ،
”قتال کرو ان کافروں سے جو تم سے متصل ہیں“

اس کے تحت بعض صوفیاء نے کہا کہ:-

قَاتِلُوا النَّفْسَ قِائِمَهَا شَكَلَ الْأُنْسَاتِ،
”نفس سے قتال کرو، کیونکہ وہ انسان سے سب سے زیادہ متصل ہے۔“

اس قسم کے جملوں کو بعض حضرات نے فترآن کریم کی تفسیر سمجھ لیا، حالانکہ درحقیقت وہ تفسیر نہیں، صوفیاء کرام کا مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ فترآن کریم کی اصل مراد یہ ہے، اور جو ہفتم ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آ رہا ہے وہ مراد نہیں ہے، بلکہ وہ فترآن کریم کے ظاہری ہفتم پرجواس کے اصل مآخذ سے ثابت ہو پوری طرح ایمان رکھتے ہیں، اور اس

لئے اور اس سلسلے میں ابوريٰ کی مفصل تردید کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر عجاج الخنزیب کی کتاب "استئنۃ قبل النَّذِیْنِ" اور ڈاکٹر رمزی غناعی کی "الاسرار میلیات و اثر ہافت کتب تفسیر" (ص ۱۵۸)

بات کا اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر وہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اُن وجدانی استنباطات کو بھی ذکر کر دیتے ہیں جو اُس آیت کی تلاوت کے وقت اُن کے قلب پر وارد ہوئے، چنانچہ مذکورہ بالامثال میں صوفیا رکا مقصدریہ نہیں ہو کہ اس آیت میں کفار کے مقابلے پر جہاد و قیال کا حکم مراد نہیں، بلکہ ان کا مقصدریہ ہے کہ کفار سے جہاد و قیال کا حکم تراس آیت کا اصل تقاضا ہے، لیکن اسی آیت سے وجدانی طور پر انسان کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ سب قریبی نافرمان اس کا نفس ہے، جو لئے بُرا نیوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے، لہذا کفار سے جہاد کے ساتھ ساتھ اُس سے بھی جہاد ضروری ہے، ماضی قریب کے معروف مفسر علامہ محمود آلویؒ، جن کی تفسیر میں صوفیا رکرام کے اس قسم کے وجدانی استنباطات بکثرت ملتے ہیں، صوفیا رکا منشار کی تشریح کرتے ہوئے سخیر فرماتے ہیں :-

”قرآن کریم میں ساداتِ صوفیا سے جو کلام منقول ہے، وہ درحقیقت ان دو نتیجے امور کی طرف اشارے ہوتے ہیں جو اربابِ سلوک پر مکشفت ہوتے ہیں، اور ان اشارات میں اور قرآن کریم کے ظاہری مفہوم میں جو حقیقتاً مراد ہوتا ہے اطمین مکن ہے، صوفیا رکا یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ ظاہری مفہوم مراد نہیں، اور یہ اسی مفہوم مراد ہے، اس لئے کہ یہ تو باطنی ملحدوں کا اعتقاد ہر جسے انہوں نے مشریعۃ کی بالکلیہ نفع کا زینہ بنایا ہے، ہمارے صوفیا رکرام کا اس اعتقاد سے کوئی داسطہ نہیں، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ جبکہ صوفیاء نے یہ تاکید کی ہے کہ قرآن کریم کی ظاہری تفسیر کو سب سے پہلے حامل کیا جاتے ہیں“
لیکن صوفیا رکا اس قسم کے اقوال کے بارے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے :-

لئہ روح المعانی، ص، ج ۱، مقدمہ، فائدۃ ثانیہ، ہمی مضمون علایہ سیر طیؒ نے شیخ تاج الدین بن عطار اندھیؒ سے نقل فرمایا ہے، (الاتفاق، ص ۱۸۵ ج ۲)

۱۔ ان اقوال کو فترآن کریم کی تفسیر قرار نہ دیا جاتے، بلکہ یہ اعتقاد رکھا جاتے کہ فترآن کریم کی اصل مراد وہ ہی ہے جو تفسیر کے اصل مانند سے سمجھ میں آتی ہے، اور یہ اقوال مخصوص و جدایی استنباط کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا اگر ان اقوال کو فترآن کریم کی تفسیر سمجھو لیا جاتے تو یہ مگر اسی ہے، چنانچہ امام ابو عبد الرحمن شافعی نے ایک کتاب حقائق تفسیر کے نام سے تکمیلی تحقیقی جوابی جو اسی قسم کے اقوال پر مشتمل تھی، اس کے باشکن میں امام واحدی نے فرمایا کہ:-

”جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔“

۲۔ اس قسم کے اقوال میں بھی صرف اُن اقوال کو درست سمجھا جا سکتا ہے جن سے فترآن کریم کی کسی آیت کے ظاہری مفہوم یا شریعت کے کبھی مسلم اصول کی نفی نہ ہوتی ہوا ادا اگر ان وجدانیات کچھ پر دے میں دین کے مسلم اصول دو قاعد کی خلاف دلaczی کی جائے گئے تو یہ صریح الحاد ہے،

۳۔ اس قسم کے وجدانیات صرف اُس وقت معجزہ ہو سکتے ہیں جب فرقہ فترآن کریم کی تحریفیں کی حد تک نہ پہنچتے ہوں، اور اگر فترآن کریم کے الفاظ کو توڑھرڈر کر کوئی بات کہی جاتے تو وہ بھی انخاد اور مگر اسی ہے، مثلاً ایک شخص نے آیتِ قرآنی ”مَنْ ذَلِيلٌ حِيْ يَشْفَعُ“ کے تحت یہ کہا کہ یہ اصل میں ”مَنْ ذَلِيلٌ ذَلِيلٌ يَشْفَعُ“ ہے، ذی ذلیل سے مراد ”نفس“ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ”جو شخص نفس کو ذلیل کرے گا، شفایا جائیگا“، اس بات کو بار رکھو، علامہ سراج الدین بلقینیؒ سے اس کے باشکن میں پوچھا گیا، تو فرمایا کہ: ”ایسا کہنے والا ملحد ہے“

۴۔ قدیم زمانے میں محلہ دہلی کا ایک فرقہ ”باطنیہ“ کے نام سے گزر رہے، جس کا دعویٰ یہ تھا کہ فترآن کریم سے ظاہری طور پر جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے، بلکہ ہر لفظ سے ایک باطنی مفہوم کی طرف اشارہ ہے، اور

دری نتر آن کی اصل تفسیر ہے یہ اعتقاد بایحکم انتہت گقر و الحاد ہے، لہذا صوفیا،
کسی قول کے بالے میں اس قسم کا اختقاد رکھا جاتے تو یہ باطنیت ہو گا،
انی چار امور کی رعایت کے ساتھ صوفیا نے کرام کے اقوال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے
اور بلاشبہ بعض مخصوص والورات والحوال رکھنے والوں کو ان اقوال سے فائدہ بھی پہنچا
ہے، اسی وجہ سے علامہ ابویسیؒ اپنی تفسیر "روح المعانی" میں آیات کی مکمل تفسیر رکھنے کے بعد
ایک مستقل عنوان "من باب الاشارة فی الآیات" قائم کرتے ہیں، اور اس میں اس
قسم کے وجدانیات ذکر فرماتے ہیں،

ذکورہ بالآخر ارشات کا غلاصہ یہ ہے کہ صوفیا برکام فی قرآن کریم کے تحت
اپنے جو وجدانیات ذکر فرماتے ہیں وہ قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہیں، اور بعض لوگوں
نے ان پر باطنیت کا بوجاز امام عائز کیا ہے وہ درست نہیں، اس کے باوجود ہم حافظ
ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کو نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے تاکہ:-
**وَمَمْذُلُّكٌ فَيَا لِيَتَهُمْ لَمْ يَتَشَاهِهُوا بِمِثْلِ ذَلِيلٍ لِمَاقِيَهٖ
مِنَ الْأَيْمَانِ وَالْأَمْبَاسِ،**

اس کے باوجود اے کاش! کہ یہ حضرات اس قسم کے اقوال نقل کرنے میں اتنے
تساویل سے کام نہ لیتے، کیونکہ ان میں غلط فہمی اور شتبہ کی ٹہری گنجائش ہے۔

۳۔ تفسیر بالراتے

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:-
مَنْ أَنْكَمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَايِهِ فَأَصَابَ هَقَّلَ أَخْطَأَ
وہ جو شخص نتر آن کریم کے بارے میں اپنی رات سے کچھ گفتگو کرے تو
اگر صحیح بات بھی کہے تو اس نے غلطی کی۔

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ بعض غلوپسند لوگوں نے اس حدیث سے یہ مطلب بھجا کہ قرآن کریم کے بارے میں کوئی بات فکر دراستے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعہ قرآن کریم سے لیے معانی بھی مستبطن ہیں کہے جاسکتے تو اصول شرعیہ کے مطابق ہوں، لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبیر اور استنباط کو جا بھا تحسن قرار دیا ہے، اور اگر فکر و تدبیر پر بالکل پا بندی لگادی جائے تو قرآن دست سے شرعی احکام و قوانین مستبطن کرنے کا دروازہ ہی سرے سے بند ہو جائے گا، لہذا اس حدیث کا مطلب ہر قسم کی راستے پر پابندی لگانا نہیں ہے،

چنانچہ اس بات پر جھوپر علامتیق پیش کہ خود قرآن دست کے درست دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا منشار یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم کے معاملہ میں خود فکر اور عقل دراستے کو بالکل استعمال نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کا اصل منشار یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے جو اصولِ اجتماعی طور پر مسلم اور مسلسل شدہ ہیں، ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیرِ محض راستے کی بنیاد پر کی جائے گی وہ ناجائز ہوگی، اور اگر اس طرح تفسیر کے معاملے میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجہ پر بھی پہنچ جائے تو وہ خطکار ہے، کیونکہ اس نے رہستہ غلط اختیار کیا، اب اصولِ تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً:-

- ۱۔ جو شخص تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی راستے کے مبنی بولتے پر تفسیر شروع کر دے،
- ۲۔ کسی آیت کی کوئی تفسیر صراحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین کے ثابت ہو اور وہ اسے نظر انداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے،
- ۳۔ جن آیات میں صحابہ و تابعین سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان و ادب کے اصولوں کو پاماں کر کے کوئی تشریح بیان کرے،

- ۴۔ قرآن و سنت سے براہ راست احکام و قوانین مستنبط کرنے کے لئے اجتہاد کی
الیت نہ رکھتا ہو، اور پھر اجتہاد شروع کر دے،
- ۵۔ قرآن کریم کی متشابہ آیات (جن کے بالے میں قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ ان کی
سو فی صد صحیح مراد سوائے الش کے کوئی نہیں جانتا) ان کی جسم در حق کے
ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے، اور اُس پر مصہر ہو،
- ۶۔ قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جس سے اسلام کے درسرے اجتماعی
طور پرسلم اور طب شدہ عقائد یا احکام مجرد ہوتے ہوں،
- ۷۔ تفسیر کے معاٹے میں جہاں عقل و فنکر کا استعمال جائز ہے، وہاں کسی قطعی دلیل
کے بغیر اپنی ذاتی راستے کو یقینی طور پر درست اور رد سکر مجتہدین کی آراء کو یقینی
طور سے باطل قرار دے،

یہ تمام صورتیں اس "تفسیر بالرأی" کی ہیں جن سے مذکورہ بالاحدیث میں منع کی گئی
ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتیں کو اس مختصر جملے میں معین کیا گیا ہے:
مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلَيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

بیو شخص قرآن کریم کے معاٹے میں علم کے بغیر کوئی بات

کے قوہ اپناٹھکانا جہنم میں بنالے یا

البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجتماعی طور پر طب شدہ ضوابط کی پابندی
کرتے ہوئے آگر تفسیر میں کسی ایسی راستے کا اہماء کیا جائے جو قرآن و سنت کے خلاف
نہ ہو تو وہ اس حدیث کی دعید میں داخل نہیں ہے، البتہ اس قسم کا اہماء راستے
بھی قرآن و سنت کے وسیع و عین علم اور اسلامی علوم میں جہارت کے بغیر ممکن نہیں،
اور علماء نے اس کے لئے بھی کچھ کار آمد اصول معتبر فرماتے ہیں، جو اصول فقہ اور
اصول تفسیر میں تفصیل سے بیان ہیے ہیں، اور ان کا ایک ہمایت مفید خلاصہ علماء
بدر الدین زرکشی نے اپنی کتاب "البرهان فی علوم القرآن" کی توجیہ علیاً میں بالخصوص

”اقسم اققیر“ کے زیرعنوان (صفحہ ۶۲) میں فرمایا ہے، یہ پوری بحث نہایت قابل تدریب، لیکن چونکہ عربی زبان و علوم کی ہمارت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اس لئے یہاں اس کا ترجمہ نقل کرتا ہے فائدہ ہے، جو عربی داں حضرات چاہیں وہاں ملاحظہ نہ رہ سکتے ہیں،

تفسیر مدرس گمراہی کے سباب

علم تفسیر چاہیں ایک اہتمامی سرفت و سعادت کی چیز ہے وہاں اس نازک وادی میں قدم رکھنا بے حد خطرناک بھی ہے، کیونکہ اگر انسان کسی آیت کی غلط تشریع کر بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں کہی، اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟ جن لوگوں نے ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر میں دخل اندازی کی ہے، وہ کافی محنت خرچ کرنے کے باوجود اس بدترین گمراہی میں مستلا ہو گئے ہیں، اس لئے یہاں ایک نظر قرآن ہے باب پر بھی ڈال لینی ضروری ہے جو انسان کو تفسیر قرآن کے معاملے میں گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں،

پہلا سلب، ناہلیت

تفسیر قرآن میں گمراہی کا سب سے پہلا اور سب سے خطرناک سلب یہ ہے کہ انسان اپنی اہلیت و صلاحیت کو دیکھنے بغیر قرآن کریم کے معاملے میں رائے زنی شروع کر دے، خاص طور سے ہمارے زمانے میں گمراہی کے اس سب سے بڑی قیامت ڈھانی ہے، یہ غلط فہمی عام ہوتی جا رہی ہے، کہ صرف عربی زبان پڑھ لینے کے بعد انسان قرآن مجید کا عالم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جس طرح سمجھ میں آئے قرآن کریم کی تفسیر کر سکتا ہے، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں مغض

زبانِ دانی کے بدل پر چمارت پیدا ہو سکتی ہو، آج تک کبھی کسی ذی ہوش نے انگریزی زبان پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا ہو سکا کہ وہ ڈاکٹر ہو گیا ہے، اور ہمیں بھل ساتھ کی کتابیں پڑھ کر دنیا پر مشقِ ستم کر سکتا ہے، اسی طرح کوئی شخصِ محض... اب خیزیر تگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اب خیزیر بننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ قانون کی اعلیٰ کتابیں دیکھ کر ماہر قانون کہلا سکتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو یقیناً ساری دنیا اُسے احمد اور بیوقوف کے گی، اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام علوم و فنونِ محض زبانِ دانی اور بخی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتے، بلکہ ان کے لئے سالہا سال کی محنت درکار ہے، انھیں ماہر اساتذہ سے پڑھا جاتا ہے، اس کے لئے بڑی بڑی درسگاہوں میں کتنی کتنی امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے، پھر کبھی ماہر فنچی اس لئے کران کا عملی تجربہ کرنا پڑتا ہے، تب ہمیں انسان ان علوم کا بندی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے،

جب ان علوم و فنون کا حال یہ ہے تو تفسیرِ قرآن جیسا علمِ محضِ عربی زبان سیکھ لینے کی بناء پر آخر کیسے حاصل ہو جائے گا؟ آپ گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ علم تفسیر میں درک حاصل کرنے کے لئے کتنی وسیع معلومات درکار ہوئی ہیں فقرت آن کریم عام کتابوں کی طرح کوئی ایسی مسلسل کتاب نہیں ہے جس میں ایک موضوع کی تمام باتیں ایک ہی جگہ تکمیل ہوئی ہوں، بلکہ وہ دنیا کی تمام کتابوں کے برخلاف اپنا ایک جدا گانہ اور ممتاز اسلوب رکھتا ہے، لہذا کسی آیت کو قارداً قی طور پر سمجھنے کے لئے اول توبہ ضروری ہے کہ اس آیت کی مختلف قراءتوں، اُس موضوع کی تمام دوسری آیات اور ان کے متعلقات پر پوری نگاہ ہو، پھر آپ سچے دیکھ چکے ہیں کہ بہت سی آیتیں کسی خاص واقعیاتی پس منظر سے وابستہ ہوئی ہیں جسے سببِ نزول کہا جاتا ہے، اور جب تک سببِ نزول کی مکمل تحقیق نہ ہو اس کا پورا مفہوم نہیں بھا جا سکتا، یعنی حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے کہ قرآن کریم بہت سی مجل یا تلوں کی تشریع و تفسیر سرکار دو عالمِ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

پر چھوڑ دیتا ہے، لہذا ہر آیت میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قول یا اعلیٰ تعلیم موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر موجود ہے تو وہ تقدیر رؤایات کے مسلم اصولوں پر پوری اترتی ہے یا نہیں؟ نیز صحابہ کرام نے جوز دل قرآن کے عین شاہد تھے، اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا؟ اگر اس بارے میں ہزویات کے درمیان کوئی تعارض و اختلاف ہر تو اس کی روشن رفخ کیا جاسکتا ہے؟ پھر عربی زبان ایک سیع زبان ہے جس میں ایک ایک لفظ کے کمی معنی اور ایک ایک معنی کے لئے کمی کی لفظ ہوتے ہیں، لہذا جب تک اس زمانے کے اہل عرب کے محاورات پر عبور نہ ہو کسی معنی کی تعین بہت مشکل ہوتی ہے، اس کے علاوہ صرف الفاظ کے لغوی معنی جاننے سے کام نہیں چلتا، کیونکہ عربی میں سخوی ترکیبوں کے اختلاف سے معانی میں تبدلی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ بات عربی لغت و ادب پر مکمل عبور کے بغیر طے نہیں کی جاسکتی، کہ اس مقام پر کونسی ترکیب محاورات عربی کے زیادہ قریب ہے؟ اور سبے آخر میں تر آن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار و معارف ایسے شخص پر نہیں کھولتا جو اس کی نافرمانیوں پر کمرستہ ہو، لہذا تفسیر قرآن کیلئے اللہ کی بندرگی اس کے ساتھ تعلق خاص، طاعت و تقویٰ اور حق پرستی کے لیے لاگ جذبے کی ضرورت ہے، اس تشریع سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ تفسیر تر آن کے لئے صرف عربی زبان کی معمولی واقفیت کام نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے لئے علم اصول تفسیر علم حدیث اصول حدیث، اصول فقہ، علم فقہ، علم تجویز، علم صرف، علم لغت، علم آداب اور علوم بلاغت میں ماہر اور بصیرت اور اس کے ساتھ ہمارت و تقویٰ ضروری ہے، ان ضروری شرائط کے بغیر تغیر کی وادی میں قدم رکھنا اپنے آپ کو گمراہی کے راستے پر ڈال سکتے کے مراد ف ہے، اور اسی طرزِ عمل کے بارے میں سرکاری دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مُمْقَعَهُ كَمِنَ النَّارِ،

”بُوْشَحْصُ فِتْرَانَ مِنْ بَغْيَرِ عِلْمٍ كَعْفَتْ كُوْكَرَ لَهُ وَهُ أَنْتَ كَعْكَلَةَ حَمَّ مِنْ
بَثَالَهُ“

چند غلط فہیاں | (۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ فتران کریم نے خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ :-

وَكَفَنْ يَبْسِرُنَا الْقُرْآنَ لِلِّيْنَ كَمْرَقَهْلُ مِنْ مُدَّ كِسَّهُ

”اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان

کر دیا ہے“

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریع کے لئے کسی بھے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر شخص فتران کریم کا ملت کر شد کر اس کو سمجھ سکتا ہے، لیکن یہ مستدلال ایک شدید مخالف طریقے ہے، جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے اور اقحہ یہ ہے کہ فتران کریم کی آیات دو قسم کی ہے، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سین آموز و اقحات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلًا دنیا کی ناپایداری، جنت و روزخن کے حالات، خوف خدا اور نکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں اور زندگی کے دو سر سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہی اس سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، بلکہ یہ مقصد قرآن کریم کے مستند تراجم دیکھ کر بھی ایک حد تک حاصل ہو جاتا ہے، مذکورہ آیت میں اسی مقصد کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے فتران کو آسان کر دیا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے یہ بات جعل نہیں چھوڑی ”لِلِّيْنَ كَمْرَ“ (یعنی نصیحت کے واسطے) کا لفظ بڑھا کر اس حقیقت کو روشن کی طرح واضح کر دیا ہے،

اس کے بخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کما حلقہ، سمجھنا اور ان سے احکام و مسل

مستبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور بخششگی حاصل نہ ہو اُس وقت تک قرآن کریم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انھیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؓ وغیرہ نے امام عبد الرحمن سعیدؓ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبیداللہ بن سعودؓ وغیرہ اخنوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دشی آئیں سیکھتے تو اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آئیوں کے متعلق تمام علم اور علمی باتوں کا احاطہ نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ:

فَعَلِمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَهْلَ جَمِيعًا

”ہم نے قرآن اور علم دل ساتھ ساختہ سیکھا ہے۔“

پشاپر موطاً امام مالکؓ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضیٰ نے صرف سورہ لقہہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مسٹدِ احمدؓ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ لقہہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا، ہماری ننگا ہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا، لہ

غور کرنے کی بات یہ ہو کہ یہ حضرات صحابہؓ میں جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی شعرو ادب میں ہمارت تالمہ رکھتے تھے، اور جن کو بلبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے از بر ہو جایا کرتے تھے، انھیں قرآن کریم حفظ کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی، کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اسکی وجہ حضرت یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے

مَنْ تَالَ فِي الْقُرْآنِ يُعَذَّبُ عَلَيْهِ قَلِيلٌ بَشَّارٌ مَعْنَى هُوَ فِي النَّارِ
جو شخص نہ رآن کے معاطل میں علم کے بغیر کوئی بات ہم تو وہ اپنا سمجھ کر
جہنم میں بنتا لے گا

(۲) بعض لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قرآن کریم علماء اور اجازہ داری سامانہ انسانوں کے لئے ایک بدایت کی کتاب ہے، لہذا ہر شخص کو اس سے اپنی سمجھ کے مطابق فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، اور اس کی تشریع و تفسیر پر صرف علماء کی اجازہ داری قائم نہیں کی جاسکتی، لیکن یہ بھی انہیں سمجھی اور جذبیاتی اعتراض ہے جسے حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، قرآن کریم بلاشبہ سامانہ انسانوں کے لئے سرمایہ بدایت ہے، لیکن اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ ہر آن پڑھ جاہل بھی اس سے درحقیقی قانونی اور کلامی مسائل کا مستنباط کر سکتا ہے؟ اور اس مقصد کے لئے کسی قسم کی صفات اہلیت و رکار نہیں ہیں، اس کی مثال یونیورسیٹیز کے کوئی ماہر قانون فلسفی یا ذاکر اگر لینے فریکوئی کتاب لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشاء، پوری انسانیت کو

فائدہ پہنچانا ہی ہوتا ہے، اب اگر کوئی ایسا شخص جوان علوم و فنون کے مبادی سے قفت نہیں ہر کھڑا ہر کریا اعڑا فتنے لگے کہ یہ کتابیں تو پوری انسانیت کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھیں، ان پر ماہرین، فنازوں، فلسفیوں اور اکابر طویل نے اپنی اجراہ داری کیوں قائم کر لی ہے؟ تو اس کی عقل پر ہاتھ کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ اگر کسی کتاب سے کا حق، فائدہ اٹھانے کے لئے اہلیت کی کچھ صفات مقرر کرنا "اجراہ داری" قائم کرنے کی تعریف میں آتا ہے تو پھر دنیا کے کسی علم وہنر کو جاہلوں اور انارتیوں کی دستبرداری محفوظ رکھا جاسکتا، دراصل علم و فن کی ہر کتاب انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہوتی ہے، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان اس علم و فن کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرے، اور اس کے لئے جو محنت اور جتنا وقت درکا ہے، اُسے خرچ کرے، اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو جن لوگوں نے اس علم و فن کو حاصل کرنے کے لئے اپنی عمریں کھپائی ہیں اُن یعنی جس پر زیادہ اعتماد ہو، اُس کی تشریح و تفسیر پر بھروسہ کرے، ان دراستوں کے علاوہ جو شخص کوئی تیسرا استہ اختریار کرے گا وہ اپنے اوپر بھی ظلم کر گیا اور متعلقة علم و فن پر بھی، بالکل یہی معاملہ قرآن و سنت کا بھی ہے، کہ وہ بلاشبہ پوری انسانیت کے لئے دستور ہدایت ہیں، لیکن اُن سے ہدایت حاصل کرنے کے بھی دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان ان علوم کو ماہر اساتذہ سے باقاعدہ حاصل کر کے ان میں پوری بصیرت پیدا کرے، یا پھر اُن لوگوں کی تشریح و تفسیر پر اعتماد کرے جنہوں نے اپنی زندگیاں ان علوم کے لئے وقت کی ہیں اس سونی صدر معقول اصول کو جس پر دنیا کے ہر علم و فن کے معاملے میں عمل کیا جاتا ہے، "اجراہ داری" کا طعنہ دینا سوچتے سطحی جذباتیت کے اور کیا ہے؟ کیا ساری دنیا میں صرف قرآن و ہی (معاذ اللہ) ایسے لاوارث رہ گئے ہیں کہ اُن سے مسائل متنبسط کرنے کے لئے اہلیت کی کوئی شرط دو کارہ نہیں ہر؟ اور اُن پر ہر کس و ناکس مشق ستم کر سکتا ہے؟

(۲) مذکورہ اعتراض ہی کو قدری مختلف عنوان سے بعض علماء اور پایا تیت لوگ اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اسلام میں "پایا تیت" کی

کوئی گناہ کش نہیں ہے، یہ بات عیسائی مذہب کا خاصہ ہے کہ اس میں باطل کی تشریع و تفسیر کا حقی صرف پوپ کو حاصل ہوتا ہی، اور کسی درست شخص کو اس سے محال اختلاف نہیں ہوتی، اسلام نے پایا یت کی جڑ کاٹی ہے، لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دین نظرت میں بھی نہ سر آن کریم کی تفسیر کا سارا حق علماء کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے کر دیا جائے؟

لیکن یہ اعتراض بھی پاپا یت اور علمائے اسلام دونوں کی بات کو غلط سمجھنے کا شیجہ ہے، قلمार، کسی ایسے مخصوص طبقے یا گروہ کا نام نہیں ہے جس کی بنیاد رنگ نسل، ذات پات، حال رو دولت یا جاہ و منصب کی خاص شرائط پر ہو، نہ "علماء" کسی ایسی لگی بندھی تنظیم کا نام ہے، جس کا اُرکن یعنی بغیر انسان "عالم" کاملانے کا حق ہو، بلکہ علم و فضل اور سیرت و کردار کی کچھ مخصوص صفات کا حامل ہر شخص عالم دین ہے، خواہ وہ کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو، کوئی زبان پولتا ہو، اور نسب کے اعتبار سے کسی بھی خاندان سے والبستہ ہو، اس ملاحظے سے اسلام کے علماء اور عیسائیت کے پاپاڑیں ممندر جم ذیل واضح فرق موجود ہیں:-

- ۱۔ "پاپا یت" ایک ایسے چیز یہ مذہبی نظام کا نام ہے جو ایک لگی بندھی عالمگیر تنظیم میں جکڑا ہوا ہے، اس میں بے شمار عہدے اور منصب ہیں، ان عہدوں اور منصب پر فائز ہونے والوں کی تعداد مفترہ ہی، ہر عہدہ و منصب پر کسی شخص کا تقرر کچھ معین انسان کرتے ہیں، اور وہی اس کو فرائض و اختیارات تفویض کرتے ہیں، کوئی شخص حاضر اپنی ذاتی اہلیت، علم و فضل یا سیرت و کردار کی بنیاد پر لازماً اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس تنظیم کے ارباب اقتدار اسے نامہ دنے کریں، اور جب تک وہ اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہ کرے مذہبی معاملات میں اُس کی ہر راستے قطعی غیر موثر ہے، خواہ وہ علم و فضل کے لئے ہی بلند مقام پر فائز ہو، اس کا شیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مذہبی علوم میں اعلیٰ درجے کی ہمار حاصل کر لے تو بھی وہ دلالت کے زدر سے چرچ کے مصبوط حصاء کو نہیں توڑ سکتا،

اور اگر یہ معین تنظیم اپنی کتب مقدسہ، پنج سینگروں اور اپنے اسلام سے بغاوت پر کمر باندھ لے تو بھی تنظیم سے باہر کے کسی عالم کو اس کے خلاف دم مارتے کی گنجائش نہیں ہے،

اس کے برخلاف عملاً نے "اسلام" کی کسی بھی زملے میں اس نوعیت کی کوئی ٹکر تنظیم نہیں رہی، جس میں داخلے کے بغیر منہبی معاملات میں لب کشانی ممنوع ہو، جس کے عمدہ دل کا اثر اختریار خاص ہو، اور جن میں تفتر کافیصلہ کیجھ مخصوص افراد کرتے ہوں، اس کے بجائے ہر وہ شخص جس نے ماہراستہ کے زیر نگرانی قرآن درست اور متعلقہ علوم میں بصیرت اور اصلاح و تقویٰ پیدا کر لیا ہو وہ غلام دین کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، مذہبی معاملات میں اُس کے فرائض و اختیارات کا حصہ معدود ہے چنانچہ ان کا کوئی نگر وہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے علم و تقویٰ کی بنیاد پر عام مقبولیت اس کا فیصلہ کرتی ہے، چرچ کے ارباب بست و شاد اپنے عہدہ و منصب کے زور پر اپنی بات منوائے ہیں، اور ایک مسلمان عالم پنے علم و فضل اور برت و کردار کی قوت سے یہ مقام حاصل کرتا ہے، وہاں چرچ کے منتشر دو ائمہ کسی شخص کو واجب الاتباع اور قابل تقليد قرار دیتے ہیں اور یہاں اس معاملے میں اہل فیصلہ کوئی قوت امت کا اجتماعی ضمیر ہے، کلیسا کے عہدہ داروں کی ایک تعداد مقرر ہے، اور اس تعداد کے پورا ہو جانے کے بعد کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو لینے رہے کے کلیسا کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکتا، اس کے برعکس عملاً نے وہیں کی کوئی تعداد مفترر نہیں ہے، علم دین کی ضروری شرائط پوری کرنے کے بعد ہر شخص عالم دن کے حقوق حاصل کر سکتا ہے،

۲۔ پھر کلیسا نے نظام میں مذهب اور عقائد کی تشریح و تفسیر کے تمام اختیارات فرد و احمد پر مکروز ہو جاتے ہیں، جسے "پوب" کہتے ہیں، اس پوب کو مذهب کے کروڑوں پیر دوں میں سے محل ستر کارڈینلز Cardinals (منتخب کرتے ہیں، اس پوب کے اختیارات یہ ہیں کہ وہ تیس الحوار میں (جناب پطرس) کا ہتھا خلیفہ ہے،

تام نہیں معاملات میں آخری اختاری طبے، مذہب کی تشریع کے معاملے میں ہر جی کے لئے واجب الالتماع ہے، اس کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عالم کو اس سے اختلاف کا حق نہیں پہنچتا، انسانیت کلوب پیڈ یا برٹائیکا میں اس کے اختیارات کی تشریع ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

ہنزا پپ عقائد و نظریات کے معاملے میں مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت

سے اسی سنتاوار Authority (اور اسی حصوصیت (Infallibility

کا حامل ہے، جس طرح پورا کلیسا، وہ قانون ساز اور جگ کی حیثیت
وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو پوری کلیسیا کو حاصل ہیں ”

غور فرمائیے کہ پوری تاریخِ اسلام میں آج تک کسی بھی عالم دین نے کبھی اس مطلق العنانی کا دعویٰ کیا ہے ؟

۳۔ پھر عیسائی عقائد کے مطابق ”پپ“ نظریاتی مسائل کا اعلان کرتے ہوئے مucchom اور خطاویں سے پاک ہوتا ہے، چنانچہ برٹائیکا میں ہے :-

”ہنزا پپ کے وہ حصوصی مہیا زات ہیں، ایک یہ کہ جب وہ مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے عقائد کے باسے میں کوئی اعلان کرے تو وہ

مucchom اور غلطیوں سے پاک ہوتا ہے، اور دوسرا یہ کہ وہ مذہب

کے تمام پیر دوں پر حاکماً اختیار کامل (Sovereign

jurisdiction) رکھتا ہے، یہ دونوں حقیقات جن کا دعویٰ اور

استعمال صدیوں سے پوپ کرتے آئے ہیں، ان کو جو لانی شرعاً

کی دیتی کن کونسل میں واضح دستوری شکل بھی دیدی گئی ہے ॥

وہ انسانیت کلوب پیڈ یا برٹائیکا مقالہ ”پپ“ ص ۲۲۲ و ۲۲۳ ج ۱۸

۳۰۰ ایضاً، ص ۲۲۳ ج ۱۸، مزید دیکھئے مقالہ ”مucchomیت“ (Infallibility)

اس کے برخلاف یہ تمام علمائے اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاء، علیہم السلام کے بعد کوئی فرد مقصوم نہیں ہے، اور ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے، چنانچہ علمائے اسلام پوری آزادی سے ایک دوسرے پر تقدیر کرتے آئے ہیں، اور یہ سلسلہ عہدِ سما پڑھنے اب تک جاری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی مشہور سے مشہور عالم اگر دنرآن رسالت کی تشریع میں کوئی غلطی کرے تو درست کرتا مسلمان علماء اس کی گرفت کر کے امت کو اس کے نتایج پر سے محفوظ کر سکتے ہیں،

۲۔ پھر کلیسا میں جو ستر کارڈ نیل پوپ کا انتخاب کرتے اور اس کو مشورے دیتے ہیں ان کی نامزدگی خود پوپ صاحب تنہنا کرتے ہیں، چنانچہ "برٹانیکا" میں ہے :-

شمارڈنیلوں کی نامزدگی آجکل تنہنا پوپ کا کام ہے، پوپ جن افسزاد کو خفیہ طور پر چلتا ہے، ان کے ناموں کی اشاعت سے یہ کام مکمل ہو جاتا ہے
اس کے لئے کسی اور صنایط کی پابندی ضروری نہیں، ... اسی طرح
سیکرڈ کالج کی ورنگ یا منظوري کی بھی چنان صدر دست نہیں ہے۔

اس کے علاوہ کلیسا کے یہ ارباب اقتدار جو مذہب کے سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں ان کا تفتر رمحن اہمیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ مختلف خطوں میں مختلف علاقائی تعصبات کا فریبا ہوتے ہیں، (برٹانیکا) ہی کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو:-

ریاستیں مختلف امریکہ میں کلیسا دنیا کی ہر قوم کے مختلف گروپوں سے مرکب ہوتی ہے، لیکن انگریزی بولنے والی اقوام اکثریت میں ہوتی ہیں
آئیسوں صدری کے وسط تک آترش اور جمن اقوام کو سب سے زیادہ کوٹا حاصل تھا، ... ان کے علاوہ مشرقی کیتوں کی اقوام مثلاً (لینانی، شامی اور آرمینی) ایک قابل حافظ تسا سب سے موجود ہیں۔

لہ انسا یکلار پیڈیا برٹانیکا، ص ۵۵۵ ج ۲، مقالہ "کارڈ نیل"۔

لہ ایضاً، مقالہ "ردمن کیتھوک چمچ" ص ۲۲۱ ج ۱۹،

اس مختصر سے تعارف کے بعد پاپانی نظام کا موازنہ علماء سے اسلام سے کیجئے تو دونوں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، علماء اسلام کی نہ کوئی لگی پستہ تنظیم ہے، نہ کوئی فرد وحدتی مذہبی معاملات میں حاکم اعلیٰ ہے، نہ کوئی شخص مخصوصیت اور غلطیوں سے بیک ہونے کا دعویٰ دار ہے، نہ علماء کی کوئی مخصوص تعداد مذہر ہے، جس پر اضافہ نہ ہو سکتا ہو، نہ کوئی شخص دوسرے علماء کی تنقید سے بالاتر ہے، نہ عالم کے منصب پر فائز ہونے کے لئے کسی فرد واحد کی اجازت اور منظوری درکار ہے، نہ اس منصب کے لئے کسی رنگ^۱ نسل یا زبان و وطن کی کوئی قید ہے، بلکہ تایخ اسلام میں ۔۔۔ کثریاست عربوں کے پاس رہی، لیکن علماء عجمیوں بلکہ غلاموں کے خاندان سے پیدا ہوتے رہے، اور پورا عالم اسلام ان کے علم و فضل اور تقدیس و تقویٰ کا درہا مانتا رہا، لہذا اجب یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرآن و سنت کے علوم میں دخل اندازی کے لئے ان علوم میں بصیرت، جہارت درکاری تو اس پر "پاپائیت" کا الزام عائد کرنا حقیقت اور انصاف کے ساتھ ایک نگینہ مذاق سے سوا کچھ نہیں ہے، اس کے بجائے درحقیقت دینی علوم کی مثال دوسرے علوم کی سی ہے، جس طرح دنیا کے تمام علوم فنون کے بارے میں کسی شخص کی بات اُس وقت تک قابلِ فعل نہیں ہو سکتی جب تک اس نے اُس متعلقہ علم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے ان کا عمل بجز بہ حاصل نہ کیا ہو، اسی طرح قرآن و سنت کی تشرع و تفسیر میں کسی کی بات اُس وقت تک قابلِ قول نہیں ہو گی جب تک اس نے متعلقہ علوم کو باقاعدہ حاصل کر کے ماہر اساتذہ کے زیر نگرانی اُن کا عملی بجز بہ نہ کیا ہے، اگر اس بات کو کوئی شخص پاپائیت^۲ سے تعبیر کرتا ہے تو دنیا کا کوئی علم و فن اس "پاپائیت" سے خالی نہیں ہو گا۔

لہ یہاں ہمارا منشاء صرف یہ بتانا ہے کہ علماء اسلام اور پاپاؤں کے درمیان کیا فرق ہے؟ یہ بات فی الحال ہم لوگے موضوع سے خالج ہے کہ پاپائیت کے نظام میں داقعہ کتنی خرابیاں اور کتنا اچھائیاں ہیں؟ درہ دو اقصے یہ ہے کہ پر دشمنت فرقے کے پر دشمنوں نے ہمیں پاپائیت کی حقیقت خرابیوں کی نشانی کی ہے، ہم اسے مخفی بدنام کرنے کے لئے ہمیں سے الramات غلط بھی لگائے ہیں جو اس پر عائد نہیں ہوتے، لیکن ہمیں اس بحث کا موقع موقع نہیں ہے، محمد تقی

۲، قرآن کریم کو اپنے نظریات کے تابع بنانا

تفسیر قرآن کے سلسلے میں دوسری عظیم مگر اسی یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ نظریات متعین کر لے، اور پھر قرآن کریم کو ان نظریات کے تابع بنانے کی تکریری، جیسا کہ علام ابن تیمیہؓ نے نشان دبی فرمائی ہے، قدیم زمانے سے باطل فرقوں، ظاہرستوں اور اپنے وقت کے نصف سے مرعوب لوگوں نے تفسیرت قرآن میں یہی گواہ کی طریقہ اختیار کیا ہے، اور الھاظف افتراقی کو توڑھوڑ کر لپنے نظریات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ طرزِ عمل دنیا کے کسی بھی عامل میں حق و انصاف کے مطابق نہیں ہے، خاص طور سے قرآن کریم کے بارے میں یہ طریقہ کاراختیار کرنا اتنا برا اظلم ہے کہ اس کے برابر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اپنے آپ کو "ہدایت" کی کتاب قرار دیا ہے، "ہدایت" کے معنی یہ ہیں کہ "جس شخص کو منزل کا رسمہ معلوم نہ ہو اسے راستہ دکھانا"، لہذا قرآن کریم سے "ہدایت" حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس شخص کی طرح خالی الذہن رکھے جسے اپنی منزل کا پتہ معلوم نہ ہو، اس کے بعد دل میں یہ اعتقاد پیدا کر لے کہ قرآن کریم جو رسمہ معلوم نہ ہو، اگر مری عقل الیسی ہی قابل اعتماد ہوگا، خواہ اسے میری مدد و دعویٰ قبول کرے یا نہ کرے، اگر مری عقل الیسی ہی قابل اعتماد تھی کہ میں اس کے ذریعہ سب کچھ معلوم کر سکتا تھا تو پھر قرآن کریم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس اعتقاد کے ساتھ جب انسان قرآن کریم کی طرف رجوع کرے گا، اور ان آداب و شرائط کو لمحظہ رکھے گا جو قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں تو اسے بلاشبہ ہدایت حاصل ہوگی اور وہ منزلِ مراد کو پائے گا، اس کے بر عکس اگر کسی شخص نے محض اپنی عقل کی بنیاد پر کچھ مخصوص نظریات اپنے ذہن میں پہلے سے بھالے، اور پھر قرآن کریم کو ان مخصوص نظریات کی عنینک سے

پڑھنا شریعہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اللہ کی اس مقدس کتاب کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے عقل نظریات کی تائید حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی عقل پر اتنا بھروسہ کرتا ہوا دراپنی عقل کو قرآن کا خادم نہیں، بلکہ (رحمۃ اللہ) قرآن کو اپنی عقل اور خراہشات کا خادم بنانا چاہتا ہو،... قرآن کریم اسے ہدایت کی رشنی عطا کرنے سے بے نیاز ہے، یہ اس شخص اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد تک پہنچنے کے بجائے اپنی مگر اسی کی ذلیل میں پھنسنا چلا جاتا ہے، اور اسے ہدایت کی توفیق نہیں ہوتی، ایسے ہی لوگوں کے باوجود میں قرآن کریم نے فرمایا ہے:

یُنِصَّلِ إِلَيْهِ كَثِيرًا وَ يَكْفُرُ إِلَيْهِ كَثِيرًا ه
اللَّهُ تَعَالَى (اس (قرآن) کے ذریعے بہت سوں کے گمراہ کرتا ہے

اور بہت سوں کو ہدایت بخشتا ہے ۴

ہبذا قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ ہے کہ اپنے ذہن کو دوسروے نظریات خالی کر کے ایک طالب حق کی طرح قرآن کریم کی طرف رجوع کیا جائے، اور اس کی مراد سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہی، ان کو حاصل کر کے اس کی تفسیر معلوم کی جائے، اور اس طرح جو کچھ ثابت ہو اس پر ایک یقینہ مؤمن کی طرح ایکسان رکھا جائے، اور جو شخص اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو، یا اُسے اپنے ذہن پر یہ اعتماد نہ ہو اس کے لئے سیدھا رہتے یہ ہو کہ وہ خود "تفسیر قرآن" کے وادی میں قدم رکھنے کے بجائے اُن لوگوں کی تفسیر پر بھروسہ کرے، جنہوں نے اپنی عمری اسی کام میں صرف کی ہیں، اور جن کی علمی بصیرت اور للہیت دخادر ترسی پر اُسے زیادہ اعتماد ہو،

۳، زمانے کے افکار سے مفرغ بیرون

تفسیر قرآن کے سلسلے میں تیسرا مگر اسی یہ ہے کہ انساف اپنے وقت کے فلسفیانہ اور عقلی نظریات سے ذہنی طور پر رعوب ہو کر قرآن کریم کی طرف۔ رجوع کرے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں اُن نظریات کو حق و باطل کا معیار قرار دے، یہ مگر اسی دراصل درستی

مگر اسی کے ذیل میں خود بخود آجانی ہے، لیکن چونکہ ہمارے زمانے میں مغربی افکار سے مرخوت نے خاص طور سے بڑی قیامت ڈھانی ہے اس لئے یہاں اس مگر اسی کو مستقل طور سے ذکر کیا جا رہا ہے،

تاریخِ اسلام کے ہر دوسریں ایسے افراد کی ایک جماعت موجود ہی ہے جو قرآن و سنت کے علوم میں بچتگی پیدا کئے بغیر اپنے زمانے کے فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے، اور وہ فلسفے اگلے ذہنوں پر اس بُری طرح حoslط ہو گیا کہ وہ اس کے بناء پر ہوئے فکر و نظر کے دائرے میں ہے باہر نکلنے کی صلاحیت نہ ہے ہی محروم ہو گئے، اس کے بعد جب انہوں نے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا، اور اس کی بہت سی باتیں انھیں اپنے آئندیل فلسفے کے خلاف محسوس ہوئیں تو انہوں نے اس فلسفے کو جھٹلانے کے بجائے قرآن کریم میں تحریف و ترمیم شروع کر دی، اور اس کے الفاظ کو کھینچ تاں کر اپنے فلسفیانہ افکار کے مطابق بنانا شروع کر دیا،

جب مسلمانوں میں یونانی فلسفے کا چرچا ہوا، اور لوگوں نے قرآن و سنت کے علوٰ میں بچتگی پیدا کئے بغیر اس فلسفے کو حاصل کرنا شروع کیا، تو یہی فتنہ پیش آیا، اور بعض لوگ جو یونانی فلسفے سے بُری طرح مروع ہو گئے تھے، قرآن کریم کو توڑ موڑ کر اس فلسفے کے مطابق بنانے کی کوشش میں لگ گئے، ان میں بہت سے لوگ مخلص بھی تھے، اور پچھے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ یونانی فلسفہ ناقابل تردید ہے، اور قرآن و سنت کی متوارث تفسیر اس کے لائے ہوئے فکری سیلاں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، اس لئے اس تفسیر کو برل کر قرآن و سنت کی ایسی تشریح کرنی چاہئے جو یونانی فلسفے کے مطابق ہو، لیکن درحقیقت یہ قرآن و سنت اور اسلام کے ساتھ ایک ناواران دوستی تھی جس نے اسلام کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے مسلمانوں میں نظریاتی انتشار برپا کیا، اور معززہ اور جسمیہ جیسے بہت سے نئے فرقے پیدا کر دیتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سچتہ کامیابی دین جنھیں قرآن و سنت کے علوم میں رسوخ حاصل تھا، اور جو قرآن و سنت کے مقابلے میں وقت کے کسی چلے ہوئے نظام فکر سے مروع نہیں تھے، ان کی ایک بڑی جماعت کو

دوسرا کام چھوڑ کر ایسے لوگوں کی تردید میں مصروف ہو جانا پڑا اور اسکو نے یو نانی فلسفے کی فکری غلطیوں کی نشان دہی کر کے ایسے لوگوں کی مدلل اور مفصل تردید کی جائیں فلسفے کے اثر سے قرآن و سنت میں معنوی تحریف کے مرتكب ہوتے تھے، غرض ایک عرصے تک فکری مباحثت اور تصنیف و مناظرہ کا بازار گرم رہا، اور فرقیین کی طرف سے اپنے اپنے موقف کی تائید میں پورے کتب خانے تیار ہو گئے،

بچھے کار علماء دین کا موقف یہ تھا کہ قرآن کریم کسی انسان کی ہمیں اُس خاتم کائنات کی کتاب ہو جو اس دنیا اور اس میں ہونے والے واقعات کی رتی تک سے باخبر ہے، اور اس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے اس سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہو سکتا، لہذا قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے بیان کردہ حقائق سدا ہمارا، اور ناقابل ترمیم میں، جن احکام و قوانین اور نظریات پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی تھی اُن کے بارے میں قرآن کریم نے خود کوئی معین بات کہنے کے بجائے ایسے جامع اصول بیان فرمادیے ہیں جو ہر تبدیلی کے موقع پر کام آ سکیں، اور ان کی روشنی میں ہر بدلتے ہوئے ماحول میں رہنمائی حاصل کی جاسکے، لیکن جو باتیں قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمادی ہیں، یا جن کی واضح تفسیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ زمانے کی تبدیلی سے بدلتے والی باتیں نہیں ہیں،

فلسفہ اور سائنس کی تایا خ اس بات کی گواہ ہے کہ اس کے وہ بلیغہ نظریات جو قطعی مشاہدہ پر مبنی نہیں ہیں، مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، اور جس زمانے میں جو نظریہ راجح رہا وہ لوگوں کے ذہن ذکر پر اس بڑی طرح چھاگلیا کر لوگ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ رہے، لیکن جب زمانے کے کسی انقلاب نے اس نظریے کی کایا پاٹی تو وہی نظریہ اتنا بڑا نام ہوا کہ اس کو بندہ سے نکالنا بھی وقیا لوسیت کی علامت بن گیا، اب اس کی جگہ کسی نئے نظریے نے ذہنوں پر اپنا سکھ بٹھایا، اور اس کی گھن گرج نے ہر مخالف راستے کا گلا گھونٹ دیا، پھر ایک عرصہ گزرنے پر یہ نیا نظریہ بھی اپنی آن پان کھو بیٹھا، اور کسی تیسرے نظریے نے اس کی جگہ لے لی، فکر اس نے

کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے، اور جب تک حقیقت کی پیاس انسان کو قطعی مشاہدہ تک نہیں پہنچا رہی اُس وقت تک یہی ہوتا رہے گا، اس کے برخلاف قرآن کریم نے جن حقائق کی طرف واضح رہنمائی عطا کی ہے، وہ چونکہ ایک الٰی ذات کے بیان کئے ہوئے ہیں جس کے سامنے یہ پوری کائنات اور اس میں ہونے والے حوارث ہاتھ کی سیخیل سے زیادہ واضح اور بے غبار ہیں، اس لئے فکر اور فلسفے کی اس آنکھ محوی کو اس کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا، آپ زمانے کے جس نظریت سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کو اس کے سامنے میں ڈھانے کی کوشش کریں گے، ہو سکتا ہے کہ وہی نظریت ہمید جہالت کی یادگار ثابت ہو، اور آپ اسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرانے لگیں،

راجح العقیدہ اہل علم کا یہ طرز فکر تحریر ہے۔ سے بالکل سچا ثابت ہوا، آج فلسفہ اور سائنس کی ترقیات نے یونانی فلسفے کی دھیجان بکھر دی ہیں، اور اس کے نصرت بہت طبعی، عنصری اور فلکیاتی نظریات غلط قرار پائی گئے، بلکہ آن کی بنیاد پر ما بعد انتہی () نظریات کی جو عمارت اٹھائی گئی تھی، وہ بھی زمین پوس ہو چکی ہے، جن لوگوں نے یونانی فلسفے کی چک دمک سے خیرہ ہو کر قرآن سنت کو موم کی ناک بنایا تھا، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً آن کی ندامت و شرمندگی کی کوئی انہما نہ رہتی،

لیکن حیرت ہر کو سطح پرستوں کا ایک گروہ تاریخ سے کوئی سبق لینے کے بجائے مغربی افکار سے مبتاثر در عرب ہو کر قرآن و سنت کی الٰی تفسیر گھرنے کی فکر میں ہے جو مغرب کے چلے ہوئے نظریات پر فیٹ ہو سکے، یہ گروہ تفسیر کے تمام معقول اور معروف اصولوں کو توڑ کر صرف ایک اصول کی بنیاد پر قرآن کریم کے ساتھ مشق ستم میں مصروف ہے، اور وہ اصول یہ ہے کہ اللہ کے اس کلام کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تاں کر مغربی افکار کے مطابق بنایا جائے، یہ لوگ کبھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ جس کلام پر وہ تاویل دتحریفت کی مشق کر رہے ہیں وہ کس کا کلام ہے؟ جو نظریات کی خاطر وہ خدا کے کلام میں کھینچ تاں کر رہے ہیں، وہ کتنے پایدار ہیں؟

اور جب فکر انسانی کا قافلہ ان نظریات کو روشن کر اور آگے بڑھے گا تو اس قسم کی تفسیروں اور تشریحات کا حشر کیا ہو گا؟

معجزات کا مسئلہ | یہ بات ایک مثال سے واضح ہو گی، جب مغرب کے مشہور فلسفی نیوٹن نے ستھوین صدی میں قانونِ تجاذب کا انتشات کیا تو

اس کا انتشات اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کے باعث میں ایک نظریہ مقبول عام ہو گیا، جسے "میکانیکی نظریہ حیات" کہتے ہیں، اور سارہ لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پوری کائنات علت و معلول کے نظام میں اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ اس سے سرہنوجاوزہ نہیں رکھتی۔ یہاں پائی جانے والی ہر چیز کی ایک فطرت یا خیر ہے، جو اس کے لئے لازم ذات ہے، اور کبھی اس سے الگ نہیں ہو سکتی، مثلاً آٹھ کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جلا سیکنے اس طرح فطرت کا اس سے الگ ہونا ممکن نہیں، چنانچہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آٹھ موجود ہو اور اس سے جلانے کی خاصیت ختم ہو جائے،

جب پوری دنیا میں اس نظریہ کا ڈنکا بجنا شروع ہوا تو مغرب کے مفکرین نے ایسے تمام دلائل کا مذاق اڑانا شروع کیا، جنہیں وہ "ما فوق الفطرت" (Super Natural) سمجھتے تھے، اور جو آن کے دریافت کئے ہوئے علت و معلول کے نظرے کے خلاف تھے، چنانچہ انہوں نے ہر اس چیز کو تم پرستی قرار دیا جو عادی اسباب کے ماتحت واقع نہ ہوئی ہو، اس نظریتے کی گھن گرج اور اس سے زیادہ "ما فوق الفطرت" اشیاء کے استہزا نے عالمِ اسلام کے بعض مجتهدین کو بھی اہتمامی مرعوب تاثر کر دیا، اور جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن کریم میں انبیاء، علیهم السلام کے بہت سے معجزات مذکور ہیں جو اس نظریتے سے میل نہیں کھاتے، تو انہوں نے قرآن کریم کے الفاظ میں ایسی کھیخ تان شروع کر دی جس سے یہ سائیٰ معجزات اہل مغرب کی اصطلاح میں "ما فوق الفطرت" یا "سُپرِ نچرل" ہونے کے بجائے عادی اسباب کے ماتحت آ جائیں، مثلاً علت و معلول کے مذکورہ بالانظریہ کے مطابق جلانا آگ کی لازمی خاصیت تھی جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن کریم نے واضح الفا

میں بیان کیا ہے، کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو ان کے لئے آگ کو ٹھنڈا کر دیا گیا تھا، چنانچہ عالم مسلم کے بعض تجذبہ پسند لوگوں نے اس واقعے ہی سے سمرے سے انکار کر دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا، اور اس غرض کے لئے قرآن کریم کی واضح آیتوں میں ایسی کھینچ تان شروع کر دی جو فتر آن کی معنوی تحریف کی حد تک پہنچ گئی، اور جو ترہ سوال کے عرصے میں قرآن و سنت کے کسی عالم کے دہم دگمان میں بھی نہیں آئی تھی، اور پوری امتت کے برخلاف کیا تھے فتر آن کی اس تحریف معنوی کا جواز پیدا کرتے ہوئے سرسید احمد خان صفا نے نکھا:-

آن کے قدیم علماء اسلام کے زمانے میں پھر سینز نے ترقی ہیں کی تھی، اور کوئی جیز اُن کو قانونی خطا کی طرح کرنا والی اور انگی غلطیوں سے منتبہ کرنے والی نہ تھی، پس یہ اسباب اور مشائیں ان کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ اُن کی کافی توجہ فتر آن جید کے ان الفاظ کی طرف تھیں ہری، مثلاً حضرت ابراہیم کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا، لیکن انہوں نے اس بات پر خیال نہیں کیا۔

حالانکہ احادیث و رایات سے قطع نظر، خود فتر آن کریم کے الفاظ اس داعمے متعلق یہ ہیں :-

قَاتُلُوا حِرْقَوَهُ وَأَنْصَرُهُ وَالْمَهْدَى كَمَرَانَ كَشْتُمُ قَاعِلِيَنَ هُمْ كُلُّنَا يَا كَانَ كُوكُونِيْ بِرَدَّا لَسْكَلَامَأَغَلَّا إِيْرَاهِيمَ هُمْ وَأَرَادُوا إِلَيْهِ كَيْنَا كَجَعَلْنَهُمُ الْكُخْسَرَيْنَ هُمْ (انبیاء، ۵۶)

”ان سب کافروں“ نے کہا کہ اس رابر ایسم کو جلد ادا اور اپنے دیتا تو کی

لئے مفرمة تفیر فتر آن از سرسید احمد خان، ص ۱۴۱

مدد کر داگر تم کرتا چاہتے ہو، ہم نے حکم دیا، اے آگ! تو براہم کے حق میں سرو
اور سلاہی بن جا، اور انھوں نے ابراہم کے ساتھ کمر کا رادہ کیا، پس ہم نے
ان کو ان کے رادہ میں ناہام بنا دیا۔

**قَالُوا إِنَّا أَنَا فِي الْجَحِيمِ هَلْ أَدْرِيهِ كَيْنَىٰ
فَجَعَلْنَاهُ هَرَمَ الْأَسْقَلِينَ،**

انھوں نے کہا اس کے لئے ایک عمارت بنائی اور اس کو دیکھتی آگ میں ڈال دو۔
پس انھوں نے اس کے ساتھ ارادہ بدکیا تو ہم نے ان کو پست، اور ذلیل کر دیا۔
ان واضح اور صریح الفاظ پر تحریف و تاویل کی مشق ستم صرف اس بنا پر کی گئی کہ حضرت
ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زندہ سلامت نہیں اتنے کایا راقعہ مغرب کے راجح الاقت
”ینجیل سینس“ کے خلاف تھا، چنانچہ سرسیدا حمدخان صاحب اور ان کے ہم زادوں کے
تجذیب پسندوں نے مغرب کی اس ”ینجیل سینس“ کی خاطر نہ صرف تفسیر قرآن کے تمام
اصولوں کو پامال کیا اور قرآن کریم کے الفاظ میں کھینچ تان شروع کی، بلکہ اسلام کے
بنیادی عقائد میں سے معاد جسمانی چیزے عقائد پر بھی خط نسخ پھیر دیا، ملائکہ، شیاطین،
اور جنات کو بھی تو ہم پرستی قرار دی�ا، اننبیاء علیہم السلام کے تمام مجرمات کو ”ما فوق لفظ“
کہہ کر قرآن کے منکر ہو گئے، اور اس غرض کے لئے پوئے قرآن کو شاعرانہ تمثیلات کا جموعہ
ہناکر رکھ دیا، ایسے لوگوں کی تفسیریں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کریم نے انہیاں
علیہم السلام کے تمام واقعات اپنے سیدھے سارے اسلوب کے بجا بے تمثیلات کے معنوں
میں بیان کئے ہیں جن کا انتشار تیرہ سو سال بعد ہی باراں فرایاں مغرب پر ہوا ہے،
فتقرآن کریم کے واضح اور صریح لفظ کو من مانے جازی معنی پہناریانا ان حضرات کا ایک
معنوی کھیل ہے، جس کی بے شمار مثالیں اُن کی تفسیروں میں ملتی ہیں، اور اس تمام
کدوکاروں کا منشاء سرسیدا حمدخان صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:-

”جب مجرمات کو ما فوق الغلط قرار دیا جادے جس کو انگریزی میں
”سپریجیل“ کہتے ہیں، اور اس سے انکار کرتے ہیں اور ان کا دروغ

ایسا ہی ناممکن فسرا رہ دیتے ہیں، جیسے کہ قوی و عدرے کا ایفاء مذہبنا، اور علائمیہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے امر کے واقع ہونے کا ثبوت نہیں ہے، جو مافق الفطرت ہو، اور جس کو تم مجرہ فرار دیتے ہو، اور اگر بغرضِ محال خدا کی قدرت کے حوالے پر اس کو تسلیم بھی کریں تو وہ ایک بے نائماہ امر ہو گا۔

اس کے برخلاف علماء میں اسلام کا موقف یہ تھا کہ مجرمات کا وقوع عقلی طور پر کوئی محال نہیں ہے، ہاں یہ واقعات خلاف عادات ضرور ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی سینیم کی حقانیت ہر عالمی اور ان پڑھ کے سامنے والٹگاٹ کرنا چاہتا ہے تو ان کے ہاتھ پر ایسے حیرت انگیز خلاف عادات کام ظاہر کر دیتا ہے، جیسیں دیکھ کر ہر شخص یہ مجھے جانتے کہ اللہ کے اس سینیم کو تائید خداوندی حاصل ہے، مگر چونکہ مغرب میں نیچرل سینس کا سکر چلا ہوا تھا، اس لئے ترسیم صاحب دغیرہ یہ بات کہتے ہوئے شرم کرتے تھے، لیکن قدرتِ خداوندی کا یہ کر شرم ملاحظہ فرماتی ہے کہ جس وقت سرسری احمد خان صاحب اور اُن جیسے دو سکے مجددین نیچرل سینس کی خاطر تمام انبیاء کے مجرمات کا انکار کر رہے تھے اور اس غرض سے قرآن کریم کی آیات پر تحریف و تاویل کی مشق کی جا رہی تھی، ٹھیک اُسی زمانے میں سائنس کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا تھا، نیوٹن کے نظریات نئی تحقیقات کی روشنی میں غلط ثابت ہوئے تھے، اور آئن آٹماں اپنے انقلابی نظریہ اضافت کی داعی بیسیں ڈال رہا تھا، جس نے سائنس کے گوشہ مفردات کی کایا پلت کر رکھ دی، اور اس کی بنیاد پر بیسویں صدی میں جس ایمی سائنس کا ڈنکابجا اس نے قانون کشش اور قانون علت و معلول کو رد کر کے نیچرل اور سینیم نیچرل کی تفہیق ہی ختم کر دی، جناب پروردہ حاضر کا ایک عظیم اور سیم سائنس داں تصریح کرایہ نیشن (Eddington) ہے:-

”سائنس کی تحقیقات سے اشیا کی کسی اندر دنی ذائقہ ولاین فک

خاصیت یا اہمیت و توعیت (نیچر) کا پتہ نہیں چلتا۔^{لہ}

اور اس طرح:-

ایک اہم شیخ خارجی دنیا میں قانون علت کے ختم ہو جانے کا یہ نکلناؤ
کرنے کی فطرت اور فرق الفطرت کے درمیان کوئی واضح فرق باقی نہیں رہتا۔^۱
سانس کے مسلمات میں یہ زبردست انقلاب کس طرح روشن ہوا، اس کی مختصر سرگزشت
ہمارے ذریعے مشہور سائنسٹ سر جیمز جینز (Sir James Jeans) کی زبانی سنئے:-

”گلیکی آزاد ریون کی عظمت ستر ہوئی صدی کی یہ بڑی عظیم کامیابی اور فتح
مانگی تھی کہ کائنات میں ہر را بعد کا تغیر و تبدل یا تخلین اپنے قابل
کا ناگزیر نتیجہ والا نہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ ساری کائنات فطرت (نیچر)
کی پوری تاریخ آخر تک لازمی اور ناگزیر نتیجہ اس ابتداء کا ہے جس میں دو
پہلے دن تھیں،“

اس تصور ہی کا لازمہ وہ حکمیک تھی جس نے ساری مادی کائنات
کو بس ایک میشین بنانا اور سمجھا یا تھا، یہ صورت حال ایسیوں صدی کے
آخر تک مسلم اور جاری رہی، اور ساری نیچرل سائنس کا واحد مقصد
اس کائنات کو مشینی ساخت (میکانیکس) میں تبدیل و تحول کرنے
بن گیا.....

پھر اسی ایسیوں صدی کے آخر میں یونیورسٹیز میں برلن کے ماکس پلانک
و Max Plank نے کوئی نظریہ کی بنیاد دی جو بالآخر
ترقی کر کے جدید طبیعت رفتگی کا ایک ہمہ گرا اصول قرار پا گیا جس

Eddington ; The Nature of Physical World P 303
لہ

ماخوذ از ”مذہب سائنس“ ازمولانا عبدالباری ندوی، ص ۸۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء،

آگے جل کر سائنس کے میکاکی عہد کا خاتمہ کر کے ایک نزد ور کا آغاز کر دیا ॥
ابتداء میں پلانک کے نظریے سے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ کائنات فطرت میں آسیسل کا عمل
کا رفرما ہے، لیکن ۱۹۱۶ء میں آئنہ ہٹالن نے بتایا کہ پلانک کا نظریہ دراصل بہت یادو
القلاب انگریز نتائج کا حامل ہے اور بقول جمیس جینز ہے:-

”یہ نظریہ اس قانون علت و معلول ہی کو اپنی فرمائروائی کے تحت سے آتا ہے
والا ہے جسکو اب تک کائنات کے ایک ہمگیر ہمہ اسون کا مقام حاصل تھا
پرانی سائنس کا یقینی اعلان اور دعویٰ خاکہ فطرت رنجپر سلسہ علل
معلومات کے بندھے ہونے قرائیں۔ سے باہر ایک قدم نہیں نکال سکتی، علت
”الف“ کے بعنایزی طور پر ”ب“ کے معلول ہی کو پیدا یا ظاہر نہ نہاچا ہے،
لیکن نئی سائنس اب سرت اتساد عویٰ کر سکتی ہے کہ ”الف“ کے بعد ”ب“،
تج“ دیگر کے یوں تو بے شمار امکانات ہیں، البتہ استدحیج ہے کہ اُن میں
”الف“ کے بعد ”ب“ کا نوادرہ نہ ہنا چج۔ کے مقابلے میں اور ”ج“ کا ”د“ کے
مقابلے میں اغلب ہے،

جمیس جینز نے بتایا ہے کہ اس اغلبیت یا اطنی غالب کے سوا کسی نام تہار علت کے بعد
کسی خاص نام نہاد معلول ہی کے پیدا ہونے کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے
نہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے، بلکہ:-

This is matter which Lies on the kness
of gods whatever gods there be.

”یہ معاملہ کلیتی تحریک کے ہاتھ میں ہے جس کو بھی خدا کہا جاتے ہے۔“
غرض بیسویں صدی میں ایمیٹی تحریک کی روشنی میں جو سائنس پر دان چڑھی ہے

لہ جمیس جینز کی کتاب ”پر اسرار کائنات“^۱
Mysterious Universe ص، ۲۱۴، ۳۲ ماخوذ از ”ذہب سائنس“ مولانا عبدالباری ندوی، ص ۸۳ تا ۵۸،

انچہ ان پر اپنے تصویرات کو جو جڑ مولیٰ ہی سے ختم کر دیا ہے کہ کائناتی آشیا، کی خاصیتیں اُن اشیاء سے جدا نہیں ہو سکتیں، اور آگ سے جلانے کی صفت کو کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا، اب سائنس کا کہنا یہ ہے کہ آگ اکثر دیشتر جلاتی مزدor ہے، اور غالب گمان یہی ہے کہ جیساں آگ ہوگی دہان پیش اور جلن پائی جائے گی، لیکن اگر کبھی اس کے خلاف ہو جاتے تو یہ نہ عقل کے خلاف ہو اور نہ سائنسی مسلمات اس کی تردید کر سکتے ہیں، لہذا آج کا سائنسدار مجہرات کے بالے میں زیادہ سے زیادہ الاعلیٰ کا الہام کر سکتا ہے، اُن کو نا ممکن کہ اُنکا اصولی انکا نہیں کر سکتا، شاید یہی وجہ ہو کہ بیسویں صدی میں مغرب کے عوام پھر ان چیزوں کی طرف لوٹ رہے ہیں جیسیں وہ پہلے آنوق المفطرت "سچو کر تو تم پرستی فترا ریدیا کرتے تھے، انہیاً یہ ہے کہ بعض اطلاعات کے مطابق مغرب کی بعض یونیورسٹیوں میں "جادو" سمجھائے کے لئے باقاعدہ شبے قائم ہونے لگے ہیں،

پھر تجدید پسندوں کی ذہینیت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ زمانے کے عام شور و شغب سے ممتاز درمذوب ہو کر بڑی جلدی سے ایک راتے قائم کر لیتے ہیں، اور معاملے کی پوری تحقیق کئے بغیر یہی اُس راتے پر فکر و نظر کی پوری عمارت کھڑی کر لیتے ہیں، مجہرات کے معاملے میں بھی یہی ہوا ہے کہ جس وقت سرستیدا حمدخان صاحب اور اُن کے ہم فوادر بر متجددین مجہرات کو نا ممکن "فترا رادے رہے تھے اس وقت مغرب میں عام شور تو بیشک اُن کے انکار ہی کا تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ نلسون اور سائنس کی دنیا کے تمام لوگ ہیوم اور حکائی کی طرح مجہرات کے منکر ہوں، بلکہ بہت سے ممتاز سائنس دان اُس وقت بھی مجہرات کے قاتل تھے جن میں نیوٹن، فرانسیس، سپین، کیلوں، اور لستر بلفور خاص قابل ذکر ہیں، اور جرمی کے مشہور سائنس دان لوٹرڈ (نے تمجذبات کی تائید میں بڑے مرکے کے مضامین لکھے ہیں، اور ثابت کیا ہے کہ مجہرات کسی بھی طرح عقل یا سائنس کے خلاف نہیں ہیں ۔^{لہ}

۱۹۔ ملاحظہ ہو انسانی بیٹریا یا طبا نیکا، ص ۷۵۸ و ۵۸۵، مطبوعہ شعبہ مقالہ "مجہڑہ" (رباق عاشق اگلے افسوس پر)

او پر عجم حاضر کے ساتھ داؤں کے جو اقوال پیش کئے گئے ہیں ہم نے ان کو قرآن کریم کی صداقت اور حقائیت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا، کیونکہ قرآن کریم کی سچائی ان اقوال کی تائید سے بے نیاز ہے، وہ آس وقت یعنی پنجاھ تھا جب ساتھ سانس داں ما فوق الفطرت اشیاء رکامنداق ادا تھے تھے، اور آج بھی چلے ہے، جب ساتھ سانس داں خود ما فوق الفطرت اشیاء کے انکاں کو تسلیم کر رہی ہے، اور اگر بالفخر حکم کل ساتھ کے نظریات دوبارہ بتل جائیں تو اس کی سچائی میں اس وقت بھی ذرۂ برابر کی نہیں آئے گی، لیکن یہ اقوال ہم نے صرف یہ بتانے کے لئے پیش کئے ہیں، کہ جن لوگوں نے مردوجہ نظریات سے مروعہ ہو کر قرآن کریم کی تفسیر میں کتر بیونت کرنے کی کوشش کی تھی ان کی بنیاد کس قدر کمزور اور ناپایدار تھی، انہوں نے ایک ایسے کلام کو دقتی نظریات کے پیانا سے ناپنے کی کوشش کی تھی، جس کا علم ماضی و مستقبل کی تمام دستتوں کو محیط ہے، اور جس کے آگے قفر انسانی کی تمام کاوشیں بچوں کے کھیل سے زیادہ دقت نہیں رکھتیں، لہذا اگر قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تابع بنانے کے بجائے اس سے واقعہ رہنا ہی ممکن ہے، تو اسے راجح وقت نظریات کی عنینک سے پڑھنے کے بجائے اس طرح پڑھتے جس طرح سرکارِ دُنیا مصلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ نے پڑھا تھا، اور اس کی تشریع و تفسیر کے وقت مردوجہ افکار کے شور و غل سے متاثر ہونے کے بجا کوہ اصول استعمال کیجئے جو تفسیر کے فطی معقول اور واقعی اصول ہیں، ان اصولوں کے ذریعہ

ربقیہ حادیہ صفحہ گزشتہ) (Miracle) اس مقالے میں الفریڈ ای، گارنے نے مجرمات کے انکا اور ضرورت پر لامپ بجھت کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ مجرمات نہ صرف عقل اور ساتھ کی رو سے مکن ہیں بلکہ انکی ضرورت ناتقابل تحریک، اس کے علاوہ مجرمہ کے موضوع پر مذکور جزیل کتابیں بطور خاص قابلِ مطالعہ ہیں: (۱) سیرۃ النبی ﷺ، امام احمد، ج ۳، باب مؤلفہ مولانا عبدالباری نوری (۲) موقف الحق و لعلم داعالم، مؤلف شیخ المصطفیٰ صبری بک، (۳) اسلام اور مجرمات، مؤلف شر حضرت مولانا بشیر احمد صاحب ختمی رحمۃ اللہ علیہ،

جو بات قرآن کریم سے واضح طور پر ثابت ہو جاتے اُسے جھینپ جھینپ کر اور شرعاً شرعاً کر
نہیں، بلکہ پورے یقین دایمان اور خود اعمادی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیجئے، اور
زمانے کے مرد جو نظریات ہزار اس کے خلاف ہوں یہ یقین رکھئے کہ حق دہی ہے جو قرآن کریم
نے بیان کر دیا، اگر انسانیت کی قسمت میں کوئی فلاح بخوبی ہے تو وہ ہزار بخوبی کیں کھانے
کے بعد اس کے بیان کئے ہوئے حقائق تک پہنچ کر رہے گی،

خلافِ عقل اور ماوراءِ عقل

یہاں ذہنوں میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر
ایسی بات قرآن کریم کی طرف منسوب ہوتی ہو جس کے بالے میں ہم جدید تحقیقات کی روشنی میں
کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں کہ وہ عقل یا مشاہدے کے خلاف ہو تو پھر قرآن کریم کی اسی
تفسیر پر اصرار کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم فتنہ آن کریم کی باقتوں کو قطعی مشاہدات کے خلاف
قرار دیں اور اس اللہ تعالیٰ کی طرف وہ بات مسیب کریں جو یقینی مشاہدے سے غلط ثابت
ہو چکی ہے،

اس کا جواب یہ ہو کہ فتنہ آن کریم کی جو تفسیر قطعی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
یا صحابہ کرامؓ کے اجماع و اتفاق سے ثابت ہوا وہ آج تک کبھی عقل یا قطعی مشاہدے
کے خلاف ثابت نہیں ہوئی، چورہ سو سال کے عرصے میں علمی تحقیقات و اكتشافات میں
سینکڑوں انقلاب آئے، لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ فتنہ آن کریم کی کوئی قطعی
الثبوت تفسیر مشاہدے کے خلاف پڑی ہو، اور چونکہ فتنہ آن کریم اللہ تعالیٰ کا حکام ہے، اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی قولی اور عملی تفسیری کے لئے مبuous کیا گیا تھا، لہذا
آپ کی بیان کردہ ہر تفسیر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت کے مطابق ہے، اور آپ کی کوئی
تفسیر آئندہ بھی عقل یا مشاہدے کے خلاف نہیں ہو سکتی،

اللہ اس معاملے میں غلطی دد طرح لگتی ہے :-

(۱) جو لوگ زمانے کے مرد جو نظریات سے بہت جلد مروع ہو جانے کے عادی
ہیں، وہ کسی چیز کے "خلافِ عقل" ہونے کا فیصلہ بہت جلد کر دلتے ہیں، یہ ایک طے شدہ

عسلکہ ہو کہ ہر حرمت انگریز چیز خلاف عقل نہیں ہوتی، اور نہ ہر اُس چیز کو ناممکن کہا جا سکتے ہے جس کے اسباب بھروسے نہ کئے ہوں، ایسی چیز کو مستبعد improbable (غیر ممکن) رسمی (astonishing)، Extra ordinary (یا حیرت انگریز) تو کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کو ناممکن ر impossible (کہنا خود خلاف عقل ہے) جو شخص متعلّف فن سے واقعہ نہ ہوا س کے لئے یہ بات قطعی تاقابل فہم ہے کہ واٹر لس سیڈیٹ میں ہزاروں میں دُور بیٹھے ہوئے انسان کی آواز کو سطح سُنائی دے رہی ہے؟ اور اگر کسی دیہاتی کے سامنے یہ بات کبی جائے تو عجیب نہیں کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار ہی کر دے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واٹر لس سیڈیٹ میں دور دراز کے کسی آڈی می کی آواز سنائی دینا خلاف عقل "یا" ناممکن" ہے، بعض حضرات قرآن کریم کی تفسیر کے معاملے میں اس فرق کو ملاحظہ نہیں رکھتے، بلکہ ہر اُس چیز کو "خلاف عقل" یا "ناممکن" قرار دیتے ہیں جو محض حیرت انگریز یا زیادہ سے زیادہ خلاف عادت اور مستبعد improbable (معلوم ہوتی ہے، حالانکہ قرآن کریم اور احادیث وغیرہ میں اس قسم کی باتوں کا پایا جانا ہرگز محل تعبیر نہیں، ہم کتاب کے شروع میں عرض کرچکے ہیں کہ وحی نبوت کا آغاز ہی اُس مقام سے ہوتا ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، وحی درسالت کے سلسلے کا تو نقصید اصلی ہی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کو ان باتوں سے باخبر کیا جائے جنہیں رہ محض عقل کے ذریعے نہیں جان سکتا، چنانچہ اگر دویں درسالت کا سلسلہ نہ ہوتا تو عقل معاد و آخر، حساب و کتاب، جنت و جہنم اور ملائکہ وغیرہ کا ادراک از خود نہیں کر سکتی تھی، ورنہ اگر تھے ساری باتیں زری عقل سے معلوم ہو سکتی تھیں تو ان بیانات علمیں اسلام کو مبیوث فرمائے، اُن پر وحی نازل کرنے اور لاحقیں آسمانی کتابیں دینے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، لہذا اگر وحی اور رسالت پر ایمان ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علم کے اس ذریعے سے ہمیں بہت سی باتیں ایسی معلوم ہوں گی جو محض عقل سے معلوم نہ ہو سکتی تھیں، اور جن کا ادراک و تصور عقل کے لئے مشکل تھا،

اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ قرآن و حدیث میں ایسی حیرت انگریز چیزوں کا وجود اُن کے

موضوع کے لحاظ سے بالکل مناسب بلکہ ضروری ہے، تو قرآن کریم کی کسی ظاہر و متبادر اور اجتماعی تفسیر کو محض اس بنیاد پر رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے ایک یحرب ایگزیبات ثابت ہوتی ہے، تا اقتیانک وہ بات داقعہ خلاف عقل یعنی ناممکن اور محال نہ ہو، لیکن قرآن کریم کی قطعی تفسیروں میں آج تک کوئی بات ایسی ناممکن اور خلاف عقل ثابت نہیں ہو سکی، اور نہ قیامت تک بوسکتی ہے، اس مسئلے کی مرتب تفصیل و تشریح ہم انشاء اللہ اکھلے با۔ میں اصول تفسیر کے تحت کریں گے،

(۱۲) دوسری غلطی بعض ادوات یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی تفسیر قطعی اور یقینی نہیں ہوتی، نہ قرآن کریم کے سیاق و سباق سے، نہ آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی قطعی تفسیر سے، نہ امت مسلمہ کے اجماع سے، اس کے باوجود وہ تفسیر عام لوگوں میں اتنی مشہور ہو جاتی ہے کہ لوگ اسے یقینی اور قطعی تفسیر سمجھنے لگتے ہیں، اور جب وہ عقل کی کسی قطعی دلیل یا مشاہدے کی پناپر غلط ثابت ہوتی ہے تو بعض ناواقف لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں، اور بعض فترات قرآن کریم یا اس کی یقینی اور قطعی تفسیروں کے باسے میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اسی طرح خلاف عقل ہو سکتی ہیں، لہذا ایسے موقع پر یہ دیکھنا چاہیکہ کہ قرآن کریم کی جو تفسیر عقل کی کسی دلیل قطعی یا مشاہدے کے خلاف معلوم ہو رہی ہے وہ کہنا۔ کی ہے؟ محض عام شہرت کی بنا پر اسے یقینی تفسیر سمجھ لینا غلط ہے،

یہ بحث "اصول تفسیر" کے تحت قدیم تفصیل کے ساتھ آگے آرہی ہے، کجب عقل اور نقل دلائل میں تضاد معلوم ہو تو صحیح راو عمل کیا ہے؟ اس موقع پر اس بحث کو فرداً دیکھ لینا چاہئے،

۲- قرآن کریم کے موضوع کو عَلَاطِ سمجھنا،

تفسیر قرآن کے بالے میں چوتھی گمراہی یہ ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کے موضوع کو صحیک ٹھیک نہیں سمجھتے، اور اس میں وہ باتیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے موضوع سے خارج ہیں، مثلاً بعض حضرات اس جستجو میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم

سے کائنات کے تمام سائنسی اور طبعی حقائق متنبہ کئے جائیں، اور سائنس کے مسلمات کو قرآن سے ثابت کیا جائے، وہ یہ صحیح ہیں کہ اگر قرآن سے سائنس کے مسائل ثابت ہو سکی تو معاذ اللہ (یہ قرآن کریم کا نقص ہو گا، چنانچہ وہ پولے خلوص کے ساتھ قرآنی آیات سے سائنسی مسلمات ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، اور بعض اوقات اس غرض کے لئے قرآنی الفاظ کو غلط معنی پہنچاتے ہیں، حالانکہ واقعی یہ کہ قرآن کریم کا اصل موضوع سائنس نہیں ہے، اس میں اگر کہیں کائناتی حقائق کا ذکر آیا ہے تو ضمنی طور سے آیا ہے، لہذا اگر اس میں کہیں کوئی سائنسی حقیقت واضح طور سے مل جائے تو اس پر توبابا شبه ایساں رکھنا چاہتے ہیں، لیکن سائنس کا کوئی مسئلہ پہلے سے ذہن میں رکھ کر قرآن کریم سے اسے زبردستی نکالنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص طب کی کتاب میں قانون کے مسائل تلاش کرنے لگے،

قرآن کریم نے اپنا موضع اور مقصد تزویل میہم نہیں چھوڑا، بلکہ بیسیوں آیات میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اُسے کیوں نازل کیا گیا ہے؟ مثال کے طور پر مندرج ذیل آیات پر غور شرمائیے :-

قُدُّسَةَ الْمُرْسَلِينَ إِذْ هُنَّ عَلَىٰ نُورٍ وَكَيْثِيَ مُهْمَنْ وَيَهْدِي مَنِ يَهْدِي إِلَيْهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رَضْوَانَهُ سُبْلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ يَأْذِنْهُ وَيَهْمِنْ يَكِيمْ إِلَى صَلَاطِ مُسْتَقِيمِهِ (مائدہ: ۱۵ و ۱۶)

”تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے، اور کتاب واضح کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضاۓ حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں، اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں نکال کر نور کی طرف لے آئے ہیں، اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتے ہیں“ ॥

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قُدُّسَةَ الْمُرْسَلِينَ كُنْدَرَ سُوْلَتَانِيَّتِيَّنَ تَكُنْ عَلَىٰ فَتْرَةِ وَقْنَ الرَّسُلِ إِنْ تَفْتَوْلُ إِمَاجَانَ نَارِيَّنْ بَشِيرِرِ لَانِيَّرِ فَقَدْ جَاءَنْ بَشِيرِرِ وَمَنِيَّرِهِ (مائدہ: ۱۹)

اے اہل کتاب تمھارے پاس یہ ہمارے رسول آپ سچے ہیں جو تم کو صاف
صاف بتلاتے ہیں، ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ (عوام سے) متوفی
تھا، تاکہ تم وہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا آئیا،
نہ ٹوڑانے والا، تو (اب) تمھارے پاس خوش خبری دینے والا اور ڈرانے
والا آگیا۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ أَنْجُونَ مُصَدِّقًا لِّتَبَيَّنَنَّ يَدَنِّيْهِ مِنَ
الْكِتَابِ وَمُهِمُّنَا عَلَيْهِ فَاحْتَمِ بِيَمِّنَمْ بِهَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا يَشْعُرُ
أَهْوَاءُهُمْ بِعَمَاجَاءُكُمْ مِّنَ الْحَقَّ، إِنَّكُمْ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شَرِيعَةً وَ
مِنْهَا لِجَاهَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى لَعَنَّكُمْ أَمْمَةٌ وَّاَحِدَةٌ وَّلَا كُنْ
تَيَسِّبُو كُمْ فِي مَا أَنْكُمْ فَاسْتَقِمُوا إِلَيْنَا هُنَّ مُرْجَعُكُمْ
جَمِيعًا، فَيُنَصِّبُكُمْ بِهَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (ماندہ: ۳۸)

ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھی ہے، جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف
ہے اور اس سے پہلے جو رآسمانی، کتابیں ہیں اُن کو بھی تصریح کرتی ہے،
اور ان کتابوں کی محاوظہ ہر تو ان کے باہمی معاملات میں اسی بھی ہوئی
کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجیے، اور یہ جو سچی کتاب آپ کو مل ہے اس سے
دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عذر آمد نہ کیجیے، تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے
خاص شریعت اور خاص طریقہ تحریز کیا تھا، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظوم
ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت میں کر دیتے، لیکن ایسا نہیں کیا، تاکہ جو
دین تم کو دیلہ ہے اس میں تم سب کا امتحان فرمادیں، تو میکیوں کی طرف
دوڑو، تم سب کو خدا ہی کے پاس جائیں ہے، پھر وہ تم سب کو جلا دیگا
جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے یا

وَكَذَلِكَ لَفَضِّيلُ الْأَذِيْتِ وَلَسْتُقِيْنَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

(انعام: ۵۵)

”اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ کھل جائے

طریقہ تہذیب کاروں کا“

رَكِبْتُ أَنْزِلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدَارَاتِ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِنَ رَبِّهِ
وَذَكْرُنِي لِلْمُؤْمِنِينَ (۱۱: اعراف)

یہ رقرآن) ایک کتاب ہے جو آپ کے پاس اس نے بھی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعے (لوگوں کو نافرمانی سے) ڈرانیں، سو آپ کے دل میں رسمی کے نامانے سے (بالکل تنگ نہ ہونے پا ہے، اور نصیحت ہے ایمان والوں کیلئے) اُوعِجَبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ دِيْنُ رَبِّكُمْ عَلَىٰ رَحْلٍ مُّثْكُمْ
لِيُذْهِنَ رِبْحَمْ وَلِسَقُوتُهِ وَلَعْلَكُمْ تُرَحْمُونَ (اعراف: ۶۲)

تیام اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پر در دگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی نہ کر دے شخص تم کو ڈراوے، اور تاکہ تم ڈر جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے“

تَلَكَ أَيْتَ إِلَيْكُمْ أَنْحَكِيمُهُ هُنَّىٰ وَرَحْمَةً لِلْمُتَحْسِنِينَ
الَّذِينَ يُقْيِمُونَ الصَّلَاةَ وَمُؤْمِنُونَ الرَّزْكُوَةَ وَهُمْ يَا الْأَخْرَقَ
هُمْ يُوقِنُونَ (القصان آتا ۲۴)

یہ آیتیں ہیں ایک پڑھکت کتاب کی، جو کہ ہدایت اور رحمت ہے نیکوکاروں کے لئے جو نازکی پابندی کرتے ہیں اور زکوہ ادا کرتے ہیں، اور وہ لوگ آخرت پر پورا العین رکھتے ہیں۔“

تَنْذِيلُ الْكِتبِ لِلَّارِيَتِ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ هُمْ يَقُولُونَ
إِفْرَارَتُهُ بَلْ هُوَ الْعَقْ وَمِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِنَ رَقْوَمَا مَآ آتَاهُمْ مِنْ
نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَكْسِلُونَ ه (مسجند: آتا ۳)

یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اس میں کچھ شبہ نہیں، یہ رب العالمین کی طرف

سے ہے، کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ سخن رسل اللہ علیہ وسلم نے یہ اپنے دل سے بنالیا ہے، بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے، تاکہ آپ اپنے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، تاکہ وہ لوگ راہ پر آ جائیں ॥

تَنْزِيلُ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَا أَنْذَرَ إِلَيْهِمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ۝ (لیل: ۱۵)

یہ قرآن خدا سے زبردست ہربان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، تاکہ آپ اپنے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پادے دادے نہیں ڈراتے گئے تھے، سو اسی پر یہ بے خبر ہیں ॥

إِنَّا أَنْذَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحُقْقِ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الْيَنْنَ، (زمر: ۲)

”هم نے اس کتاب کو آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل کیا ہے، سو آپ خاص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کیجئے ॥

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنذِرَ أَمَّ الْفَرْسَى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَأَرَيْبَ فِيهِ، قَرِئْتَ فِي الْجَنَّةِ وَ قَرِئْتَ فِي السَّعَيْرِ (شوریٰ: ۷)

”ہم نے اسی طرح آپ پر نتر آن عربی وحی کے ذریعے نازل کیا ہے، تاکہ آپ مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے ارد گرد میں، ان کو ڈرائیں، اور جمع ہونے کے دن (یعنی قیامت) سے ڈرائیں، جس میں ذرا شک نہیں، ایک گردہ جنت میں ہوگا، ایک گردہ دوزخ میں ॥

شَهَدَ جَاهِلُّونَ كُلَّ مُشَرِّكٍ عَيْنَهُ مِنَ الْأَمْرِ قَاتِلُهُمَا وَلَا شَيْءٌ أَهْوَ أَهْوَهُهُمُ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ، إِنَّهُمْ لَنْ يُغْنِوا عَنْكَ مِنَ النَّهَى شَيْئًا وَلَا إِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْ لِيَا وَبَعْضٌ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُسْتَقِيمِ ۝

هُدَىٰ بِعَصَائِرِ الْنَّاسِ وَهُدًىٰ وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ أَيُّوبٍ قَوْنُونُ ۝
 (المائحة: ۲۰-۲۱)

پھر ہم نے آپ کو (دو دین کے) ایک خاص طریقے پر کر کر دیا، سو آپ اسی طریقے پر چلے جائیے، اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلتے، یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذریکام نہیں آسکتے، اور نظام لوگ ایک دوسرے کے درست ہوتے ہیں، اور انشدروست ہے اب تقویٰ کا، یہ قرآن عام لوگوں کے لئے بصیرتی اور بہادیت پر مشتمل ہے، اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت رکھتا ہے۔

اللَّهُ فَرَّأَىٰ أَخْسَنَ النَّعْدِ يُمِيزُ كَتَابًا مُّتَشَابِهً اَمْثَانِيْ كَفَشَ عِرْمَنْهُ
 مَجْمُودٌ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلَيْنَ مَجْمُودَهُمْ وَقُلُوْبَهُمْ
 إِلَىٰ ذِكْرِ رَبِّهِنَّهُ ذِلْكَ هُدُىٰ اللَّهُ يَهْدِيٰ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يَضْلِيلٍ

اللَّهُ فَهَمَّ الَّهُ مِنْ هَادِ رَزْمَرْد ۲۳

”الشَّاعِلَى نَبَّىٰ بِرَاعِدَةِ كَلَامِ رَفِتْرَانِ (نازل فرمایا ہے)، جو ایسی کتاب ہے کہ باہم بليٰ مجلقی ہے، راوی جس میں ضروری باتیں، بار بار دہرانی گئی ہیں جس سے آن لوگوں کے دل کا پس اٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کے ہدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہ (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے، جس کو وہ چاہتا ہے اس کے لئے ذریعہ ہدایت کرتا، اسکے اور خدا جس کو مگر اہ کرتا ہے اُس کا کوئی ہادی نہیں ۴۶“

یہ محض چند مثالیں ہیں، اور اگر صرف اپنی پر غور کر لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہو کہ فترآن کریم کا اصل مقصد انسان کو آخرت کی تیاری پر آمادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی تعلیم و ترغیب ہے، اور جتنی باتیں اس میں تاریخی واقعات یا کائنات و آفاق سے متعلق آئی ہیں وہ سب اسی بنیادی موضوع کی تائید و تقویت کے لئے آتی ہیں، بلزا اگر اس میں سائنس کا کوئی مشہور مسئلہ موجود نہ ہو تو نہ یہ کوئی عیب کی بات ہے نہ تتعجب کی، کیونکہ یہ اس کا موضوع، یہ نہیں ہے، اسی طرح اگر

ماضی میستقبل کا کوئی واقعہ قرآن مجید میں نہ ملے تو یہ بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، کیونکہ وہ تایاخ کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں جستہ جستہ واقعات عبرت اور موعظت کے لئے بیان کئے گئے ہیں،

اس سے بعض اُن غیر مسلموں کا اعتراض بھی دُور ہو جاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی مالک نے جن علوم و فنون کے ذریعے مادی ترقی کی ہے، اُن کے بارے میں قرآن کریم نے پچھے کیوں نہیں بتایا؟ اور اُن لوگوں کی غلط فہمی بھی دُور ہو جاتی ہے جو ان اعتراضات سے متاثر ہو کر اس نظر میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم سے سائنس وغیرہ کا کوئی نہ کوئی مسئلہ کرسی نہ کسی طرح ثابت کیا جاتے، کیونکہ اس کو شیش کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص قانون کی کسی کتاب پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس میں ایتم بھم بنافے کا طریقہ کیوں نہ کوئی نہیں؟ تو اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص قانونی الفاظ کو توڑھوڑ کر اس سے ایتم کی تھیوری نکالنے کی کوشش کرنے لگے، ظاہر ہے کہ یہ اُس اعتراض کا جواب نہیں، بلکہ ایک مذاق ہیوگا، اسی طرح جو شخص مفت قرآن کریم میں سائنس اور انجینئرنگ کے مسائل نہ ہونے پر عصی ہو، اس کی صحیح جواب یہ نہیں ہے کہ قرآنی الفاظ کو توڑھوڑ کر اس سے سائنس کے مسائل زبردستی نکالے جائیں، بلکہ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نہ سائنس یا انجینئرنگ کی کتاب ہے اور نہ مادی ترقی حاصل کرنے کے طریقے اس کا موضوع ہیں، چونکہ یہ ساری بائیس انسان اپنی عقل و فکر اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے معلوم کر سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو انسان کی اپنی محنت و کارش اور تحقیق و تجویز پر چھوڑ دیا، اور ان باتوں کو قرآن کریم کا موضوع بنایا جو شخص انسانی عقل سے معلوم نہیں ہو سکتیں، بلکہ اُن کے اور اُن کے لئے دوچی ابھی کی رہنمائی ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان سائنس اور طیکنا بوجی کے میدان میں عقل و فکر اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے موجودہ مقام تک پہنچ گیا، لیکن ایساں رویقین کی دولت، قلب دُرُوح کی پاکیزگی، اعمال و اخلاق کی تبلیغ، انشر کے ساتھ بندگی کا تعلق اور اختر دی زندگی سنوارنے کا جذبہ بوجی ابھی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اور جسے قرآن کریم نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ عقل و فکر کی اس حیرت انگیز تگ دیتا

کے بعد بھی انسان کو نہ حاصل ہو سکا ہے، اور نہ اُس وقت تک حاصل ہو سکتا ہے جیسا کہ
اس معاملے میں پچھے دل سے قرآن کی رہنمائی حاصل نہ کی جائے،
ہماری اس نگرانی کا منشار یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم سے سائنس کا کوئی
مسئلہ اخذ کرنا عالمی الاطلاق کوئی جرم ہے، یہیں یہ تسلیم ہے کہ قرآن کریم میں صحنی طور سے
سائنس کے بہت سے حقائق کا بیان آیا ہے، چنانچہ جہاں اس کی کسی آیت سے کوئی
 واضح سائنسیک بات معلوم ہو رہی ہو اسے بیان کرنے میں کوئی تحریج نہیں، لیکن
اس معاملے میں درجہ ذیل علمیوں سے پرہیز لازمی ہے:-

(۱) سائنس کی جربات قرآن کریم میں مذکور ہے وہ صحنانہذکور ہے، اس کا اصل مقصد
ان حقائق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی قدرت کامل کا اختصار اور اس کے ذریعے ایمان میں
پختگی پیدا کرنا ہے، لہذا اس بیان پر قرآن کریم کو سائنس کی کتاب بمحضایا باور کرنا بالکل
غلط ہے،

(۲) جہاں سائنس کے کسی مسئلے کی تکمیل و معاہد موجود نہ ہو دہاں خواہ مخواہ الفاظ
اوہ سیاق و سیاق کو توڑموڑ کر سائنس کی کسی دریافت پر حسپان کرنے کی کوشش
کسی طرح درست نہیں، یہ بات ایک مثال سے واضح ہو گی؛
جس وقت سائنس کی دنیا میں یہ نظریہ مشہور ہوا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور
دو سکریتارے اس کے گرد حکمت کرتے ہیں تو بعض لوگوں نے اس نظریہ کو قرآن کریم
سے ثابت کرنے کی کوشش کی، اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا گیا:-

آئُنْ جَعَلَ الْأَرْضَ فَتَرَ أَرَأً،

يَا دَوْذَاتِ لَأَنِّي عَبَارَتْهُ،

جَاءَنَ قَرَبَنِيَا ॥

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ "فترار" کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے،
حالانکہ قرآن کریم کا مقصد تو یہ بیان کرنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ تم
زمین پر ڈانو اڑوں رہئے کے بجائے اطمینان کے ساتھ رہتے ہو، اور اس میں لیٹئے،

بیٹھنے اور قرار حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی تکلیف یا داشت کرنی نہیں پڑتی، اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس العام کا زمین کی حرکت و سکون سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ زمین متحرک ہو یا ساکن، یعنی نعمت ہر صورت میں انسان کو حاصل ہے، اس لئے اس آیت سے زمین کو ساکن ثابت کرنا یا کہ خواہ مخواہ کی زبردستی ہے، پھر جب سائنس نے زمین کے ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہونے کے کا نظریہ پیش کیا تو بعض حضرات کو یہ نظریہ بھی قرآن سے ثابت کرنے کی فکر لاحق ہوئی، اور مدرسہ ذیل آیت کو حرکتِ زمین کی تائید میں پیش کر دیا۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسِبُهُ أَجَامِنَةً وَّهُنَّ

ثَمَرَ مِنَ الشَّحَابِ

”اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہو کہ یہ جادیں، اور یہ بارل کی طرح چل رہے ہوں گے“

ان حضرات نے یہاں ”تمہیں“ کا ترجمہ ”چل رہے ہوں گے“ کے بعد چل رہے ہیں ”کر کے یہ دعویٰ کیا کہ اس آیت میں زمین کی حرکت کا بیان ہے، کیونکہ پہاڑوں کے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین چل رہی ہے، حالانکہ آیت کا سیاق و سبان (Context) صاف بتا رہا ہے کہ یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے، اور آیت کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ سارے پہاڑ جنہیں تم اپنی جگہ اٹھ سمجھتے ہو فضا میں بارلوں کی طرح اڑتے پھریں گے، لیکن قرآن کریم سے سائنس کے مسائل مستنبط کرنے کے شوق نے سیاق و سبان پر غور کرنے کا موقع، یہ نہیں دیا،

واقعہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت اور سکون کے بارے قرآن کریم خاموش ہے، اور پولے قرآن میں کہیں اس مسئلے کا بیان نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بات اس کے موصوع سے خارج ہے، نہ قرآن سے زمین کی حرکت ثابت ہوتی ہے نہ سکون، لہذا سائنس کے دلائل کے لحاظ سے اس میں سے جو نظریہ بھی اختیار کیا جاتے قرآن اس میں مزاحم نہیں ہوتا، اور نہ اُس سے دین و ایمان کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے،

یہاں یہ واضح کر دیتا مناسب ہو گا کہ فترآن سے سائنسک مسائل تنبیط کرنے کی کوششیں بسا اوقات بڑے خلوص کے ساتھ کی جاتی ہیں، اور اس کا منشاء غیر مسلموں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ دیکھو! جو بات تم نے صدیوں کی محنت کے بعد معلوم کی ہے وہ ہمارے قرآن میں پہلے سے موجود ہے، لیکن درحقیقت اگر یہ استنباط اصولی تفسیر کو توڑ کر کیا گیا ہے تو یہ فترآن کے ساتھ نادان دوستی کے سوا کچھ نہیں جس وقت لوگ فترآن سے زمین کا ساکن ہونا ثابت کرنا چاہ رہے تھے، دہربزم خود اسے فترآن کی خدمت تصوّر کرتے تھے، لیکن اگر ان کی یہ کوشش کامیاب ہو جائی اور عالمگیر طور پر یہ مان لیا جاتا کہ فترآن زمین کے ساکن ہونے کا قابل ہے تو آج جبکہ زمین کو ساکر بسخنا سائنس کے نقطہ نظر سے کلمہ کفر کے مراد ہو گیا ہے قرآن کے ساتھ یہ نادان دوستی کی انتاہی پیدا کرتی؟ لہذا سائنس کے بارے میں جو باتیں قطعی طور پر فترآن کریم میں موجود ہیں انھیں تو فترآن کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن جن بالوں کی قطعی وضاحت فترآن نے نہیں کی، انکو خواہ مخواہ اس کی طرف منسوب کرنا کل بھی غلط تھا اور آج بھی غلط ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لہ اس مسئلہ کی مزید تفصیل و تشریح کے لئے ملاحظہ ہو جیکم الامت حضرت مولانا اشرف علی حسین تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب "الانتباہات المفیدة" اور اس کی محل الانتباہات "انتباہ چہارم" ص ۲۶۷ ج ۲ مطبوعہ دصلی،

باب سوم

تفسیر کے چند ضروری اصول

جیسا کہ اور پر عرض کیا گیا، قرآن کریم کی تفسیر اور اس سے احکام و قوانین کا استنباط ایک بہت دسیع مونوع ہے، اور اس کے متعلق اصولوں کو سمجھنے کے لئے عربی زبان و ادب، خود صرف، بلاغت اور علم حدیث و فقہ کی واقفیت ضروری ہے، بلذًا اس کتاب میں یہ تمام اصول بیان نہیں ہو سکتے، علم اصول فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کریم سے احکام و قوانین مستنبط کرنے کے اصولوں پر ہی مشتمل ہے، اور جو شخص اس موضوع کا مفصل علم حاصل کرنا چاہتا ہو اس کے لئے علم اصول فقہ کو ماہر اساتذہ سے پڑھنا ضروری ہے، لیکن یہم چاہتے ہیں کہ یہاں تفسیر قرآن کے سلسلے میں چند وہ مولیٰ مولیٰ اصول بیان کر دیں جو علم اصول فقہ کی پوری مہارت کے بغیر بھی سمجھ میں آ سکتے ہیں، اور جن کو نظر انداز کرنے کی بنا پر تفسیر کے معاہلے میں بڑی غلط فہمیاں بلکہ مگر اسیاں پھیل رہی ہیں، یہ تفسیر کے متعلق اصول نہیں ہیں، بلکہ اس علم کے جستہ جستہ مباحث ہیں، جیسیں عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق انتخاب کر کے پیش کیا جا رہا ہے، واللہ الموفق والمعین،

۱- قرآن کریم اور محاجہ

پہلی ضروری بات یہ ہو کہ بعض اوقات ایک لفظ سے اس کے حقیقی معنی مراد

ہمیں ہوتے، بلکہ مجازی معنی مراد ہوتے ہیں، مثال کے طور پر "شیر" کے حقیقی معنی تو ایک مخصوص درندے کے ہیں، لیکن بسا اوقات یہ لفظ "بہادر انسان" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ائمہ کامصرع مشہور ہے صدر کس شیر کی آمد ہے کہ زن کا نپ رہا ہے

یہاں شیر سے مراد وہ درندہ ہمیں ہے، بلکہ بہادر انسان ہی، اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ کسی خاص مناسبت سے کسی ایسے معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں جو ان کے لغوی اور حقیقی معنی ہمیں ہوتے، قرآن کریم میں بھی بہت سے الفاظ اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال ہمیں ہوتے، بلکہ ان سے مجازی معنی مراد لری گئے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہمیں ہو کہ ہر شخص کو یہ اختیار ہو کہ وہ قرآن کے جس لفظ کو چاہے حقیقی معنی پر اور جس کو چاہو جو مجازی معنی پر محوں کر سکتا ہے، بلکہ علماء امت نے اس کا ایک ایسا ضابطہ بنایا ہے جو سرفی صد معمول ہے اور جس پر تمام علماء متفق ہیں، یہاں اس ضابطے کو سمجھ لینا ضروری ہو رہا ضابطہ ہو کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اصل یہ ہو کہ ان سے حقیقی معنی مراد ہوں گے، اور مجازی معنی صرف اُس وقت مراد ہوں گے جب حقیقی معنی کسی مجبوری کی وجہ سے مراد نہ ہو سکتے ہوں، اور جہاں کوئی مجبوری نہ ہو وہاں مجازی معنی مراد لینا کسی طرح درست ہمیں ہو گا، مجبوری کی صورتیں مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ حقیقی معنی عقلی طور پر یا قطعی مشاہدے کی رو سے ممکن نہ ہوں، اور عقلی طور پر ممکن نہ ہونے کی مفصل تشریح انشا اسلام کے اصول میں "قرآن کریم اور عقلانی لائل" کے زیر عنوان آئے گی،

۲۔ عرف اور محاورے کے اعتبار سے اُس لفظ یا جملے کے حقیقی معنی مرتود کت ہو گئے ہوں، مثلاً کفار کے بارے ارشاد ہے:-

فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ

"یہ لوگ سخواڑا ہی ایمان لاتے ہیں"

لفظ "قلیل" کے حقیقی معنی "تحوڑے یا" گم" کے ہیں، لیکن ایسے مقامات پر عرف اور

محادرے میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے کہ وہ ایمان تولاتے ہیں مگر تحوڑا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بالکل ایمان نہیں لاتے، اور اس طریقیاً "کافیلاً" کا لفظ مجاز اُنفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اردو میں "تحوڑاً" اور انگریزی میں "few" کا بھی یہی حال ہے۔ ۳۔ مجازی معنی مراد لینے کے لئے تیسرا مجبوری یہ ہوتی ہے کہ عبارت کے سیاق و سیاق میں کوئی قرینہ ایسا ہوتا ہے جو حقیقی معنی کو ناممکن بنارتیا ہے، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَمَنْ شَاءَ فَلِيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلِيَكُفِرْ

پس جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو چلا ہے کفر کرے۔

ان الفاظ کا مطلب لغی اور حقیقی مطلب یہ ہو گا کہ (معاذ اللہ) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور کفر کی مساوی اجازت ہے، لیکن آگے ارشاد ہے:-

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا

بِلَا شَهِيدٍ لَّهُمَّ رَّبَّ الْكَافِرِينَ

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایمان اور کفر مساوی طور سے جائز ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ دنوب کا انجام واضح ہو جائے کے بعد انسان کو اختیار کر کر وہ کفر کی راہ پر باقی رہے یا ایمان لے آتے، پہلی صورت میں اُسے عذاب جہنم سے واسطہ پڑے گا اور دوسری صورت میں وہ رضائے اُتھی سے ہمکار ہو گا،

ان مجبوریوں کے سوا کسی لفظ کو اُس کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی پر محبوں کرنا ہرگز درست نہیں، یہ ایک متفقہ اصول ہے، اور اس کی معمولیت ناقابل انکار کر اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے کلام سے مجازی معنی مراد لینے کی کھلی جھٹی دیدی جائے،

لہ یہاں ہم نے اس مسئلہ کے مفصل معنی مباحثے سے بچے ہوئے سارہ الفاظ میں اس اصول کا صلسلہ بیان کیا ہے اس موضوع کی مکمل اور جامع و مانع بحث کیلئے اصول فقہ کی تابیں ملاحظہ قرائی جائیں، بالخصوص فخر الاسلام بز دہمیؒ کی اصول اور اس کی شرح "کشف الاسرار" عبد العزیز البخاریؒ،

تو قرآن کریم کی کوئی آیت معنوی تحریف سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور ہر شخص اپنے من بنے نظریات کو قرآن کریم میں ٹھونس کریے کہ سکتا ہے کہ یہاں الفاظ کے مجازی معنی مراد ہیں بلکہ بات صرف حقیقت اور مجاز تک ہی محدود نہیں، بسا اوقات ایک بی لفظ یا ایک ہی جملے کے ایک سے زائد معنی ہو سکتے ہیں، اور وہ سب اس کے حقیقی معنی ہوتے ہیں، ایسی صورت میں بھی مسلمہ قاعدہ یہ ہو کہ جو معنی عوف اور محاوارے کے لحاظ سے زیادہ قریبی ظاہر اور متبادر ہوں ان کو اختیار کیا جائے گا، اور دور دلار کے معانی کو اس وقت تک خستیار نہیں کیا جا سکتا جب تک قریبی معنی مراد لینے میں مذکورہ بالاجبور وہ میں سے کوئی مجبوری لاحق نہ ہو، یا خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد سے دوسرے معنی ثابت نہ ہو جائیں، چنانچہ علامہ پیر الدین زکریٰ تحریر فرماتے ہیں۔

أَحَدُهُمَا أَنْ يَكُونَ أَحَدُهُمَا أَظْهَرُ مِنَ الْآخَرِ، فَيَعْبُدُ
الْحَمْلُ عَلَى الظَّاهِرِ إِلَّا أَنْ يَقُومَ دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْمُرَادَ هُوَ
الْحَقِيقِ دُونَ الْجَلَّ فَيَعْمَلُ عَلَيْهِ،

”قرآن کریم میں ایک سے زائد معنی کے احتمال کی) ایک صورت یہ ہو کہ ایک معنی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ظاہر ہوں، ایسی صورت میں وہی معنی مراد لئے جائیں گے جو زیادہ ظاہر ہیں، الایہ کہ کوئی دلیل اس بات پر قائم نہ ہو جائے کہ یہاں ظاہری معنی کے بجائے پوشیدہ معنی مراد ہیں، ایسی صورت میں پوشیدہ معنی مراد لینا ضروری ہو گا۔“

یہ اصول اس قدر بدیہی (self evident) اور معقول ہے کہ قرآن کریم تو اس تعلیٰ کا کلام ہے، عام انسانی لگنگوں میں بھی اس پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ کا رہ نہیں، اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو کوئی بھی شخص کی بات کو صحیح طور سے سمجھنا ممکن نہ رہے، فرض کیجئے کہ ایک مسافر یلوے کیشیشن پر پہنچ کر اینے

لوگر سے کہتا ہے کہ ”مکٹ لے آؤ“، اس کے جواب میں اگر فکر ریلوے کا مکٹ لانے کے بجائے ڈاک کا مکٹ لے آئے تو اسے ساری دنیا احتمال مفتراء دے گی، اگرچہ ”مکٹ“ کے لفظ میں دو فوں احتمال موجود ہے لیکن نوکر کی حاصلت یہ ہو کہ اس نے ریلوے اسٹیشن کے ماحول میں مکٹ کے ظاہری اور قریبی معنی کو چھوڑ کر دُور کے معنی مراد لئے، اسی طرح اگر کسی شہر کا حاکم کسی اجیزیر کو یہ حکم دے کہ فلاں جگہ ایک ہنر کھودنے جائے جس سے آس پاں کی آبادی سیراب ہو سکے، اور اجیزیر اس کا یہ مطلب بیان کرے کہ ہنر کھوڈنے سے یہاں مراد ایک درسگاہ قائم کرنالا ہے جس سے آس پاس کی آبادی تعلیم حاصل کر سکے، اور اپنے آس دھرے کی تائید میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا کلام پیش کر دے کہ انہوں نے درسگاہ کے لئے ”ہنر“ کا فقط استعمال کیا ہے، تو ایسے اجیزیر کو آپ کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ ساری دنیا اسے دیوانہ قرار دے گی، یکوں نکہ ”ہنر“ کے لفظ کو مجازاً ”درسگاہ“ کے معنی میں بے شک استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس لفظ کی یہ تشریع اسی وقت درست ہو سکتی ہے جبکہ ”ہنر“ کے اصلی اور حقیقی معنی کے خلاف کوئی دلیل یا اقرینہ موجود ہو، اور مذکورہ مثال میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں تھی،

بعض لوگ اس واضح اصول کو پس پشت ڈال کر فترآن کریم کی تفسیر میں شدید گماہیوں کے شکار ہو گئے ہیں، قدیم زمانے میں ملحدین کی ایک جماعت قرامطہ یا باطنیتی کے نام سے گزری ہو، اس نے تو اپنے مذہب باطل کی پوری عمارت اسی طرح کھڑی تھی کہ قرآن کریم کے ہر لفظ کو اس کے ظاہری اور حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اسے عجیب غائب معانی پہنچاتے تھے، چنانچہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن کریم میں ”صلوٰۃ“ (نماز) سے مراد امام (یعنی باطنی لیڈر) کی اطاعت ہے، ”حج“ سے مراد اس لیڈر کی زیارت اور خدمت ہے، ”صوم“ (روزے) سے مراد اس لیڈر کا راز فاش کرنے سے پرہیز ہے، نہ کہ کھانے پہنچنے سے، اور ”زنا“ سے مراد باطنی فرقے کا کوئی راز فاش کرنالا ہے، اسی طرح عصا موسیٰ

سے مراد ائک نزدیک حضرت موسیؑ کا غالب آ جانا ہے، اور بادل کے سایہ کرنے سے مراد اُنکی حکومت کا قیام ہے،

ہمارے زمانے میں بھی بہت سے مصنفین نے اس اصول کی خلاف درزی کر کے تفسیر کے معاملے میں خطرناک ٹھوکریں کھانی ہیں؛ مثلاً انیسویں صدی کے آغاز میں مغربی فلسفے کی سرسری معلومات کی بنیاد پر عالم اسلام کے بعض "جنت پسند" حضرات اسلامی عقائد میں سے اُن تمام چیزوں کا انکار کر بلطفی صحیح، بعض مغرب کے لوگ "تو تم پرستی" کا طعنہ دیا کرتے تھے، اس وجہ سے انہوں نے قرآن کریم میں الیسی تحریفات کی ہیں جنہیں دیکھ کر دل لرزائھتا ہے، اور اس غرض کے لئے قرآن کریم کی تقریباً آڑھی آیات کو مجاز، استعارہ اور تمثیل و ضرار ویدیا ہے، مثال کے طور پر قرآن کریم میں دیسیوں مقامات پر حضرت آدم علیہ اسلام کی تخلیق، اُن کے آگے فرشتوں کے بعدہ ریز ہونے اور ابلیس کے انکار کا واقعہ بیان ہوا ہے، لیکن چونکہ مغرب میں ڈاروون ر Darwin کا نظریہ ارتقاب اُس دور میں کافی مقبول ہو رہا تھا، اور اس کی کچھ ناتمام سی اطلاعات ہندوستان میں بھی پہنچ رہی تھیں، اس لئے انہوں نے یہ دعویٰ کروایا کہ قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ اسلام، فرشتوں اور ابلیس کا جو واقعہ بیان فرمایا ہے وہ بعض ایک تمثیل ہے، اور نہ آدم علیہ اسلام کا کوئی شخصی درجہ ہے، نہ فرشتوں کا اور نہ ابلیس کا چنانچہ مرسید احمد خاں صاحب لکھتے ہیں:-

"آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے جسکو عوام انساس اور مسجد

کے مُثلاً با اَدَمَ کہتے ہیں، بلکہ اس سے نور انسانی مراد ہے" ۔

آگے لکھتے ہیں:-

"اس تھتے میں چار فریق بیان ہوتے ہیں، ایک خدا، دوسرا فرشتے ریعنی

لہ ایملل وال محل للہرستان" مع حاشیہ ص ۳۲۲ ج ۱،

لہ تفسیر القرآن از مرسید احمد خاں ص ۳۸ ج ۱،

یہ غیرت ہے کہ خدا کا مطلب قویین میں مادرہ وغیرہ نہیں بتایا،

قرائے ملکوتی) تیرے الہیں یا شیطان (یعنی قراءے ہیسمی) چوتھے آدم ریعنی انسان جو مجموعہ ان قوائی کا ہے، اور جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں (مقصود قہستہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے)۔

سوال پیدا ہوا کہ قرآن نے تو فرشتوں کے بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں، اس کے جواب میں سرسید صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”جو قوی جس کام کے لئے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں کہ وہ ہی اُن کی تسبیح اور تقدیس ہے، قوت نامہ ائمہ اور قوت ناطق نطق، قوت احران حرق، قوت سیال سیلان، قوتِ حامدہ انجام دکے سو اور کچھ نہیں کر سکتی“

پھر سوال پیدا ہوا کہ آدمؑ کے جنت میں رہنے، شجرہ ممنوعہ کھانے اور وہاں سے زین پر اُنمارے جانے (ہبوط) کا کیا مطلب ہو؟ اس کے جواب میں ”مجاز و تمثیل“ کی یہ کوشش کاری ملاحظہ فرمائیے :-

”ہم شروع ہی سے اس قصہ (یعنی آدم و الہیں کے واقعہ) کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے، بلکہ صرف انسانی فطرت کا اُس فطرت کی زبان حال سے بیان فترار دیتے ہیں، پس انسان کا جنت میں رہنا اُس کی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہی جب تک وہ مکلفت کسی امر وہی کا نہ تھا..... اور اس کا شجرہ ممنوعہ کے پاس جانا، اس کا بھل کھانا، اس کی فطرت کی اُس حالت کا بیان ہی جبکہ وہ غیر مکلفت سے مکلفت ہوا، ہبوط (یعنی اُترنے) کے لفظ کا استعمال قرآن تعالیٰ مکان ہی پر منقص نہیں ہے لیے“

پھر بھی کوئی پوچھ سکتا تھا کہ اسی واقعہ میں الہیں نے سجدہ کرنے سے انکار کیتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدمؑ کو مٹی سے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا :-

لہ تفسیر القرآن از سرید احمد خان، ص ۱۵ ج ۱،

”قوائے سہیئے کو جن کا مبدل احرارت غریزی و حرارت خارجی ہے آگ سے مخلوق
ہونا بیان کرنا صحیک تھیک اُن کی فطرت کا بتلانے ہے“
اب پورے واقعہ کا خلاصہ خود اُن کے الفاظ میں یہ ہے:-

”یہ فطرت انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارے میں بیان کی ہے، اس لئے تما
فطرت کو باغی کی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے، سن رشد دہیز کے پہنچنے کو درخت
معرفت خرد شر کو بھل کھانے سے، انسان کا اپنی بڑیوں کے چھپانے کو درخت کے
پتوں سے ڈھانکنے سے تغیر کیا ہے، مگر شجرہ الحد کے بھل سک اس کو نہیں بچایا،
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو درائی بقا نہیں ہے“
ان اقتباسات پر ہم کسی علی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے، قرآن کریم میں حضرت
آدمؑ اور ابلیس کا واقعہ ملاحظہ فرمائیتے، اور مذکورہ بالا تأملات و تحریفات کو اس پر چیپاں

لئے تفسیر القرآن از سرید احمد خان، ص ۱۵۹ ارج ۱

لئے البتہ مذکورہ بالاحتریفات پر ہم فرقہ باطینیہ کا مشہور لیٹر ربیع الدین بن الحسن الفردانی یا آگی،
جس نے اپنے ایک پیر دکو نکھاتھا: إِنَّ أُدْصِيكَ بِتَشْكِيكَ النَّاسِ فِي الْقُرْآنِ وَالْتُّورَاةِ وَالْبُرُودِ
الْأَجْنِيلِ وَبِدُعْوَتِهِمْ إِلَى الْبَطَالِ الشَّرَاعِقِ وَإِلَى الْبَطَالِ الْمَعَاوِدِ وَالشُّوَرِينِ الْقَبُورِ وَالْبَطَالِ الْمَلَائِكَةِ فِي الْأَمَا
وَالْبَطَالِ الْجِنِّ فِي الْأَرْضِ وَأُدْصِيكَ بَأَنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْقُولِ بَأَنْ تَقِيَّ كَانَ قَبْلَ آدَمَ بَشِّرَ كِثِيرًا فَانْذَلَكَ
عوْنَ عَلَى قِرْمِ الْعَالَمِ رَالْفَرْقُ بَيْنَ الْفَرْقَتِ، ص ۲۹۶ و ۲۹۷ یعنی میں تمہیں دعیت کرتا ہوں کہ،
و لوگوں کو قرآن، توراة، زبور اور انجیل کے بالے میں شکوک و شبہات کا تنکار بناو، اخھیں تمام
شرعی قوانین کے باطل ہونے کی طرف دعوت دو، اور آخرت اور حشر و نشر، انسان میں ملائکروں
زمیں میں جنات کے تصور کو مٹاؤ، نیز میں تمہیں دعیت کرتا ہوں کہ لوگوں کو اس اعتماد کی طرف
دعوت دو کہ آدم رعلیہ السلام، سے پہلے بھی بہت سے انسان ہو چکے ہیں، یعنیکہ یہ اعتقاد دنیا
کو غیر فانی ثابت کرنے میں تحصار اور گارثافت ہو گا،

کر کے دیکھئے، خود اندازہ ہو جاتے گا کہ حقیقت و مجاز کے بارے میں جو مسلم اصول اور بیان کیا گیا ہے اس کو نظر انداز کر کے کیسی کیسی لغو بائیں فتر آن کریم کی طرف منسوب کی گئی ہیں؛ اسی طرح فتر آن کریم جا بجا جنت کی نعمتوں کے بیان سے بھرا ڑاپا ہے، اس میں جنت کے ہرے بھرے باغات بہتے ہوئے دریاؤں، خوبصورت مکانات، حسین اور پاکیزہ شریک زندگی، لذیذ کھانوں اور پھلوں کا بیان اس کثرت سے آیا ہے کہ شمار مشکل ہے، لیکن سرستہ احمد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ مجاز ہی مجاز ہے، اُن کا اصل مقصد "اعلیٰ درجے کی خوشی اور راحت" کا بیان ہے، اور مذکورہ بالا اشیاء، حضن اس نے بیان کی گئی میں تاکہ جاہل قسم کے لوگ ان لذتوں کے لایچے میں دن رات اٹھا میں لگے رہیں،

"ایک تربیت یا غفر و ماغ خیال کرتا ہے کہ دعڑ دعید و وزخ و بہت کے جن الفاظ سے بیان ہوئے ہیں اُن سے بعینہ دہی اشیاء مقصود نہیں، بلکہ اس کا بیان کرنا صرف اعلیٰ درجے کی خوشی دراحت کو فہم انسانی کے لائق تشبیہ میں لانا ہی، اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے اہتمامی، لفیع جنت کی اور ایک ترغیب اور امر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے، اور ایک کو ٹمغر، ملایا شہوت پرست زاہدیہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں ہنایت خوبصورت آن گفت حوریں ملیں گی، شرابیں پیں گے، میوے کھادیں گے، دودھ و شہد کی ندیوں میں ہنڈیں گے، اور جو دل چاہے گا دل مرنے اُڑا دیں گے، اور اس لغو، بیہودہ خیال سے دن رات ادامہ کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے"

واقعہ یہ ہے کہ حقیقت و مجاز کے بارے میں جو اصول اور بیان کیا گیا ہے اگر اس کو

پس پشت ڈال دیا جاتے تو کوئی خراب سے خراب عقیدہ اور بُرے سے بُرا عمل ایسا نہیں ہے جسے قرآن کی طرف منسوب نہ کیا جاسکے، آخر باطنی فرقے کے لوگوں نے مجاز و استخارہ کے بیچیار استعمال کر کے فترآن سے محوسی عقائد ثابت کر دیئے تھے، اور آج بھی بہت سے عیسائی پادری قرآن کریم ہی کی آیتوں میں در دراز کی تاویلات کر کے اُسے عیسائی مذہب کا حامی ثابت کرتے رہتے ہیں، اور پھر جب آدھا فترآن مجاز و استخارے پر مشتمل ہو اور اس میں ملاںگہ سے مراد رختوں کی قوتِ نو، دریا و لکی قوتِ روانی اور آگ کی قوتِ احران، آدم علیہ السلام سے مراد نوعِ انسان، ابلیس سے مراد شر کی قوتیں ہو سکتی ہیں تو دوزخ سے مراد دنیوی تمکیفیں اور جنت سے مراد دنیوی راحتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور خدا کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ (معاذ اللہ) وہ کسی مستقل وجود کا نام نہیں، بلکہ کائنات کی اصل یعنی مادے یا توانائی کا نام ہے، اور خدا کا تصوّر جو قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ (معاذ اللہ) آپ نے محض اس لئے بیان فرمایا تاکہ عرب کے بد و دُن کو اس سے ڈراؤ کاچھ کاموں کی طرف ٹبلا یا جاسکے، لیجئے اس عرضِ مجاز و استخارے کے اس ہتھیار نے دین و مذہب کی بالکل ہی حصہ کر دیا، اور قرآن پر عمل کرنے کے لئے خدا کے وجود پر ایمان رکھنا بھی صدوری نہ رہا، اور یہ بات محض ایک عقلی فرد نہ ہی نہیں ہے، مجاز اور تمثیل کے استعمال کو کھلی جھٹی دے کر فرقہ باطنیہ نے بالکل اسی جیسی دعوے کئے تھے، علامہ عبد القاہر بغدادیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

”فرقہ باطنیہ کے مشہور ریڈ رعبداللہ بن الحسن قیروانی نے اپنی ایک

سمتاب میں لکھا ہو کر آخرت کی جزا و سزا الخواتیں میں اور جنت سے

مراد رحیقت زندگی کا عیش و آرام ہے، اور عذاب مراد شریعت پرست

کا شزاد روزے اور حج و جہاد کے چکر میں بھسا رہتا ہے۔“

لہذا اگر قرآن کریم سے اللہ کی کتاب برہایت کی حیثیت میں فائزہ حاصل کرنا ہو،

تو یہ طریقہ عمل اہتمائی نامعقول ہے۔ بہبودہ اور خطرناک ہو کہ قرآن کریم کی جوبات پنچ سی نظریہ کے خلاف معلوم ہواں میں تاؤ بیلات کا دروازہ مکھوں کر کہتا مشروع کر دیا جائے کہ اس کے ظاہری اور حقیقی معنی کے بجایے فلاں معنی مراد ہیں، عبد حاضر کے چن مصنفین نے علم تفسیر کی ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر پر قلم اٹھایا ہے، ان میں یہ اصولی غلطی بکثرت پائی جاتی ہے، اور ان کے مطابع کے زوران اگرذ کر رہ بالا اصول کو فہم میں رکھا جائے تو ایسی تسانیف کی بہت سی غلطیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں،

۲۔ قرآن کریم اور عقلی دلائل؛

عبد حاضر کے بعض مصنفین قرآن و سنت کے ارشادات میں بعض اوقات یہ کہہ کر دراز کار تاؤ بیلات اختیار کرتے ہیں کہ ان ارشادات کا ظاہری مفہوم عقل کے خلاف ہو، اس لئے ان کی ایسی تاویل کرنی ضروری ہی جو عقل کے خلاف نہ ہو، اس معاملے میں چونکہ غلط فہمیاں بہت عام ہیں، اس لئے ہم یہاں اس مسئلے کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں،

سب سے پہلے یہ سمجھو لیجئے کہ قرآن و سنت سے جو باتیں ثابت ہوتی ہیں آگے ہم اپنی
”نقلی دلائل“ سے تعبیر کریں گے، اور عقل سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں انھیں ”عقلی دلائل“ سے،
در اصل اس معاملے میں غلط فہمیوں کا اصل سبب یہ ہو کہ ہمارے علماء، متكلمین نے
اپنی کتابوں میں یہ قاعدہ لکھا ہو کہ اگر نقلی دلائل عقلی دلائل کے خلاف ہوں تو عقلی دلائل
پر عمل کیا جائے گا، اور نقلی دلائل اگر مستند کے اعتبار سے قابل اعتماد نہ ہوں تو ان کے باوجود
یہیں یہ کہا جائے گا کہ وہ صحیح نہیں ہیں، اور اگر وہ سندر کے حاظے سے ناقابل انکار ہوں تو یہ
ہمیں گے کہ ان کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے، پھر اگر ان کا کوئی دوسرا مطلب بے تکلف
ہو سکتا ہو تو کہا جائے گا کہ وہ مفہوم مراد ہے، اور اگر کوئی بے تکلف مطلب سمجھو میں نہ آئے
تو کہیں گے کہ اس کا صحیح مفہوم ہم پر واضح نہیں ہو سکا، اور اس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی
کو ہے، نقلی دلائل کی اس آخری قسم ہی کو ”متشابہات“ سے تعبیر کرتے ہیں،

یہ قاعدہ علیاً اور متكلمین میں مشہور و معروف ہے، لیکن اس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بناء پر بعض مصنفین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ قرآن و سنت کی جو کوئی بات اپنی کسی راتے کے خلاف ہوئی اس میں یہ کہہ کر تاویل شروع کر دی کہ یہ عقل کے خلاف ہے، حالانکہ جن متكلمین نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے انھوں نے اس کی مکمل تشریح بھی کر دی ہے، یہاں اس تشریح کو اپنی طرح سمجھ لیتا چاہتے، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تعالیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "الانتباہات المفیدہ" میں اس قاعدے کو بتیرن اداز میں منضبط فرمایا ہے، پہلے ہم اہنی کے الفاظ میں یہ قاعدہ ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد انشا اللہ اس کی مفصل تشریح پیش کی جائے گی، حکیم الامت حضرت محتاج نوی تحریر فرماتے ہیں :-

دليل عقل و نقل میں تعارض کی چار صورتیں عقلانی محتمل ہیں :-
 ایک یہ کہ دونوں قطعی ہوں، اس کا کہیں وجود نہیں، تو ہو سکتا
 ہے، اس لئے کہ صادقین میں تعارض محل ہے، تو مرے یہ کہ دونوں
 ظنی ہوں، وہاں جمع کرنے کے لئے گوہر دین میں صرف عن الناظر کی
 گنجائش ہے، مگر انسان کے قاعدے سے کہ اصل الفاظ میں حل علی
 الناظر ہے، نقل کو ظاہر پر رکھیں گے اور دلیل عقلي کی دلالت کو
 جھٹت نہ سمجھیں گے،

(ربقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اعلم ان الدلائل القطعیۃ العقلیۃ اذا قامت علی ثبوت شیء ثم جعلت
 ادنی نقلیۃ پیشر ظاہر باخلاف ذلک فتک لایخلو الحال من احمد امور اربعۃ ... و لما بطلت
 الاقسام الاربعۃ لم يبق الا ان يقطع بمقتضی الرؤاں العقلیۃ القاطعۃ بان بذه الدلائل النقلیۃ
 اما ان يقال اینا غير صحة او يقال اینا صحة الا ان المراد منها غير ظاہرها، ثم ان جوزنا التاویل و
 اشتغلنا على سیل البرع بذکر تلک التاویلات على التفصیل و ان لم یجز التاویل فضنا للعلم بہا
 الى اللہ تعالیٰ، فہذا ہو القانون انکلی المرجوع الیہ فی جمیع المتشابہات، (اساس التقدیس
 ص ۲۷۳۲ افصل ۳۲، مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۵۴ھ)

۷۰۹

تیسرا یہ کہ دلیل نقل قطعی ہو اور عقلی ظنی، یہاں یقیناً نقل کو مقدم رکھیں گے
چوتھا یہ کہ دلیل عقلی قطعی ہو اور نقل ظنی ہو، ثبوتاً یاد لالہ، یہاں عقل کو
مقدم رکھیں گے، نقل میں تاویل کریں گے، پس صرف یہ ایک موقع ہی،
درایت کی تقدیر کار دایت پڑنیہ کہ ہر جگہ اس کا دعویٰ یا استعمال
کیا جائے گے۔

اس قاعدے کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ذہن نشین کر لیں گا چاہئے کہ عقل دلائل تین
قسم کے ہو سکتے ہیں:-

۱. **قطعی عقلی دلائل** | یعنی ایسے عقلی دلائل جو سونی صدقینی ہوں، انھیں تمام انسان
کسی ادنیٰ اختلاف کے بغیر تساہم کرتے آتے ہوں، اور ان
کے خلاف ہر بات سونی صدنا ممکن ہو، مثلاً یہ بات کہ دوا درد چار ہوتے ہیں،
قطعی عقلی دلیل ہی، جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا، یعنی دوا درد دلیل کر کبھی
نہیں یا پابچ نہیں ہو سکتے، اسی طرح یہ بات عقلی قطعی طور سے ناممکن ہو کہ ایک شخص
ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر موجود بھی ہو اور وہاں سے غائب بھی،

۲. **ظنی عقلی دلائل** | یعنی وہ عقلی باتیں جو سونی صدقینی تو نہ ہوں، لیکن عقل اور
تجربے کی رو سے اُن کی سچائی کا غالباً مگان پسرا ہوتا ہو،

ایسی باتوں کی سچائی پر تمام اہل عقل ہمیشہ متفق نہیں رہتے، بلکہ مختلف زمانوں،
مختلف خطروں اور عقول و خردوں کے مختلف ساچخوں کے اعتبار سے ان معاملات میں
نظریاتی اختلاف پیش آتا رہتا ہے، مثال کے طور پر نیوٹن کا نظریہ سخت بازبـ

ر) آئن اسٹانن کا نظریہ اضافیت Theory of Gravity

() ڈاروں کا نظریہ ارتقا..... Theory of Relativity

ر) دیگر، ظاہر ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی Theory of Evolution

نظریہ سوفی صدقینہ نہیں تھا، بلکہ ان فلسفیوں نے اپنی عقل اور اپنے تجربات کو کام میں لا کر ایک راستے قائم کی تھی، جو ان کو اس وقت کی معلومات اور اس وقت کے حالات کے لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی تھی، اور اس کی سچائی پر ان کا گمان غالب ہو گیا تھا، لیکن اس راستے کو لیقینی اور قطعی طور سے سوفی صدر درست نہیں کہا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے دوسرے فلاسفہ نے اس سے اختلاف کیا، ایک زمانے میں کوئی نظریہ ذہنوں پر چھایا رہا، اور دوسرے زمانے میں وہی نظریہ عقل سے خارج نظر آنے لگا، **۳۔ وہی عقلی دلائل** [یعنی وہ دلائل جن کی بنیاد تلقین یا گمان غالب کے بجائے محسن وہم و قیاس پر ہو، مثلاً اب سے کچھ عرصہ پہلے تک سانس دانوں کا یہ خیال تھا کہ مریخ پر زندگی موجود ہے، ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد کسی قطعی یا انتہائی دلیل پر نہیں، بلکہ محسن وہی اندازدیں پر تھی، اسی طرح نقل دلائل کی بھی تین قسمیں ہیں :-]

۱۔ قطعی نقلي دلائل [وہ دلائل ہیں جو سوفی صدقینہ ہوں، یعنی کسی مصنفوں کے متعلق ان کے الفاظ بھی باکل صریح اور صفات ہوں، اور سند و ثبوت کے اعتبار سے بھی لیقینی طور سے قابل اعتماد ہوں، مثلاً قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ لَا تَقْرُبُوا إِلَيْنَا مِنْ حَلَّةٍ يَا أَنْتُمْ تَرَاهُنَّا كہ پاس تک نہ جاؤ] یہ اس بات کی قطعی اور لیقینی دلیل ہے کہ اسلام میں زنا حرام ہے، اکیس نکہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے حکایم ابھی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس کی مذکورہ آیت سے لیقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم زنا سے منع کرنے چاہتا ہے، اسی طرح جو باتیں متواترا حادیث یا اجماع قطعی سے ثابت ہوں

لہ متواترا حادیث کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے ہر درمیں استئن رہے ہوں کہ عقل اُن سب کے بیک وقت جھوٹا ہوتے کونا ممکن سمجھتی ہو، لیسی حادیث تو سند و ثبوت کے اعتبار سے سوفی صدقطعی اور لیقینی ہوتی ہیں، لیکن اخبار آحاد (یعنی وہ حدیثیں جن کو روایت کرنے والے کسی زمانے میں صرف ایک یا دو تین روکنے ہوں) ظاہر ہوتی ہیں، یعنی اُن کے ثبوت کا ایسا لیقین (باقي بصیرت آئندہ)

وہ بھی اسی قسم میں داخل ہیں،

۲۔ قطعی نقلی دلائل | یعنی وہ نقلی دلائل جو پہلی قسم کی طرح قطعی تو نہیں ہوتے لیکن اُن سے جو بات ثابت ہوتی ہے اس کے صحیح ہونے کا غالباً عکان قائم ہو جاتا ہے، مثلاً وہ تمام احادیث جو متواتر نہیں ہیں، لیکن اصولِ حدیث کی شرائط پر پر اُترتی ہیں، ایسی احادیث اگرچہ واجب العمل ہوتی ہیں، اور ان کی مخالفت کرتا جائز نہیں ہوتا، لیکن جو نکم ثبوت کے اعتبار سے وہ قرآن اور متواتر احادیث کی طرح قطعی اور یقینی نہیں ہوتیں، اس لئے اسکیں دوسرے درجے میں رکھا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہو کہ اگر کوئی ایسی حدیث قرآن کریم یا متواتر احادیث کے خلاف ہو تو اس کی ایسی تشریح کی جاسے گی جو قرآن کریم یا متواتر احادیث کے مطابق ہو، اور اگر ایسی تشریح ممکن نہ ہو تو اسے چھوڑ دیا جاسے گا،

۳۔ وہی نقلی دلائل | یعنی وہ نقلی دلائل جن کی صحت کا غالباً عکان بھی قائم نہ ہوتا بلکہ وہ مخصوص دہم اور تجھیس پر مبنی ہوں، مثلاً وہ احادیث جو اصولِ حدیث کی شرائط پر پر اُترتیں،

ان چھ قسموں میں سے دو (یعنی وہی عقلی دلائل اور وہی نقلی دلائل) کا تذکرہ اعتبار ہی نہیں ہے، لہذا وہ خاص بحث ہیں، البتہ باقی چار اقسام کو تذکرہ کرتے ہوئے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض و اختلاف کی عقلآل جا رصورتیں ہو سکتی ہیں:-
۱۔ پہلی صورت یہ ہو کہ دلیل نقلی بھی قطعی ہو اور دلیل عقلی بھی قطعی، یہ صورت مخصوص ایک نظریاتی مفرد حصہ ہو، عملًا آج تک نہ ایسا ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، کہ کوئی قطعی نقلی دلیل کسی قطعی عقلی دلیل کے مخالفت ہو جائے، اگر کہیں بظاہر

(لتفیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نہیں ہوتا جیسے متواتر احادیث کا، البتہ اگر وہ اصولِ حدیث کی شرائط پر پر اُترتی ہوں تو غالباً عکان یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح ہیں، اس لئے پوری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اُن پر عمل صرفی ہے،

ایسا نظر آتا بھی ہو تو نقی دلیل صرف اپنی سند اور ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہوگی، لیکن اس کا جو مضمون قطعی دلیل عقلی کے مخالف معلوم ہو رہا ہو، اس پر اس کی دلالت قطعی نہیں ہوگی، اور اگر اس مضمون پر اس کی دلالت قطعی ہوگی تو وہ سند اور ثبوت کے اعتبار سے قطعی نہیں ہوگی، ایسا نہ آج تک ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، کوئی دلیل نقلي اپنے ثبوت اور دلالت دونوں کے اعتبار سے قطعی ہو، اور پھر وہ کسی قطعی دلیل عقلی کے خلاف ہو،

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نقی دلیل ظنی ہو اور عقلی دلیل قطعی، اور دونوں میں تعارض واقع ہو جائے، یہ وہ صورت ہے جس کے بارے میں علماء اور مشکلین نے کہا ہے کہ ایسی صورت میں عقلی دلیل پر اعتماد کیا جاتے گا، اور نقی دلیل کے ایسے معنی بیان کئے جائیں گے جو عقل کی ولیل قطعی کے موافق ہوں، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

آلِ حَمْدٍ عَلَى الْعَرْشِ أَسْتَوْيَ

رَحْمَنُ رَاهِنَّهُ تَعَالَى عَرْشُ پَرْ سَيِّدُهَا ہو گیا

پر قرآن کریم کی آیت ہے، لہذا ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے، یعنی اس کا حکام آتی ہو ناچیز ہے، لیکن اس کا جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ قطعی نہیں، کیونکہ لفظ "استوی" کے عربی محاورے میں بہت سے معنی ہو سکتے ہیں، اور جو معنی لئے گئے ہیں وہ قطعی نہیں، لہذا یہ اس نقی دلیل کی مثال ہے جو دلالت کے اعتبار سے ظنی ہے، دوسری طرف اس کے جو معنی ظاہری طور پر بھی میں آرہے ہیں (یعنی عرش پر سیدھا ہو جانا) وہ عقل کی دلیل تقاضا یہ ہے کہ باری تعالیٰ کوئی جسم نہیں ہے، اس طرح یہ ظنی نقی دلیل عقل کی دلیل قطعی کے مخالف ہو گئی، چنانچہ مفسرین انتہا نے بااتفاق عقل کی دلیل قطعی کو اختیار کیا، اور اس آیت کے بارے میں تمام علماء نے یہ فرمایا کہ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں، پھر بعض حضرات نے تو اس کو مجاز قرار دیا، اور کہا کہ اس سے مراد غلبہ اور قدرت وغیرہ ہی، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ آیت اُن متشابہات میں

بے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دلایا تعلم مُتَّقِيْلَةُ إِلَّا إِنَّهُ رَأَىٰ تَوْلِيْلَهُ (اس کی اولیٰ و تفسیر اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اسی طرح قرآن کریم میں حضرت زوال القرین میں کا داقعہ بیان کرتے ہوتے ارشاد ہے:-

**حَتَّىٰ إِذَا أَبَلَّمْ مَعْرِيْلَةَ الشَّمْسِ وَجَدَ هَاتَغَرْبُ فِي عَيْنِ
حَمِيْلَةٍ،**

"یہاں تک کہ جب وہ (زوال القرین) مغرب میں پہنچے تو سورج کو ایک کچھڑواں چیز میں ڈوبتا پایا" ،

یہ بھی قرآن کریم کی آیت ہے، اس لئے اس کے حکایاتی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس جملے کا جو مفہوم ظاہری طور سے سمجھ میں آتا ہے کہ سورج واقعی ایک کچھڑواں چیز میں ڈوب رہا تھا، وہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل کی رو سے درست نہیں، کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ سورج اور زمین دونوں الگ الگ کر کے ہیں جو کسی بھی مقام پر آپس میں نہیں ملتے، لہذا آیت کا یہ ظاہری مفہوم مراد یعنی اسی طرح درست نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جس مقام پر اس وقت زوال القرین پہنچتے تھے وہاں آگے کوئی آبادی نہیں تھی، اور حد نظر تک ڈلڈل ہی ڈلڈل تھی، اس لئے رسمیتے والے گوی محوس ہوتا تھا کہ سورج اس کچھڑواں چیز میں ڈوب رہا ہے، یہ مفہوم اگرچہ آیت کے الفاظ سے سہل مفہوم کے برابر ظاہر نہیں ہے، لیکن چونکہ آیت کے الفاظ میں اس کی بھی پوری تجھیش ہے، اس لئے یہ آیت پہلے مفہوم پر طبق الدلالۃ ہے اور جب اس کا مقابلہ عقل و مشاہدہ کے قطعی دلائل سے ہوا تو یہ قطعی دلائل راجح قرار پائے، اور آیت کے اس مفہوم کو باجماع اختیار کر لیا گیا، جو ان قطعی دلائل کے موافق تھے،

۳- تیسرا صورت یہ ہے کہ نقلی دلیل قطعی ہو اور عقلی دلیل ظرفی، ظاہر ہے کہ اس صورت میں نقلی دلیل ہی کو ترجیح ہو گی، کیونکہ ظرفی دلیل قطعی دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مثال کے طور پر ڈارون نے اپنے نظریہ ارتقاء میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ

انسانوں کی نسل یکجا یک وجہ میں نہیں آئی، بلکہ حیوانات مرور یا ایام کے ساتھ ساتھ ایک سلسلہ ارتقا سے وابستہ رہے ہیں اور اس ارتقا کے نتیجے میں انہوں نے بہت سی ہمیتیں بدلتی ہیں، یہاں تک کہ انسان بننے سے پہلے اس کی آخری شکل بندر یا یعنی بندروں میں سے ایک انسان کی ایک نسل ارتقا کے مراحل طے کرتی ہوئی انسان بن گئی، ظاہر ہے کہ ڈاروں کا یہ نظریہ ایک عیاسی نظریہ تھا، اور جو دلالت اسے پیش کئے تھے، اگر انھیں دلالت کہنا صبح ہوتا زیارت سے زیادہ وہ ظہی دلالت تھے، اس کے مقابلے میں قرآن کریم واضح الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے :-

تَيَاٰ إِيمَانُهَا النَّاسُ الْغَوَّارُ تَكُوْرُ الْأَنْبَىٰ خَلَقَكُمْ مِّنْ نُفُرَّعَةٍ
وَخَلَقَ مِنْهُمَا زُوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً

(رساء ۱:۱)

لئے لوگو! اپنے اس پر درگار سے طرد جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس جان سے اُس کی بیوی کو پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد دعورت (دنیا میں) پھیلا دیتے ہیں ॥

نیز ارشاد فرمایا:-

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَّرًا مِّنْ صَلْصَالٍ
وَنِسَاءً مِّنْ صَلْصَالٍ فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَحْتَهُ فَنِيهِ مِنْ أَرْوَحِي فَقَعُوا هُنَّا
سَاجِدِينَ، فَسَجَنَ الْمَلَائِكَةُ مُهْمَّاً أَجْمَعُونَ،

(الحجور: ۲۸-۳۱)

جب تمہارے پر درگار نے فرشتوں سے ہمارے میں خیر اٹھے تو ہم کھارے سے جو سوچ کر بچنے لگتا ہے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پس جب میں اس کو بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھر کوک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گریزا، پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، الخ ॥
یا اور ان جیسی متحدد آیات صراحت یہ ثابت کرتی ہیں کہ بنی نور انسان کی ابتدا، ایک

فرد واحد رحمت آدم علیہ السلام) سے ہوئی ہے، جو حیثیں اللہ تعالیٰ نے گارے سے پیدا کیا تھا، قرآن کریم کے یہ دلائل قطعی ہیں، ہذا ان سے ڈاروں کے نظریے کی قطعی تردید ہو جاتی ہے، اور اس نظریہ کی وجہ سے رجسے زیادہ سے زیادہ طبقی کہا جاسکتا ہے (قرآن کریم کے صریح بیانات کو چھوڑ دینا یا ان میں دور از کارت آؤیلات کرنا اکسی طرح درست نہیں ہو سکتا،

(۲) چوتھی صورت یہ ہے کہ نقل دلیل بھی ظنی ہوا ورعقلی دلیل بھی ظنی، اس صورت میں بھی عملاء اور متكلین کا اس پراتفاق ہو کہ نقل دلیل کو ترجیح ہوگی، اور جب تک عقلی دلیل قطعی مشاہدے کی صورت اختیار نہ کر لے اُس وقت تک اس کی وجہ سے قرآن و سنت کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹانا درست نہیں ہوگا، اس کی وجہ وہی ہے جو "قرآن کریم اور مجاز" کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان ہو جکی ہے کہ صرف قرآن کریم ہی نہیں دنیا کی ہر گفتگو میں اصل یہ ہو کہ وہ حقیقت ہو، مجازی معنی اسی وقت اختیار کئے جائیں گے جب کوئی مجبوری لاحق ہو جائے، اگر عقل کی کوئی دلیل قطعی حقیقی معنی کے معارض ہر تسبیح مجبوری واضح ہو، اور اس صورت میں مجازی معنی بھی مراد لینا واضح ہے، لیکن جب عقلی دلیل ظنی ہے تو مجازی یا دُور کے معنی اختیار کرنے کی مجبوری ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ عقل کے ظنی دلائل کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی عالمگیر اور ابدی نہیں ہوتے، ایک شخص ظنی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن دوسرا اس کا منکر کرے، ایک زمانے میں اسے قبول عام حاصل ہے، اور دوسرا کر زمانے میں اُسے چالات سمجھا جاتا ہے، فلسفہ اور سائنس کی تایخ اخھاکر دیکھتے وہ اس قسم کے کتنے بیشمار نظریات سے بھری ہوئی ہے، ایک ہی زمانے میں ایک فلسفی ایک نظریے کا قاتل ہے، اور اپنے ظنی دلائل کو تمام دوسرے دلائل پر فوقيت دیتا ہے، لیکن دوسرا فلسفی ٹھیک اُسی دُور میں ایک بالکل متصاد نظریہ کو درست سمجھتا ہے، اور اس کے دلائل کو ترجیح دیتا ہے، پھر جب زمانہ کچھ آگے بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھلے دُو کے تمام فلسفیوں کے دلائل بے بنیاد اور غلط تھے، ایسے ظنی عقلی دلائل کا تو شمار

مشکل ہے جنہیں آگے چل کر عقل اور مشاہدے کے قطعی دلائل نے ہمیشہ کے لئے باطل تاریخ دی دیا، اس کے برخلاف چودہ سو سال کی مدت میں ایسے ظنی نقلی دلائل ایکاڈ کیا ہی ملیں گے جن کو عقل کے قطعی دلائل یا مشاہدے نے یقینی طور پر غلط افترا دیدیا ہو، لہذا اگر عقل کی ہر ظنی دلیل کی وجہ سے نقلی دلائل میں تاویلات کا دروازہ کھول لایا تو قرآن و سنت کو بازیجھے اطفال بنانے کے سوا اس کا اور کیا نتیجہ بخوبی سکتا ہے؟ حضرت مولانا حافظ الرحمن حفظہ اللہ علیہ نے بڑی اچھی بات بخوبی ہے :-

در اصل اس قسم کے مباحثہ علیت کے لئے ہر سلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدے کی حد تک پہنچ پہنچے ہیں اور قرآنی علوم اور دحیٰ الہی ان حقائق کا انکار نہیں کرتے رکینہ کفر قرآن عزیز مشاہدہ اور بدراہست کا کبھی بھی انکار نہیں کرتا، تو ان کو بلاشبہ تسلیم کیا جائے اس لئے کہ ایسے حقائق کا انکار بے جا تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جسم کی اُس حد تک نہیں پہنچ ہوں کو مشاہدہ اور بدراہست کہا جاسکے، تو ان کے متعلق قرآن عزیز کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہیں، اور خواہ محظاہ ان کو جدید تحقیقات کے سانچے میں ڈھانٹنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہئے، کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آنکھا رکر دیں کہ ان کے انکار سے مشاہدے اور بدراہست کا انکار لا جاؤ آ جاتے، اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ مسائل علمیہ کو تو بارہا اپنی جگہ سے ہٹنا پڑتا ہے، مگر علم فقرہ آنی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔

لہذا بیانیادی اصول تو یہی ہے کہ جب عقل اور نقل کے ظنی دلائل میں تعارض پیش آئے

۱۷ تقصص القرآن، ص ۳۹۹ ج ۱، واقعہ آدم علیہ السلام، مسئلہ نمبر ۱،

تو نقل کے طبق دلائل کو ترجیح ہوگی، اور عقل کے طبق دلائل کی بنیاد پر نقلی دلائل میں دوسرے راز کی تاویلات اختیار کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ ظنی دلائل بھی سب ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے، بلکہ ان میں بھی مختلف درجات ہوتے ہیں، چنانچہ بعض ظنی دلائل دوسرے طبق دلائل کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتے ہیں، مثلاً یہ بات بھی ظنی ہو کہ زمین حرکت کرتی ہے، اور یہ بھی ظنی ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں "نیاندرthal" (Neanderthal) کے نام ایک مخلوق پائی جاتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ قوت کا بوجو درجہ پہلی بات کو حاصل ہے، وہ دوسری بات کو حاصل نہیں، اسی طرح ایک ظنی نقلی دلیل وہ ہے جو صحیح بخاری، اور صحیح مسلم اور تمام حدیث کی کتابوں میں موجود ہو، اور ایک وہ جو صحیح سندر کے ساتھ منقول ہے، لیکن صحاح بستہ اور حدیث کی معروف و متداول کتابوں میں نہیں پائی جاتی ظاہر ہے کہ پہلی قسم دوسری کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے، اس طرح ظنی دلائل میں درجات متفاوت ہو سکتے ہیں، اب اگر کوئی عقلی دلیل ظنی درجہ اول کی ہو اور نقلی دلیل ظنی درجہ درم سوم کی ہو تو ایسی صورت میں ایک مجتہد عقلی دلیل کو نقلی دلیل پر ترجیح دیکر نقلی دلیل کی ایسی توجیہ کر سکتا ہو جو ظاہری الفاظ کے لحاظ سے نسبتاً بعید لیکن عقلی دلائل کے مطابق ہو، البتہ جب تک وہ عقلی دلیل بعثاہدے یا نقطیات سے ثابت نہ ہو جائے اُس وقت تک نقلی دلیل کی اس توجیہ کو قطعی اور متعین طریقے سے بیان نہ کرنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جو عقلی دلائل کے لحاظ سے راجح معلوم ہوتا ہے،

لیکن چونکہ ظنی دلائل کے ان درجات کو پیٹھے قواعد کے تحت لانا مشکل ہے اس لئے یہ فیصلہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہو کہ کوئی دلیل کس درجے کی ظنی ہے، چنانچہ یہ فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے نقل و عقل کے دلائل پر مکمل عبور اور قرآن و سنت کے علوم میں

لہ دیکھئے انسانیکلو پیڈیا برٹانیکا، مطبوعہ نسخہ مقالہ "Man" ۱۹۵۷ء ص ۶۲، ج ۱۳

پوری بصیرت حاصل ہو، اور اس معاملے میں اہل علم کی آراء میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے گا
یہ بات ایک مثال سے واضح ہو سکے گی، قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جب حضرت
ذوالقرنین نے یا جو ج و ما جو ج کو روکنے کے لئے دیوار بنائی تو فرمایا اہ-

**هُنَّ أَرْحَمُهُمُ الَّذِينَ فَيَأْذَى جَاهَدَهُ وَعَذَّلَهُ تَرَبَّى جَعَلَهُ
ذَكَاءً وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقَّاً**

"یہ (دیوار) میرے پروردگار کی طرف سے ایک رحمت ہے، پس جب
میرے پروردگار کا وعدہ پورا ہونے کا وقت (آئے) تو وہ اس دیوار کو
ٹوٹ دیگا، اور میرے پروردگار کا وعدہ صحیح ہے" ۹

اس میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ "پروردگار کا وعدہ" سے مراد قیامت ہے،
اور مطلب یہ ہے کہ جب قیامت قریب آجائے گی، اور یا جو ج و ما جو ج کے نکلنے کا وقت
ہو گا، اس وقت یہ دیوار ٹوٹ جائے گی، اگرچہ قرآن کریم نے صرف "پروردگار کا وعدہ"
کا لفظ ذکر فرمایا ہے، اس کی مزید تشریح و تفسیر نہیں فرمائی، لیکن چونکہ قرآن کریم میں
متعدد مقامات پر یہ لفظ قیامت کے معنی میں آیا ہے، اس لئے مفسرین نے یہاں
جی اس کے یہی معنی مراد لئے ہیں، لیکن یہ تفسیر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے،
دوسری طرف اب تک جو جزافیاں اور تاریخی تحقیقات ہوئی ہیں ان سے گما
یہ ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار کافی عرصہ پہلے ٹوٹ چکی ہے، اگرچہ یہ
تحقیقات بھی ظنی ہیں، کیونکہ ذوالقرنین کی دیوار کا قطعی اور لبقی تعيین جس میں کوئی
مشبه باقی نہ رہے بہت مشکل ہے،

اس کے باوجود ایک شخص جسے عقلی اور نقلی دلائل میں موازنے کا مکمل سلیقہ اور
ان معاملات کی صحیح بصیرت عطا فرمائی ہو یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ تاریخی اور جزافی
تحقیقات درجہ اول کی ظنی ہیں، اور آیت کی مذکورہ بالاتفاقی درجہ دوم کی ظنی ہے،
ہلذا ان تحقیقات کے مطابق یہ کہتے ہیں کوئی حرج نہیں ہو کہ فتر آن کریم کی مذکورہ
آیت میں "پروردگار کے وعدے" سے مرا و قیامت بے بجائے دہ معین وقت بھی

ہو سکتا ہے، جس میں اس دیوار کا ٹوٹنا تقدیر ابھی میں طشدہ ہو، چنانچہ حضرت علامہ اور شاہ صاحب تفسیری رحمۃ اللہ علیہ نے گزشتہ عام مفسرین کے خلاف اسی تفسیر کی طرف اپنائی۔ حجت ظاہر گیا ہے کہ ذوالقرنین کے اس قول کامنداش قیامت کی کسی علامت کی طرف اشارہ کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ ایک عام بات کہنا چلتی تھی، کہ جب میرے پروردگار کا حکم ہو گایہ دیوار ٹوٹ جاتے گی، اور قیامت کے قریب یا بحوج و ما بحوج کے جس خروج کا ذکر قرآن کریم نے دوسری یہ چند فرمایا ہے اُس کا دیوار ٹوٹنے کے دلتنے سے کوئی تعلق نہیں ہے،

لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ظنی دلائل کی یہ درجہ بندی بڑا نازک کام ہے، اور اس کے لئے نقلی و عقلی علوم میں فسراً و اقیٰ بصیرت و مہارت کی ضرورت ہے، لہذا اس معاملے میں پوری حستیاط، سمجھ و بوجہ اور خوف خدا کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے، اور عرض کیسی راجح وقت نظریے کی چک دمک سے مرعوب ہو کر جلد بازی میں کوئی فیصلہ کر لینا اکثر گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، یہ ہے عقلی اور نقلی دلائل میں تعارض کے وقت صحیح طریق کا رجوت تمام علماء سلف کا معمول رہا ہے، اور جس کی معقولیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا،

۳۔ احکام شرعیہ و رعقل

قرآن کریم کی تفسیر میں عقل کے استعمال کی ایک بدترین صورت یہ ہے کہ قرآن کریم کے صریح اور واضح الفاظ سے جو شرعی حکم ثابت ہو رہا ہو، اُس سے اس بناء پر انکار کیا جاتے کہ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آسکی، آجھل معتبری افکار کے تسلط یہ خطناک و بابھی عام ہو رہی ہے کہ جن شرعی احکام پر پودہ سو سال سے پوری

لہ تفصیل کیلئے دیکھئے عقیدۃ الاسلام فی حیات عیلیۃ الاسلام از حضرت مولانا اور شاہ صاحب تفسیری ص، ۱۹ و نفحۃ العبراز حضرت مولانا محمد یوسف تباہی تبوری، ص ۵۸ اوقصص لفہ قرآن،

امت مسلط متفق چلی آرہی ہے، اور جو قرآن کریم یا العادیت بنویس سے صراحت ووضاحت کے ساتھ ثابت ہیں، وہ بعض از از کو اپنے مزاج کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، اس لئے قرآن و سنت کی جن نصوص سے وہ ثابت ہیں ان میں وہ تاویں اور تحریف کار و ازاد کھل دیتے ہیں، اور ذہجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں دینہ احکام شرعیہ رمعاذ اللہ ہیں بوجنگٹ نہیں رہے،

مثلاً قرآن کریم نے چور کی سزا کے بارے میں واضح حکم دیا ہے کہ:-

اَشْلِدُّوْنَ وَالشَّارِقَةَ فَاتَّعْكُوْنَ اَيْنِي يَسْهَمَا

چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی ہوڑت کے

باقھ کاٹ دو ॥

اب ایک عرصہ سے غرب کے مصنفوں اسلام کی مقررگی ہوئی ان سزاویں برائیاں من کرتے ہیں، اور چوروں پر ترس کھا کر با تحد کلائٹنے کی سزا کو بہت سخت بلکہ (رماعت اللہ) وجہاً قرار دیتے رہے ہیں، چنانچہ عالم اسلام کے وہ تجدید دین جو غرب کے ہر اعتراف کے جواب میں ہاتھ چوڑ کر معذرت پیش کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں ان سزاویں میں کوئی ایسی تحریم کی جاتے جواہیں مغرب کو راضی کر سکے، چنانچہ وہ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیت میں تو طردرڑکی کو شمش کرتے رہے ہیں، ایک معاصر اہل قلم نے اپنے ایک مقالہ میں تو یہاں سک لکھ دیا کہ مذکورہ آیت میں "چور" سے مراد "سرمایہ دار" ہیں، اور ان کے ہاتھ کلائٹنے سے مراد ان کے کارخانے ضبط کر لینا ہے، اور اس آیت میں چور کی سزا بیان نہیں کی گئی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ سرمایہ داروں کی تمام صنعتیں قومی تحول میں لے لیئی چاہیں، یہی حال اُن لوگوں کا ہو جو سُرُد، فقار اور شراب وغیرہ کی کسی نہ کسی شکل کو جائز قرار دینے کی فکر میں ہیں، اور اپنے اس طرزِ عمل کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ عقل کی رو سے موجودہ زور میں ان کی حرمت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، لہذا یہاں اصولی طور پر یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ احکام شرعیہ اور عقول میں کیا نسبت ہے؟ شرعی احکام

کے معاملہ میں عقل سے کام کتنا بیا جا سکتا ہے؟ اور اس کی کیا حدود ہیں؟ راقعہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے احکام عقل سیم کے عین مطابق ہیں، اور ان میں سے ایک ایک کے بارے میں پوری تفصیل سے ناقابل انکار دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ انسانیت کی صلاح و فلاح کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں، البتہ اس موضوع سے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں وہ چونکہ چند درجہ میں، اس نے یہاں اس بحث کو کئی حصوں پر تقسیم کرنا پڑے گا، ذیل میں ہم مقدمہ کے طور پر چند باتیں بیان کرتے ہیں، ان مقدمات کے اچھی طرح ذہن نشیں ہو جائے کے بعد ہی صحیح نتیجہ برآمد ہو سکے گا، لیکن جو حضرات واقعۃ اس مسلم کی تشفی بخش تحقیق چاہتے ہیں اُن سے گزارش یہ ہو کہ وہ اس بحث کے صرف کسی ایک بُرے کو روکھ کر محملت میں فیصلہ نہ کریں، بلکہ پوری بحث اور اس کے تمام مقدمات کو ایک مرتبہ پورے غور و خوض اور ٹھنڈے دل کے ساتھ پڑھ لیں، داشدہ لی البراتیۃ وال توفیق،

۱۔ آزاد عقل اور ہدایت دگر اہی؛

جیسا کہ اپر عرض کیا گیا افتر آن و سنت کا کوئی حکم عقل سیم کے مخالف نہیں لیکن سب پہلے متعین کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کی عقل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، ہذا اپنے بُرے کی تمیز کے لئے کوئی عقل کو بنیا بنایا جائے؟ اگر دنیا کے تمام معاملات کا فیصلہ اور قانون سازی اُس خالص عقل کی بنیاد پر کی جانے لگے جو ہر قسم کی دریں پابندیوں سے آزاد ہو تو دنیا میں ایک ایسی فوضیوت اور انانار کی کاڈور دوڑہ ہو گا، جس کی موجودگی میں انسانیت کی بالکلیہ تباہی ایقینی ہے وجب یہ ہے کہ اگر انسانی عقل کو برقسم کی حدود دیور سے آزاد کر دیا جائے تو اس سے وہ پیش پا افتادہ اخلاقی مسلاط اور حقائق بھی ثابت نہیں ہو سکتے جیھیں ایک شریف بچہ بھی درست سمجھتا ہی، مثلاً اپنی بیوں کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب ایسا لکھنا ز جرم ہے جسے دنیا کے کسی مذہب دللت اور کسی قوم میں بھی پسند نہیں کیا جاتا... یہاں تک کہ وہ بدترین ملحد خداور رسولؐ کو بھی نہیں مانتے وہ بھی اس فعل کو انہیں کی

سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس گھناؤ نے فعل کو ناجائز ثابت کیتا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے، یکونکہ خالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بہن اپنے بھائی کو راحت پہنچانے کے لئے کھانا پختا ہے، اس کے سونے کے لئے بستہ تیار کرتی ہے، اس کے کپڑے سیتی ہے، اس کی ضروریات کو ستوار کر رکھتی ہے، وہ بیمار ہو جائے تو اس کی تیارداری کرتی ہے، غرض اپنے بھائی کو آرام پہنچانے کے لئے اس قسم کی جو خدمت بھی انجام دیتی ہے، تو معاشرہ کے اچھی نگاہ سے دیکھتے ہے، اور اس کی تعریف کرتا ہے، لیکن اگر یہی بہن اپنے بھائی کی جنسی تسلیم کے لئے اپنے آپ کو پیش کرے تو ساری دنیا اس پر لعنت و ملامت کی بوجھاڑ کر دیتی ہے، اگر ہر معاملہ کا تصفیہ خالص اور آزاد عقل کے جو لئے کیا جائے تو وہ بالکل بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر ایک بھائی اپنی بہن سے بر قسم کا آرام حاصل کر سکتا ہے تو جسی آرام حاصل کرنا کیوں منوع ہے؟ یہ سوال اخلاق اور رسم درواج کی مفترکی ہوئی حدود کے تحت انتہائی اچنہ با بلکہ گھناؤ نا محسوس ہوتا ہے، لیکن جو عقل کسی قسم کی حدود و قیود کی پابند نہ ہوا اس کو آپ یہ کہہ کر مطین نہیں کر سکتے کہ یہ فعل اخلاقی اعتبار سے انتہائی پست اور گھناؤ نافعل ہے، سوال یہ ہے کہ خالص عقلی نقطہ نظر سے اس میں کیا خرابی ہے؟ آپ کیمیں گے کہ اس سے اختلاط انساب کا فتنہ پیدا ہوتا ہے، لیکن اول تو بر تھے کنٹرول کے اس دور میں اس جواب کی کوئی جنی یہیں نہیں رہی اور اگر بالفرض اس سے اختلاط انساب ہوتا یعنی ہر تو خالص عقل کی بنیاد پر ثابت کیجئے کہ اختلاط انساب بھروسی چڑھے، یکونکہ وہاں بھی ایک آزاد عقل یہ کہہ سکتی ہے کہ اختلاط انساب کو مجرانی فشار دینا مذہب و اخلاق کا کرشمہ ہے، اور جو عقل مذہب و اخلاق کی زنجیروں سے آزاد ہوا اس کے لئے کسی بُرا یہ کو بُرا نی ٹابت کرنے کے لئے کسی خالص عقلی دلیل کی ضرورت ہے،

آپ کیمیں گے کہ یہ عمل انتہاد رجی کی بے حیانی ہے، لیکن خالص اور آزاد عقل اس کے جواب میں یہ کہو گی کہ "حیا اور بے حیانی" کے یہ سارے تصورات

مذہب، اخلاق یا سماج کے بناءے ہوئے ہیں، اور نہ عقلی اعتبار سے یہ عجیب معاملہ ہے کہ ایک عورت اپنے جسم کو ایک قطعی انجان آدمی کے حوالے کرنے تو یہ حیاداری ہے، اور جس بنتے تکلف شخص کے ساتھ اس کا بچپن گزر لہے اس کے حوالے کرنے تو یہ بے حیائی ہے... آپ کہیں گے کہ انسانی نظرت اس عمل سے انکار کرتی ہے لیکن آزاد عقل اس کے حوالہ میں کہتی ہے کہ اس عمل کے غیر فطری ہونے کی دلیل عقل کیا ہے؟ درحقیقت یہ عمل اس لئے خلاف فطرت معلوم ہوتا ہے کہ صدروں سے سماج اس کو بڑا بھختا آرہا ہے، اگر سماج کے بندھن کو توڑ کر خالص عقل سے تو پہنچنے تو اس عمل میں قباحت کیا ہے؟ غرض آپ خالص عقل کی بنیاد پر اس سوال کو حل کرنا چاہیں گے تو یہ قیامت تک حل نہیں ہو سکے گا،

اور یہ محض ایک مفرد ضمہ ہی نہیں، آج کی آزاد عقل نے تو اس کے قسم کے بے شمار سوالات اٹھاہی رکھے ہیں، پُرانے زمانے میں بھی جب کسی نے خالص اور آزاد عقل کے ذریعہ دنیا کے معاشرتی مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمیشہ عقل سوال و جواب کی اس بھول بھدیاں میں بھنس کر رہا گیا ہے، یقین نہ آئے تو فرقہ باطنیہ کے حالات کا مطالعہ کیجئے، اس فرقہ کا ایک مشہور یہودی عبید الدین بن حسن القیرداوی اپنی کتاب "اسیاستہ والبلاغ الائیڈ و الاموس الاعظم" میں لکھتا ہے:-

"اس سے زیادہ تعجب کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ عقل کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس قسم کی بے عقولیان کرتے ہیں کہ اُن کے پاس ایک حسین رحمیل ہےں یا بیٹی موجود ہوتی ہے، اور خود ان کی بیوی الیسی حسین ہیں ہوتی، اس کے باوجود وہ اپنی بہن یا بیٹی کو لپٹے اور پڑھام سمجھ کر اس کو ایک اجنبی شخص کے حوالے کر دیتے ہیں، اگر یہ جاہل عقل سے کام لیتے تو انہیں احسان ہوتا کہ ایک اجنبی کے مقابلہ میں اپنی بہن اور بیٹی کے دہ خود زیادہ حق دار ہے، دراصل اس نادانی کی ساری وجہ یہ ہے کہ اُن کے رہنماؤں پر دنیا کی لذتیں حرام کر دی ہیں۔"

اس گھناؤ نی عبارت کی مشناعت و خباثت پر جتنی چاہے لعنت بھیجتے رہتے، لیکن ساتھ ہی دل پر ہاتھ رکھ کر سوچتے کھالص اور آزاد عقل کی بنیاد پر اس میں کا کوئی جواب آپ دے سکتے ہیں؟ واقعہ یہ ہو کہ دنیا بھر کے جو عقل پرست صحیح و شام آزاد عقل کی رٹ لگاتے رہتے ہیں، اگر وہ سب مل کر اس اعراض کا خالص عقل جواب دینا چاہیں تب بھی قیامت تک نہیں دے سکتے،

اور پھر کمال یہ ہے کہ یہ عبید اللہ قیرداںی جس کی عبارت اور پر بھی گئی ہے فتنہ آن کا کھلما منکر نہیں تھا، بلکہ روشنے باطنیہ کی طرح قرآن میں عتل کی بنیاد پر تاویلات کیا کرتا تھا، اور یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ قرآن کے جو معنی ظاہری طور پر سمجھ میں آتے ہیں وہ رحیقت وہ مراد نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کچھ مجاز و استعارہ اور تمثیل و تشبیہ ہے جس کا حقیقی مطلب کچھ اور ہے،

اسی طرح اگر آپ مطلق زنا کی حرمت آزاد اور خالص عقل سے ثابت کرنا چاہیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہو گا، کیونکہ آزاد عقل یہ سوال کر سکتی ہے کہ اگر دو مردوں عورت باہمی رضامندی سے بد کاری کا ارتکاب کرنا چاہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسی پہنچنے سے قوانین میں باہمی رضامندی سے زنا کر لینا کوئی جرم نہیں ہے، کیونکہ ان قانون سازوں کو زنا بالرضا میں کوئی خالص عقل خرابی نظر نہیں آتی، بلکہ ابھی کچھ عرصہ پہلے برطانیہ کی مجلس قانون سازنے بھاری اکثریت سے تایلیوں کی گورنخ نہیں یہ قانون منظور کیا ہے کہ دزمردی کا باہمی رضامندی سے لواطت در Homo Sexuality ارتکاب قانوناً بالکل جائز ہے، اس قانون سازی کی وجہ بھی یہی سمجھی کہ خالص عقل پر طور پر اس عمل میں کوئی قابل سزا بات نظر نہیں آتی،

اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، انسانی ذہن کے بناءے ہوتے قوانین کا یہ لازمی خاصہ ہے کہ وہ انسانیت کی صحیح تربیت کر کے اس کو امن و سکون سے ہمکنار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، اور ان کے ذریعہ انسان عقل کے نام پر ایسی

ایسی بے عقلیاں کرتا ہے کہ الامان، وجہیہ ہو کر جب مخالف عقل "قانون سازی کی بنیاد پر ہے تو اس دنیا میں ہر انسان کی عقل درست سے مختلف ہوتی ہے، زمانے کا کوئی عام چلن آگر ایک زمانے کے افراد کو کسی ایک عمل کی اچھائی یا بُرا نی پر متفق کرتا بھی ہو تو کسی دوسرے زمانے کی عقل اسی عمل کے بارے میں کون مختلف رائے دیدیتی ہو کیونکہ "عقل" کے پاس کوئی ایسا متفق معیار نہیں ہے جس کی بنیاد پر اقدار (Values) کا تعین کیا جاسکے اور اس کی روشنی میں صحیح قوانین بناتے جاسکیں،

چنانچہ بعد حاضر کے ماہرین کو بھی عقل و فہم کے ہزار دعووں کے باوجود دشنا سال کی بخوبی کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قانون سازی کا یہ بنیادی مسئلہ ہم ابھی تک نہیں کر سکے کہ قانون سازی کے لئے کسی چیز کو اپنایا بُرا کہنے کا کیا معیار ہے مقرر کرنا چاہتے ہیں؟ ہمارے زمانے کے معروف ہر قانون کا لٹپٹن George Whitecross Paton اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب "اسول قانون" میں لکھتی ہیں:

"ایک مثالی نظام قانون میں کون سے مفارقات کا تحفظ ضروری ہے؟ یہ ایک اقدار کا سوال ہر جس میں فلسفہ قانون کو اپنائ کرو ارادہ کرنا ہوتا ہے بنیادی طور پر یہ "نظری قانون" (Natural Law) کا مسئلہ ہے" یعنی اس سوال کا جواب ہم جتنا فلسفے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اتنا ہی فلسفے اس کا جواب ملتا مشکل ہے، کیونکہ ابھی تک اقدار کا کوئی متفقہ پیمانہ نہیں مل سکا، واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہب ایسی چیز ہے کہ جس میں ہمیں ایسی بنیادی سختی ہے، یعنی مذہب کے حقائق کو اعتقاد یا وجدان کے ذریعہ تسلیم کرنا ضروری ہے، نہ کہ خالص منطقی دلائل کے ذریعہ آگے اسی مصنف نے ان آراء و خیالات کی بڑی دلچسپ داستان بیان کی ہے جو قانون کے مقصد اس کے فلسفہ اور اس کے اخلاقی بنیادوں سے متعلق مختلف مفکرین نے

ظاہر کی میں، لیکن یہ آراء و خیالات اس قدر متفاہی ہیں کہ جارج بیٹھنے لگتے ہیں ۔ ۔ ۔
 ”قانون کا مقصد کیا ہوتا چاہئے؟ اس بارے میں آراء و نظریات تقریباً اتنے
 ہی بے شمار میں جتنے اس موضع سے مت رکھنے والے مصنفین کی تعداد،
 کیونکہ ریسے نکھنے والے مشکل ہی سے ملیں گے جنہوں نے قانون کے لئے کوئی
 مثالی مقصد وضع نہ کیا ہوا“

آئے انہوں نے تفصیل سے بتایا ہک کہ اس موضع پر ہر زمانے میں مفکرین قانون
 عقل و فکر کی تگ و تازے اس الجھی ہوئی ڈور کو کس طرح مزید پُرچ بناتے رہیں،
 آخر میں وہ نکھتے ہیں ۔ ۔ ۔

The orthodox natural law theory based
 its absolutes on the revealed truths of
 religion. If we attempt to secularize
 jurisprudence, where can we find an
 agreed basis of values ? (P. 126)

راوح العقیدہ فطری قانون کا نظریہ لپٹنے عمومی اصولوں کی بنیاد مذہب کے
 الہامی حقائق پر رکھتا تھا، اگر ہم اصول قانون کو لادینی بنانے کی کوشش
 کریں تو اقدار کی متفقہ بنیاد ہم کہاں سے لاسکیں گے؟
 غرض یہ کہ اگر دھی الہی کی رہنمائی سے قطع نظر کر کے عقل کو بالکل مادر پدر
 آزاد چھپڑ دیا جائے تو اچھے بڑے کی تمیز کرنے کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی،
 انسان کو مگر اسی اور ربے عقلی کے لیے یہی تاریک غاروں میں گرا کر جھوڑتی ہو کہ
 جہاں رشد و ہدایت کی کوئی، بالکل سی کرو بھی نہیں پڑتی، وجہ یہ ہے کہ وحی الہی کی
 رہنمائی کے بغیر جب انسان نری عقل کو استعمال کرتا ہے تو وہ اسے آزاد عقل سمجھتا ہے اگر
 لیکن درحقیقت وہ اس کی نفسانی خواہشات کی غلام ہو کر رہ جاتی ہے جو عقل کی
 غلامی کی بدترین شکل ہے، جو لوگ ہر کام میں خالص عقل کی بیرونی کا دعوے

کرتے ہیں وہ درحقیقت انہتاً، ورجہ کی خود فریبی میں مستلا ہیں، اُن کے مقابلہ میں وہ لگ زیادہ حقیقت بسند اور جرأت مند ہیں جو کھل کر یہ کہتے ہیں کہ ہماری عقتوں آزاد نہیں، بلکہ ہماری خواہشات نفس کی غلام ہے، فلسفہ قانون کی بحث میں۔ مارٹن مفکرین کے ایک گروہ کا ذکر آتا ہے، جن کا فلسفہ (Noncognitivist) کے نام سے مشہور ہے، عہد حاضر کے معروضت مہر قانون (Ethical Theory) ڈاکٹر فرانٹ مین کے الفاظ میں اس فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

Reason is and ought only to be the slave
of the passions and can never pretend to
any other office than to serve and obey
them.

یعنی ”عقل درحقیقت انسانی جذبات کی غلام ہے، اور اسے صرف اپنی جذبات کا غلام ہونا بھی چاہئے، اس کا کام اس کے سوا کچھ ہوہی نہیں سکتا کہ وہ اُن جذبات کی خدمت اور اطاعت کرتی رہے“

اس فلسفہ کا مตیجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرانٹ مین لکھتے ہیں :-

”اس کے علاوہ ہر جیز مثلاً ایک سادہ حکم، شرم و حیا، جانی، بلکہ ”اچھے“ جسے ”جیسے تصورات یا“ فلاں کام ہونا چاہئے“ اور ”فلاں کام اس لائق ہے“ جیسے الفاظ سب نالصہ“ خواہشات و جذبات کی پیداوار ہیں“ اور علم اخلاق نام کی کسی چیز کا کوئی حقیقت وجود نہیں ہے“

اس بحث سے قطع نظر کہ اُن لوگوں کا یہ فلسفہ اچھا ہے یا بُرا؟ یہ کتنی بات انہوں نے بالکل سمجھی کی ہے، کہ دھی الہی کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد عقل اور اخلاق نام کی کوئی چیز باقی رہ ہی نہیں سکتی، اس کے بعد انسان کے وجود اور اعمال افعال

پر خالصہ اس کے جز بات و خواہشات کی حکمرانی ہوئی ہے، اور یہ خواہشات و خذالت
ا سے جہاں لیجا نا چاہیں وہاں اُسے جانا پڑتا ہے، پھر اگر کسی کام کو انسان کا انہیں
قبول بھی نہ کرتا ہو تو سب بھی اس کے پاس خواہشات کو رد کرنے کے لئے کوئی معین
بنیاد باقی نہیں رہتی، چنانچہ برطانیہ میں یہ جن برقی کو سندھ جواز دینے کا اقدام اسی
بیچارگی کے عالم میں ہوا کہ بعض معنکر سن اُسے ناپسند کرتے تھے، اور خود جائز قرار
دینے والے بعض افراد کا ضمیر اس پر مطمئن نہ تھا، لیکن خواہشات کی غلام بخنز
کے بعد عقل کے پاس اس مطالیہ کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، ولہستان
کیلئے (Wolfenden Committee) جو اس مشتمل پر غور
کرنے کے لئے بنائی گئی تھی، اور جس کی سفارشات کی بنیاد پر اسلامی میں یہ فیصلہ
ہوا، اس کی روپورٹ کے یہ الفاظ اس درجہ بحترت خیز ہیں :-

جب تک قانون کے ذریعہ کام کرنے والی سوسائٹی اس بات کی جانی بوجھی
اور سوچی بوجھی کو مشش نہ کر کے معاشرے میں جرم کا خون گناہ کے خوف
کے برابر ہو جائے اس وقت تک پرایمرویٹ اخلاق اور بداخلی کے تصور
کی حکمرانی باقی رہی گی، جو مختصر مگر صاف لفظوں میں قانون کے دائرة کا
سے باہر ہے ”

لیکن نظر آن کریم جو انسانیت کو خواہشات کی بھول بھلیاں میں بھکلتا چھوڑنے
کے لئے نہیں بلکہ ہدایت کا صاف اور سیدھا راستہ بنانے کے لئے آیا ہے اور
جس نے واضح طور سے بتایا ہے کہ انسان کی جبلت میں اچھی اور بُری ہر طرح کی
خواہشات و دلیلت کی گئی ہیں وہ لپنے پیروؤں کو اس ہولناک اندر ہیرے میں
نہیں چھوڑ سکتا، اس کی صطلاح میں دھی کی رہنمائی سے آزاد عقل کا نام ہوئی ”
ہے، جس کے بارے میں اس کے ارشادات یہ ہیں :-

وَقَرِيبَ الْحَقِّ أَهُوَ أَمْ هُمْ لَفَسَلَتِ السَّمَاوَاتِ

وَالْأَسَاطِيرُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (المؤمنون : ۱۷)

”اور اگر حق آن کی خواہشات کے پچھے چلتے تو آسمان و زمین اور ان کی مخلوقات درہم برہم ہو کر رہ جائیں“

أَقْمَنْ دَكَانَ عَلَىٰ تِينَةٍ مِنْ قَرْبِهِ كَعْنَ زُّتِنَ لَهُ سُوْءَةٌ
عَمَّكِهِ وَأَتَبَعُوا أَهُوَاءَهُمْ (محمد : ۱۲)

”تو کیا وہ شخص ہے اپنے پر در دکار کی طرف سے روشنی میں ہواں لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جیسی اپنی بد عملی ایجھی لگتی ہے، اور جو اپنی خواہشات نفس کی اتباع کرتے ہیں“

وَلَا تُطِمْ مَنْ أَغْفَلْنَا إِلَيْهِ عَنِ الْذِكْرِ نَاقِ أَتَبَعَ

هَوَاهُ وَدَكَانَ أَمْ رُهْمَةً فُرُطًا، (کعبت : ۲۸)

”اور تم اس شخص کی اطاعت نہ کر د جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش نفس کے پچھے ہو لیا، اور اس کا معاملہ حد سے گز ر گیا“

فَلَكَ يَعْصِي نَلَقَاعَهُمْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَأَتَبَعَ هَوَاهُ

فَتَرْدَلِي (طلہ : ۱۶)

”پس تمہیں آخرت سے ہرگز گزیر زان نہ کرے وہ شخص جو اس پر ایمان نہیں رکھتا، اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کرتا ہے (ایسا نہ ہو) کہ تم بلاک ہو جاؤ“

وَمَنْ أَهْمَلَ فِيمَنِ أَتَبَعَ هَوَاهُ بِعِيْدِهِدَىٰ مِنْ أَنْ دِلَّهُ،

(الفصل : ۵۰)

”اور اس شخص سے زیادہ مگر اس کوں ہو گا جو اللہ کی طرف سے آتی ہوئی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے“

فِيْلَدَ الِّاَنْقَادِيْمُ وَاسْتَقِيمَ كَمَا اُمْرَتَ وَلَا تَشْيِعْ
اَهُوَآءَهُمْ رَا الشَّرِيفِ : ۱۵)

”پس اسی کی تم دعوت دو، اور جیسا تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر استقامت اختیار کرو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پروردی کرو۔ آفْكَمْمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ كَمَا لَأَهْوَى أَنْفُسُكُمْ
اَسْتَكْبِرُ كُمْ، رالمقرر : ۸۰)

”تو کیا رحمتھارا حال یہ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمھلے پاس آیی
باتے کرائے جو تمھارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم نے
سرکشی کی؟“

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی چیل بینیاد اس عقل پر نہیں جو خواہشات نفس
کی غلام ہو، بلکہ اس عقل پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہدایات کی پابند
اور اپنے حدود کا راستے اچھی طرح واقع ہو، اور یہی عقل سلیم کی تعریف ہے،
۲۔ اسلامی احکام کی حکمتیں اور دین میں ان کا مقام

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے ذریعہ جو احکام دیئے ہیں
وہ معماز اللہ عقل و حکمت کے خلاف ہیں، بلکہ واقع یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے
دیئے ہوئے احکام عقل سلیم کے عین مطابق ہیں، اور بتیرہ اس کا گواہ ہے کہ
صلاح و فلاح کا اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا، چنانچہ اس کے ہر جنم
میں بہت سی حکمتیں مصلحتیں اور انسانیت کے فائدے مضمون ہوتے ہیں، لیکن یہ
ضروری نہیں کہ ہماری محدود عقل اُن تمام حکموں اور مصلحتوں کا احاطہ بھی
کر سکے، ظاہر ہے کہ وہ خالق کائنات جس کے سامنے زمین و آسمان کی تمام
مورخودات اور ماضی مستقبل کے تمام حالات ہیں، اس کے علم و حکمت کا کون
احاطہ کر سکتا ہے؟ لہذا یہ عین ممکن ہے کہ قرآن و سنت کے کسی حکم کی حقیقی حکمت
و مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن کسی حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آنے کا یہ نتیجہ

ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اس حکم ہی کو درست تسلیم نہ کیا جائے، کیونکہ اگر انسان کو پنے فائدے کی تمام باتیں از خود بھی میں آسکتی تھیں تو سفیروں کو سمجھنے اور اسافر کتابیں نازل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، وحی درسالت کا مقدس سلسلہ تو جاری ہی اس لئے کیا گیا، ہتھ تک اس کے ذریعہ انسان کو ان باقتوں کی تعلیم دیجاسکے جس کا دراک نری عقل سے ممکن نہیں، اس لئے اگر اللہ پر اس کی قدرت کامل ہے اس کے علم حجیط پر، اس کے سمجھنے سے پیغمبروں پر اور اس کی نازل کی ہوتی کتابوں پر ایمان ہے تو لازماً یہ بھی مانے پڑے گا کہ اس کے نازل کئے ہوئے ہر حکم کی پوری پوری مصلحت کا باالکلیہ سمجھ میں آجانا ضروری نہیں، اور اگر اس کا کوئی حکم ہماری محدود عقل و نظر سے ما درام ہو تو اسے ملنے سے انکار کرنا کوئی معقول طرز عمل نہیں، اس بات کو ایک نظیر سے سمجھتے، دنیا کے جسی ملک میں کوئی قانون بنایا جاتا ہے وہاں قانون سازوں کے پیش نظر ہر قانون کی کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں، اور ابھی مصلحتوں کی خاطروں قانون نافذ کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ملک کا ہر شہر و ملک کے ہر قانون کی پوری پوری مصلحتوں سے باخبر ہو؟ ظاہر ہے کہ ملک میں بسا۔ اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جو قانون اور اس کی عائد کی ہوتی پابندیوں کے فوائد سے واقف نہیں ہوتے، اب کسی ملک کا جو قانون اس کے بہترین دماغوں نے تمام پہلو میں نظر کھکر بنایا ہے، کیا اسے اس بناء پر ناکارہ یا غلط کہا جا سکتا ہے کہ چند آن پڑھ دیہاتیوں کو اس کا فائدہ سمجھ میں نہیں آیا، اگر کوئی جاہل انسان محض اس بناء پر کسی قانون کی تعییل سے انکار کرے، کہ اس کی مصلحتیں میری سمجھ سے باہر ہیں تو اس کا مقام جیل خانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر ماہرین قانون اور ایک جاہل انسان کے علم میں تو کسی نسبت کا تصور کیا جبھی جا سکتا ہے، خالق کائنات اور ایک بے مقدار انسان کے علم میں تو کوئی نسبت ہی..... متصور نہیں، لہذا ایک انسان کے لئے یہ بات کیونکہ معقول ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی صریح اور واضح حکم کو اس بناء پر رد کر دے

یا اس میں تاریل دھر لیف کام تکب ہو کہ اس کے فائدے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے،
۳۔ حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہوتا

اسی بنا پر تمام اہل علم کا ہر دو میں اس بات پر اجماع رہا ہے کہ شرعی حکما
کا دار و مدار ان کی حکمتوں پر نہیں بلکہ علتوں پر ہوتا ہے، جو تکمیل ہے اسے دو میں بہت
حضرات "علت" اور "حکمت" کا فرق بھی سمجھ نہیں پاتے، اس لئے یہاں مختصرًا
ان دونوں کی حقیقت بھی سمجھ لینا ضروری ہے،

"علت" اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قانون کے واجب تعییل ہونے کا لازمی
سبب ہوتی ہے، اس کی حیثیت ایک ایسی لازمی علامت کی سی ہے جسے دیکھتے
ہیں قانون کے متبوعین پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ حکم کی پیر دی کریں، اور "حکمت"
اس فائدے اور مصلحت کو کہتے ہیں جو قانون وضع کرتے وقت قانون ساز کے
پیش نظر ہوتی ہے، مثلاً قرآن کریم نے شراب کی حرمت کا حکم دیا ہے، اور
"نشہ" کو حرمت کی لازمی علامت قرار دیا گیا ہے، کہ جس چیز میں بھی نہ ہو
اس کا پہلنا منزع ہے، اور اس ممانعت کی بہت سی مصلحتیں ہیں جن میں سے
ایک یہ ہے کہ لوگ ہوش دھو اس کھو کر ایسے افعال میں مبتلا نہ ہوں جو انسانی شرف
و دقار سے فرو تر ہیں — اس مثال میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ شراب
سے پرہیز کرو، ایک حکم ہے، "نشہ" اس حکم کی علت ہے، اور لوگوں کو ہوش د
حوالس کھو کر پڑے افعال سے بچانا اس کی حکمت ہے، اب ممانعت کے حکم کا
دار و مدار اس کی علت یعنی "نشہ" پر ہو گا، اور جس چیز میں بھی "نشہ" پایا جائے گا،
اُسے حرام کہیں گے، اس حکم کی حکمت پر حکم کا دار و مدار نہیں ہو گا، لہذا اگر کوئی
شخص یہ کہے کہ میں شراب پینے کے باوجود بہکتا نہیں ہوں اور نہ ہوش دھو اس
کھوتا ہوں، اس لئے شراب پیرے لئے جائز ہونی چاہئے، یا اگر کوئی شخص کہئے
لگئے کہ آجھل شراب تیار کرنے کے زیادہ ترقی یافتہ ذراائع ایجاد ہو چکے ہیں جنہوں
نے اُس کے نقصانات کو کم کر دیا ہے، اور شراب پینے والوں کی ایک بڑی تعداد

شراب نوشی کے باوجود دھوکہ و حواس کے ساتھ پہنچ کام کرتی رہتی ہے، اس لئے آجھل
مٹراب جائز ہونی چاہتے، تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ غدر قابلِ ساعت نہیں ہوگا،
اسی طرح قرآن و سنت نے اپنے متبوعین کو مشقت سے بچانے کے لئے یہ حکم دیا
ہے کہ سفر میں پوری نماز پڑھنے کے بعدے آدمی نماز پڑھا کر وجہے "قصر" کہتے ہیں،
اس مثال میں "قصر" ایک حکم ہے، سفر اس کی علت ہے، اور مشقت سے بچانا اس
کی حکمت ہے، اب حکم کا دار و مدار اس کی علت یعنی سفر پر ہوگا، حکمت پر نہیں، لہذا
اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ آجھل ہوا تی چہاروں اور ریل کے آرام دہ ڈبوں نے سفر
کو آسان کر دیا ہے، اور اب پہلی سی مشقت باقی نہیں ہی اسلتو آجھل "قصر" کا حکم
باقی نہیں رہا، تو اس کا یہ کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ الشد کے بندے کی حیثیت میں
ہمارا کام حکم کی علت دیکھ کر حکم پر عمل کرنا ہے، اس حکم کی حکمت اور مصلحتوں کو نہیں
رکھ کر احکام کی تعمیل ہمارا منصب نہیں،

اور یہ قاعدہ صرف اسلامی شریعت ہی کا نہیں، بلکہ راجح وقت قوانین میں
بھی یہی قاعدہ کار فرمائے، مثال کے طور پر طریقہ کے حادثات کی روک تھام
کے لئے حکومت نے یہ قانون بنایا ہے کہ جب کسی چورا ہے پر سرخ سگنل نظر آئے
ہر گاڑی کے لئے رُک جانا لازمی ہے، اس مثال میں گاڑیوں کا یہ حکم کہ "رُک جاؤ"
ایک قانون ہے، سرخ سگنل اس قانون کی علت ہی، اور تصادم کے خطرات سے
بچاؤ کرنا اس کی "حکمت" ہے، اب اس حکم کا دار و مدار اس کی "عملت" یعنی سرخ سگنل
پر ہے، نہ کہ اس کی "حکمت" یعنی تصادم کی روک تھام پر، لہذا اگر کسی وقت حادثے
کا کوئی خطرہ نہ ہو تب بھی سگنل دیکھ کر رُک جانا لازمی ہے، اور اگر کوئی ڈرائیور
یہ سوچ کر سگنل پار کر جائے کہ اس کی نظر میں حادثے کا کوئی خطرہ نہیں ہے تو قانون کی
نظر میں وہ مجرم اور چالان کا سختی ہے،

غرض راجح وقت قوانین میں بھی احکام کا دار و مدار ہمیشہ ان کی علتوں پر
ہوتا ہے..... حکمتوں پر نہیں ہوتا، اور جب دنیا کے عام قوانین کا معاملہ یہ ہے

تو الحش کے بناء پر ہوتے ہوئے قوانین میں تو اس قاعدے کی پایتھی زیادہ ضروری ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم ہر شرعی حکم کی تمام حکمتیں اور مصلحتیں کا احاطہ نہیں کر سکتے اس لئے اگر احکام کا مدار حکمتیں پر رکھا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایک فائدے کو حکم کی واحد حکمت سمجھ کر اس کے مطابق کوئی اقدام کر دیں، غالباً انکہ اس کی دوسری بہت سی حکمتیں اور بھی ہوں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "حکمت" یا "مصلحت" عموماً کوئی لگی بندھی، منضبط اور ایسی واضح چیز نہیں ہوتی جسے دیکھ کر ہر کس وناکس یہ فیصلہ کر سکے کہ یہاں یہ حکمت حاصل ہو رہی ہے یا نہیں؟ اب اگر حکم کا دار و مدار اس کی حکمتیں پر رکھ دیا جائے تو احکام و قوانین کا نفاذ ہو رہی نہیں سکتا، کیونکہ شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے فلاں حکم پر اس نے عمل نہیں کیا کہ اس وقت اس کی حکمت نہیں پائی جا رہی تھی، مثلاً اگر ہر شخص کو یہ آزادی دیدی جائے کہ وہ چراگہ عبور کرتے وقت خود یہ فیصلہ کرے کہ حادثے کا خطہ ہر یا نہیں، اگر خطرہ ہو تو رُک جائے اور خطرہ نہ ہو تو آگے بڑھ جائے، تو اس کا نتیجہ شدید بد نظمی اور بے کی علت یعنی نشر کے بجائے اس کی حکمت پر موقن کر دیا جائے تو ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے مٹاپ کے ایسا نشہ لاحق نہیں ہوتا جو میرے ہوش دھواں گم کر کے میرے کاموں میں خلل انداز ہو، ایسی صورت میں حرمت مٹاپ کا حکم محض ایک کھلونا بننے کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے؟

اس کے برعکس احکام کی علیتیں ایسی لگی بندھی اور منضبط ہوئی ہیں کہ شخص امتحیں دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہو کہ یہاں علیت پائی جا رہی ہے، یہاں ان کے ذریعے احکام کی خلاف ورزی پر گرفت بھی باسانی ہو سکتی ہے، اور ان پر قوانین کا دار مدار قضاہ رے کر سی دنیا میں نظم و ضبط، امن و سکون اور قانون کا احترام پیدا کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُمّت مسلم کے بہت سے علماء نے اسلامی احکام کی حکمتیں اور

مصلحتیں واضح کرنے کے لئے باقاعدہ ضخم کتابیں لکھی ہیں، اور ہر حکم کے بارے میں بتایا ہو کہ اس سے کیا کیا فائد حاصل ہوتے ہیں، لیکن نہ تو کسی نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ آئندہ ان احکام کی تمام حکمتوں کو پا گیا ہے، اور نہ یہ غلط فہمی کسی کو ہوئی ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رہوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ الباғہ" اُسی قصہ کے لئے لکھی ہے کہ اس کے ذریعہ شریعت کی حکمتوں کو تفصیل سے واضح کرس، اور انہوں نے ایسے لوگوں کی سخت تروید کی ہے جو احکام شریعت کی حکمتوں کا آنکھ کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ محترم فرماتے ہیں:-

لَا يَحِلُّ أَنْ يَتَوَقَّفَ فِي امْتِشَالِ أَحْكَامِ الشَّرِيعَةِ إِذَا صَحَّتْ بِهَا
الرِّوَايَةُ عَلَى مَعْرِفَةِ تِلْكَ الْمَصَالِحِ لِعَدَمِ اسْتِقْلَالِ عُقُولِ
كَثِيرِ مِنِ النَّاسِ فِي مَعْرِفَةِ كَثِيرِ مِنِ الْمَصَالِحِ وَلِكُونِ الْبَنِي
صَطِ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْثِقُ عِنْدَنَا مِنْ عَقُولِنَا وَلِذِلْكَ
لَعِيْزَلْ هَذِهِ الْعِلْمُ وَضَنْنُنَا بِهِ عَلَى غَيْرِ أَهْلِهِ^۱

”یہ ہرگز جائز نہیں ہو کہ شریعت کے جو احکام صحیح روایت سے ثابت ہیں اُن کی تفصیل میں اس بناء پریس و پیش کیا جائے کہ اُن کی مصلحتیں ہیں معلوم نہیں، کیونکہ بہت سے لوگوں کی عقليں بہت سی مصلحتوں کو سمجھتی ہیں سکتیں اور کیونکہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نزدیک ہماری عقولوں سے زیادہ قابل اعتماد ہیں اسی لئے اس علم (یعنی حکمت دین کے علم) کو سہیشہ نا اصل لوگوں سے بچانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے“

لَهُجَةُ اللَّهِ الْبَالِغُرْصُ ۶۷ مطبوعہ مکتبۃ سلفیۃ لاہور ۹۵۲ھ، اسی کی مزید تفصیل تحقیق
کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب مذکور، ص ۱۲۹ باب الفرق بین المصالح والشرائع ۱۲

۲۔ احکام شریعت کا اصل مقصد اتباع کا متحان ہی

ایک اور چیز جو احکام شریعت کے معاملہ میں پیش نظر ہنسی چاہئے یہ ہو کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق انسان کی زندگی کا مقصد "اللہ کی بندگی" ہے، ارشاد ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّةِ وَالْإِنْسَانَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

(الذاریات : ۵۶)

اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ

وہ میری بندگی کریں ॥

اور اس بندگی کا طریقہ بھی قرآن کریم نے واضح فرمادیا ہے، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مکمل اتباع میں مختصر ہے، ارشاد ہے:-

إِتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَلَا تَشْتَغِلُوا

مِنْ دُونِهِ أَفْلَيْأَمْ، (الاعراف : ۷۰)

جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اُس کا اتباع کرو، اور اس کے علاوہ دوسرے (خود ساختہ) شرکاء کا اتباع نہ کرو ॥

يَقُولُمْ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ، اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسَاكِنُمْ

آجْرًا وَهُمْ فَهَمَّلُونَ ۝ (آلہ : ۲۱۰)

لئے میری قوم (اللہ کے) پیغمبروں کی اتباع کرو، اُن کی اتباع

کرو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اور وہ ہدایت پر ہیں ॥

وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ

(آلہ : ۵۵)

اُن بہترین باتوں کی اتباع کرو جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھاری طرف نازل کی گئی ہیں ॥

وَهُنَّ أَكْتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مَبَارِكٌ فَاتِّيَعُوهُ وَأَتَمْتُوا
تَعْلَمُكُمْ تُرْحِمُونَ ه (الانعام : ۱۵۳)

"اور یہ برکت والی کتاب ہو جسے ہم نے نازل کیا ہے، پس تم اسکے
اتباع کرو، اور راشد سے ڈر دتا کہ تم پر حرم کیا جائے یہ"

فَآمِنُوا بِإِنْشَهٰ وَرَسُولِهِ الْمُتَّيَ الْأَمِيَ يُوَمِّنُ بِإِلَهٰ
وَكَلِمَاتِهِ وَأَسْعُوهُ (الاعراف : ۱۵۵)

پس تم اشہد پر اور اس کے رسول پر ایمان لا ذجو اُمی ہے، اور خود
الشہر پر اور اس کی باقتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی اتباع کرو یہ"

قرآن کریم ہی نے یہ واضح فرمایا ہے کہ انسان کو پیدا کرنے اور اسے مختلف احکام کا پابند
بنانے کا مقصد اس بات کی آزمائش ہے کہ کون اشہد اور اس کے رسول کی اتباع
کرتا ہے اور کون نہیں کرتا؟

أَلَّذِي خَلَقَ النَّوْتَ وَالْعِوَادَ لِيَتَبَوَّ كُمْ ۖ يُكْرُمُ
آخْسَنُ عَمَلَّا ه (الملاک : ۲)

(اشہد وہ ذات ہے) جس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا
تھا کہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے؟
وَمَا بَجَعَلْنَا الْقِيَلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِتَعْلَمَ مَنْ
يَتَّخِيمُ اللَّهُ سُوْلَ هِمْنَ يَنْقِلِبُ عَلَى عَيْبَيْهِ (البرہہ : ۱۴۳)
اور رکے بنی؟ یہ جس قبلے پر آپ پہلے تھے اس کو ہم نے صرف اسی
لئے قبلہ بنایا تھا تاکہ یہیں یہ معلوم ہو کہ کون رسول کی اتباع
کرتا ہے اور کون لئے پاؤں توڑ جاتا ہے؟

اور جب بندے کا کام ہی اشہد اور اس کے رسول کی اتباع ہوا، اور اسی میں اس کی
ساری آزمائش ہے، تو اشہد اور اس کے رسول کا کوئی صریح حکم آجائے کے بعد انہیں
کام بین تسلیم ختم کرو دیتا ہے، اس کے بعد اسے یہ ختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ حکم

اے اچھا لگے تو قبول کرے اور اچھا نہ لگے تو اُسے رد کر دیے؛
 وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَكُونَ مُمْهَنَةً إِذَا أَقْضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ
 أَمْرًا أَنْ يَكُونُ لَهُمُ الْخَيْرَ مِنْ آمْرِهِمْ،
 (الاحزاب: ۳۶)

”اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معلمے میں کوئی اختیار یا قی رہے“

لہذا اللہ اور اس کے رسول کا داخیل حکم سننے کے بعد اگر کوئی شخص اس بنا پر اُسے ماننے میں تأمل کرے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تو رحمیت وہ عقل کا نہیں، بلکہ اپنی خواہشات نفس یا شیطان کا اتباع کر رہے ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَسِّمُ
 كُلَّ شَيْطَانٍ مَرِيدٍ، (الحج: ۳۱)

”اور بعض لوگ وہ میں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں (صحیح) علم کے بغیر جھگڑا کرتے ہیں اور ہر مرکش شیطان کی اتباع کرتے ہیں“
 ایسے شخص کو آخرت میں ہی نہیں، دنیا میں بھی خسارہ اٹھانا پڑے گا:-
 وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبَثُ مِنَ اللَّهِ عَلَى حُرُوفٍ ۚ وَإِنْ أَصْنَأَ
 نَعْيِرُ لِنَطْمَأَنَّ بِهِ ۖ وَلَمَّا أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ ۖ يَأْنِقْلَبَ
 عَلَى رَجْهِهِ تَفْتَخِرُ بِهِ ۖ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ مَذْلِكٌ هُرَّ
 الْعُسْرَ أَنَّ الْمُمْسِئِينَ ۝ (الحج: ۱۱)

”اور بعض آدمی اللہ کی عبادت راس طرح کرتا ہے (جیسے ہنار پر (کھڑا ہو) ہیں اگر اسے کوئی دنیوی) نفع پہنچ گیا تو اس کی وجہ پر جیسے مطمئن ہو گیا، اور اگر کوئی آزمائش پڑ گئی تو ممکنہ اٹھا کر چل دیا، یعنی جیسے ایسا شخص (دنیا اور آخرت ردنوں) کے خسانے میں ہی اور یہ

لہذا اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہر حکم اگرچہ اپنے سچھے بیشمار حکمیتیں اور مصالح رکھتا ہے، لیکن انسان کا کام یہ ہو کر دہ اس حکم کی اطاعت کا مقصود را صلیٰ ان حکمتوں اور مصلحتوں کو نہ بناتے، بلکہ اس کا اصل مطلب نظر ایک حقیقی بندے کی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی خشنودی اور اس کے احکام کا اتباع ہونا چاہئے، یہی وجہ ہو کہ جب قرآن کریم میں سید کی حرمت کا حکم نازل ہوا، اور اس پر کفار نے یہ اعتراض کیا کہ:-

قَالُوا إِنَّمَا الْبَيِّنُ مِثْلُ السَّرِّ بِهِ

”انہوں نے کہا کہ بیع سودہی کی طرح تو ہے“

تو اس کے جواب میں بہت سی عقلی دلیلیں بھی دی جا سکتی تھیں، اور یہ بھی بتایا جاسکتا تھا کہ بیع و شرا، اور سورہ لین دین میں کیا فرق ہے؟ لیکن ان ساری عقلی توجیہات کو چھوڑ کر قرآن حکیم نے ایک ہی تکسالی جواب دیا:-

وَأَخَلَّ اللَّهُ الْبَيِّنَ وَخَرَّمَ الْتِرِبَةَ الْبَقَعَةَ : (۲۰۵)

”حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام کر دیا“

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں سے ایک چیز کو حلال اور ایک کو حرام کر دیا تو اب تمہیں عقلی دلیلیں طلب کرنے کی گنجائش نہیں، تمہارے لئے دونوں کے درمیان یہی فرق کیا کم ہے کہ اللہ نے دونوں کا حکم یکساں نہیں رکھا، بلکہ ایک کو جائز اور دوسرے کو ناجائز قرار دیدیا ہے،

قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ دیلوں مقامات پر ذکر فرمایا ہے، اس واقعہ میں نہ کوہرہ کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی تھی کہ ”میں آدم سے بہتر ہوں“ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو کھیرتے ”غور فرمایتے کہ غالص اور آزاد عقل کے نقطہ نظر سے اس دلیل میں کیا خرابی تھی؟ لیکن یہی ”عقلی دلیل“ ابلیس کے راندہ درگاہ ہونے کا سبب بن گئی، وجہ وہی تھی کہ واضح اور صریح حکم آجائی

کے بعد اس کے خلاف عقل کی پسروی درحقیقت عقل کی نہیں خواہشات کی غلامی ہر شاعر مشرقی علامہ اقبال نے یہی بات بڑے لطیف پیرا یہ میں کہی ہے ۵
صیحہ ازل یہ مجھ سے کہا جو تسلیم نہیں ہے چو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
۵۔ قرآن و سنت کی تعبیر کا صحیح طریقہ

اور جب انسان کا قریضہ احکام اُتھی کا اتباع ہے تو اس کا صفات اور سادہ طریقہ یہ ہر کہ قرآن و سنت کا جو حکم صریح اور واضح ہو اسے اپنے واضح معنی میں ہی خستیار کیا جائے، اور مغضن اس بناء پر اس میں تو ڈرم و ڈر اور تاویل میں تحریف کا ارتکاب نہ کیا جائے کہ یہ واضح معنی ہمارے نفس کو پسند نہیں آ رہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب نہ کیا جائے کہ لئے تازل فرمائی ہے، اور اس لئے تازل فرمائی ہر کہ اس کے احکام کا اور اس کم مغضن اپنی عقل سے نہیں کر سکتے تھے، لہذا اس کی تشریح و تفسیر میں اگر ہم اپنی خواہشات کی بناء پر دراز کار تاویلات خستیار کریں گے، تو یہ اُن احکام کا نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا اتباع ہو گا، اور اس سے کتاب اُتھی کام مقصید نہ ہو یہ تلپیٹ ہو کر رہ جائے گا،

قرآن کریم کا معاملہ توانہتائی ارفع داعی ہی خود انسانی ذہن کے تراش ہوتے قوانین کا حال یہ ہے کہ جب پاریمنٹ کوئی قانون منظور کر لیتی ہے تو نج کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اس قانون کی لفظی پیروی کرے، اگر لے اپنے علم اور سمجھیے کی روشنی میں وہ قانون غلط معلوم ہوتا ہو تب بھی وہ اس کے اتباع پر مجبور ہو، اور اس کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہر کہ اپنی ذاتی راستے کی بنیاد پر قانون کی ایسی تعبیر و تشریح کرے جو اس کے الفاظ اور عبارتوں کے لحاظ سے دراز کار ہو، موجودہ "اصول قانون" میں ایک مستقل بحث "تبیر قانون" اسے متعلق

Interpretation of statutes.

ہوتی ہے، اس بحث کا خلاصہ ڈاکٹر جاچ پسٹن کے الفاظ میں یہ ہے :-
"انگریزی مقدمات میں تبیر قانون کے تین بنیادی اصول تجویز کئے گئے ہیں

پہلا اصول لفظی اصول کہلاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قانونی دفعہ کا مطلب واضح ہو تو ہر حال میں اسی پر عمل کیا جائے گا، تابع خواہ کچھ ہوں؛ دوسرا اصول "سہرا اصول" ہملا تا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قانون کے الفاظ کو بہشتہ اُن کے عمومی معنی پہنانے سے جاتی ہے گے، تا اقتیکار ایسا کرنے سے کوئی اہمال یا قانون کی باقی دفعات سے واضح تضاد پیدا نہ ہوتا ہو، تیسرا اصول "فسادی اصول" (Mischief Rule) ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس قانون کی عمومی پالیسی کیا ہے؛ اور کس خرابی کو کرنا اس کے پیش نظر ہے۔

آگے اس تیسراے اصول کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

"یہ نظریہ کہ پارلیمنٹ کی نیت اور اس کے مقصد کی نیز دی کری چاہئے، ہمیں (الفاظ قانون سے) زیادہ درستگانہ کی گنجائش نہیں دیتا، کیونکہ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے کہ رب عییر قانون کے وقت پارلیمنٹ کی داخلی نیت۔"

ر. **Subjective Intention** (پر غرضیں کیا جاسکتا، بلکہ

پارلیمنٹ کی نیت بھی لازماً اس کے وضع کردہ قانون سی سے نکالی جاتی ہے)

یہ اس قانون کا حال ہے جسے انسانی ذہن جنم دیتا ہے، اور جس کے بارے میں تپین کے الفاظ میں خود ماہرین قانون کا اعتراض یہ ہے کہ:-

"یہ سمجھنا بالغ ہو گا کہ انسان اپنے ہر عمل کی کوئی معقول وجہ رکھتا ہے، اس

کے بجائے ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ہم کوئی کام پہلے کر لیتے ہیں اور سوچتے

بعد میں ہیں، ہمارا یہ طرزِ عمل صرف اسی قسم کی صورتِ حال سے مخصوص ہیں

جب ہم کسی تیز رفتار کا سے اپنی جان بچانے کے لئے چھلانگ لگاتے ہیں،

بلکہ یہ طرزِ عمل بسا اوقات اس وقت بھی ہوتا ہے، جب ہم معاشرتی رسماں و

عادتاً کو جنم دیتیں، بلکہ اگر کسی ادارے یا قانون کی تشكیل کے وقت کوئی معقول پالیسی پہلے سے متعین رہی ہرتبھی ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ قانون کا حاصل ہونے والا نتیجہ اُس مقصد سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کی خواہش نے وہ قانون بنوایا تھا۔^{۱۰}

لیکن ایک نجی یہ جاننے کے باوجود کہ قانون کے موجودہ طھاپخ سے اس کے مطلوبہ تباہ حاصل نہیں ہو سکتے، اُسی قانون کی لفظی پسیر دی پر مجبور ہری ادارے دراصل کا تاباریا گھڑ نے کا حق حاصل نہیں، خواہ وہ اس کی نظر میں مطلوبہ تباہ سے زیادہ قریب ہوں بلکہ بقول پیشمن : -

”اگر کہیں غیر منصفانہ قوانین نافذ ہوں تو چیلچر قانون ساز ادارہ تو ایکی مسروخ کر سکتا ہے، لیکن نجی پر ایسے قانون کی پریدی لازم ہے، خواہ وہ اس قانون کے اصولوں کو کتابی ناپسند کر تا ہو۔“

کیونکہ نجی وحقیقت قانون ساز نہیں، بلکہ شارح قانون ہے، اس کا منصب قانون وضع کرنا نہیں، بلکہ قانون کا اتباع کرنا ہے، اور وہ قانون کی تشریح بھی اپنی حدود میں رہ کر کر سکتا ہے، جو ”اتباع“ کے دائرے میں سما سکتی ہوں، اسے ”اتباع“ کی حدود پھلا لگ کر ”اصلاح و ترمیم“ کے منصب پر پہنچ جانے کا اختیار نہیں ہے، یہ حال انسان کے بناءے ہوتے اُن قوانین کا ہے جن میں فکری غلطیوں کے ہزار امکانات موجود ہیں، جن میں نہ قانون سازوں کی امانت و دیانت شک رشبہ سے بالآخر ہوتی ہے، نہ اُن کی عقل و فکر کو غلطیوں سے پاک کہا جا سکتا ہے، اور نہ اس بت کی کوئی ضمانت ہے کہ اسخوں نے واقعہ اس قانون کے تمام ممکنہ تباہ پر کماحة غور کر لیا ہو گا،

پھر یہ ان انسانوں کے بناءے ہوتے اُن قوانین میں جھیں آنے والے دن کا بھی کچھ

پتہ نہیں کہ وہ حالات میں کیا تبدیلی لے کر بودار ہو گا اور نہ اس بات کا کوئی علم ہر کہ ہمارے مطلوبہ تباخ اس قانون سے حاصل ہو سکیں گے یا نہیں؟

جب محسن قیاسات اور تجھیں کے اندر ہیروں میں بنے ہوئے قوانین کا اتباع اس درجے میں لازم ہے تو وہ خالق کا نشان جس کے علم صحیح سے مربوط دفات کا کوئی ذرہ مخفی نہیں جو زمانے کے تمام بدلنے ہوئے حالات سے پوری طرح باخبر ہے جو انسان کے نفع و نقصان اور اس کی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے، اس کے بناء ہوئے قوانین میں محسن اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر دواز کار تا دیلات تلاش کرنا آخر کونسی عقل، کوئی دیانت اور کوئی نسافات کی رو سے درست ہو سکتا ہے؟

۶۔ زملے کی تبدیلی اور احکام شرعیہ

پھر ہیاں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا بھی ضروری ہے، آجکل یہ بات تصریبیا ہر "جدت پسند" کی زبان پر رہتی ہے کہ کسی بھی نظام قانون کو جامد (Static) ہمیں ہونا چاہیے، بلکہ حالات کے لحاظ سے تغیر پذیر (Dynamic) ہونا چاہیے، اور یہ بات "جدت پسند" زہن کی خاصیت ہے کہ اس کی نظر میں جب کوئی چیز بڑی قرار باتی ہے تو وہ ہر حال میں سرتاپا بڑی ہوتی ہے، اور اس کا نام ہی گالی بن جاتا ہے، اور جب کوئی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے تو وہ ہر حال میں سراپا خیری خیر قرار باتی ہے، اور جگہ بے جگہ اس کا استعمال ایک فیشن بن جاتا ہے، یہی حال جلد (Static) اور تغیر پذیر (Dynamic) کی اصطلاحات کا ہے کہ اول الذکر کی بڑائی کرنا، اور متاخر الذکر کی تعریف کرنا آج کا علمی فیشن بن چکا ہے، اور جس "جدت پسند" کو دیکھئے، دنیا کی ہر چیز میں "جامد" اور "ناقابل تغیر" کے نام سے منہ بنانے اور "تغیر پذیر" کے نام سے خوش ہونے کا عادی بن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ مغرب کے فکری نظام میں کوئی بڑے سے بڑا اخلاقی یا دینی اصول ناقابل تغیر باتی نہیں رہا، بلکہ انہوں نے زندگی کی ہر چیز کو "تغیر پذیری" کی خراد پر گھس دیا ہے، اور اس کی دست بر دست سے نہ کوئی دینی عقیدہ محفوظ ہو اور نہ کوئی اخلاقی اصول صحیح سالم رہا ہے،

حال نکد واقعیہ ہے کہ نہ ہر جیز کا ہر حال میں "نماقابل تغیر" رہنا انسانیت کے لئے مفید ہے اور نہ ہر جیز کا ہر حال میں "تغیر پذیر" رہنا، انسان کو اس دنیا میں اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے چنان اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کرتا رہے وہاں اس بات کی بھی شدید ضرورت ہے کہ اس کے پاس کچھ اصول و احکام ہر حال اور ہر زمانے میں آن بہت اور نماقابل ترمیم ہوں، اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان میں تبدیلی نہ کر سکے، ورنہ اس کی بھی اور نفسانی خواہشات "زمانے کی تبدیلی" کی آٹلے کر اس کو شر و فساد و اخلالی دیوالیہ پن کی اس آخری سرحد تک پہنچا سکتی ہیں جہاں وہ "انسانیت" کے ہر جامے سے آزاد ہو کر جانوروں کی صفت میں شامل ہو جائے، اگر دنیا کے ہر فکری اصول، ہر اخلاقی صنایطے اور ہر قانونی حکم کو "تغیر پذیر" قرار دے کر جب جی چاہے بدلتے ہیں کی آزادی ہو تو اس کا انجام اُس حنلالق باختی، انسانیت کوئی اور اضطراب و ہجینی کے سوا ہوئی نہیں سکتا، جو ہمالئے زمانے میں مغربی معاشرے کا مقدار بین چکی ہے اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ تمام فکری اصول اور قانونی احکام قابل ترمیم و تغیر نہیں ہونے چاہیں، بلکہ کچھ احکام لیے بھی رہنے ضروری ہیں جو کسی حال تبدیل نہیں تو اب صرف مسئلہ باقی رہ جاتا ہے کہ قانون کے کوئی احکام کو نماقابل تغیر قرار دیا جاؤ اور کوئی احکام کو قابل تغیر؟ اگر اس مسئلے کو "عقل خالص" کے حوالے کیا جائے تو اس کی نارسانی کا مفصل حال آپ سچیہ دیکھ چکے ہیں، اس کے علاوہ اس مسئلہ کو "زی عقل" کے حوالہ کر کے آپ کبھی ایسے نماقابل تغیر اصول و احکام حاصل نہیں کر سکتے، جو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان متفق علیہ ہوں، کیونکہ دنیا میں ہر شخص کی عقل کا فیصلہ اور سوچ کے نتائج رو سرے سے مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ ایک شخص یا جماعت کسی ایک اصول کو نماقابل تغیر قرار دے گی اور دوسرًا شخص یا جماعت کسی دوسرے اصول کو اور مسئلہ جوں کا توں باقی رہ گا، لہذا اس مسئلہ کا حل بھی جیز اس کے کوئی نہیں کہ جن ذات نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو انسان کی تمام

واقعی ضروریات سے بھی باخبر ہے اور اس کے نفس کی چوریوں سے بھی آگاہ ہے، اسے اس معاملے میں رہنمائی طلب کی جاتے، اور اس سے رہنمائی طلب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے سمجھیے ہوئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اشارات کی طرف رجوع کیا جاتے، جو بالترتیب قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہیں جب ہم قرآن کریم اور احادیث مبسوٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم فاضح طور سے نظر آتا ہے کہ ان میں بعض احکام صراحت و دضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اور بعض احکام میں ان دونوں نے محض چند موٹے موتے اصول بیان کرنے پر استفایہ فرمایا ہے، اور ان کی جزوی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں، قرآن کریم کے ارشادات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت چونکہ کسی خطے یا زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے عام ہے، اس لئے جن احکام پر زمانے کی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اُن کو قرآن و حدیث میں صراحت و دضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اور بعض اوقات اُن کی جزوی تفصیلات بھی معمین فرمادی گئی ہیں، اس کے برعکس جو احکام زمانے کی تبدیلی سے متاثر ہو سکتے تھے قرآن حدیث نے اُن کی جزوی تفصیلات معین کرنے کے بجائے کچھ عام اور ہمگیر اصول بیان فرمادیے ہیں، جن کی روشنی میں ہر ذور کے اہل علم جزوی تفصیلات معین کر سکیں،

لہذا قرآن و حدیث میں جو احکام منصوص ہیں اور جن پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے وہ قطعی طور پر ناقابل تغیر اور ہر دور کے لئے واجب لعمل ہیں، سیونکہ اگر زمانے کے بدلتے سے اُن میں فرق پڑتا تو اسکی قرآن و حدیث میں منصوص نہ کیا جاتا، ہاں جو احکام قرآن و سنت میں منصوص نہیں ہیں، اور نہ اُن پر امت کا اجماع منعقد ہوا ہے اُن میں قرآن و سنت کے بیان گزدہ اصولوں کے مطابق قیاس و اجتہاد کی گنجائش ہے، اسی قسم کے احکام پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی ہے، اور ایسے ہی احکام کے باسے میں فہما، کایہ مقولہ ہے کہ:

الاَحْکَامُ تَغْيِيرٌ بِتَغْيِيرِ الزَّمَانِ

اَحْكَامُ زَمَانِيَّةٍ كَيْ تَبْدِيلٍ سَعَى بَدْلَتْ رَهْبَتْهُ بَيْنَ

درست اگر قرآن و سنت کے واضح اور صریح احکام میں بھی زمانے کی تبدیلی سے ترمیم تغییر کی گنجائش ہوتی تو ایش تعالیٰ کو آسمانی کتاب نازل کرنے اور پیغمبروں کو مبعوث فرمانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، لیکن ہمیں یہی حکم کافی تھا، کہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عقل سے احکام وضع کر لیا کرو، لہذا جو شخص قرآن و سنت کے صریح اور واضح احکام سننے کے بعد بھی ”زمانے کی تبدیلی“ کا عذر پیش کرتا ہے، ایسا زمانے کی تبدیلی، کی بنیاد پر قرآن و سنت کے واضح احکام دو من مانے معنی پہنانے اور ان میں ترمیم و تحریف کے لئے تیار رہتا ہے، وہ آسمانی کتابوں کے نزول اور ان بیانات علیہم السلام کی بعثت کے بنیادی مقصود تک سے بے خبر ہے،

۷۔ زمانے کی تبدیلی کا مطلب

پھر یہاں ”زمانے کی تبدیلی“ کا مطلب سمجھ لینا بھی ضروری ہے، زمانے کی جو تبدیلی احکام شرعیہ پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ تبدیلی سچے جس سے حکم کی علت بدل جائے، مثلاً ہمارے قدیم فہما، نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گھوڑا کرایہ پر لے اور گھوڑو کے مالک سے پہنچنے کرے کہ کتنی دراس پر سفر کرنا ہے اور اس کی کل اجرت کیا ہوگی، تو یہ اجارہ فاسد اور ناجائز ہے، لیکن آج جبکہ میٹرو ای ٹیکسیاں ایجاد ہو چکی ہیں تو یہ حکم باقی نہیں رہا، آج لوگ ٹیکسی میں بلٹھنے سے قبل ڈرایور سے کوئی معاملہ نہیں کرتے، اور فرلقین میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سفر کی مجموعی اجرت کیا ہوگی، لیکن اس کے باوجود یہ اجارہ جائز اور درست ہے، وجہ یہ ہو کہ پہنچنے والے کے فہما، نے جو مسئلہ بیان کیا تھا اس کی علت خود ابھی کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ اجرت طے نہ ہونے کی صورت میں فرلقین کے دریان جھگڑے کا قوی امکان تھا، اب لہ علت کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے گزشتہ قریبی صفحات میں عنوان ”حکمتوں پر حکم کا مدار نہیں ہے“، ضرور ملاحظہ فرمائیا جائے،

زمانہ بدل گیا اور میطروں کی ایجاد کے بعد عرف عام یہ ہو گیا کہ میٹر جو اجرت بتا دیتا ہے اس پر فرقیین متفق ہو جلتے ہیں، اس لئے جھگڑے کا وہ قوی امکان باقی نہیں ہا جو معاملہ کے ناجائز ہونے کی علت تھا، چنانچہ زمانے کی اس تبدیلی سے حکم بھی بدل گیا اس کے بر عکس جہاں حکم کی علت برقرار ہو دہاں محسن زمانے کے عام چلن کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، اسلام میں اس اصول کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کہ زمانے میں جس جس براہی کار راج پھیلتا جاتے اس کو جائز و حلال اور جس جس شکی کو لوگ چھوڑتے جائیں اُسے خیفرزوری قرار دیتے جاؤ، کیونکہ اس فسکست خود رہ ذہنیت کی تاں بالآخر اُسی "خواہش پرستی" پر جا کر ٹوٹتی ہے جس سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا ہے اور جس کی غلامی سے نجات دینے کے لئے سر در کو نین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں،

۸۔ عقل کا صحیح دائرہ کار،

ند کو رہ بحث کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ جو احکام قرآن و سنت میں منصوص ہیں ان کے بارے میں زمانے کے کسی مرد جب نظر یا اہل زمانے کے عام چلن سے مرعوب و متأثر ہو کر عقلی گھوڑے دوڑانا اور قرآن و سنت کو توڑو ڈر کر ان میں دوزا ز کارتادیلات تلاش کرنا یا زمانے کی تبدیلی کا غریبی کرنا کسی طرح درست نہیں، کیونکہ قرآن و سنت میں جو احکام منصوص ہیں وہ ایسے ہی ہیں جن پر زمانے کی تبدیلی سے کوئی حقیقی اثر نہیں پڑتا، خواہ زمانے کے شور و شغب اور خواہشات کی رُدنے ایخیں کتنا ہی اجنبی اور اجنہ بناویا ہو، لہذا ایسے مواقع پر "عقلی تاریلا" کو احکام شرعیہ میں وخل دینا درحقیقت عقل سالم کا ہنسیں بلکہ اُس "عقل" کا انتہاء ہے جو خواہشات نفس کی غلام ہوتی ہے، اور جس کے بارے میں تفصیل سے غرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا نتیجہ بدترین مگر اسی اور انسانیت، اخلاق اور شرافت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں،

حقیقت یہ ہے کہ خود "عقل سالم" ہی کا تفاسایہ ہو کہ انسانی دماغ کی حدود

کو سمجھانا جاتے، اور اس پر وہ بوجھ نہ ڈالا جائے جس کا وہ محمل نہیں ہے، اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کی صلاحیت کی کچھ حد دیہیں، جن سے آگے وہ کام نہیں ہیتی، "عقل" بھی اسی کائنات کا ایک حصہ ہے، اور اس کی صلاحیتیں بھی غیر محدود ہیں، میں، اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنی حقائق و احکام کی طرف انسان کی رہنمائی فرمائی ہے، جن کے درآک میں عقل ٹھوکریں لکھتا تھی، لہذا ان آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام کی صراحتوں کے مقابلہ میں عقتوں کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمد ہو اپنی تجہاز کے الجن کو ریل گاڑی کے اصولوں کے مطابق ٹیکست کرنا سفر درع کریے،

آخر میں یہ بات وہ نہیں کر لینا بھی ضروری ہے کہ مذکورہ بالاجھٹ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو کہ قرآن و سنت پر ایمان لانے کے بعد عقل کا کوئی کام باقی نہیں رہتا، وجہ یہ ہے کہ انسان کو زندگی میں جن کاموں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے ایسے افعال بہت کم میں جنہیں شریعت نے فرض و اجنب یا مسنون مستحب یا حرام و مکروہ قرار دیا ہے، اس کے مقابلے میں ایسے افعال بے شمار ہیں جنہیں مباح "قرار دیا گیا ہے، یہ "مباحات" کا دائرہ عقل کی وسیع جو لانگاہ ہے، جس میں شریعت کوئی مداخلت نہیں کرتی، ان "مباحات" میں سے کسی کو اختیار کرنا اور کسی کو حبہ دینا عقل ہی کے سپرد کیا گیا ہے، اس وسیع جو لانگاہ میں عقل کو سیتعال کر کے انسک ماؤں ترقی اور سائنس فک انسکشافات کے باہم عروج تک بھی پہنچ سکتا ہے، اور ان ترقیات و انسکشافات کا صحیح فائدہ بھی حاصل کر سکتا ہے، اس کے بر عکس احکام ایسیہ میں دخل اندازی کرنے کا نتیجہ اس کے سر اور کیا انکھا ہے کہ سائنس اور مکنہ لوجی کی ترقی جن کو انسانیت کیلئے باعثِ رحمت ہونا چاہئے تھا، اُن کا نہ صرف صحیح فائدہ انسان کو حاصل نہیں ہو رہا، بلکہ بسا اوقات وہ انسان کے لئے ایک عذاب کی صورت اختیا کر گئی ہیں، یہ تمام ترتیج ہے اسی بات کا ہو کہ "عقل" پر وہ بوجھ لا دیا گیا ہے جو اس کی برداشت سے باہر تھا، اور جس کا تحمل انسان سے وحی الہی کے مکمل اتباع کے بغیر

ہوئی نہیں سکتا،
فلسفہ تاریخ کے مشہور امام علامہ ابن خلدونؓ نے اس سلسلے میں بڑی نفیس است
لکھی ہے، فرماتے ہیں :

فَالْحِسْنُ أَدْرَاكَ وَمِنْ رِكَاتِكَ فِي الْحُصُنِ، وَاتَّبَعَ مَا أَمْرَكَ الشَّارِعُ
مِنْ اعْقَادِكَ وَعَمَلَكَ، فَهُوَ حِرْصٌ عَلَى سَعَادَتِكَ، وَاعْلَمُ
بِمَا يَنْفَعُكَ لَانَّهُ مِنْ طُورِ فُرْقَةِ أَدْرَاكَ وَمِنْ نَطَاقِ اَوْسَعِ
مِنْ نَطَاقِ عَقْلِكَ وَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِيرٍ فِي الْعُقْلِ وَمِنْ أَرْكَهُ
بِلِ الْعُقْلِ مِيزَانٌ صَحِيحٌ، فَإِحْكَامُهُ بِيَقِينِيَّةٍ لَا كَذِبَ فِيهَا
غَيْرَ إِنَّكَ لَا تَطْمِعُ أَنْ تَزَنَ بِهِ أَمْوَالُ التَّوْحِيدِ وَالْأُخْرَى وَحَقِيقَةُ
النَّبِيَّ وَحَقَائِقُ الْفَضَّلَاتِ الْإِلَمِيَّةِ وَكُلُّ مَا وَرَاءَ طُورِهِ، فَإِنَّ
ذَلِكَ الْمُبْهِبُ فِي مَحَالٍ، وَمَثَالُ ذَلِكَ مَثَالُ رَحْلَةِ رَأْيِ الْمِيزَانِ
الَّذِي يَوْزِنُ بِهِ الْحَلْبَ، فَيُطَمِّعُ أَنْ يَزَنَ بِهِ الْجَبَالُ، هُلْ أَ
لَا يَدِرُكُ عَلَى أَنَّ الْمِيزَانَ فِي الْحُكَمَاءِ غَيْرِ صَادِقٍ،
لَكِنَّ الْعُقْلَ يَقْتَعِنُ عَنْهُ وَلَا يَتَعْدَى طُورَهُ،

”ہذا تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصہ کر دیتے ہیں خطوار سمجھو، رجو کچھ ہم
جانتے ہیں تمام موجودات ان میں مخصوصیں، اور شارع علیہ السلام کے بتائے
ہوئے اعقاوات اور اعمال کا اتباع کرو، یکونکہ وہ تم سے زیادہ تھمارے
بھی خواہ اور سود و بہرہ کو سمجھنے والے ہیں، ان کا علم تھمارے علم سے بلند اور یک
ذریعے سے حاصل ہونے والا ہے جو تھماری عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے،
اور یہ بات عقل اور اس کی معلومات کے لئے کوئی عیوب نہیں ہے، بلکہ عقل
و رحقیقت ایک صحیح میزان ہی، جس کے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں“

لہ مفتدرہ ابن خلدونؓ ،

یکن یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توحید و آخرت کے امور نبوت و صفات آنکھیں یا کہی لورا ایسی چیز کا دزن کرنے لگو جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص سوتا تو نئے کا کاشاد بیکھ اور پھر اس سے پھاڑ دیں کوئی خواہ کرنے لگے ہنا ہر ہے کہ (جب اس میں پھاڑ دیں سکیں تو) یہ نہیں کہا جائے گا کہ ترازو و جبوٹی ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ہر میزان کی ایک حد ہوتی ہے، جس سے آگے وہ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح میزان عقل بھی ایک خاص موقع پر ٹھہر جاتی ہے، اور اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ ۔ ۔

اسی طرح فتر آن دستت نے بہت سی باتیں خود بیان کرنے کے بجائے فہما کے اجتہاد واستنباط پر چھوڑ دی ہیں، چنانچہ جو لوگ اس کام کے اہل ہوں، ان کے لئے قرآن دستت اور اصول شریعت کی روشنی میں احکام کا استنباط عقل کے ساتھ معاں کا دوسرا بڑا میدا ہے، جس میں ہر زملنے کے فہما برطیع آزمائی کرتے رہے ہیں، یعنی قرآن دستت کی صراحتوں کو چھوڑ کر یا اصول شرعیت کو پایاں کر کے محض عقل کی بنیاد پر قرآن دستت میں تو مذہرو طریکی کو روشن سونے کے کامنے سے پھاڑ دیں کو تو نئے کے مراد فہم ہے، آخر میں اس بحث کو ہم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی

رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں : -

”یہ منشاء ہرگز نہیں کہ فکر وہ ہے تندلائی ایک عرض عجیث اور لفظ چیز ہے، یا اس سے تعزیز کرنا کوئی شرعاً گناہ ہے، لیکن ہاں؛ کسی فرد بشر کے داسطہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقلی شخصی اور فکر ناقص کو اصل اصول ٹھہرا کر اپنی رعلیہم السلام کے پاک و صاف، صحیح و صارق اور بلند و برتر تعلیمات کو زبردستی ان پر منتبط کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اس کا صنیر بھی خود اندر سے فعنیں کر رہا ہو، اس کے برخلاف، نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل فترار فی کر

اپنی عقلی معلومات کو ان کے تابع بنادے، اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امراضی روحانی کے حق میں اکسیر شفا تصویر کر کے سمعاً و طاعةً کہتا ہوا بلا جھٹ و تکڑا سراور آنکھوں پر رکھئے،

وَالذِّينَ رَجَعُوكُنْ فِي أَنَّهُ مِنْ بَعْدِ مَا أَسْتَحِبُ لَهُ حِجَّتَهُمْ
دَاهِشُونَ عَنْهُنَّ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضْبٌ وَلِهِمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ
”اور جو لوگ اللہ کے بالکے میں نبیؐ سے جھگڑا کرتے ہیں جبکہ آدمی اس کی با
قبول کرچکے تو ان کی جگت باطل ہو، اور ان پر خدا تعالیٰ کا غضب ہے، اور
آن کے لئے سخت عذاب لہ ہے یہ“

—بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ—

لہ العقل ولیعقل، مؤلفہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح صفحہ ۹۵، مطبوعہ
ادارہ اسلامیات، لاہور، ستمبر ۱۹۹۳ء

باب چہارم

قرآن اولیٰ کے بعض مفسرین

ہمارا ارادہ تھا کہ اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل اور مبسوط تاریخ بھی ذکر کی جائے، لیکن چند درجند و وجود کی بنا پر یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑتا، اس کے علاوہ اس موصوع پر مستقل کتابیں منظر عام پر آجھی پکی ہیں، لہذا علم تفسیر کی مکمل تاریخ کے جایے اس باب میں ہم صرف قرآن اولیٰ کے بعض ایسے مفسرین کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جن کے حوالے تفسیر کی کتابوں میں اہتمان کثرت سے آتے ہیں، مقصود یہ ہو کہ تفسیر کا مطالعہ کرتے وقت مندرجہ ذیل مباحث ذہن میں رہیں تو ان حضرات کے اقوال سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں انشا اللہ آسانی ہوگی،

حضرت عبداللہ بن عباس رضی یوں توصیہ کرائیں کہ ایک بڑی جماعت لیکن ان حضرات میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بطور خاص ایک امتیازی مقام حاصل ہے، اس کی بلیادی وجہ توبیہ ہے کہ ان کے حق میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم تفسیر کی مہارت کی رعایت فرمائی تھی، متعدد روایات میں وارد ہے کہ آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر یہ دعاء فرمائی تھا کہ :

اللَّهُمَّ فَقِهْهُ فِي الدِّينِ وَعَلِمْهُ الْمَوَالِيْلِ

تَيَاانِدُّ اللَّهُ اسْكُونِيْنَ كَمَّ عَطَافِرِيْمَا اُوْرَانِخِيْسِ تَفْسِيرِ قُرْآنِ كَمَا

عَلِمْ عَطَافِرِيْمَا

لہ مثلاً ملاحظہ ہو تاریخ القرآن و تاریخ التفیر تو لفہ پر و فیس عبد الصمد صارم صاحب،

اور ایک مرتبہ یہ دعا فرمائی کرے:-

اللهم بارک فیہ وَاشْرِمْنَهُ^{۱۰}

یَا اللَّهُمَّ أَنْ كُوْرَكْتُ عَطَافِرَا أَوْ رَانَ كَيْ ذَرِيعَ

عَلِمْ دِينِ كُوْعَامْ فَرِما

اور بعض روایات میں ہو کہ آپ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

نَعَمْ تَرْجِمَانَ الْقُرْآنِ أَنْ أَنْتَ

مُتَمَّمٌ قُرْآنَ كَرِيمَ كَيْ أَچْحَى تَرْجِمَانَ هُوَ

چنانچہ ان کو صحابہ کرام "ترجمان افتر آن" اور "البھر" رزبر دست عالم (اوہ "بھر" (دریائے علم) کے لقب سے یاد کرتے تھے، چنانچہ بڑے بڑے صحابہ کرام میں ان کی کم سی کے باوجود تفسیری معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کے قول کو خاص وزن دیتے تھے،

خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد میں نے انصار کے صاحب سے کہا کہ ابھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہبہ سے صحابہ بناتی ہیں، آؤ ہم ان سے (علم کی باتیں) معلوم کیا کریں، ان صاحب نے کہا: "کیا آپ کا خیال ہے کہ کسی وقت لوگ علم کے معاملہ میں آپ کے محتاج ہوں گے؟" جو اس وقت کی تیاری ابھی سے کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے میری تجویز منتظر نہ کی، اور میں نے تھنا یہ کام ضرورع کر دیا، کہ صحابہ کے پاس جاتا اور ان سے علم کی باتیں معلوم کرتا رہا، اگر مجھے کسی شخص کے حوالہ سے کوئی حدیث پہنچتی تو میں اُس کے دروازے پر پہنچ جاتا، معلوم ہوتا کہ در پہر کے وقت آرام میں ہیں تو میں اپنی چادر کو تکیہ بناتا کروئیں دروازے

له الاصابه، للحافظ ابن حجر، ص ۲۲۳ ج ۲

له الاتقان ص ۱۸۷ بحول الحلية الاولياء لابي نعيم

له أيضًا بحوله مذكور،

پر بیٹھ رہتا، ہوا کے جھکڑا میرے چہرے پر مٹی لا لکڑ لاتے رہتے، جب وہ صاحب باہر بکل کر مجھے دیکھتے تو کہتے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چڑا دبھائی! آپ کیوں تشریف لاتے؟ میرے پاس سیغام بحیج دیا ہوتا، میں آپ کے پاس چلا آتا! یہی جواب میں کہتا: «نہیں! یہ میرا فرض تھا کہ آپ کے پاس آؤں» چنانچہ میں اُن سے اس حدیث کے باعث میں پوچھتا رہیں (سلسلہ عصرم تک جاری رہا) وہ انصاری بزرگ (جنہوں نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کیا تھا) بعد میں کافی دن تک زندہ رہے، یہاں تک کہ انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا کہ لوگ میرے ارد گرد جمع ہیں، اور مجھے سے نوالات کر رہیں، اس وقت انہوں نے کہا کہ یہ تجویں مجھ سے زیادہ عقلم نہ تھا۔^۱

عبداللہ بن علی بن ابی رافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ ابو رافعؓ کے پاس آتے اور ان سے پوچھتے کہ فلاں ون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا تھا؟ اور ابن عباسؓ کے پاس ایک آدمی اور ہتاجوں (ابو رافع و کا جواب) لکھ لیتا تھا، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے پاس ہر وقت طلبہ علم کا جگہ تھا اگر رہتا تھا، اور آپ اُن کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر، احادیث، نبویہ اور فقہی مسائل وغیرہ بیان فرماتے رہتے تھے، اہنی وجہ کی بناء پر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو امام مفسرین، کہا جاتا ہے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں سب سے زیادہ روایات اہنی سے مردی ہیں،

البتہ اُن سے جو روایات مردی ہیں اُن کا ایک بڑا حصہ ضعیف بھی ہے، لہذا اُن کی روایات سے استفادہ کرنے انھیں اصول حدیث کی شرائط پر جا چنا

لہ الاصابہ، ص ۳۲۳ ج ۲، بحوالہ مسند وارثی و مسند حارث بن ابی اسامہ، مزید ملاحظہ ہو تذكرة الحفاظ للذہبی، ص ۳۸ ج ۱طبع دکن، لہ ایضاً بحوالہ مسند رؤیانی، لہ ملاحظہ ہو الاصابہ، ص ۳۲۵ ج ۲ والاستیعاب علی ہالمش الاصابہ ص ۳۳۲ ج ۲

حضرتی بے، اس سلسلے میں چند باتیں یاد رکھنے کی ہیں :-

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی روایات میں سب سے زیادہ قوی اور قابل اعتماد وہ روایات ہیں جو "ابو صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ" کے طریق سے مردی ہیں، امام احمدؓ کے زمانہ میں مصر میں حضرت ابن عباسؓ کی تفاسیر کا ایک مجموعہ اسی سند کے ساتھ موجود تھا، امام احمدؓ اس کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص صرف اسی نسخہ کو حاصل کرنے کا قدر لے کر مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی، یہ نسخہ تولید میں نایاب ہو گیا، لیکن بہت سے محدثین اور مفسرین نے اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں، چنانچہ امام بخاریؓ نے اپنی صحیح میں اس کی بہت سی روایات تعلیقائی ہیں، نیز حافظ ابن حجر روزگار، ابن ابی حمّام اور ابن المنذرؓ نے متعدد واسطوں سے بہت سی روایات اسی طریق سے نقل فرمائی ہیں، گولڈزیہر کا ایک معارض | یہاں ایک مخالفتی طرف توجہ دلانا مناسب ہو گا، مہمہور مستشرق گولڈزیہر Goldziher (نے اپنی کتاب "مذاہب تفسیر الاسلامی" میں حسب عادت یہ مخالفت انگیزی کی ہے کہ :-

"خود مسلمان ناقدين حدیث اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے وہ تفسیری اقوال خود نہیں سنتے جو انہوں نے اس کتاب میں ذکر کئے ہیں، خود اسلامی نقد حدیث کا یہ فیصلہ ابن عباسؓ کی تفاسیر کے اس مجموعہ کے پانے میں ہی جو سب سے زیادہ قابل قبول ہجھا جاتا ہے"

لیکن گولڈزیہر نے یہ ذکر نہیں کیا کہ نقد حدیث کے ماہر علماء نے جہاں یہ لکھا ہے کہ علی بن ابی طلحہ نے یہ تفسیری اقوال حضرت ابن عباسؓ سے نہیں سنتے، وہاں انہوں نے تحقیقیں کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ روایات علی بن ابی طلحہ نے کچھ مجابر سے لی ہیں،

لہ الاتقان، ص ۱۸۸ ج ۲ نوع نمبر: ۸

لہ مذاہب تفسیر الاسلامی از گولڈزیہر ترجیح عربی: دکٹر عبدالحیم الحنوار، ص ۹۸

اور کچھ سعید بن جبیرؓ سے، حافظ ابن حجرؓ فرماتے ہیں:-

بعد ان عرفت الواسطۃ و هي ثقۃ فلا ضیر في ذلك
جب یپن کا واسطہ معلوم ہو گیا، اور وہ ثقہ ہے، تو اب کوئی حرج
بات نہیں رہا۔

علی بن ابلی طلحہؓ کے اس طریق کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ کی روایات کے اور بھی متعدد صحیح
یا حسن طرق ہیں مثلاً أبو ثور عن ابن حریج عن ابن عباسؓ یا حجاج بن محمد عن
ابن حریج عن ابن عباسؓ یا قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر
عن ابن عباسؓ یا ابن اسحق عن محمد بن ابی محتسین عن عکرمة او
سعید بن جبیر عن ابن عباس وغیره (الاتفاق)

(۳) حضرت ابن عباسؓ کی جو روایات مندرجہ ذیل انسانیہ سے آئی ہیں وہ ضعیف ہیں:-
الف) محمد بن السائب الكلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ
اور جب کلبی سے محمد بن مروان السنّی الصغیر روایت کریں تو
اس سند کو محدثین سلسلہ الکذب قرار دیتے ہیں، مفسرین میں سے شعبی اور
واحدی نے اس سلسلے سے بکثرت روایات نقل کی ہیں،

(ب) ضحاک بن مزاحم عن ابن عباسؓ، یہ طریق اس لئے ضعیف
ہے کہ ضحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں، اور اگر ضحاک
سے روایت کرنے والے بش بن عمارہ عن ابی روق ہوں تو یہ سلسلہ
اور ضعیف ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بش بن عمارہ ضعیف ہیں، اور اگر ضحاک
سے روایت کرنے والے جو تیرہ ہوں تو اس کا ضعف اور زیادہ ہو جاتا ہے،
کیونکہ جو پر نہایت ضعیف ہیں،

(ج) عطیۃ العوف عن ابن عباسؓ، یہ طریق بھی عطیۃ العوف کے ضعف

کی بناء پر ضعیف ہے ابتدی بعض حضرات اُسے حسن کہتے ہیں، کیونکہ امام ترمذی نے عطیہ کی روایات کی تحسین کی ہے، اس مسئلہ پر مفصل بحث عطیہ الحنفی کے تذکرہ میں آرہی ہے،

(د) مقاتل بن سلیمان عن ابن عباس^{رض}، یہ طبع بھی مقاتل بن سلیمان^{رض} کے ضعف کی بناء پر بحدود ہے، مقاتل کا پورا الحال بھی آگئے آرہا ہے،

مروجہ تفسیر ابن عباسؓ کی حیثیت | "تغیر المقیاس فی تفسیر ابن عباسؓ" کے نام سے

شائع ہوئی ہے جسے آجکل عوماً "تفسیر ابن عباسؓ" کہا اور سمجھا جاتا ہے، اور اس کا ازوٰ ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں کیونکہ یہ کتاب محمد بن مروان اللہ تعالیٰ عن محمد بن السائب الكلبی عن ابن صالح عن ابن عباسؓ کی سند سے مروی ہے، اور پیچے گذر چکلہ کے کاس سے کو محذفین نے "سلسلۃ الکذب" (جھوٹ کا سلسلہ) قرار دیا ہے، لہذا اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا،

حضرت علیؑ تفسیر قرآن کے معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام اہم ترین بلند ہو، پہلے تین خلفاء کی وفات چونکہ جلدی ہو گئی تھی اس لئے اُن سے تفسیری روایات بہت کم مروی ہیں، اس کے برخلاف حضرت علی صَوْمَة دراز تک افادہ علم میں مشغول رہے، اس لئے اُن سے بہت سی روایات منقول ہیں، علم تفسیر میں اُن کے مقام بلند کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابو طفیلؓ کہتے ہیں:-

"میں نے حضرت علیؑ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا، وہ فرمائے تھے کہ....."

مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوالات کیا کرو، کیونکہ خدا کی قسم قرآن کریم

لہ یہ پری بحث الاتقان ص ۱۸۸ و ۱۸۹ ارج ۲ نوع نمبر ۸ سے ماخوذ ہے، مزید تفصیل کے لئے ان روایوں کا تذکرہ ملاحظہ فرمائی جو آگئے آرہا ہے، ۳۷۵ دیجھے تغیر المقیاس صفحہ اول،

کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ یہ رات کو نازل
ہوئی یادوں کو، میدان میں اُتری یا پہاڑ پر ۔ ۔ ۔

حضرت علیؑ نے چونکہ آخر میں کوفہ کو اپنا مستقر بنالیا تھا، اس لئے آپؐ کا علم زیادہ تر اسی
علاقوں میں پھیلا، اور آپؐ کی بہیشتر روایات اہل کوفہ سے مردی ہیں،

حضرت عبد اللہ بن مسعود رض حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بھی ان صحابہ میں سے ہیں
ہیں، بلکہ ان کی مردیات حضرت علیؑ سے بھی زیادہ ہیں احافظ ابن حجر رحمۃ وغیرہ نے
ان کا یہ قول روایت کیا ہے کہ:-

وَالذِّي لَا إِلَهَ غَيْرَهُ مَلَأَ الْأَرْضَ إِلَيْهِ مَنْ كَتَبَ اللَّهُ أَلَا وَإِنَّا
أَعْلَمُ فِيمَنْ نَزَّلْنَا مِنْ نَزْلَتْنَا وَلَوْلَا عِلْمُ مَكَانٍ أَحْدَى أَعْلَمُ
بِكِتابِ اللَّهِ مِنِّي تَنَاهَى الْمُطَّلِّبُ لِلأَتِيَةِ تَهْ

قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کہ کتاب اللہ کی جو آیت
بھی نازل ہوئی ہے، اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ کس شخص کے
بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھے کسی ایسے شخص کا
پتہ معلوم ہو جائے جو کتاب اللہ کو مجھے سے زیادہ جانتا ہو تو میں اس کے
پاس ضرور جاؤں گا، بشرطیکہ اس کی جگہ تک اونٹیاں جا سکتی ہوں ۔ ۔ ۔
مشہور تالیعی حضرت مسروق بن الاجدع رض فرماتے ہیں کہ:-

”حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ہمارے سامنے ایک سورت پڑھتے، اور د
کا بیشتر حصہ اس کی تفسیر میں اور اس کے بالے میں احادیث بیان کرنے
میں صرف فرمادیتے تھے تیہ“

اور حضرت مسروقؓ رہی کا قول ہو کہ میں نے بہت سے صحابہؓ کرامؓ سے استفادہ کیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ تمام صحابہؓ کے علوم پچھے آدمیوں میں جمع تھے:-
حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین، پھر میں نے غور کیا تو ان پچھے حضرات کے علوم و حضرات کے درمیان مخصوصیاتے، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ

حضرت ابی بن کعبؓ حضرت ابی بن کعبؓ بھی اُن صحابہ میں سے ہیں جو تفسیر اور قرآن کے علم میں معروف تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا:

اقرئ هم ابی بن کعبؓ

صحابہ میں شے بڑی قاری ابی بن کعبؓ ہیں

آپ کی جلالتِ قدر کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہ جیسے امام المفسرین نے آپ سے استفادہ کیا ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:-
عامة علها بن عباس من ثلاثة، عمر و

علی و ابی بن کعب،

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے مشیر علمون تین حضرات سے ماخوذ ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ پہلے مفسر ہیں، جن کی تفسیر کتابی صورت میں مرتب ہوئی، ان کی تفسیر کا ایک بڑا سخن تھا، جس کو ابو جعفر رازی ابو ربيع بن انس عن ابی الحاییہ روایت کرتے تھے، امام ابن جریرؓ، ابی حاتمؓ، امام

ملہ مقدمۃ نصب الرایۃ، لکھنوریؓ، ص ۳۷۱

ملہ تذکرۃ الحفاظ للذہبیؓ، ص ۳۸۷

احمد بن حنبل^{رض} اور امام حاکم^{رض} نے اس سے روایات لی ہیں، امام حاکم^{رض} کی وفات ۵۷۲ھ میں ہوئی، اس لئے یہ نسخہ پانچ سویں صدی تک موجود تھا۔^۱
 مذکورہ حضرات کے علاوہ حضرت زید بن ثابت^{رض}، حضرت معاذ بن جبل^{رض}، حضرت عبد اللہ بن عمر^{رض}، حضرت عبد اللہ بن عرفة، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم، حضرت جابر^{رض}، حضرت ابو موسیٰ اشعیٰ^{رض}، حضرت انس^{رض} اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیر قرآن کے سلسلے میں روایات منقول ہیں،

صحابہؓ کے بعد

صحابہؓ کرامؓ نے مختلف مقامات پر قرآن کریم کے درس کا سلسلہ جاری کیا ہوا تھا اُن کی تعلیم و تربیت سے تابعین کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی، جس نے علم تفسیر کو محفوظ رکھنے کے لئے نیاں خدمات انجام دیں، ان میں سے اُن چند حضرات کا مختصر تعارف درج ذیل ہے، جن کا حوالہ کتب تفسیر میں پہ کثرت آتا ہے،
 ۱) حضرت مجاهد^{رض} ان کا پورا نام ابو الحجاج مجاهد بن جبیر المخزومی^{رض} ہے، زادات ۲۱۳ھ
 وفات ۲۱۸ھ میں، یہ حضرت عبد اللہ بن عباس^{رض} کے خاص شاگرد ہیں، جن سے انھوں نے تیس مرتبہ قرآن کریم کا دوسری کیا ہے، اور تین مرتبہ تفسیر پڑھی ہے، تاداہ اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ

اعلم من بقی بالتفسیر^۲

”تفسیر کے جو علماء باتی ہیں اُن میں مجاهد^{رض} سبکے بڑے عالم ہیں“

۱) الائقان، ص ۱۸۹ ج ۲

۲) ان کے والد کا صاحب نام جبیر ربروز نصر^{رض} ہے، اور بعض حضرات جبیر ربروز^{رض} ریبر^{رض} بھی کہتے ہیں، (تہذیب الاسلام واللغات للنووی ص ۸۳ ج ۲)

۳) تہذیب التہذیب، ص ۳۳ ج ۱۰،

اوْرْ حَسِيفٌ؟ كَاوْلَ بَهْ :-

اعْلَمُهُمْ بِالْقَسِيرِ مُجَاهِدٌ
تَحْمِيلُ تَفْيِيرَ كَيْ سَبِيلٍ بَرَّ عَالَمَ بَيْنَ

کہا جاتا ہے کہ اُن کی تفاسیر کا ایک مجموعہ مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہے،
حضرت مجاہدؓ اگرچہ تابعین میں سے ہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نبھی اُن کی تدریجی
کرتے تھے، حضرت مجاہدؓ خود فرماتے ہیں:-

صَبَّتْ أَبْنَ عَمْرَوْ أَنِ ارْمِينَ اَنْ اَخْدِمَهُ فَكَانَ هُوَ
يَخْدِمُهُنَّ

میں حضرت ابن عمرؓ کی صحبت میں رہا، اور میں اُن کی خدمت
کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ میری خدمت کرتے تھے۔
چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ اُن کی رکاب پکڑ کر فرمایا:-
”کاش! کہ میرا بیٹا سالم اور میرا غلام نافع حافظہ میں
تم جیسے ہو جائیں“

حضرت مجاہدؓ کی دفات ۳۳ھ میں سجدہ کی حالت میں ہوتی، (البدایۃ رالہبایۃ
للبن کثیر، ص ۲۲۲ ج ۹)

۱۰) حضرت سعید بن جبیرؓ مشہور تابعی ہیں، اور انہوں نے حضرت عبداللہ
بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت انس بن مالک،
حضرت عبداللہ بن مخلصؓ، حضرت ابو مسعود البدریؓ جیسے صحابہ سے استفادہ کیا ہے،

۱۱) تذكرة الحفاظ للذہبی ص ۸۶ ج ۱ ترجیح ۸۳

۱۲) تاریخ التفسیر، از عبدالصمد صارم، ص ۸، مطبوعہ وصلی شہزادہ امام

۱۳) حلیۃ الاولیاء لابی نعیم، ص ۲۸۵ و ۲۸۶ ج ۳

۱۴) تہذیب الاصائر واللغات للنووی ص ۲۱۶ ج ۱

عبارت اور زہر میں معروف ہیں، رات کو نماز میں کثرت سے رونے کی بنابرائی بینائی میں نفس آ گیا تھا، حجاج بن یوسف شافعیہ میں شہید کیا جس کا واقعہ معروف ہے، انھوں نے خلیفہ عبد الملک بن مردان کی فرماں پر ایک تفسیر لکھی تھی، خلیفہ نے اس کو شاہی خزانہ میں محفوظ کرایا تھا، پچھے عصہ کے بعد یہ تفسیر حضرت عطاء بن دینار (متوفی ۱۴۹) کے ہاتھ آ گئی، چنانچہ وہ اس نسخہ کی بنابرائی اس تفسیر کی روایات کو حضرت سعید بن جبیرؓ سے مرسل اور ایت کیا کرتے تھے، لہذا عطاء بن دینارؓ سے حضرت سعید بن جبیرؓ کی جو روایات منقول ہیں وہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق "وجادہ" ہیں، اور زیاد قابل اعتماد نہیں ہیں،

حضرت سعید بن جبیرؓ کی بہت سی روایات مرسلاں ہیں، (یعنی ان میں صحابی کا واسطہ مخدود ہے) لیکن ان کی مراasil قابل اعتماد ہیں، حضرت یحییٰ بن سعیدؓ فرماتے ہیں کہ۔

"سعید بن جبیرؓ کی مرسلات مجھے عطا رأ اور جبایہؓ کی مراasil سے زیادہ پسند ہیں"

(۳) حضرت عکبرؓ یا عکمہ مولیٰ ابن عباسؓ کے نام سے مشہور ہیں، یہ بربادی غلام تھے حصین بن ابی الحار العبری نے انھیں بطور بدیہی حضرت ابن عباسؓ کو پیش کیا تھا، حضرت ابن عباسؓ نے ان کو انتہائی محنت سے تعلیم دی، اور انھوں نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت حسن بن علیؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عسرہؓ، حضرت عبدالرشد بن عمارؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت معاویہؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے بھی روایات نقل کی ہیں،

لہ حلیۃ الاولیاء، ص ۲۸۲ ج ۳ ترجمہ ۲۴۵

۲۷ تہذیب التہذیب ص ۱۹۸ و ۱۹۹ ج، ترجمہ عطاء بن دینار،

۲۸ ایضاً، ص ۱۲۳ ج ۳ ترجمہ سعید بن جبیرؓ،

۲۹ تہذیب التہذیب ص ۲۶۳ ج ۳،

عَلَمَهُ خُود فرماتے ہیں کہ میں نے چالینگ سال طلب علم میں گزارے ہیں لیکن چنانچہ انھوں نے
مصر، شام، عراق، اور افریقہ تک کے سفر کئے ہیں یعنی امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارے
زمانے میں کتاب اللہ کا کوئی عالم عَلَمَهُ سے بڑا باقی نہیں رہا۔ حضرت قادةؓ فرماتے
ہیں: ”تابعین میں چار آدمی سب سے زیادہ عالم تھے، عطا، سعید بن جبیرؓ، عَلَمَهُ
اور حسن بصریؓ“

بعض محدثین نے عَلَمَهُ پر کچھ اعتراضات بھی کئے ہیں، مشہور مستشرق گولڈزیہر نے اپنی اعتراضات

کو بھی انکے بناؤ کریتاً اثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے یہ مشہور
شاگرد بھی تفسیری روایات کے مقابلے میں ناقابل اعتماد ہیں، حالانکہ واقعی ہے کہ
محقق علماء نے ان اعتراضات کو پوری تحقیق و تفییش کے بعد رد کیا ہے، اس مسئلہ پر
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمۃ فتح الباری میں ہدایت مبسوط اور کافی و شافی بحث
کی ہے، انھوں نے ہی یہ بھی بتایا ہے کہ متعدد ائمۃ حدیث نے عَلَمَهُ کے حالات کی
تحقیق پر اور ان پر عائد کئے جانے والے اعتراضات کی تفییش کے لئے مستقل
کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں حافظ ابن حجر طبریؓ، امام محمد بن نصر مردزیؓ،
ابو عبد اللہ بن مندرؓ، ابو حاتم بن حبانؓ، اور ابو عمر بن عبد البرؓ جیسے حضرات شامل
ہیں یعنی اس کے بعد حافظ ابن حجر حلی بتایا ہے کہ عَلَمَهُ پر جو اعتراضات مذکور کو جائیں

۱۔ تذكرة الحفاظ للذہبی ص ۹۰ ج ۱

۲۔ البداية والنهاية لابن کثیر، ص ۲۳۵ ج ۹

۳۔ تہذیب التہذیب ص ۲۶۶ ج ۱، و مفتاح السعادة، ص ۳۱ ج ۱

۴۔ تہذیب التہذیب، حوالہ بالا،

۵۔ دیکھنے والا بہبی تفسیر الاسلامی اذ گولڈزیہر ترجمہ عربی ڈاکٹر عبد الجلیم البخار، ص ۹۵،

۶۔ ہدیٰ الساریٰ (مقدمۃ فتح الباری) للحافظ ابن حجر، ص ۱۹۲ ج ۲ فصل ۹ حرف العین،

اُن کا دار و مدار تین اعترافات پر ہی، ایک یہ کہ انہوں بعض غلط باتیں حضرت ابن عبیش کی طرف مسوب کر دی ہیں، دوسرا یہ کہ وہ عقیدۃ خارجی تھے، اور تیسرا یہ کہ وہ امراء و حکام سے انعامات وصول کر لیتے تھے،

جہاں تک اس تیسرا الزام کا تعلق ہے کہ انہوں نے امراء سے انعامات وصول کئے ہیں سو ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی بناء پر اُن کی روایات کو رد کر دیا جائے، رہے باقی دو اعترافات، سو حافظ ابن حجرؓ نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اُن میں سے کوئی الزام اُن پر ثابت نہیں ہوا، اس سلسلے میں جتنے قصے اُن کی طرف مسوب ہیں، حافظ ابن حجرؓ نے ان میں سے ایک ایک کو نقل کر کے اس کی مدل تردید یا توجیہ کی ہے، مثلاً اُن پر جھوٹ کا جزو الزام عائد کیا گیا ہے اس کا منشا، ایک غلط فہمی ہے، اور وہ یہ کہ بسا اوقات انہوں نے ایک حدیث درآدمیوں سے سُنی ہوتی تھی، ایک موقع پر وہ ایک شخص سے روایت کرتے، پھر کوئی اُسی حدیث کے بارے میں پوچھتا تو درست کر آدمی سے روایت کر دیتے، اس سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ یہ حدیث گھر طتے ہیں، حالانکہ درنوں مرتبہ اُن کی روایت و رست تھی، چنانچہ خود انہوں نے فرمایا ہے کہ:-

أَرَأَيْتَ هُؤُلَاءِ الَّذِينَ يَكْذِبُونَ مِنْ خَلْفِي، أَفَلَا
يَكْذِبُونَ فِي وِجْهِي؟

”بھلا یہ لوگ جو میرے پیچھے پیچھے میری تکذیب کرتے ہیں میرے سامنے
کیوں تکذیب نہیں کرتے؟“

مطلوب یہ ہر کہ اگر وہ میرے سامنے تکذیب کریں تو میں اُن کو حقیقت حال سے آگاہ کر دوں،

اسی طرح اُن پر خارجی ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے اس کے بالے میں حافظ ابن حجرؓ فرماتے ہیں کہ وہ کسی قابل اعتماد ذریعہ سے ثابت نہیں ہوا، البته ہوا یہ ہر کہ انہوں نے بعض جز دی (فقہی) مسائل میں ایسا مسلک اختیار کیا تھا جو خارجیوں کے مطابق

تھا، اس سے بعض لوگوں نے انھیں خارجیت کی طرف منسوب کر دیا، چنانچہ امام عجمیؒ فرماتے ہیں :

عکرمة مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما مکی تابعی
ثقة بربیع حمایرمیہ به انسان به من الحوریۃ
”عکرمه حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ ہیں، کم کے رہنے والے ہیں، ثقة
تابعی ہیں، اور لوگ اُن پر خارجیت کا جواز اذام لگاتے ہیں اسی بری ہیں“
اور حافظ ابن حجر الرضا فرماتے ہیں :“

اگر ہر دو شخص جس کی طرف غلط مذہب منسوب کر دیا گیا ہو اس نسبت
کی وجہ سے ساقط العدالت قرار دیا جائے گے تو اکثر محدثین کو چھوڑنا پڑے
کیونکہ اُن میں سے تقریباً ہر ایک کی طرف ایسی باتیں مفسوب ہیں جیسیں“
پسند نہیں کرتے“

یہی وجہ ہو کہ تقریباً تمام ائمۃ حدیث نے اُن سے روایات لی ہیں، امام بخاریؒ
جونقدر جان کے معاملے میں بہت سخت ہیں، اور انھوں نے مشتبہ روایوں تک کو چھوڑ دیا
ہے انھوں نے بھی اپنی صحیح میں اُن کی روایات نقل کی ہیں، امام مسلمؒ کی طرف منسوب ہو
کر وہ عکرمةؒ پر طعن کرتے تھے، لیکن انھوں نے بھی اپنی صحیح میں عکرمةؒ کی روایت متفروضاً
ذکر کی ہے، امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی گئی ہے کہ وہ عکرمةؒ کو ناپسند کرتے تھے،
لیکن خود انھوں نے موطاؑ کی کتاب الحجؑ میں عکرمةؒ کی روایت نقل کی ہے تھے، امام محمد
ابن سیرینؓ کے بالے میں بھی مشہور ہے کہ وہ اُن پر طعن کرتے تھے، لیکن خالد الحذاہؓ سے
مردی ہے کہ :

لاد یہ تمام اقوال حافظ ابن حجرؓ نے نقل فرمائے ہیں، تفصیل کے ملاحظہ ہو ہڈی الساری،
ص ۱۹۲ تا ۱۹۴ ج ۲ فصل نمبر ۹،
لکھ التاریخ الکبیر للبخاریؒ، ص ۲۹۹ ج ۲ ترجمہ نمبر ۲۱۸

ہر دہ حدیث جس کے بارے میں محمد بن سیرینؓ کی کہیں کو ثابت عن
ابن عباسؓ یعنی ابن عباسؓ کے یہ بات ثابت ہر دہ اخنوں نے
عکرمؓ سے سُنی ہوتی ہے، نام وہ اس لئے ہنہیں لیتے کہ وہ اخھیں
ذاتی طور پر ناپسند کرتے تھے۔

غرض تحقیقی بات یہی ہر کہ عکرمؓ کی روایات قابل قبول ہیں، اور اکثر ائمہ حدیث نے
آن کی روایات بے خوف و خطر ذکر کی ہیں۔

گولڈزیہر کا ایک معارض آخر میں گولڈزیہر کے ایک اور ضمنی مخالف طرف کی نشاندہی
عکرمؓ کی وفات ہوئی تو ان کے جنازے میں شریک ہونے والے اتنے بھی نہیں تھے
کہ ان کا جنازہ اٹھانے کے لئے کافی ہوں، دوسرا طرف اسی روز مشہور شاعر
کشیر عزّۃ کا انتقال ہوا تو اس کے جنازے میں قریشیوں کا ایک بڑا مجمع شریک تھا،
اس سے گولڈزیہر نے دنیجہ نکالے ہیں، ایک یہ کہ اُس زمانے میں عام مسلمانوں کے دل میں
ایک عوامی شاعر کا احترام حاملین سنت کے مقابلہ میں زیادہ تھا، اور دوسرا یہ کہ شرکاء
جنازہ کی اس کی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ ایک نسل غلام کو مرنے کے بعد بھی ایک اصل
عرب کے مقابلے میں حصہ سمجھتے تھے۔

یہ کہ گولڈزیہر کی یہ خیال آفرینی اسی بغرض و عناصر پر مبنی ہے جو ہر ٹھیکانی بات کو
قول کر کے اس پر یہ بنیاد خجالات کے محل تعمیر کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی،
واقعہ یہ ہو کہ اول تریہ قصہ ہی سرے سے فلط ہر کہ کشیر کے جنازے میں بڑا مجمع شریک
ہوا اور حضرت عکرمؓ کو چار اٹھانے والے بھی میسر نہ آتے، حافظ ابن حجرؓ فرماتے ہیں:-
فالذی نقل اکفم شهد ولجنازة کشیر و ترکوا عکرمہ

لہ البدایۃ والہنایۃ ص ۲۳۵ ج ۹ و صدی الساری، ص ۱۹۲ ج ۲

لہ مذاہب لتفیر الاسلامی، اد گولڈزیہر، ص ۹۵ و ۹۶

لحریثیت، لآن ناقله لم یستہ بلے

اُور یہ جو منقول ہے کہ لوگ کثیر سکے جنازے میں تو شریک ہوتے لیکن
مکرمہؐ کو چھوڑ دیا، یہ بات ثابت نہیں، اس لئے کہ یہ قصہ ایک مجہول
شخص نے بیان کیا ہے؟

اور اگر بالفرض عکرمہؐ کے جنازے میں واقعۃ لوگ کم شریک ہوتے ہوں تب بھی
جن حالات میں عکرمہؐ کی وفات ہوتی ہے اُن کے پیش نظر پچھے بعید نہیں، کیونکہ تمام
توایخ میں تصریح ہے کہ ایک عرصہ سے حکومت نے اُن کے خلاف گرفتاری کے احکام
جاری کئے ہوتے تھے، جن کی بنا پر وہ روپوش ہو گئے تھے، اور اسی روپوشی کی حالت
میں ان کا انتقال ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں لوگوں کو ان کی وفات کا پورا عمل
نہ ہو سکا ہو گا، اس لئے اُن کے جنازے میں شرکت زیادہ نہ ہو سکی، اس سے یہ تیجہ
کون عقلمند نکال سکتا ہے کہ لوگوں کے دل میں اُن کا احترام ایک شاعر سے بھی کم تھا؟
بلکہ صحیح تاریخوں میں تو یہ منقول ہے کہ جب لوگوں کو ان کی اور کثیرؐ کی وفات کا علم ہوا
تو عام لوگوں کی زبانوں پر یہ جملہ تھا کہ:-

مات أفقه الناس و اشعر الناس

أثر سبب بڑے فقیر کا بھی انتقال ہو گیا اور سب سے بڑو

شاعر کا بھی“

پھر مستشرقین کا یہ انداز تحقیق بھی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ایک چھوٹے سے غیر مستند
واقعہ کی بنیاد پر کس ڈھنائی لکھا بڑے بڑے عمری نتائج نکال لیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ
عوام کے دلوں میں ”حامیین سنت“ کا احترام جانچنے کے لئے صرف ایک حضرت عکرمہؐ
کا جنازہ سی رہ گیا تھا؟ اُن کے علاوہ جو لاکھوں ”حامیین سنت“ گزرے ہیں اُن کی زندگی

لے تہذیب التہذیب، ص ۲۰۳ ج ۲،

لے الہبیۃ والہبیۃ ص ۲۳۵ ج ۹،

اور وفات کے بے شمار واقعات سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی؟ اسی طرح غلامیں کے علماء کے ساتھ عام لوگوں کا سلوک معلوم کرنے کے لئے بھی ایک ہی قصہ ان کو تاریخ میں مل سکتا ہے! حضرت عکرمؓ کے علاوہ جو ہزار ہا غلام علم حاصل کرنے کے بعد شہرت و عزت کے باہم عروج تک پہنچ ہیں، اور خود حضرت عکرمؓ کو اپنی زندگی میں جو عزت و احترام لھیب ہوا اُن... واقعات سے اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہیں ملتی؟

حقیقت یہ ہے کہ کسی علیٰ کتاب میں مستشرقین کے اس قسم کے بے سر و پا الزامات کا ذکر کرتے ہوئے بھی جی متلا تاب ہے، لیکن یہ بات اس لئے ذکر کر دی گئی کہ آنحضرات کا معیار تحقیق اور انداز فکر و نظر بھی قارئین کے سامنے آجائے جو "تحقیق" کے نام پر اپنے بعض دسدار کے جذبات ٹھنڈے کرنے میں مصروف ہیں،

(۲) حضرت طاؤسؑ آنکا پورا نام ابو عبد الرحمن طاؤس بن گیسان الجیری الجندی ہے، یہ میں کے شہر جندر کے باشندے تھے، اور یہ بھی غلام تھے، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت زید بن ارشدؓ، اور دوسرے متعدد صحابہؓ نے علم حاصل کیا تھا، لیکن حضرت عائشہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور خلفتے راشدینؓ سے اُن کی روایات مُرسَل ہیں، یہ اپنے زمانے میں علم و فضل کے علاوہ عبادت و زبد میں بھی پہنچ ہوئے تھے، انہوں نے چالینگ حج کئے ہیں، امام زہریؓ فرماتے ہیں کہ "اگر تم طاؤسؑ کو دیکھتے تو یقین کر لیتے کر دہ جھوٹ نہیں بول سکتے" یہ عرب دین دینارؓ کا قول ہے کہ "میں نے لوگوں کے مال دردلت کے محلے میں طاؤسؑ سے زیادہ سی ریشم کوئی نہیں دیکھا۔"

لہ خود حضرت طاؤسؑ کے جنازے کا حال آگے آرہا ہے ایز آگے جن "حامیین سنت" کے حالات آرہے ہیں، اُن میں سے بیشتر غلام تھے،
لہ یہاں تک کے تمام اقوال تہذیب التہذیب، ص ۹۰۹۱ ج ۵ سے ماخوذ ہیں،

علامہ نووی[ؒ] لکھتے ہیں یہ اُن کی جلالتِ قادر، اُن کی فضیلت، دفعہ علم، صلاح و تقویٰ، قوتِ حافظہ، اور احتیاط پر علماء کا اتفاق ہے[ؒ] حافظاً بونعیم اصہانی[ؒ] جنے حلیۃ الادلیاء میں اُن کے صلاح و تقویٰ کے واقعات اور مظہروں کا تفصیل سے ذکر کئے ہیں، شتمہ مہ میں منی یا مزدلفہ میں اُن کی وفات ہوئی، جنازے میں ارکان حکمت سے میں گر علماء و علماء تک ہر طبقے کے افراد شریک ہیں، یہاں تک کہ جو تم کی وجہ سے غلیقہ کو پولیس یعنی پڑی، حضرت عبدالرشد بن الحسن بن علی بن ابی طالبؑ نے ان کا جنازہ مسلسل اپنے کاندھ سے پراٹھائے رکھا، یہاں تک کہ اُن کی ٹوپی گرگئی اور جا رہچکی گئی، ۵ حضرت عطاء بن ابی رباح[ؓ] تابعین کے دور میں عطا نام کے چار بزرگ بہت مشہور ہیں، عطاء بن ابی رباحؓ، عطاء بن یساعؓ، عطاء بن اسائبؓ، اور عطاء المزاہنی، ان میں سے پہلے دو بااتفاق ثقہ ہیں، اور آخری دو کے بارے میں کچھ کلام ہوا ہے، لیکن دینی علوم کی تکالیفوں میں صرف عطا، تکھا جاتا ہے تو عمر[ؓ] عطاء بن ابی رباحؓ ہی مراد ہوتے ہیں، حضرت عطاء بن ابی رباحؓ کا پورا نام ابو محمد عطاء بن ابی رباح المکی الفتریشی ہے، یہ ابن خیثم القریشی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں ولادت ہوئی، اور اللہ^ع میں وفات پائی، انھوں نے حضرت عبدالرشد بن عباس، حضرت عبدالرشد بن زیرؓ اور حضرت عائشہؓ اور دروسِ صحابہؓ و تابعینؓ سے علم حاصل کیا، اور خاص طور پر علم فقہ میں بہت مشہور ہوئے، کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانے میں مناسکِ حج کے سب سے بڑے عالم تھے[ؒ] عبادتِ دزہد میں ہمایت مردود تھے، ابن حجر[ؒ] رکھتے ہیں کہ ”بینی سال تک مسجد کافرش اُن کا بیسٹر رہا“[ؒ] محمد بن عبدالرشد الدیماج[ؒ] کہتے ہیں کہ ”میں نے کوئی مفتی عطا سے بہتر نہیں دیکھا،

۱۔ تہذیب الاسمااء، ص ۲۵۷ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۶۹ ،

۲۔ حلیۃ الادلیاء، ص ۳۲۷ ج ۳ ترجمہ نمبر ۲۲۹ ۰

۳۔ تہذیب الاسمااء، ص ۳۳۳ د ۳۳۳ ج ۳ ترجمہ نمبر ۲۰۹ ،

آن کی مجلس مسلسل ذکر ائمہ سے معمور رہتی تھی، جس کا سلسلہ ٹوٹتا ہمیں تھا، اسی دوران میں
 آن سے رفقی) سوال کیا جاتا تو بہترین جواب دیتے ہیں
 البتہ حضرت عطاء بن ابن رباح و جن صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں آن سب سے
 آن کا سامع ثابت نہیں ہے، یہاں تک کہ حضرت ابن عمرؓ میں جن سے دہ بکثرت روایات
 نقل کرتے ہیں آن سے بھی آن کا بلا واسطہ سامع نہیں ہے، اُسی طرح حضرت ابوسعید
 خدراویؓ، حضرت زید بن خالدؓ، حضرت اُم سلمہؓ، حضرت اُم تَّمَّ، حضرت ام کرزیؓ
 حضرت رافع بن خدیرؓ، حضرت اُسامہؓ، حضرت جبیر بن مطعمؓ، حضرت ابوالدرداءؓ
 اور حضرت فضل بن عباسؓ سے بھی انہوں نے بلا واسطہ روایات نہیں سنیں؛ لہذا
 ان تمام حضرات سے آن کی بلا واسطہ روایتیں مرسلاں ہیں، اور امام احمدؓ وغیرہ آن کی
 مراسیل کو "اصنعت المراسیل" (رسیگے کمزور مراسیل) کہتے ہیں، کیونکہ وہ ہر کس ذمکر
 سے روایات لیتے تھے ہے

(حضرت سعید بن المیتبؓ) آپ کا پورا نام سعید بن المیتبؓ تھے جو حزن لفڑی شیخ
 المخدومی ہے، آپ حضرت ابوہریرہؓ کے داماد تھے، اس لئے حضرت ابوہریرہؓ کی
 بہت سی روایات آپ ہی سے مروی ہیں، عبادت و زهد کا حال یہ تھا کہ چالیس
 سال تک کوئی اذان ایسی نہیں ہوئی جو انہوں نے مسجد میں نہ سنی ہوئی، مسلسل
 روزے رکھتے تھے، اور عمر میں چالیس مرتبہ حج کیا ہے، کبھی کسی امیر کا کوئی انعام

لئے تذكرة الحفاظ للذہبی ص ۹۲ ح ۱ ۔ لئے تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ و ۲۰۳ ح ۱ ،
 لئے میتبؓ میں یا پر زبردار زرد فوی پڑھ جائیے ہیں، زبر کے ساتھ تزیادہ مشہور ہیں، لیکن
 مروی ہے کہ حضرت سعید خود یا پر زبر پڑھنا پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ اہل مدینہ میں عام رواج زیادہ
 کے ساتھ پڑھنے کا تھا، رہنمای اللہ تعالیٰ میں، ص ۲۱۹ ح ۱)
 لئے ایضاً ص ۸۸ ح ۱ ،

قبول نہیں کیا، گذر بر سریل وغیرہ کی تجارت پر سخنی، امام بالکل نے ان کا قول رد ایت کیا ہے کہ ”میں بعض اوقات صرف ایک حدیث کی طلب میں کئی کمی دن را سفر کیا کرتا تھا۔ آپ کی ولادت حضرت عمر بن کی خلافت کے تیسرا سال ہوئی، اس لئے آپ نے بہت سے صحابہ کرام سے احادیث سُنی ہیں، جن حضرات صحابہ سے انھوں نے براہ را احادیث سنیں ہیں اُن کو یہ بکثرت بلا واسطہ (مرسل) روایت کرتے ہیں، لیکن اُن کی مراسیل بہت ایسے علماء کے نزدیک بھی مقبول ہیں، جو مرسل کو جمعت نہیں مانتے، مثلًا امام شافعیؓ مرسل کو قابلِ استدلال نہیں سمجھتے، لیکن فرماتا ہیں کہ اسال ابن المستیب عنده حسن را بن مستیب کی مرسل روایات ہمارے نزدیک حسن ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ثقہ راویوں ہی سے روایات نقل کرتے تھے، غیر ثقہ راویوں کی روایات بیان نہیں فرماتے تھے۔^۱

لیکن امام نوویؓ نے اس خیال کی تردید فرمائی ہے، کہ شافعیہ کے نزدیک اُن کی مراسیل علی الاطلاق قابل قبول ہیں، اس کے بجائے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اُن کی مرسلات کا حکم بھی وہی ہے جو درست کیا تباہی کی مرسلات کا ہے، لیعنی اگر کسی مُسندر روایت سے یا کسی اور مرسل سے یا بعض صحابہ کے اقوال سے یا صحابہ کے بعد اکثر فقہاء کے اقوال سے اس کی تائید ہو جائے تو اسے قبول کیا جائے گا در نہ نہیں ہے، بہر کیف! یہ گفتگو امام شافعی کے مسلک پر ہے، حفیہ کے نزدیک اُن کی مراسیل علی الاطلاق قابلِ اعتماد ہیں، آپ کی سُنِ دفات کے بارے میں ملود ہے یکرہ شامہ تک مختلف اقوال ہیں،

(۱) محمد بن سیرین | آپ کا پورا نام ابو بکر محمد بن سیرین ہے، آپ کے والد سیرین

لہ تذکرة الحفاظ، ص ۱۵ و ۵۲ ج ۱،

لہ تہذیب التہذیب، ص ۵۸ تا ۵۵ ج ۱،

لہ تہذیب الاسلام، ص ۲۲۴ ج ۱ و مقدمۃ المجموع شرح المہذب ص ۱۰۰ ج ۱ امطبعة العالیہ قاهرہ

حضرت انسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ صفیہؓ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آزاد کردہ کنیز تھیں، جب یہ حضرت ابو بکر رضی کی ملکیت میں آئیں تو ان ازواج مہراتؓ نے ان کو خوش برگاتی، اور اس تقیریب میں اٹھا رہ بدری صحابہؓ مشریک ہوئے، جن میں حضرت ابی بن کعبؓ بھی شریک تھے، جخنوں نے دعا کرائی اور باقی صحابہ نے آئیں کہی، حضرت سیرینؓ کی اولاد میں چھ افراد محمد، معبد، انس، یحییٰ، حفصہ اور کرمیہ معرفت ہیں، اور جچؓ کے چھ حدیث کے ثقہ راوی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر صاحبزادے حضرت محمد بن سیرینؓ ہیں، جن کے عجیب غریب حالات مستقل تصنیف چاہتے ہیں، آپ کا درع و تقویٰ ضرب لمشل ہے، حضرت ہشام بن حسانؓ کہتے ہیں کہ ”ہم ابن سیرین کے گھر میں مقیم رہے تو ہم دن کے وقت ان کے ہنسنے کی آوازیں سنتے تھے (کیونکہ آپ شکفتہ مراج اور ظریف بزرگ تھے) اور رات کے وقت ان کے روٹے کی“ درع و تقویٰ ہی کی بنا پر آپ نے قید بند کی صوبتیں بھی اٹھائیں، اسی گرفتاری کے دران قید خانے کے دربان نے آن کو پیش کش کی، کہ آپ روزانہ رات کو اپنے گھر چلے جایا کریں اور صبح کو دراپس آ جایا کریں لیکن انہوں نے جواب دیا: ہمیں خدا کی قسم، میں سلطان کی خیانت پر تمہاری اعانت نہیں کروں گا۔“

اسی گرفتاری کے دران مشہر صحابی اور ان کے والد کے آقا حضرت انسؓ کا مقابلہ ہو گیا، انہوں نے وصیت کی تھی کہ محمد بن سیرینؓ مجھے غسل دیں، لوگ اُن کے پاس آؤ اور اس وصیت کا ذکر کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ ”میں قید میں ہوں“ لوگوں نے کہا کہ، ہم نے امیر سے اجازت لی ہے،“ حضرت محمد بن سیرینؓ نے جواب دیا کہ ”مجھے قید کرنے والا امیر نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس کا حق مجھ پر واجب ہے،“ چنانچہ لوگوں نے اس شخص سے اجازت لی، تب انہوں نے جا کر حضرت انسؓ کو غسل دیا۔“

لہ یہاں تک کے تمام حالات تمذیب الاسلام و اللغات ص ۸۳ و ۸۴ ج ۲۶،
لہ حلیۃ الاولیاء، لابی نیم ص ۲۶،

بہر حال؛ حضرت محمد بن سیرینؓ مسلم طور پر تفسیر، حدیث اور رفقہ کے امام ہیں، صحابہؓ میں سے حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت زید بن شاہدؓ سے ان کا ساع ثابت ہے، جن صحابہؓ سے ان کا ساع نہیں ہے اُن سے بھی یہ بلا واسطہ (مرسل) روایت کرتے ہیں، لیکن انکی مراasil بہت سے وہ حضرات بھی قبول کرتے ہیں جو رسول کو جنت نہیں مانتے ہیں مثلاً علامہ ابن تیمیہؓ فرماتے ہیں:

وَمُحَمَّدٌ بْنُ سِيرِينَ مِنْ أَوْيَاءِ النَّاسِ فِي مَنْطَقَةِ

مَرَاسِيلِهِ مِنْ أَصْحَاحِ الْمَرَاسِيلِ^{۱۰}

تمود بن سیرینؓ اپنی گفتگو میں محتاط ترین انسان ہیں اور ان کی

مَرَاسِيلِ مَجْمَعِ تَرِينِ مَرَاسِيلِ مِنْ سَيِّدِنَا

آپ کی دفات بصرہ میں ۹ شوال شالہ کو ہوئی۔^{۱۱}

(۸) حضرت زید بن اسلمؓ [ان کا پورا نام ابو عبد اللہ زید بن اسلمؓ ہری (متوفی ۱۴۰)]

ہے، یہ مدینہ طیبہ کے باشندے ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، انھوں نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ اور حضرت سلمہ بن الاکوعؓ وغیرہ سے روایات نقل کی ہیں، یہ علم تفسیر کے بڑے عالم تھے، اور پاتفاق ثقہ ہیں، مسجد نبویؓ میں اُن کا حلقة درس ہوتا تھا، اور ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ان کے صاحبزادے عبد الرحمنؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد کبھی مجھے اپنے کسی شاگرد کے پاس بھیجتے تو وہ میرے سر کو بوسدے کر فرماتے ہے خدا کی قسم، مختارے والد ہیں اپنے اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہیں، اور اگر ہمیں یہ خبر دی جاتے کہ یا ہمارے اہل و عیال کو موت آتے گی یا زید بن اسلمؓ کو اور ہمیں یہ اختیار ملے کہ جس کی موت کچھ اپنی خستیاں کر لیں تو ہماری خواہش یہ ہوگی کہ زید بن اسلمؓ زندگی

لئے منہاج السنۃ ص ۸۶ ج ۳، گلہ تہذیب التہذیب ص ۲۱۶ ج ۱،

گلہ تہذیب التہذیب مع حاشیہ ص ۵۹۵ و ۳۹۶ ج ۳،

حضرت ابو حازمؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت زید بن اسلمؓ کی مجلس میں چالیس فہماں کی کے ساتھ رہتے تھے، ہم سب کی ادنیٰ خصلت یہ تھی کہ اپنی املاک سے ایک دوسرے کی عنخواری کرتے تھے اور اس مجلس میں مجھ کبھی دوآدمی بھی ایسے نظر نہیں آئے جو کسی بے فائزہ گفتگو پر بحث یا جھگڑا کر رہے ہوں،^{لئے}

حضرت زید بن اسلمؓ کو عموماً ثقہ قرار دیا گیا ہے، البتہ عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

”مجھے ان میں کسی نہ رابی کا علم نہیں، البتہ وہ قرآن کریم کی تفسیر کی بہت اپنی رائے سے کرتے ہیں“ اور سفیان بن عینہؓ کا قول ہے کہ: ”زید بن اسلمؓ عصایع آدمی تھے، یعنی ان کے حافظہ میں کچھ نقص تھا“ (تہذیب التہذیب) ان دو حضرات کے علاوہ کسی اور سے اُن پر برجح نظر سے نہیں گزری،

حافظہ تھیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن اسلمؓ کی ایک تفسیر تھی جسے اُن کے صاحبزادے عبد الرحمن بن زید بن اسلمؓ روایت کرتے تھے لہٰ یعنی واضح رہ کر عبد الرحمن بن زید بن اسلمؓ اپنے صلاح و تقویٰ کے باوجود ضعیف ہیں، اور اکثر محدثین نے اُن کی روایات کو ناقابل اعتبار کیا ہے، لہٰذا حضرت زید بن اسلمؓ کی جزو تفسیری روایات اُن کے صاحبزادے عبد الرحمن سے مردی ہیں وہ پوری طرح قابل اعتبار نہیں ہیں، اُن کے صاحبزادے کا حال آگے آ رہا ہے،

۹۰) حضرت ابوالعلیٰ مجیدؓ ان کا پورا نام ابوالقاریؓ دربر وزن زید، بن ہمراں الرياحی ہے
یہ بصرہ کے باشندے ہیں، زمانہ جاہلیت میں پیدا ہو چکے تھے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دفات کے دسال بعد مسلمان ہوئے، حضرت ابو بکرؓ مسے ملاقات کی ہے، اور صحابہؓ میں سے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعب رضی،

لئے تہذیب الاسلام، ص ۲۰۰، ج ۱،

لئے تذكرة الحفاظ، ص ۱۲۵ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۳

لئے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب، ص ۸، ۱۶۹۱ء۔

حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو موسیؓ، حضرت ابو ایوبؓ اور حضرت ابو بزرگؓ وغیرے سے روایت کرتے ہیں، قرآن کریم کے بہترین قاری تھے، یہ بھی بنی رباح کی ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے لہ، یعنی حضرت ابن عباسؓ ان کو اپنے ساتھ چاہی پر بجھاتے تھے، جبکہ دوسرے قلیشی لوگ بیچے بیٹھے ہوتے، اور فرماتے تھے: «علم اسی طرح انسان کے شرف میں اضافہ کرتا ہے تھا، ان کے ثقہ ہونے پر علماء کا اتفاق ہی،^{۹۳} میں وفات ہوئی، نادراہ انہر کے علاقہ میں سب سے پہلے اذان دیتے ہوئے تھے،

(۱) حضرت عودہ بن الزبرؓ آپ حضرت زیر بن عمومؓ کے صاحبزادے ہیں، مدینہ طیبہ کے مشہور فقہاء سبعہ میں سے ہیں، حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں، اس لئے حضرت عائشہؓ سے انہوں نے بہت سی احادیث روایت کی ہیں، اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں ان کو سب سے زیادہ ثقہ قرار دیا گیا ہے، ان کی جلالتِ قدر، علم و فضل، اور وثائق پر اجماع ہے، ان کے صاحبزادے ہشامؓ فرماتے ہیں کہ میرے والد ہمیشہ روزے رکھتے تھے، اور روزے ہی کی حالت میں (سالہ ۷۰ میں) وفات پائی،

ابن شوذبؓ کہتے ہیں کہ شعوہؓ ہر روز جو تحانی قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اور رات کو تہجد میں بھی قرآن پڑھتے تھے، یہ معمول ساری عمر میں صرف اُس رات تھا ہوا جس رات میں آپ کی نانگ رایک بیماری کی وجہ سے (کافی گھنی)،

(۲) حضرت حسن بصریؓ آپ کا پورا نام ابو سعید الحسن بن ابی الحسن یسار بصریؓ ہو،

۱۰ تہذیب الاسلام، ص ۱۵۲ ج ۲،

۱۱ تذكرة الحفاظ، ص ۵۸ ج ۱ ترجمہ نمبر: ۵،

۱۲ تہذیب التہذیب ص ۲۸۳ ج ۳،

۱۳ حلیۃ الاولیاء، ص ۲۲۱ ج ۲،

۱۴ تہذیب الاسلام، ص ۳۳۱ و ۳۳۲ ج ۳ ترجمہ نمبر: ۳۰۵،

۱۵ تذكرة الحفاظ ص ۹۵ ج ۱ ترجمہ ۱۵،

آپ حضرت زید بن ثابت رضی کے راوی بعض حضرات کے قول کے مطابق جمیل بن قطبہ کے، آزاد کر دہ غلام تھے، اور آپ کی والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کر دہ کینز تھیں، چنانچہ بھی آپ نے حضرت ام سلمہ رضی کا دو دھنی پیا ہی، آپ کی ولادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے دو سال پہلے ہوئی، اور آپ نے بہت سے صحابہؓ کی تیاریت بھی کی اور ان سے علم بھی حاصل کیا، علم و فضل کے اعتبار سے آپ کی جلالت قدر ستم ہے، اور آپ کی عبادت و زہد اور پر حکمت ملفوظات مشہور ہیں، اس کے ساتھ ہی آپ ہنایت یہاں رجایہ بھی تھے، متعدد جنگوں میں شریک ہوتے ہیں، اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں خراسان کے گورنر رتبیع بن زیاد کے کاتب بھی رہے ہیں،

آپ نے بہت سی احادیث مرسلہ روایت کی ہیں، ربیعی جن صحابی سے آپ نے وہ حدیث سنی تھی ان کا دو سلطے ذکر نہیں کیا، ایسی احادیث کے بارے میں محدثین کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے، کہ وہ قابل قبول ہیں یا نہیں، بعض حضرات انھیں قبول کرتے ہیں اور بعض حضرات انھیں ضعیف قرار دیتے ہیں، امام ابن المدینی فرماتے ہیں کہ "حسن" کی مرسلات اگر تفتریح راویوں سے مردی ہوں تو وہ صحیح ہیں اور بہت کم ساقط الاعتبار ہیں، اور امام ابو زرعہؓ کا قول ہے کہ "وہ تمام احادیث جو حسن بھی" نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر بلاد اسطہ، روایت کی ہیں میں کے تحقیق سے اُن کو ثابت پایا، سو اسے چار احادیث کے (جن کی بنیاد مجھے نہیں ملی) لیکن امام الحسینؑ نے اُن کی اور حضرت عطاؓ کی مراسیل کو "اضعفت امرا سیل" (زمزوڑیں مراسیل) کہا ہے، آپ کی رفات مذکور ہیں ہوئی،

(۱۲) حضرت قتادہؓ آپ کا پورا نام ابو الخطاب قتادہ بن دعامة (بکسر الدال)

۱۰ تہذیب الاسلام ص ۱۶۱ ج ۱ ترجمہ نمبر ۱۲۲،

۱۱ تہذیب التہذیب ص ۲۰۲ ج ۳ ترجمہ عطاء بن ابی رباح ابن المدینیؓ اور ابو زرعہؓ کے اتوال نیز اس مسئلہ پر مفصل بحث کیلئے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ص ۲۹۶، ج ۲، ۳،

السدی البصري ہی، آپ مادرزاد نبینا تھے، اس کے باوجود قوت حافظت کا عالم پر بحث کے خود فرماتے ہیں: ”میں نے کبھی کسی محدث سے حدیث کو دوبارہ سُنانے کی فرائض نہیں کی، اور میرے کافوں نے کوئی ایسی بات نہیں سُنی جسے میرے دل نے یاد نہ کر لیا ہو“ نیز فرماتے ہیں ”قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں میں نے کچھ نہ کچھ (یعنی کوئی نہ کرنی روایت) سُن نہ رکھی ہو“ امام حسین فرماتے ہیں کہ ”قتادہ تفسیر کے زیادہ بڑے عالم ہیں“، اس کے علاوہ ان کو عربی لغت و ادب اور تاریخ و انساب میں بھی بڑا درک حاصل تھا، البتہ محدثین نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات روایات میں تدليس کیا کرتے تھے، آپ کا انتقال ۶۳۴ھ میں طاعون کی وبا سے شہر واسطہ میں ہوا، (۱۳) محمد بن کعب لہٰ ظریح اپ کا نام محمد بن کعب بن سلیم بن اسد الفتری ہے، گنیت ابو حزہ یا ابو عبد اللہ ہے، آپ کے والد بزرگ ریظہ میں سے تھے، اور غزہ بزرگ کے وقت نابالغ ہونے کی بنابر اسکیں امان دی گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد بن کعب قرظیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں پیدا ہو چکے تھے، آپ نے حضرت علیؓ، حضرت ابن سعیدؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ، حضرت براہین عازبؓ، حضرت معاذؓ، حضرت کعب بن ججرہؓ، حضرت زید بن ارقمؓ، حضرت میخراہ بن شعبہؓ، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ سے روایات نقل کی ہیں، امام ابن سعدؓ فرماتے ہیں ”ثقة اور کثیر الحديث عالم تھے“ امام عجمیؓ کا قول ہے کہ ”ثقة اور صالح ہیں اور قرآن کریم کے عالم ہیں“ ”عون بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے تفسیر قرآن کا آن سے بڑا عالم نہیں دیکھا“ علامہ نوویؓ فرماتے ہیں کہ: ان کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے“ آپ شروع میں کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، بعد میں پھر مدینہ طیبہ والیں آگئے، لہٰ یہ تمام باتیں تذكرة الحفاظ ص ۵۱۱۱، طبقہ نمبر ۲۲ ترجیہ نمبر ۱۲ سے مأخذ ہیں،

لہٰ ہندیب المتنبی ص ۲۰۰ تا ۳۲۲ ج ۹

مشنلہ اور سلہ ح کے درمیان وفات پائی،^{۱۷}

حضرت علمیہ ^(۱۲) آپ کا پورا نام ابو شبلیل علمیہ بن قیس بن عبد اللہ الخنی ہے، آپ کو فکے باشندے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی پیدا ہو چکے ہیں، یوں تو آپ نے بہت سے صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں، لیکن آپ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد تھے، یہاں تک کہ صورت و سیرت میں بھی ان سے مشابہ تھے، اس لئے حضرت ابن مسعودؓ کی روایات کے معاملہ میں آپ پر اور حضرت اسودؓ پر بطور خاص اعتماد کیا جاتا ہے، ہنایت خوش الحان قاری تھے، اور حضرت ابن مسعودؓ آپ کو مُلا کر آپ سے قرآن کریم مُتنا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک رات میں آپ نے پورا قرآن ختم کر لیا، بالتفاق ثقہ ہیں، اور خاص طور سے علم فقہ میں آپ کا مقام بہت بلذہزی، آپ کی وفات کے بارے میں سلہ ح کے لئے کرسکہ م تک مختلف اقوال ملتے ہیں ہے، آپ انتہائی متواضع بزرگ تھے، لپٹے گھر ملکی کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور اپنا باقاعدہ حلقة درس بنانا پسند نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ میرے پچھے پچھے چلیں اور ایک دس کر سے کمیں کہ علمیہ ہیں، آپ نے اپنے مکان کے علاوہ صرف ایک قرآن کریم کا نسخہ اور ایک گھوڑا اور شہ میں چھوڑا۔^{۱۸}

حضرت اسودؓ آپ کا پورا نام ابو عمرو بن یزید بن قیس الخنی ہے، آپ بھی کوفہ کے باشندے ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد ہیں، حضرت علمیہ کے بھتیجے اور حضرت ابراہیم شخصی کے ماموں ہیں، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ: «آپ کی وثائقت اور جلالتِ قادر پر اتفاق ہے» عبارت و زحد میں بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ آپ نے عمر میں اتنی مرتبہ حج یا عمرے کے لئے حرمین کا سفر کیا ہے،

۱۷ تہذیب الاسلام، ص ۹۰ ج ۱،

۱۸ تہذیب التہذیب ص ۲۴۸ ج،

۱۹ حلیۃ الاولیاء لأبی نعیم، ص ۱۰۰ ج ۲،

آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن سات سورکعتیں روزانہ پڑھتے تھے، اس کے باوجود سہاجا ناتھا کہ وہ حضرت اسودؓ کے گروالوں میں رعایت کے اندر (سب سے کم محنت کرتے ہیں)۔

حضرت ابراہیم شخصی فرماتے ہیں کہ: "حضرت اسود رمضان میں دو راتوں کے اندر قرآن مجید ختم کر لیتے تھے اور مغرب اور عشا کے درمیان سوتے تھے، اور رمضان کے علاوہ چھرatoں میں قرآن ختم کرتے تھے" روزے اتنی کثرت سے رکھتے تھے کہ جسم نیلا پیلا ہو جاتا، حضرت علقریبؓ اُن سے کہتے کہ "پنچ جسم کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہو؟ تو جواب میں فرماتے کہ" اسی جسم کی لاخروی، راحت چاہتا ہوں، اور کبھی جواب میں فرماتے: "ابو شبل! رآخترت کا معاملہ بڑا نیگین ہے، هشیم کے لگ بھگ آپ کی رفات ہوئی،

(۱۶) مرۃ الہدایہ^۱ "آپ کا پورا نام ابوسعیل مرۃ بن شراحیل الہدایی اسکے لکوف ہے، اور آپ اپنے زمانے میں "مرۃ الطیب" اور "مرۃ الظیح" کے لقاب سے معروف تھے یوں تو آپ حضرت میں میں سے ہیں، اس لئے بہت سے صحابہ سے روایت کرتے ہیں، مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابوذرؓ دیغیرہ، لیکن حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے زیادہ علم حاصل کیا ہے، چنانچہ تفسیر کی کتابوں میں حضرت ابن مسعودؓ کی تفسیری روایات ان سے بکثرت مروی ہیں، بالاتفاق ثقہ ہیں آپ کی کثرت عبارت کا حال یہ تھا کہ مورخین لکھتے ہیں "آپ نے اتنے سجدے کئے ہیں کہ مٹی آپ کی پیشانی کو کھا گئی تھی" اور آپ کی یومیہ رکھات کی تعداد بعض حضرات کی

^۱ تذكرة الحفاظ ص ۲۴۰ ج ۱۰ تہذیب الاسلام، ص ۱۲۲ ج ۱،

تلہ حلیۃ الاولیاء ص ۱۰۳ ج ۱۰ ترجمہ نمبر ۱۶۵

تلہ حضرت میں ان حضرات کو کہتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمان پایا، لیکن زیارت نہیں کی،

پانچ سو اور بعض نے چھ سو بتائی ہے، حافظہ سبیٰ لکھتے ہیں: "آپ تفسیر میں صاحب بصیرت تھے، تقریباً نصفہ میں وفات پائی۔" لیکن واضح رہے کہ کتب تفسیر میں آپ کی تفاسیر بکثرت ستری سے مردی ہیں، جن کا حال "ضعفاء" کے عنوان کے تحت آگئے آ رہا ہے، اور حضرت نافعؓ آپ کا پورا نام ابو عبد اللہ نافع بن ہر مزہ ہے، اور بعض حضراتؓ کے نافع بن کاؤس بتایا ہے، آپ نیشاپور کے باشندے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ جلیل القدر تابعی ہیں، آپ نے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ہریرؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت ابو لبابةؓ، حضرت نافع بن خدیجؓ اور حضرت عائشةؓ وغیرہ سے علم حاصل کیا، حضرت ابن عمرؓ کے شاگردوں میں دو حضرات کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد قرار دیا گیا ہے، ایک حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے سالم بن عبد اللہ دو سکرآن کے غلام نافعؓ، علامہ نوویؓ فرماتے ہیں کہ "ان کی جلالتِ قادر اور تو شیق پر اجماع ہے"، اور امام بخاریؓ فرماتے ہیں کہ "تمام اسانید میں سب سے زیادہ صحیح سند مالکؓ عن نافع عن ابن عمرؓ ہے"، خود حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: "لقد منَ اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْنَا بِنَافِعٍ" راشد تعالیٰ نے نافعؓ کے ذریعہ ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے، حافظ ابن حجرؓ لکھتے ہیں "لَا يعْتَدُ لِخطَّأَ فِي جَمِيعِ مَارِوَاهِ" (جتنی احادیث انہوں نے روایت کی ہیں ان میں کوئی غلطی دریافت نہیں ہوئی) امام مالکؓ حضرت نافعؓ کے خاتم شاگرد ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آپ بہت متواضع بزرگ تھے، عموماً ایک سیاہ چار راڑہ میتو تھے اور بہت کم گفتگو کرتے تھے، حضرت نافعؓ خود فرماتے ہیں کہ "میں نے حضرت ابن عمرؓ کی تیس سال خدمت کی، اس کے بعد ابن عامر رضی اللہ عنہ انجیس پیش کی کہ وہ مجھے تیس ہزار درہم میں اُن کے ہاتھ فروخت کر دیں، حضرت ابن عمرؓ نے مجھ سے فرمایا مجھے خطرہ ہے"

لِهِ تَهْذِيبُ التَّهْذِيبِ، ص ۸۸ ج ۱
لِهِ تَهْذِيبُ الْأَسَاءِ، ص ۱۲۳ و ۱۲۴ ج ۲ ترجمہ نمبر ۱۸۰،
لِهِ تَهْذِيبُ التَّهْذِيبِ ص ۲۱۳ تا ۲۱۵ ج ۱۰

کہ کہیں ابن عامر کے دراہم مجھے فتنہ میں مستلانہ کر دیں، جاؤ تم آزاد ہو، ﷺ میں
آپ کی رفات ہوئی،^{لہ}

(۱۸) حضرت شعبؑ آپ کا پورا نام ابو عرب عامر بن شراحیل الشعی الجیری ہے، آپ
کوئی کے مشہور فقیہ، تابعین میں سے ہیں، تقریباً پانچ سو صحابہ کی زیارت کی ہے، حافظ
غیر معنوی طور پر قوی تھا، کبھی عمر بھرا احادیث لکھ کر بیان نہیں کیں، نرماتے تھے کہ
جو شخص مجھے کوئی بات سُتا ہے مجھے فوراً یاد ہو جاتی ہے، انہی کا قول ہے کہ مجھے سب
کم جو چیز یاد ہو رہ اشعار ہیں، اس کے باوجود اگر میں چاہوں تو جمینہ بھر تک شعر سنانا
رہوں، اور کوئی شعر مکرر نہ ہو، آپ امام ابو حینفہ ع کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور
آپ کی جلالت قدر پراتفاق ہے، **اَمَّا حَسْدُ اُولَٰئِمَّا عَجْلٍ** فرماتے ہیں کہ آن کی مراسیل
بھی صحیح ہیں، کیونکہ وہ صرف صحیح روایات ہی کو مسلم اور روایت کرتے ہیں،^{لہ}

(۱۹) حضرت ابن ابی مایکلؓ آپ کا پورا نام ابو محمد عبد اللہ بن عبید اللہ بن ابی ملیکة
ائیتی الکی ہے، آپ حضرت عبد اللہ بن زیرؓ کے ہمدرد خلافت میں نکہ مکرمہ کے قاضی اور
مسجد حرام کے وزن تھے، بعد میں حضرت ابن زیرؓ نے آپ کو طائف کا قاضی بناریا تھا
آپ نے بہت سے صحابہؓ میں سے احادیث روایت کی ہیں، خود فرماتے ہیں کہ: **سیں نے میں**
صحابہؓ کرام سے ملاقات کی ہے، طائف کے قیام کے دوران آپ نے حضرت ابن عباسؓ
سے بھی استفادہ کیا ہے، حافظ ذہبیؓ فرماتے ہیں: کان اسامہؓ فیہا سجدۃ فسیحہ حا
مدھما متفاقاً علی ثقہتہ، خلاصہ یہ کہ آپ کی امامت اور وثاقت پراتفاق ہے،
رَسُولُهُ مِنْ وَنَاتِ بَالِيٍّ

۱- تذكرة الحفاظ ص ۹۹۲ ج ۱

۲- ایضاً، س ۳، ت ۳، ج ۱

۳- تہذیب النہذیب، ص ۴۰۳ ج ۵

۴- تذكرة الحفاظ، ص ۴۵۶ ج ۱

۱۰) حضرت ابن حجری رحمۃ اللہ علیہ آپ کا پورا نام ابو اولید عبد الملک بن عبد العزیز بن حجری القرشی الحنفی ہے، آپ تبع تابعین میں سے ہیں، اور حضرت طاؤسؑ، حضرت عطاء بن ابی رباحؓ، حضرت مجاہدؓ، حضرت ابن ابی ملیکؓ اور حضرت نافعؓ وغیرہ کے شاگرد ہیں، خاص طور سے حضرت عطاؓ کے ساتھ سترہ سال رہے، میں، حضرت عطاؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم کس سے مسائل پوچھا کریں، تو حضرت عطاؓ نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: "اگر یہ نوجوان زندہ رہے تو ان سے" اسی لئے آپ کو حضرت عطاؓ کی روایات کے معاملہ میں اشتہ الناس (تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد) کہا گیا ہے، آپ کی ایک خصوصیت یہ ہو کہ آپ دینی علوم کے پہلے باقاعدہ مصنف ہیں، جنہوں نے علوم کی پہلی بار تردن کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ: "ماد ڈن العلم تدا دینی احد" رجھے پہلے میری طرح کسی نے علم کی تدوین نہیں کی تھی، عبادت و زهد میں بھی آپ ہنایت بلند پایہ بزرگ تھے، مہینہ میں صرف تین دن روزے کے بغیر رہتے تھے، درم سارے ہمیشے روزے رکھتے تھے، امام عبد الرزاقؓ فرماتے ہیں کہ: "جب کبھی میں ابن حجری رحۃ کو سماز پڑھتے ہوئے دیکھتا تو مجھے حقیقیں ہو جاتا کہ آپ کا دل خشیت انسان سے معمور ہے"

بیشتر محدثین نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ بعض علماء سے آپ پر معمولی جرح و تقدیم بھی مردی ہی، مثلاً امام مالکؓ سے منقول ہے کہ: "ابن حجری رحۃ حاطب السیل ہیں" ریعنی رطب و یا بس ہر طرح کی روایات لے لیتے ہیں (تجھی بیں عین فرماتے ہیں کہ "وہ زہریؓ" کی روایات کے معاملے میں پچھہ نہیں ہیں) (ریعنی ناقابل اعتبار ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ بعض اوقات ضعیف راویوں سے تدلیس کر جاتے تھے، اسی لئے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ جزویات انہوں نے صراحتہ حدا ثقیٰ یا اخباری کے الفاظ سے نقل کی ہیں

وہ تو ٹھیک ہیں، البتہ جو روایات عن کے لفظ سے نقل کی ہیں وہ مشتبہ ہیں، لیکن حثیتی مجموعی آپ قابل اعتماد راوی ہیں، چنانچہ صحاح رستمہ میں آپ کی روایات بکثرت مروی ہیں۔

(۲۱) **حضرت ضحاک** آپ کا پورا نام ابو الفاسد الضحاک بن هراجمہ البلالی ہے، آپ خراسان کے باشندے ہیں، "ضحاک" کے معنی ہیں "بہت ہنسنے والا" اور آپ کا نام ضحاک اس لئے رکھا گیا کہ آپ دوسال بطن مادر میں رہے، اور جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے دانت نکل چکے تھے، اور آپ ہنس رہے تھے، آپ صحابہؓ کے ذریعہ پیدا ہو چکے تھے، لیکن کسی صحابی سے آپ کا روایت کرنا مشکوک ہے، یہاں تک کہ حضرت ابن عباسؓ سے بھی آپ کی روایات صحیح قول کی بنا پر مرسلاں ہیں، عبد الملک بن مسیروؓ فرماتے ہیں کہ "ضحاک کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے نہیں ہوئی، البتہ رئے کے مقام پر حضرت سعید بن جبیرؓ سے ملاقات ہوئی ہے، اور انہی سے انہوں نے تفسیر حاصل کی ہے، اکثر علماء نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، صرف حضرت شعبہؓ اور حبیبؓ بن سعید القطانؓ ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں، لیکن اول توبہ دو نوں حضرات رجال پر جرح کرنے کے معاملہ میں دوسروں سے زیادہ متفق ہیں، دوسرا نے غالباً ان کی جرح کا منشاء یہی ہے کہ ضحاک کی ملاقات کسی صحابی سے نہیں ہوئی، اس کے باوجود وہ صحابہؓ سے براہ راست روایت کرتے تھے، ورنہ بذات خود وہ ثقہ ہی ہے، حافظ ذیکرؓ نے ان کا تذکرہ کر کے لکھا ہے: رثقاً احمد و ابن معین و البرزعة وغيرهم،

۱۰۔ نہذبۃ التہذیب ص ۳۰۶ تا ۳۰۷ ج ۶

۱۱۔ مفتاح السعارة، طاش کبری زادہ ص ۳۰۲ ج ۱، والبداية والنهاية للبن کثیرؓ

۱۲۔ ص ۲۲۳ ج ۹، احوال اللہ عزیزؑ نہذبۃ التہذیب ص ۳۵۳ ج ۳،

۱۳۔ دیکھنے الاجوبۃ الفاضلة، مولانا عبد المحبی لکھنواریؓ، ص ۱۶۱ تا ص ۱۸۰ امطبوع شام،

بحقین ایشیع عبدالفاتح (یونہر)،

وضعفه بعیی القطان وشعبة الصدا، وهو قوی فی التفسیر رام احمد
وابن معین اور ابو زرعة وغيره نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے، اور سچی القطان اور ضعیفہ
نے ان کی تضعیف کی ہے اور وہ تفسیر میں قوی ہے^{لہ}، اور حافظ ابن حجر تحریر فرماتے
ہیں: "حدائق کثیر الادس سال رپیچے ہیں، مگر مُرشَّل روایات کثرت سے ذکر کرتے
ہیں^{لہ}، یہ بات تو ہم پچھے لکھی ہی چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کی جو روایات ان کے
طريق سے آئی ہیں انھیں محمد بن حنبل نے ضعیف قرار دیا ہے، البته خود ان کے باپ تفسیری
اقوال قابل قبول ہیں، ان کی وفات ۷۳۴ھ اور شمس الدین ۷۴۰ھ کے درمیان ہوئی ہے،

قروان اولیٰ کے ضعفاً یا اختلاف فیہ فسیروں

مذکورہ بالاحضرات تردہ تھے جن کے ثقہ اور قابل اعتماد ہونے پر علماء محدثین کا
تفقیہ اتفاق رہا ہے، اور جن کا ذکر تفسیری اقوال و روایات میں بکثرت آتا رہتا ہے اور
ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت وہب بن منذہؓ، اور رکعب الاحبارؓ کا
مفہول تذکرہ "اسراتیلیات" کے عنوان کے تحت آچکا ہے، اب تابعین اور تبع تابعین
کے عہد کے بعض ان حضرات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہو جھیں یا تو ضعیف
قرار دیا گیا ہے یا جن کے قابل اعتماد ہونے میں قابل الحاظ اختلاف رہا ہے،
تفسیر کی کتابوں میں "سدی" کے نام سے در صاحب معروف ہیں،
سدیٰ کبیر دونوں کا تذکرہ الگ الگ مناسب ہوگا،

(۱) ابو محمد اسمحیل بن عبد الرحمن بن ابی کریمہ استدی الکوفی رمتو فی ۱۲۰ھ
"الستدی الکبیر" کہا جاتا ہے، اور تفسیر کی کتابوں میں جب صرف "سدی" لکھا جاتا ہے

۱۰ المغنى في الضعفاء للذهبى، ص ۳۱۲ ج ۱ ترجمہ نمبر ۲۹۱۲

۱۱ تقریب الہنفی، ص ۳، ۲ ج ۱ مطبوعہ مدینہ متوفہ،

تو عموماً یہ مراد ہوتے ہیں، اُن کو "سدی" کہنے کی وجہ یہ ہر کو کوئی تذکرہ کی جا سچ مسجد کے دروازے پر ایک چوتھے ساتھا، یہ اُس پر بیٹھ کر اور صنیلوں کی تجارت کیا کرتے تھے، دروازے کے اپسے چوتھے کوئی عربی میں "سرہ" کہتے ہیں، اس نے ان کو سدی کیا جانے لگا، اُن کو تفسیر قرآن کی درس و تدریس کا خاص ذوق تھا، چنانچہ تفسیر کی ستائیں اُن کے اقوال اور روایات سے بھری ہوئی ہیں، البتہ علم تفسیر اور روایات کے معاملہ میں یہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں، اس مسئلہ میں محققین کی آراء مختلف ہیں، بعض حضرات نے اُن کی تو شیخ کی ہے، مثلاً حضرت سعید بن سعید القطان فرماتے ہیں: "لاباس به ما سمعت احد ابن کرو الا بغير" (اُن کی روایات میں کوئی حرج نہیں، میں نے جس کسی کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سنا) امام حسن فرماتے ہیں کہ "وہ ثقہ ہیں" (امام ابن عری فرماتے ہیں: "لہ احادیث وہ عندهی۔ مستقیم الحدیث صدق لا باس به") ر میری نظر میں حدیث کے معاملے میں وہ صحیک ہیں، پس یہیں، ان میں کوئی حرج نہیں) امام عجل فرماتے ہیں "ثقة عالم بالقىبررواية له" (وہ تفسیر کے ثقہ عالم اور راوی ہیں)، امام نسائی و اخھیں صالح کہتے ہیں، (امام بخاری کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اخھیں قابل اعتبار سمجھتے ہیں، کیونکہ اخھوں نے اپنی تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں کوئی حرج نقل نہیں فرمائی، بلکہ اسماعیل بن ابی عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "سدی قرآن کریم کے شعبی" سے زیادہ بڑے عالم ہیں" اور سعید بن سعید القطان کا وہ قول بھی نقل کیا ہے جو اور پر گزر اکہ "میں نے جس کسی کو اُن کا ذکر کرتے ہوئے سنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سنا" ان رواویں کو نقل فرمائک اخھوں نے خود کوئی

۱۔ محدثین کے ان اقوال کا ہم نے تقریبی ترجمہ مختص سہولت کے لئے کر دیا ہے، اور نہ یہ تمام فقرے اصطلاحی ہیں، اور ان کا صحیک صحیک مفہوم اصول حدیث پر نظر کھنے والے حضرات بھی سمجھ سکتے ہیں، اس پر سے مفہوم کراڑو میں منتقل کرنا حکمن ہیں،
۲۔ تذکرہ المہذب، ص ۳۱۲ و ۳۱۳ ج ۱،

جرح نہیں فرمائی، امام مسلم کے نزدیک بھی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ اسخونوں نے اپنی صحیحیت میں ان سے حدیث لی ہے،

اس کے برخلاف دوسرے بہت سے علماء نے ان پر جرح بھی فرمائی ہے، مثلاً امام شعبیؓ سے کسی نے کہا کہ ان السنّتِ قدسی اعلیٰ حظاً من علماء افراط ان رسالہ کو قرآن کریم کے علم کا بڑا حصہ ملابہ، اس کے جواب میں امام شعبیؓ نے فرمایا "قد اعلیٰ حظاً من جمل بالقص ان" (ان کو نتران کریم سے جاہل ہونے کا بڑا حصہ ملابہ)، حضرت صحیحی بن معین الحنفی ضعیف قرار دینے شروع اور فرماتے تھے "فی حدیثه ضعفت" (ان کی احادیث میں ضعفت ہے) امام ابو زرعہؓ الحنفی لیتن رزم، کہتے تھے، جوانی درجہ کی توثیق ہے، امام ابو حاتم رضی فرماتے ہیں "یکتب حدیثہ ولا يصتبح به ران کی حدیثیں لکھی جائیں مگر ان سے مستدلال درست نہیں، ساجی" فرماتے ہیں "صدق و فیہ نظر" (چچے ہیں مگر محل نظر ہیں)، امام عقیلؓ کا قول ہے "ضعیف و کان یتناول الشیخین" (ضعیف ہیں اور شیخین یعنی حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی بدگونی کرتے تھے)، امام طبریؓ کہتے ہیں "ذیتعجب بصنیشہ" (ان کی حدیث سے مستدلال درست نہیں)، امام جوز جانیؓ فرماتے ہیں "کذاب شتم" (وہ جھوٹی اور تبرابار ہیں)، امام فلاسؓ نے حضرت عبد الرحمن بن مهردیؓ کا قول کیا ہے کہ "وہ ضعیف ہیں" اور حسین بن داfer المژریؓ کہتے ہیں کہ "سمعت من السیدی فما قلت حتى سمعته يشتمن ابا بکر و عمر فلم ااعد اليه" (میں نے سیدی سے احادیث سنی ہیں، اور ان کو اس وقت چھوڑا میں نے ان کو سنا کہ وہ حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کے خلاف بذریعی کر رہے ہیں، اس کے بعد میں ان کے پاس نہیں گیا۔)

۱۔ النابغة الکبیر للبغاری ص ۳۶۱ قسم اجلدا ترجمہ نمبر ۵۲۱، طبع بیروت،

۲۔ تہذیب التہذیب ص ۳۱۳ و ۳۱۴ ج ۱

۳۔ میزان الاعتدال للذہبی ص ۲۳۶ و ۲۳۷ ترجمہ نمبر ۹۰،

اُن کے بارے میں ساری بحث کا خلاصہ حافظ ابن حجر نے یہ مکالہ ہے کہ "صد و ق پھم و رضی بالنشیم" رہ پچے ہیں، مگر ان کو ردیت میں دہم ہو جاتا ہے، اور ان ہی نشیع کا بھی الزام ہوتا ہے لفظ صدق و حق" محدثین کی اصطلاح میں اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو جھوٹا تو نہ ہو لیکن اس کا حافظہ بھی معیاری نہ ہے، بلذات ان کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ قوتِ حافظہ کے اعتبار سے یہ محدثین کے معیار پر پورے نہیں اُترتے دوسرے اُن پر شیعہ ہونے کا بھی الزام ہے، لیکن اُن کو گذاب "صرف امام جوزجانی" نے کہا ہے،

سدیٰ صیر | اس تدریجی میں، جو عبد الرحمن ابن زید بن الخطابؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، اُن کی ردایات سُدیٰ کبیر کے مقابلہ میں کم ہیں، اور ان کو سُدیٰ کبیر سے متاز کرنے کے لئے "السدیٰ الصیر" کہا جاتا ہے، یہ بھی کوفہ کے باشندے ہیں، اور ان کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کااتفاق ہے، یہ مشہور مونخ کلبیؓ کے شاگرد ہیں (رجن کا ذکر آگے آ رہا ہے) امام بخاریؓ فرماتے ہیں "لایکتب حدیثہ البتة، ران کی احادیث ہرگز نہ بھی جائیں" امام ابن معینؓ کا ارشاد ہے: "لیں بشقة" (وہ ثقہ نہیں) امام حسَّمَد فرماتے ہیں "ادرکته و قد کبر فتزکته ریں نے اُن کو اس وقت پایا جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے لہذا میں نے انھیں چھوڑ دیا، حافظ ذہبیؓ اُن کے بارے میں فرماتے ہیں: "ترکوہ دا تکہہ بعضہم بالکن ب" (محترم نے انھیں چھوڑ دیا ہے، اور بعض لوگوں نے اُن پر جھوٹ کا الزام بھی لگایا ہے)۔ اور ایک دوسرے مقام پر اُن کے بارے میں لکھتے ہیں "واہ بمرغ" راہتیانی راہیات

۱۷ تزیب التہذیب ص ۲۷۷ ج اترجمہ عنبر ۵۳۲ طبع المدینۃ المنورۃ ،

۱۸ تایار بغزار للخطیب ، ص ۲۹۱ ج ۳

۱۹ میزان الاعتدال ص ۳۲۲ و ۳۳۲ ج ۲۳۲ والمعنى في الصنف ، ص ۶۳۱ ج ۲ ترجمہ نہر ۵۹۶ ،

راوی یہں^{لئے} امام نسائی فرماتے ہیں متروک الحدیث، ابو علی صالح بن محمد کہتے ہیں
گمان ضعیفاً، وکان یضم الحدیث ایضاً ”ضعیف تھے اور حدیثیں گھر ابھی کرتے
تھے“

پچھے حضرت ابن عباس^{رض} کے تذکرے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ”تنیر المقیاس فی
تفسیر ابن عباس“ کامرو جنہ اہنی سے مردی ہے، اور علامہ سیوطی^{رحمۃ اللہ علیہ} نے اس کی سند
کو ”سلسلۃ الکذب“ قرار دیا ہے، اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہیں^{لئے}

مقاتل | مقاتل نام کے بھی دو صاحب معروف ہیں، ایک ابو بسطام مقاتل بن
حیان^{رحمۃ اللہ علیہ} اور دوسرا ابو الحسن مقاتل بن سلیمان، دونوں ایک ہی شہر کے
یعنی بخ کے باشندے ہیں، دونوں ایک ہی زمانے کے ہیں اور ایک ہی طرح کے اساتذہ
سے روایت کرتے ہیں، اس لئے بسا اوقات ان میں التباس ہو جاتا ہے، ان میں سے
اول الذکر (یعنی مقاتل بن حیان) راجح قول کی بناء پر ثقہ ہیں، اور جلیل القدر علام
میں سے ہیں، لیکن تفسیر کی کتابوں میں ان کا حوالہ کم آتا ہے، تفسیر کی کتابوں میں جب
صرف ”مقاتل“ لکھا جاتا ہی، تو اس سے مراد دوسرے صاحب (یعنی مقاتل بن سلیمان)
ہوتے ہیں، ایکونکہ دوسرے لقب سے مشہور ہیں، اور انہی کی روایات اور اقوال
کتب تفسیر میں زیادہ ہیں، لہذا یہاں ان کا حال قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا؛
مقاتل بن سلیمان (متوفی ۷۵۴ھ) نے ایک تفسیر لکھی تھی، جس کے حوالے کتب
تفسیر میں بکریت آتے ہیں، چند علماء نے ان کی تعریف کی ہے، لیکن اکثر محدثین نے
انھیں مجرد حرج اور ناقابل اعتبار بتایا ہے، تعریف کرنے والوں میں امام شافعی^{رحمۃ اللہ علیہ} ہیں جو

لہ میزان الاعتدال ص ۲۳۱ ج ۲۳ ذی ترمیم اسحیل بن عبد الرحمن الشدی الکبیر
لہ کتاب الضعفاء، والترذیکین للنسائی و مجمع التاییع الصغیر للخواری ص ۳۰۳ مطبوعہ شیخو پورہ ،
لہ تاییع بغداد للخطیب ص ۲۹۲ ج ۲ طبع پروردت ،
لہ الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲

فرماتے ہیں، "الناس عیال علی مقاتل فی التفسیر" (لوگ تفسیر کے معاملہ میں مقابل کے محتاج ہیں) نیز حضرت بقیہ رہ کہتے ہیں کہ حضرت شعبہ سے مقابل کے بارے میں بحث سوال کیا جاتا تھا، میں نے ہمیشہ ان کو مقابل کا ذکر خیر کرتے ہوتے ہی پایا اور حضرت مقابل بن حیانؓ ان کو علم کا سمندر کہا کرتے تھے،

لیکن ان چند تعریفی کلمات کو چھوڑ کر بیشتر ائمۃ حدیث نے ان پر شدید جرح اور تنقید کی ہے، ان پر سپلا اعتراض تو یہ ہے کہ وہ بے اصل روایات نقل کرتے ہیں، حضر وکیح فرماتے ہیں: "ہمارا ارادہ ہوا کہ ہم سفر کر کے مقابل کے پاس جائیں، لیکن وہ خود ہی ہمارے شہر میں آگئے، ہم ان کے پاس پہنچے، مگر ہم نے انھیں کذاب پایا، اس لئے ان سے کچھ نہیں لکھا،" امام جوزجانیؓ ان کے باسے میں کہتے ہیں "کان کذاباً بتسویر رباطِ صیط کذاب ہر،" امام ابن معینؓ فرماتے ہیں "لیس بثقة" (وہ ثقہ نہیں ہر) اور ایک اور موقع پر انہوں نے کہا "لیس بشیع" (وہ کچھ بھی نہیں)، عمرو بن عسلی رفلاسؓ فرماتے ہیں "مترد احادیث کن اب،" امام ابن سعدؓ کہتے ہیں: "اصحاب الحدیث یتفقون حدیثہ ویندرونہ" (علماء حدیث اس کی حدیث سے بچتے اور اسے منکر سمجھتے ہیں)، عبد الرحمن بن حکمؓ کہتے ہیں: "وہ قصہ گو تھا، لوگوں نے اس کی حدیثیں ترک کر دی ہیں،" ابراهامؓ اور امام عجلؓ فرماتے ہیں: "مترد احادیث کن اب،" امام نسائیؓ نے انھیں کذاب قرار دیا ہے اور ایک درسرے موقع پر فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثیں گھٹ کر منسوب کرنے والے چار آدمی بہت مشہور ہیں، ان میں سے ایک مقابل بھی ہیں،" امام دارقطنیؓ لکھتے ہیں "یکذب" (وہ جھوٹ بولتے ہیں، امام حاکمؓ لکھتے ہیں: "لیس بالقوی عن حم" رہ علماء کے نزدیک قوی نہیں ہیں)، عبد الصمد بن عبد الوارثؓ فرماتے ہیں کہ: "مقابل ہمارے پاس آئے اور یہیں عطاؓ کے واسطے کے کچھ حدیثیں سنانے لگے، پھر وہی حدیثیں ضحاکؓ کے واسطے سنائیں، پھر وہی احادیث عمرو بن شعیبؓ کے واسطے سے مسنائیں، ہم نے ان سے کہا کہ یہ روایات آپ نے کس سے سُنی ہیں؟ تو پہلے تو انہوں نے

ہم اک ان سب سے سنی ہیں، مگر پھر کہنے لگے، نہیں خدا کی قسم مجھے یا رہمیں کسی سے سنی ہیں۔ اور امام بخاری فرماتے ہیں: ”لَا شئَ الْبَتَّةُ“ (روه ہرگز کوئی شے نہیں) عبداللہ بن مبارک اُن کی عبارت گزاری کی تعریف کرتے تھے، لیکن اُن کی روایات قبول نہیں کرتے تھے تھے۔

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ عقائد کے اعتبار سے فرقہ مجسم میں سے تھے لیعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے اعضا، وغیرہ کے قال تھے، عباس بن مصعب مردی گئے ہیں کہ: ”مقاتل بن سلیمان اصلًا طَنَخَ کے باشندے تھے، پھر مرد میں آگئے، یہاں انہوں نے جامع مسجد میں قصہ گوئی شروع کر دی، یہیں پر اُن کے اور حبیم بن صفوان (ربانی فرقہ جہمیہ) کے درمیان مباحثہ شروع ہو گئے، چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھیں، اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: ”ہمارے یہاں مشرق کی جانب سے دو بڑے خبیث نظریات گھس آئے ہیں، ایک حبیم رکانظریہ، جو معطلہ میں سے تھا، اور ایک مقاتل رکانظریہ، جو مشتبہ ہیں سے تھا“، یعنی امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں، ”حبیم نے نفی صفات، میں غلو کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو کا عدم بنادیا، اور مقاتل نے اثاث رصفات، میں غلو کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوقات کے مشابہ قرار دیا، چنانچہ حافظ شخص اسے ذہبی نے اُن کو ضعفا میں شمار کر کے لکھا ہے: ”مقاتل بن سلیمان البلحی المفسر، هالک، کدن بہ وکیم والنسائی“، مقاتل بن سلیمان بھی مفسر تباہ حال ہیں، وکیم اور نسائی رنے انہیں کذاب کہا ہے۔

لہ یہ تمام اقوال ہندیب التہذیب ص ۲۸۵ تا ۲۸۲ ج ۱۰ سے مانوذیں،

لہ انتیاب الحکیم ص ۱۷۳ قسم ۲ ج ۳ ترجیہ نمبر ۱۹۰۶ء،

لہ مفتاح السعارة، طاش کبری زادہ (ص ۳۰۳ ج ۱) مطبوعہ دکن،

لہ ہندیب التہذیب حوالہ بالا،

لہ المغنی فی الضعفاء، للذهبی ص ۵ ج ۹، ۱۲

اور حافظ ابن حجر^ر نے ان کے احوال کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ ”کذبۃ و هجرۃ و رُجْعَا بالتجھیم“، رعلام نے ان کی تکذیب کی ہے اور آن کی روایات کو چھوڑ دیا ہے، اور ان پر فرقہ مجسمہ میں سے ہونے کا الزام بھی ہے۔

اتی شدید جرح و تنقید کے باوجود تفسیر کی کتابوں میں ان کے اقوال بڑی کثرت سے ذکر کئے جاتے ہیں، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اگرچہ رداشت حدیث میں ان پر بھروسہ نہیں ہو لیکن وہ وسیع المعلومات آدمی تھے، اور پوچھ کر انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا مشغل تفسیر ہی کو بنایا تھا، اور اس بارے میں مختلف طریقوں سے معلومات جمع کی تھیں، اس لئے ان کی تفسیر میں بعض کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں، اس لئے ان کی معلومات بھی مفسرین نے ذکر کر دی ہیں، تاکہ محقق علماء ان میں سے کوئی بات مفید اور صحیح پائیں تو قبول کر لیں ورنہ رد کر دیں، اس سلسلے میں بعض علماء کے اقوال یہ ہیں:-

امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ: ”ان کے پاس کچھ کتابیں تھیں جنہیں دیکھتے رہتے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ فترآن کا کچھ علم ان کے پاس تھا“، حضرت ابراہیم ؓ ختمی فرماتے ہیں کہ: انسا جمع مقاتل تفسیر الناس و فتن علیہ من غیر سماع (مقالات) نے مختلف لوگوں کی تفسیریں جمع کر کے ان کے مطابق تفسیر کی ہے، مگر کسی سے ان تفسیر کو برآہ راست نہیں سننا، عباس بن مصعب مروزیؓ فرماتے ہیں: ”کان حافظاً للتفسیر لا يضبط الاستناد“ (انھیں تفسیر تو یار تھیں مگر سند یاد نہ تھی)

۱۰ تقریب التہذیب، ص ۲۴۲ ج ۲ ترجمہ نمبر، ۱۳۳

۱۱ تاریخ بغداد للخطیب، ص ۱۶۱ ج ۱۳، خطیب بغدادیؓ نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک دن خلیفہ منصور بن یحیا ہوا تھا، ایک سکھی بار بار آکر اس کے چہرے پر سٹپر ہی تھی، یہاں تک وہ پریشان ہو گیا، اتنے میں مقائل بن سیمان آگئے، منصور نے ان سے پوچھا: ”تمہیں پتہ ہے کہ الشرنے مسکھی کر کیوں لے پیدا کیا ہے؟“ مقائل نے کہا: ”ہاں! اس نے پسیدا کیا ہے کہ اس کے ذریعہ جابر قسم کے لوگوں کو ذلیل کرے؟“ منصور خاموش ہو گیا، (ص ۱۴۲ ج ۱۳)

لیعم بن حماد کہتے ہیں کہ "میں نے حضرت سفیان بن عیینہؓ کے پاس مقائل کی ایک کتاب دیکھی تو ان سے پوچھا کہ؟ کیا آپ تفسیر میں مقائل کی روایات نقل کرتے ہیں؟" انھوں نے جواب میں کہا: "نہیں، لیکن میں اس سے مدد لیتا ہوں" حضرت عبداللہ بن المبارکؓ نے اُن کی تفسیر دیکھی تو کہا "اس میں علم تو بڑا عجیب ہے، کاش! کہ اس کی اسناد بھی (صحیح) ہوتیں" حضرت حاد بن عمروؓ نے فرمایا "جو باتیں یہ بیان کرتے ہیں اگر انھیں علم کہنا صحیح ہو تو یہ کتنے بڑے عالم ہیں؟" امام ابن جانؓ فرماتے ہیں کہ: "وہ یہ ورنصاری سے قرآن کا علم حاصل کرتے تھے جو ان کی کتابوں کے موافق ہے، اور خلیلیؓ کہتے ہیں: "اہل تفسیر کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہے، اور وہ وسیع العلم تھے، لیکن حفاظ حدیث نے روایت میں اُن کو ضعیف قرار دیا ہے"

لہذا مقائل کی تفسیروں پر روایتی نقطہ نظر سے تو ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہئے البتہ لغت و ادب، تاریخ و قصص، کتب سابقہ کے حوالوں اور عام معلومات کے لحاظ سے اُن کی تفسیر میں کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں جن سے محقق اہل علم کچھ نہ کچھ فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں، اس لئے عام مفسرین نے ان کو نقل کرنے میں قباحت نہیں سمجھی،

ربیع بن السن [ان کا نام ربیع بن انس بھکری الحنفی ہے، یہ اصلاً بصرہ کے باشندے ہیں، پھر خراسان چلے گئے تھے، اس لئے ان کو بصری بھی کہا جاتا ہے اور خراسانی بھی، انھوں نے حضرت انسؓ، حضرت ابوالعالیٰؓ اور حضرت حسن بصریؓ وغیرہ سے روایات لی ہیں، امام عجلیؓ، ابو حاتمؓ اور امام نسائیؓ نے انکے لئے صدوقؓ یا "لیس بد بائس" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، جو ادنی درجہ کی توثیق کو لے تہذیب التہذیب ص ۲۸۳ تا ۲۸۰، ج ۰، او میزان الاعتدال ص ۳، ج ۱، طبع مصر، مقائل بن سلیمان کے بارے میں جتنے اقوال ہم نے تہذیب التہذیب سے بلاستدق نقل کئے ہیں ان کی سند کے لئے ملاحظہ ہوتا یا بخیل غدار للخطیبؓ ص ۱۶۰ تا ۱۷۹،

۵۷ تہذیب التہذیب ص ۲۳۹ ج ۳ والبحرح والتعديل لابن ابی حاتمؓ ص ۲۵۳ ج ۱ قسم ۲ ترجمہ نمبر ۵۷ طبع دکن،

البته حضرت یحییٰ بن معینؓ فرماتے ہیں: "کان یتشیع فیفرط" روه شیعہ تھے اور رشیعہ میں، افراط سے کام لبنتے تھے، اور امام ابن حبانؓ نے انھیں "ثقات" میں شارکیا کر اور ساتھ ہی کہا ہے کہ "ابو جعفر رازیؑ نے ان کی جور دلایات ذکر کی ہیں لوگ ان سے احتراز کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کی روایات میں اضطراب بہت ہے" اور حافظ ابن حجرؓ نے ان کے بارے میں خلاصہ یہ ذکر کیا ہے کہ: "خندوق لہ ادھام رہی بالتشیع" روه پنج بولتے ہیں، مگر ایک توان کو روایات میں وہم بھی ہو جاتا ہے دوسرے ان پر تشبیح کا الزام ہے)

علیتۃ العوْنَی | ان کا پورنام ابو الحسن عطیہ بن سعد بن جنادۃ العوی اصحاب ری
[رمذانی اللہ عزوجل] ہے، یہ کوفہ کے باشندے تھے، تابعین میں سے
ہیں اور حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عباسؓ
اور حضرت زید بن ارفتمؓ وغیرہ سے روایات نقل کرتے ہیں، ان کو امام نسائیؓ نے
"ضعیف" کہا ہے، نیز آمام حسنؓ وحیی بن سعید القطاؓ، ہبشیمؓ، ابو حاتمؓ، ابن عذرؓ
جوز جانیؓ، ابن حبانؓ، امام ابو رازد اور ساجیؓ وغیرہ نے بھی ان کی تضعیف کی ہے، اور
ابن سعدؓ نے اتنا لکھا ہے کہ: "لہ احادیث صالحۃ و من الناس من لا يعنی
بہ" روه شہیک حدیثیں روایت کرتے ہیں، اور بعض لوگ ان سے استدلال نہیں کرتے
اور امام ابو زرعہؓ نے انھیں "لین" کہا ہے جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے، اور بھی بن معینؓ
ان کو "صالح" کہتے ہیں، یہ بھی ہلکی قسم کی توثیق ہے، دراصل ان پر چار قسم کے اعتراض
ہیں، پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انھوں نے روایات کی سند میں مغالطہ الگیری کا ادا کا
کیا ہے، امام احمدؓ اور امام ابن حبانؓ نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ یہ بھلی کے

۱۔ تہذیب التہذیب ص ۲۲۱ ج ۳

۲۔ تقریب التہذیب ص ۲۲۳ ج ۱

۳۔ کتاب الضعفاء، والمرذکین، للنسائیؓ، مع التاریخ الصغری للخاریؓ، ص ۱۰۱،

پاس جاکر ان سے تفسیر کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور ان سے روایات لیتے تھے،
لیکن جو نئے مکمل ضعیف اور بدنام ہیں (جیسا کہ آگے آ رہا ہے) اس لئے انہوں نے انکی
کنیت اپنی طرف سے ابوسعید رکھ لی تھی، اور جو روایات یہ مکملی سے سنتے ان کو مکملی
کا نام لینے کے بجائے ابوسعید کی کنیت سے روایت کر دیتے، اور جو نکم عطیۃ الوفی مشہور
صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے بعض احادیث مُنْبَحِث تھیں، اس لئے ناداقتنا لوگ یہ
سبجتے... کہ یہ روایت بھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے مردی ہو گی، حالانکہ وہ حقیقت
وہ مکملی کی روایت ہوتی تھی۔

اُن پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شیعہ تھے، اور تمیسرا اعتراض یہ ہے کہ روایات
نقل کرنے میں غلطیاں کرتے تھے، اور جو کتنا اعتراض یہ ہے کہ مدنس تھے، چنانچہ حافظ
ابن حجرؓ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "قدرت یخطیع کثیراً، کان شیعیاً منتسلاً"
رُسْخَ بُونَنْ وَالَّى هُنْ مُغْرِبُ غُلَطِيَانَ بِهِتَ كَرَتَنَ بِهِنْ شِيعَهَ تَحْتَهُ اور مدنس تھے، اور حافظ
شمس الدین ذہبیؓ ضعفا میں اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "تَابِیٰ مشہور
مجبع علیٰ ضعفه" (مشہور تابی ہیں، اُن کے ضعفت پر اجماع ہے) البته امام ترمذیؓ
نے اُن کی بعض روایات کو حسن فستار دیا ہے، لیکن امام ترمذیؓ کی اصطلاح میں
حسن سے مراد ہر وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی راوی ہم تم بالکذب (جھوٹ
کا ملزم) نہ ہو، اور وہ ایک سے زائد طریقوں سے مردی ہو، اس لئے اُن کی تحسین سے
اُن اعتراضات کا دفعہ نہیں ہوتا جو عطیۃ الوفی پر وارد کئے گئے ہیں،

۱۷ تہذیب التہذیب ص ۲۲۵ و ۲۲۶ ج ۴

۱۸ تہذیب التہذیب ص ۲۲۳ ج ۰۲

۱۹ المعنی فی الضعفاء ص ۲۲۶ ج ۲ ترجمہ نمبر ۳۱۳۹

۲۰ الاتقان ص ۱۸۹ ج ۲ نوع ن۵

۲۱ دیکھئے کتاب العلل للترمذیؓ

عبد الرحمن بن زيد بن اسلم | ان کا پورا نام عبد الرحمن بن زید بن اسلم العددی المدنی (رمتو فی علیلہ) ہے، یہ حضرت زید بن اسلمؓ کے صاحبزادے ہیں جن کا تذکرہ سچی آچکھا ہے، ان کو بیشتر محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، صرف امام بن عدریؓ کا قول ہے کہ ”له احادیث حسان“ وہو من احتمال الناس وصدقہ بعضہم وہو من یکتب حدیثہ ”لہ اسن سے حسن احادیث مردی ہے“ وہ ان راویوں میں سے ہیں جنہیں لوگوں نے گوارا کیا ہے، اور بعض حضرات نے ان کی تضییغ کی ہے، ان کی حدیثیں بھی جاسختی ہیں (باقی تمام علماء جرح نے ان کی تضییغ کی ہے، امام بخاریؓ لکھتے ہیں: ”ضعفه علی جدّاً علی ابن المدینی“ لئے ان کو بہت ضعیف کہا ہے، امام نسائیؓ لکھتے ہیں: ”ضعفه علی“ امام احمدؓ اور امام ابو زرعۃؓ نے بھی ان کی تضییغ کی ہے، امام ابو داؤدؓ فرماتے ہیں کہ ”زید بن اسلمؓ کے تمام بیٹے ضعیف ہیں“ امام ابو حاتمؓ فرماتے ہیں کہ ”ابنی ذات میں صالح آدمی تھے، مگر حدیث میں بہت کمزور“ امام ابن خزیمہ رحمتہ اللہ علیہ ہے: ”لیس هو همن يحتاج اهل العلم بعنی پیغمبر“ لسوع حفظہ، وہو جل صناعتہ العبادۃ والنقشت“ (رده ان لوگوں میں سے نہیں جن کی حدیث سے اہل علم استلال کر سکیں، کیونکہ ان کا حافظہ کمزور تھا، ان کا اصل کام عبادت و زهد ہے)۔ امام ابن حبانؓ فرماتے ہیں: ”کان یقلى الاخبار وهو لا يعلم حتى كثرة ذلك في روایته من رفع المراسل وباسناد الموقوف فاستعن بالترك“ (وہ روایات کو بغیر شعوری طور پر پڑھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی روایت میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ مرسل کو مرفع بنایا اور موقوف کو مُسند کر دیا، اس نے وہ مُتحقِّق ترک ہیں)، امام طحاویؓ فرماتے ہیں: ”حدیثہ عند اهل العلم بالحديث في النهاية من الضعف“ (علماء)

۱۰- *التایع الکبیر للبخاری*، ص ۲۸۷ ج ۳ قسم اترجمہ نمبر ۹۲۲،
۱۱- کتاب الصنفان والمتروکین، مع التایع الصغير ص ۲۹۶

حدیث کی نظر میں ان کی احادیث اہمیتی ضعیف ہیں، اس کے علاوہ اہم مالک ہے۔ امام ابن معین^{رض}، دراوردی^{رض}، معن^{رض}، امام ابن سعد^{رض}، ساجی^{رض}، حاکم^{رض}، ایونیم^{رض} اور جوزجانی^{رض} سے بھی اُن پر سخت جرح منقول ہے، اور علامہ ابن جوزی^{رض} نے لکھا ہے: "اجماعاً على ضعفه" (ان کے ضعفت پر اجماع ہے) چنانچہ ابن جوزی^{رض} نے ان کے بارے میں فیصلہ یہی کیا ہے کہ وہ ضعیف ہے^۱

بکلی اُن کا پورا نام ابوالنصر محمد بن السائب بن بشربیع عزد بن عبدالحارث
بن عبد العزیز الكلبی (متوفی ۲۳۴ھ) ہے، یہ قبیلہ بنو کلب کی طرف
منسوب ہیں، کوفہ کے باشندے تھے، اور تاریخ راساب اور تفسیر میں مشہور ہیں، علماء
اُن کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے پر متفق ہیں، صرف امام ابن عری^{رض} نے اتنا لکھا
ہے کہ "لہ غیر ما ذکرت احادیث صالحۃ، و خاصۃ عن ابی صالح، و لہ
معروف بالتفسیر و لیس لاحدا اطول من تفسیرہ، و حدث عنه ثقات
من الناس و رضوہ في التفسیر و امام في الحدیث قلمه مناکیر" (ان کی جو
حدیثیں میں نے ذکر کی ہیں اُن کے سوا ان کی حدیثیں ٹھیک ہیں، خاص طور سے وہ
احادیث جو ابو صالح سے مردی ہیں، وہ تفسیر میں مشہور ہیں، اور کسی کی تفسیر ان کی
تفسیر سے زیادہ طویل نہیں ہے، اور ان سے بعض ثقہ لوگوں نے بھی حدیثیں لی ہیں
اور تفسیر میں انھیں گوارا کیا ہے، البته حدیث میں اُن کی روایات منکر ہیں، لیکن
باتی تمام اہل علم نے اُن پر شدید جرح کی ہے،

ان پر سب سے سلیمان الزام جھوٹ روایتیں بیان کرنے کا ہے، محترم سلیمان^{رض}
اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ: "کوفہ میں دو کذب تھے، ان میں سے ایک کلبی ہیں" تفسیر
میں ان کی بیشتر روایات ابو صالح سے مردی ہیں، لیکن ابو جناب کلبی^{رض} بیان کرتے ہیں

۱۔ محدث تہذیب التہذیب ص ۲۰۰، آتا ۹۶، اج ۲۹، مزید ملاحظہ مولیٰ میر ان الاعتدال ص ۵۶۲ ج ۲

۲۔ محدث تہذیب التہذیب ص ۲۸۰، اج ۲۸، ترجمہ بندر ۹۲۱

کہ ابو صالح نے قسم کھا کر کہا ہو کہ میں نے بکلی کو کوئی بات تفسیر کی نہیں سنائی، اور سفیان ثوریؓ فرمائی ہیں کہ بکلی نے ایک مرتبہ خود اعتراض کیا کہ ”میں نے ابو صالح سے ابن عباسؓ کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں، تم انھیں روایت نہ کرو“ حضرت سفیان ثوریؓ سے بعض احادیث بکلی کی سند سے مردی ہیں، اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ دیا کہ جب سفیان ثوریؓ جیسا محدث بکلی سے روایت کرتا ہے تو وہ ثقہ ہی ہوں گے، لیکن اسکی حقیقت حضرت ابو حامیمؓ نے بیان فرمائی ہے کہ ”حضرت سفیان ثوریؓ کا مقصد ان سے روایت لینا ہنسیں تھا، بلکہ انھوں نے بعض اوقات انہما تعجب کے لئے بکلی کی روایات میں سُنائیں، اس پر بعض حاضرین نے ان روایات کو سفیان ثوریؓ سے نقل کر دیا“ اور حضرت قرۃ بن خالدؓ کہتے ہیں کہ ”لوگوں کا خیال عام طور سے یہ تھا کہ بکلی جھوٹ بولتے ہیں“

ان پر درملا اعتراض یہ ہے کہ یہ اہمائي غالی شیعہ تھے، حضرت ابو حزبؓ کہتے ہیں کہ ”میں نے اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک مرتبہ حضرت جرجسیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے انھر کلپنے لگتے، حضرت علیؑ وہاں بیٹھتے تھے تو جرجسیل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علیؑ پر نازل کر دی ”ابل حبیبؓ“ کا یہ قول مشہور محدث یزید بن زریعؓ کے سامنے نقل کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ”میں نے بکلی سے یہ بات تو نہیں سُتی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہے تھے کہ میں سبائی ہوں میں سبائی ہوں“ یہی قول حافظ ذہبیؓ نے ہتمامؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ ”میں نے اسے کہتے ہوئے سنائے کہ میں سبائی ہوں“ اور امام ابن حبانؓ فرماتے ہیں ”بکلی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا

ملہ تمام اتوال تہذیب التہذیب نقل کئے جا رہی ہیں، البتہ حافظ ذہبیؓ نے خود سفیان ثوریؓ سے نقل کیا ہو کہ انھوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا ”بکلی سے پچھو“ ان پر جھاٹا گیا کہ ”آپ تو اس کو روایت کرتے ہیں؟“ اس پر انھوں نے فرمایا: ”میں اس کے جھوٹ پچھ کو پچھاتا ہوں“ (میزان الاعدال ۵۵۳)

ملہ تہذیب التہذیب ص ۸۱۱، ۱۸۱

جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی رفات نہیں ہوتی، وہ دوبارہ دنیا میں آتیں گے اور اس کو ایسے وقت میں عدل و انصاف سے بھر دیں گے جب وہ ظلم دجور سے بھری ہوگی۔ یہ لوگ جب کوئی بادل ریکھتے ہیں تو کہتے ہیں، "امیر المؤمنین اس میں ہیں"

خلاصہ یہ کہ کلبی قدیم اولیٰ کے مفسرن میں ضعیف ترین مفسر ہیں، امام احمدؓ سے پوچھا گیا کہ، کیا کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟ تو انھوں نے فرمایا، "نہیں" حافظ ذہبیؒ نے ان کا اطویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں، "لا یحل ذکرہ فی الکتب فَكِيفُ الْاحْتِجَاجُ بِهِ؟" رکتابوں میں اُن کا ذکر ہی درست نہیں، تو ان سے استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے،

آخر میں تفتین طبع کے لئے ان کا ایک لطیفہ پیش خدمت ہے، وہ خود کہتے کہ میں نے یادداشت کا مظاہرہ بھی ایسا کیا ہے کہ کسی نے نہ کیا ہو گا، اور بھگول کا مظاہرہ بھی ایسا کیا کہ کسی نے نہ کیا ہو گا، یادداشت کا داقعہ تو ہے کہ میں نے پورا قرآن چھپا ساتھ میں یاد کر لیا تھا، اور بھگول کا عالم یہ ہے کہ ایک روز میں نے اپنا خط بنانے کے لئے ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑا، چاہتا یہ تھا کہ مٹھی سے نیچے کے باولوں کو کاٹ دوں، لیکن بھگول کر مٹھی کے ادپر سے پوری ڈاڑھی کاٹ ڈالی تھی

یوں تو تفسیر کی رکتابوں میں اور بھی بہت سے لوگوں کے نام آتے ہیں، لیکن جن

لہ میزان الاعتدال ص ۵۵۸ ج ۳، ۳۷۶ ایضاً ص ۵۵۹ ج ۳،
لہ اوانی بالوفیات للصفدریؒ ص ۸۳ ج ۳ مطبع باشیہ دمشق ۱۹۵۳ء و میزان الاعتدال
ص ۵۵۶ ج ۳، یکن خطیب بغدادیؒ نے یہ قصہ اُن کے بجائے اُن کے بیٹے ہشام ابن الكلبی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے،

(تایب بندار ص ۲۶ ج ۱۲ ترجمہ ہشام ابن الكلبی)

حضرات کا نذکرہ اس باب میں آگیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کے حوالے تفسیر میں ہٹائی کر شرت سے آتے ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہو گا کہ بعد کی تمام تفاسیر کا بنا بری مآخذ یہی حضرات ہیں، اور بیشتر تفاسیر انہی کی روایات اور اقوال کے گرد دھوتی ہیں، اس لئے ان حضرات کے احوال علوم ہونے سے انشا اشد ان تمام تفاسیر کے مطابع میں بصیرت پیدا ہو گی جھنوں نے تفسیر بالرواۃ کا طریقہ خستیار کیا ہے، مثلاً:-
تفسیر ابن جریر، تفسیر الدرا المنشور اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ، یا جن میں سندر کے بغیر قدیم امکہ تفسیر کے اقوال بیان ہوتے ہیں، جیسے روح المعانی، تفسیر ہفت طبیٰ اور متاخرین کی دوسری تفاسیر

متاخرین کی چند تفاسیر

جیسا کہ اس باب کے شروع میں عرض کیا جا چکا ہے، ہم نے اس کتاب میں علم تفسیر کی مفصل تاریخ بیان کرنے کے بجائے صرف قرون اولی کے بعض آن مفسرین کے تعارف پر استفادة کیا ہے جن کی روایات اور اقوال پر پورے علم تفسیر کی بنیاد ہے، بعد میں مختار آن کریم کی جو تفسیریں لکھی گئیں، اور علاوہ امتنانے جس پہلو سے قرآن کریم کی خدمت کی وہ ایک طویل الذیل موضوع ہے، جو مستقل تصنیف چاہتا ہے، یہ دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ تفسیر قرآن کا حق ادا ہو چکا ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شیعہ رسلالت کے پروانوں نے اشد تعالیٰ کی اس عظیم کتاب کی خدمت میں صرف محنت و عرق ریزی ہی سے نہیں، جزوں عشق سے کام لیا ہے، چنانچہ یہ دعویٰ بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے، کہ دنیا میں نہ کسی کتاب کی اتنی شرحیں لکھی گئی ہیں نہ اُس کے لئے ترجیح ہوئے ہیں، اور نہ اس کی مختلف پہلوؤں سے اس قدر خدمت کی گئی ہے، حالانکہ اس مقصد کے لئے کسی بھی دُر میں کوئی غالی تنظیم قائم نہیں رہی،

بہر کیف؛ آج ان تمام خدمات کی روشنی میں مختار آن کریم سے استفادہ بہت

بہت آسان ہو، اور جو شخص کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا چاہے اس کے لئے پورے کتب خلندے موجود ہیں، اگر صرف ان تفسیروں کا تعارف کر لیا جائے جو آجکل دستیناً ہیں تو بھی اس کے لئے ایک مستقل تالیف چاہئے، لیکن یہاں میں صرف ان چند تفاسیر کا مختصر نزدکہ کرنا چاہتا ہوں جن کا احقر پر ذاتی طور سے بڑا ناقابل فراموش احسان ہے، اور جو احقر کو سلف کے تفسیری علوم کا خلاصہ محسوس ہوتی ہیں، اور جب کبھی کسی آیت کی تفسیر میں کوئی الجھن پیش آئی ہے احقر نے سب سے پہلے اپنی کی طرف رجوع کیا ہے، اور جن کے پارے میں میرنا چیز خیال یہ ہو کہ ہم چیزے لوگوں کے لئے جو منیخم تفاسیر کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کر سکتے یہ کتابیں بڑی حد تک دوسری کتب کی سمجھی پوری کردیتی ہیں،

(۱) تفسیر ابن کثیر | ان میں سرفہrst تفسیر ابن کثیر ہے، یہ حافظ عاد الدین ابو الفداء اسماعیل بن الحنفیہ ابن حفص عربن کثیر الشافعی (متوفی ۷۳۸ھ) کی تصنیفت ہے، اور چار جلدوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کو تفسیر ابن عجیر کا خلاصہ کہنا چاہئے، حافظ ابن کثیر نے جو طریقہ اختیار فرمایا ہو وہ تفسیر بالرواۃ کا طریقہ ہے، یعنی ہر آیت کے تحت وہ پہلے اس کی تفسیر کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں، پھر اس کے مختلف کلمات یا جملوں کی تفسیر میں انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اصحابہؓ و تابعینؓ کی جتنی روایات ملتی ہیں وہ ذکر فرماتے ہیں، لیکن ان سے پہلے کے جن مفسرین نے تفسیر بالرواۃ کا طریقہ ختیار فرمایا ہے، مثلاً حافظ ابن جریرؓ ابن مردیؓ، اور ابن ماجہؓ وغیرہ، انہوں نے تفسیری روایات کو صرف صحیح کرنے کا کام کیا ہے، اُن کی جھان پٹک نہیں کی، لیکن حافظ ابن کثیرؓ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ حلیل القدر محمدث بھی ہیں، اور روایات پر جرح و تفہید کے فن سے واقع ہیں، چنانچہ انہوں نے اول تو ان ضعیف اور موضوع روایات کو بکثرت چھانٹ دیا ہے جو مقدمیں کی کتابوں میں لکھی چل آرہی تھیں، دوسرے جو کمزور روایات وہ لاتے ہیں عموماً اُن کی علی اسناد پر بھی تنبیہ فرمادی ہے، (مثلاً ملاحظہ ہو

ص، ۲۱۳ ج اوص، آتا ۲۱ وص ۲۳ وص ۳ وص ۵۰۸ وص ۵۱۹ وص ۵۲۰ ج ۲۲ فیض
 تفسیر بالرواية کی کتاب میں اکثر دبیشتر اسرائیلیات سے بریز پڑیں، لیکن ایسی روایات
 کے بارے میں حافظ ابن کثیرؓ کا طرزِ عمل اہتمامی محاط، صاف سخرا اور خالص قرآنؐ^۱
 سنت پر مبنی ہے جس کی تفصیل خود انہی کے الفاظ میں "اسرائیلیات" کے عنوان کے
 تحت آچکی ہے، چنانچہ انہوں نے اول تو اپنی کتاب میں اسرائیلی روایات زیادہ نقل
 نہیں کیں، اور جہاں نقل کی یہیں رہاں عموماً یہ بتا دیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں،
 مثلًا سورہ صافات میں انہوں نے بعض لیے آثار نقل کے یہیں جن سے معلوم ہوتا ہے
 کہ ذیح حضرت الحسن علیہ السلام تھے، اور اس کے بعد لکھا ہو کہ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے"
 لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاجرار سے ماخوذ ہیں، ان روایات میں ہر طرح
 کی رطب دیا ہے باقی جمع تھیں، اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی
 بھی ضرورت نہیں ہے" (ص، ۱ ج ۲)

بہر کیفیت اور ایتی لحاظ سے تفسیر ابن کثیرؓ سے محاط اور مستند تفسیر ہے لیکن
 اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس تفسیر میں درج ہر روایت درست ہے، بلکہ
 بعض مقامات پر حافظ ابن کثیرؓ بھی ضعیف روایات کو کسی تنبیہ کے بغیر نقل کر گئے
 ہیں، مثلًا سورہ توبہ کی آیت وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَنَ اللَّهَ الَّذِي كہ تفسیر کرتے ہو تو حضرت
 شعبانؓ کی جو روایت انہوں نے نقل کی ہے (ص ۲۳، ۲ ج ۲) وہ محدثین کے نزدیک
 ضعیف ہے،

اس کے علاوہ جن مفسرین کے بارے میں ہم نے پہچھے ذکر کیا ہے کہ وہ ضعیف
 تھے، مثلًا مقاتل، بلکی اور عطیۃ المعنی دغیرہ، آن کے اقوال بھی انہوں نے بکرشت ذکر
 کئے ہیں، لیکن عموماً ان کے دسی اقوال بغیر تنقید کے لئے ہیں جو کسی دلیل شرعی کے خلاف
 نہیں ہیں، لہذا ان کی حیثیت مستند روایت کی نہیں بلکہ مفسرین کے اپنے اقوال کی ہوئی
 تفسیر کبیرؓ دوسری کتاب امام رازیؓ کی تفسیر کبیر ہے، اس کا اصل نام
 "تفسیر کبیرؓ سماfatih al-nibab" ہے، لیکن تفسیر کبیر کے نام سے زیادہ مشہور ہے،

یہ امام فخر الدین محمد ابن حنیف الدین عمار رازی (متوفی ۲۱۰ھ) کی تصنیف ہے جس طرح روایت کے اعتبار سے تفسیر ابن کثیر نہایت جامع اور بے نظیر تفسیر ہے، اسی طرح علوم و رایت کے لحاظ سے تفسیر کبھی کوئی جواب نہیں، بعض لوگوں نے اس کتاب پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ: فیہ کل شیع الائالتفسیر "راس میں تفسیر کے سواب پکھ ہے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ اس کتاب پر پڑا بزرگ و سلطنتی ظلم ہے، اس لئے کہ حل و فرآن کے لئے اس تفسیر کا کوئی جواب نہیں ہے، اس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:-

(۱) ہر آیت کی تفسیر، ترکیب سخنی اور شانِ نزول سے متعلق سلفت کے جتنے اقوال ہوتے ہیں، امام رازی ان کو نہایت مرتب اور منضبط انداز میں پوری شرح و وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جس سے آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں کتنے اقوال ہیں، اور کیا کیا؟ دوسری تفسیروں میں یہ مباحثہ عموماً منتشر اور بکھر کر ہوتے ہوئے ہیں، جن سے خلاصہ نکالنے میں وقت لگتا ہے، لیکن تفسیر کبھی میں یہ سب بائیں سکم جا اور منضبط طریقے سے مل جاتی ہیں،

(۲) قرآن کریم کے اندازِ بیان کی شوکت و عظمت کو پوری تفصیل سے بیان فرماتے ہیں،

(۳) آیت سے متعلق جو فقہی احکام ہوتے ہیں انھیں تفصیل دلائل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں،

(۴) آیت میں جن باطل فرقوں اور عقول پرستوں نے کوئی تحریک کی ہوتی ہے اسے بنام و کمال ذکر کر کے اس کی مدلل اور مفصل تردید کرتے ہیں، اس طرح اس میں جمیعہ، معترض، مجتہد، اباجیہ اور ان کے زمانہ کے تمام باطل فرقوں کی تردید موجود ہے،

لہ الاتقان ص ج ۲ دیجیٹ المسلمین بکلام رب العالمین،
لیکن ہماری ناچیز راستے میں اگر یہ فقرہ کسی کتاب پر راست آسکتا ہے تو وہ ہمارے دور کی تفسیر ابجوہر للطفاویؒ ہے،

(۵) تفسیر کیریکی ایک خصوصیت، جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہو اس کا بیان کیا ہوا ربط آیات ہے، واقعیت ہے کہ آئینوں کے درمیان ربط و منابعت کی وجہ وہ بیان فرماتے ہیں وہ عموماً اتنی بے تکلف، دشمن اور معمول ہوتی ہے، کہ اس پر دل نصر مطمئن ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے قرآن کریم کی عظمت کا غیر معمولی تاثر پیدا ہوتا ہے،
 (۶) قرآنی آیات اور اسلامی احکام کے اسرار حکم پر بھی اُن کا کلام خوب ہوتا ہے،

خلاصہ یہ کہ تفسیر کیرا نہایت جامع تفسیر ہے، اور احقف کا ذاتی تجربہ یہ ہو کہ حل قرآن کے سلسلہ میں جب بھی کوئی دشواری پیش آئی ہے، تفسیر کیریکی نے اس معاملے میں غیر معمولی رہنمائی کی ہے، عموماً لوگ اس کا طول بیان دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں، (حدیقہ) کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر اس کے ۵۰ اصناف میں آئی ہے، لیکن یہ تطبیل شروع میں زیادہ ہے، بعد میں اتنی نہیں رہی، اور اس سے استفادہ کیا جائے تو علم و معرفت کے گورنریاں باتھا کتے ہیں، البتہ اس تفسیر کے بارے میں چند باتیں ذہن نشین رہنی چاہئیں۔

(۱) امام رازیؒ نے یہ تفسیر سورہ فتح تک الحکمی تھی، کہ وفات ہو گئی، چنانچہ سورہ فتح کے بعد ایک دوسرے عالم قاضی شہاب الدین بن خلیل البخول الدمشقی (متوفی ۳۹۳ھ) یا شیخ بجم الدین حسین بن محمد القبوری (متوفی ۴۷۷ھ) نے مکمل فرمایا، لیکن کمال یہ ہے کہ امام رازیؒ کے اندازِ تکارش کو اس طرح برقرار رکھلے ہے کہ اگر کسی کو یہ حقیقت معلوم نہ ہو تو وہ کبھی شبہ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ امام رازیؒ کے سوا کسی اور کی تحریر ہے،

(۲) تفسیر کیریکی روایات دوسری تفاسیر کی طرح رطب دیا جس کا مجموعہ ہیں،
 (۳) معروفے چند مقامات پر امام رازیؒ نے جمورو مفسرین سے الگ راہ اختیار کی ہے، (مثلاً لم یکذب ابراہیم الا ثلت کن بات کی حدیث صحیح کو رد کر دیا ہے)

ہذا جہاں انہوں نے تقدیر اختیار کیا ہے دہلی علی جہور بھی کے مسلک پر ہونا چاہتے ہیں،
(۳۲) تفسیر ابی سعود [ابی یہ قاضی ابوالسعود محمد بن محمد العادی الحنفی رمذانی (متوفی ۱۴۷۰ھ)] کی تصنیف ہے، اور بلاشبہ ان کی علمی گہرائی، وقت نظر اور تدریب ترقیاتی کا شاہ ہے کار ہے، یہ سچل پاپیچ جلد وں پر مشتمل ہے، اور اس میں اختصار کے ساتھ قرآن کریم کی بڑی لذتیں تفسیر کی گئی ہے، اس کی خمیاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم قرآن، تناسب آیات اور بلاغت کے بڑے نفیں نکالتے ہیں، جن سے قرآن کریم کی مراد سمجھنے سہیست، آسانی بھی ہو جاتی ہے، اور قرآن کریم کے مجرماں اور ازیز بیان کی عظمت بھی سمجھیں آئے گلتی ہے،

(۳۳) تفسیر لفڑی [اس کا پورا نام "الجامع لأحكام هفت آن" ہے، یہ انڈس کے مشہور اور محقق عالم علام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرج لفڑی (متوفی ۱۴۷۰ھ)] کی تصنیف ہے، جو فقہ میں امام مالکؓ کے مسلک کے پروتھے، اصل میں اس کتاب کا بینایادی موصوع تو قرآن کریم سے فہمی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انہوں نے آیتوں کی تشریع، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعواب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، خاص طور پر روزمرہ کی زندگی کے لئے قرآن کریم سے جو ہدایات ملکی ہیں ان کو اچھی طرح واضح فرمایا ہے، اس کتاب کا مقدمہ بھی نہایت مفصل اور علوم قرآن کے اہم مباحث پر مشتمل ہے، یہ تفسیر بارہ جلد وں میں ہے اور بار بار شائع ہو چکی ہے،
(۳۴) روح المعانی [المثانی] [اس کا پورا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظيم" دیجیع رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۷۰ھ)] کی تصنیف ہے، اور یہ بخاری کے مشہور عالم علامہ محمود آلو حنفی بالکل آخری دور کی تصنیف ہے، اس لئے انہوں نے کوشش کی ہے کہ سابقہ تفاسیر کے اہم مباحث اس میں جمع کر دیں، چنانچہ اس میں لغت، نحو، ادب، بلاغت، فقرہ،

حقاند، کلام، فلسفہ، ہدیت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی بیسوط بھیں کی ہیں، اور کوئی شیخ یہ فرمائی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشتہ تشنہ نہ رہے، روایات حدیث کے معاملہ میں بھی علامہ آلوسی دو سکے مفسرین کے مقابلہ میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کو سابقہ تفاسیر کا خلاصہ کہنا چاہئے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مردو سے بے نیاز نہیں ہو سکتا،

یہ پانچ تفاسیر احقر کے ناچیز زدن کے مطابق ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف انہی پر اعتماد کر لے تو انشاء اللہ مجموعی چیزیت سے اُسے دوسرا تفاسیر سے بے نیاز کر دیں گی، یہ احقر کی ذاتی راستے تھی، بعد میں اپنے خدموم بزرگ حضرت مولانا ہمید محمد یوسف بوڑی صاحب مظلہم العالی کے ایک مقالے سے اس کی تقریباً حرفاً بہ حرفت تائید ہو گئی، فللہ اللہ موصوف اپنے گرانقدر مقالے "یقینۃ البیان" میں تحریر فرماتے ہیں :-

پتو نکم علی عزیز کم ہے، آفات زمان زیادہ، اور ہمارے دار میں ہمیں پست، اور عز امام کمزور ہو گئے ہیں،..... اس لئے میں اپنے طالب علم بھائیوں کو چار ایسی تفاسیر کی نشان دی کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان پر قناعت کرنا چاہے تو وہ، انشا اللہ کافی ہوں گی،

ایک تفسیر ابن کثیر جس کے باہرے میں ہمارے استاذ ر حضرت علام انور شاہ صاحب کثیریؒ فرماتے تھے کہ "اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے بے نیاز کر سکتی ہو تو وہ تفسیر ابن کثیر ہے جو تفسیر ابن حجر یہ سے بے نیاز کر دیتی ہے" دوسری تفسیر کبیر امام رازیؒ جس کے باہرے میں ہمارے استاذ فرماتے تھے کہ "قرآن کیم" کے مشکلات میں مجھے کوئی مشکل ایسی نہیں میں جس سے امام رازیؒ نے تعریض نہ کیا ہو، یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات مشکلات کا حل ایسا پیش نہیں کر سکے جس پر دل مطمئن ہو جائیں، اور اس کے باہرے میں جو کہا گیا ہے کہ فیہ کل شئی الا التفسیر، تو یہ خواہ مخواہ اس کی جلالتِ تدرکو کم کر کے دکھانا ہے، اور شاید کسی ایسے شخص کا قول ہے جس پر روایات کا غالیہ تھا، اور قرآن کریم کے طائف و علما

کی طرف توجہ نہ تھی، تیسرا تفسیر روح المعانی جو بہرے نزدیک قرآن کریم کی ایسی تفسیر ہے جیسے صحیح بخاریؓ کی شرح فتح البهاری، الایہ ک فتح البهاری ایک کلام مختصر کی شرح ہے، اس لئے اس نے شرح بخاریؓ کا جو فرضہ اُست پر تھا اُسے چکار دیا ہے، اور الشرک کا کلام اس سے بلند در تر ہے، کوئی بشر اس کا حق ادا کر سکے، پوچھتی تفسیر ابیال سعود ہے، جس میں نظریت آنی کو بہترین عبارت میں بیان کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے، اور وہ بسا وفات زعفرانی کی کشائی سے بنے نیاز کر دیتی ہے ۔
اس عبارت میں تفسیر و ضرطیؓ کو چھوڑ کر انہی چار کتابوں کا تذکرہ انہی خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے، جوناچیز کی بحث میں آئی تھیں، حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے تلمیز و شید حضرت پتوری مظلوم کے ساتھ اس توافق پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں

یہ بحث توعیی تفاسیر کے بارے میں تھی، اردو زبان میں حسکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "بیان القرآن" اپنے مصنفوں کے اعتبار سے بے نظیر تفسیر ہے، اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوتا جہا انسان تفسیر کی ضخیم کتابیں مہمنگا لئے کے بعد اس کی طرف رجوع کرے، البتہ اس کی زبان چونکہ علمی اور اصطلاحی انداز کی ہے، اس لئے عام اردو دان حضرات کو اس کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، اسی ضرورت کے پیش نظر احرقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مظلوم العالی نے "معارف القرآن" کے نام سے آٹھ جلدیں میں مفصل تفسیر تحریر فرمائی ہے، جس میں بیان القرآن کی شرح اور تسلیل بھی ہے، اور عصر حاضر کی ضروریات زندگی پر قرآن کریم کی بڑیات کی بہترین وضاحت بھی، اور تہذیب جدید کے مسائل پر قرآنی فکر کے تحت بھروسہ تبصرہ بھی، اب تک اردو زبان میں چتنی تفاسیر منظرعام پر آئی ہیں اُنمیں یہ ایک منفرد تفسیر ہے جیسیں سلف الحدیث کے مسلک دہشتر کی پوری حفاظت

لہ ملکہ ان "تیتہ البیان" مقدمہ مشکلات القرآن" ص ۲۳ و ۲۴ طبع مجلس علیہ دہلی ۱۳۵۴ھ ،

کے ساتھ عصر حاضر کی ضروریات کو بطرق احسن پردازیا گیا ہے، بحدا اللہ یہ تفسیر عوام و خواص میں بیجہ مقبول ہو رہی ہے، اور اس سے بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے، آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ، میں قرآن کریم کی رحمت و عظمت پہچانے کی توفین عطا فرمائے، اس کی صحیح فہم کی دولت سے نوازے، اور اس کی تلاوت، اس پر عمل اور اس کی نشر و اشاعت کے حقوق ہم پر عالم ہوتے ہیں انھیں ادا کرنے کی توفین عطا فرمائے، آمین،

اللَّهُمَّ إِنِّي وَخَشِيتُ فِي قَبْرِيَ، أَلَّا تَهْمِمَ أَرْحَافُ الْقُرْآنِ عَظِيمٌ
وَاجْعَلْنِي إِمَاماً وَمُؤْرِثًا وَهُدًى وَرَحْمَةً، أَلَّا تَهْمِمَ عَلَيْنِي
مِنْهُ مَا جَعَلْتَ وَذَكَرْتِي مِنْهُ مَا نَسِيْتُ
وَارْزُقْنِي تِلَادَةً إِنَاءَ الدَّيْلِ وَ
إِنَاءَ الْهَبَارِ وَاجْعَلْنِي
حَجَّةً يَارَبَّ الْعَالَمِينَ،

وَلِلَّهِ الْحَمْدُ أَرْلَدُ الْأَخْرَاءِ، وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا
مُحَمَّدٍ وَعَلَى أَلَّا وَاصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَاتَّبَاعِهِ أَجْمَعِينَ؛

احقر

محمد تقی عثمان

لیلۃ الجمعة ۱۴۲۶ھ اربیع الثانی ۱۳۹۶ء

دارالعلوم کورنگی
کراچی نمبر ۱۷

کتبہ سیدنا شاہ حسین ساکن فتحی ۶۰۶

صاحبِ تصنیف

مولانا محمد تقیٰ علیل ابن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب :

(مفتی اعظم پاکستان، بیانی دارالعلوم کراچی)

5 شوال المکرہ 1362ھ (اکتوبر 1943ء)

1- تحصیل درس نئائی دارالعلوم کراچی 1379ھ (1960ء)

2- فاضل عربی و تجاتب پورڈ 1958ء م امتیازی درجے کے ساتھ

3- بی اے کراچی یونیورسٹی 1964ء

4- ایل ایل بی کراچی یونیورسٹی 1967ء م امتیازی درجے کے ساتھ

5- ایم اے عربی و تجاتب یونیورسٹی 1970ء م امتیازی درجے کے ساتھ

حدیث و فقہ کے علاوہ مختلف اسلامی علوم کی تدریس دارالعلوم
کراچی 1960ء سے تا حال۔

محافف :

ادارت ماہنامہ "البلاغ" 1967ء سے تا حال

ادارت ماہنامہ "البلاغ" نظریہ نظریہ (انگریزی) 1989ء سے تا حال

مناصب :

1- نائب صدر دارالعلوم کراچی 1976ء سے تا حال

2- مجری شعبہ تصنیف دلیل - دارالعلوم کراچی

3- شریعت انہلیت ٹاؤن پریم کورٹ آف پاکستان

4- نائب رئیس "مجمع الفقہ الاسلامی" جده، سعودی عرب

5- محاذیات اور نئک پر قابل قدح کام کے باعث مسلمانوں کے

مختلف میکونوں میں (Shariah Supervisory Boards)

شریعت انگریزی پورڈ کے بہر

تصانیف کی فہرست اسی کتاب کے لایپ پر لاحظہ فرمائیں۔